[illegible]

اردوئے معلیٰ

جلد (۴) | بابت ماہ جنوری ۱۹۰۵ء | نمبر (۱)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علیگڈھ
۱۲۸
باہتمام خاکسار احمد سعید
مطبع احمدی علی گڈھ مین طبع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرزا احمد منشا

انقلاب زمانہ کے ہاتھوں جہاں اور کملاء اور شعراء کے نام فہرست معدومیت میں درج ہیں وہاں میرزا احمد منشا کا نام بھی جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ مرزا صاحب نواب سعادت علیخان بہادر کے عہد میں لکھنو سے ہوائے عشق میں عظیم آباد تشریف لائے۔ یہ مرزا نجم الدین علیخاں کے بیٹے اور سید انشا کے داماد تھے۔ چونکہ ان کے مزاج میں دخل سودا پہلے ہی سے تھا اسکی یہ خیال راسخ ہوگیا تھا کہ میں نائب امام آخر الزماں علیہ السلام ہوں اور اس حیثیت سے سلطنت روئے زمین کا مالک ہوں۔ خندہ مزاج اور مذاق آشنا امراے عظیم آباد انھیں برابر چھیڑا کرتے اور بادشاہ سلامت کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اور مرزا صاحب باغ باغ ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ تقاضائے جنون ہے یہ اکثر زہریلی چیزیں اور سنکھیا اپنی جیب میں لیئے پھرتے اور جہاں ہوتے شغلاً نوش فرمانے لگتے تھے۔ حالانکہ اگر انہیں سے کوئی ذرا سا بھی کھا لیتا تو فوراً جاں بحق تسلیم ہو جاتا مگر بادشاہ سلامت پر خاک اثر نہوتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب ناظر وزیر علی صاحب عبرتی مرحوم کی صحبت میں تشریف رکھتے تھے کہ کچھ زہریلی بوٹیاں جیب سے نکالکر بے تکلف کھانے لگے۔ حالت دگرگوں ہونے لگی۔ معاً کچھ خیال آیا دوسری جیب میں کوئی چیز ٹٹولنے لگے۔ جبتک ملی تو زبان اینٹھنے اور حالت مرگ طاری ہونے لگی۔ لوگوں نے گھبرا کر سبب پوچھنا شروع کیا مگر اونہوں نے کچھ جواب نہ دیا اور گولر کے ایک درخت کیطرف اشارہ کیا جو مکان کے پس پشت استادہ تھا۔ لوگ سمجھ گئے۔ جلدی جلدی اسکی چھال پسوا کر پلوائی۔

جب جاکے اونہیں ہوش آیا۔ ورنہ دم نکلنے میں کوئی بات باقی نہ تھی۔ حواس میں آئے تو خود ہی ارشاد فرمایا کہ میں دفع سُم کے لئے گوُر کا چھلکا بھی جیب میں رکھہ لیا کرتا تھا مگر اتفاقیہ آج بھول گیا۔

مرزا صاحب نہایت قانع۔ متوکل۔ آزاد مزاج اور ذی علم شخص تھے اور امرائے عظیم آباد کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ تلامذہ مرزا محمد حسن قتیل میں کوئی اونکا ہمسر نہ تھا شوخی وسلاستِ سخن۔ سوز وگداز۔ اور برگشتگی میں انکا کلام ممتاز تھا۔ قصیدے بھی باشکوہ کہتے تھے۔ زیادہ تر فارسی زبان میں غزل سرائی کا شوق تھا اور اوائل میں اوج تخلص فرماتے تھے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ آپکے کلام فارسی کا ایک مجموعہ بھی تھا مگر خدا جانے کدہر سے کدہر ہو گیا۔ ایک قصیدہ پولیٹکل اجنٹ لکھنو کی شان میں بھی کہا تھا۔ جسکے یہ چند اشعار بزرگان عظیم آباد سے سنتا آیا ہوں۔ ؎

جو سوکے اٹھا سحر کا گورا شعاع تاباں کی کرچ لیکر۔ + مسیح نے مہر کا کٹورا شراب گلرنگ سے دیا بھر
نہیں یہ بادل گرج رہے ہیں فرنگی طنبور بج رہے ہیں + گلابی دستار سج رہے ہیں۔ اُتار غنچے سروں سے افسر
لگا ہے تاروں میں منہ کو جہولا خوشی سے طفلِ شگوفہ پہولا + بہار نے اپنا ہاتہی ہولا بکہیرے دور کے ہوا کے فرفر

مرحوم کی ایک اردو غزل بھی تذکرہ شمع انجمن میں نظر سے گذری۔

یہ تذکرہ زبان فارسی میں ہے اور مولوی سید امیر جان صاحب فرقتی دہلوی ساکن عظیم آباد کی تصنیف سے ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ تذکرہ نگار راقم الحروف کے حقیقی چچا تھے۔ جنہوں نے سال پیوستہ میں انتقال فرمایا اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے مگر افسوس اسوقت تک کوئی کتاب۔ قالب طبع میں نہیں آئی۔ خیر مرزا کی وہ غزل یہ ہے ؎

ہے کون وہ دل جسپہ جو شیدا نہیں ہوتا	پر تو ہے وہ کافر کہ کسیکا نہیں ہوتا
دنیا میں مرے لاکھوں ہیں پر جی جو بجھا ہے	طالب کسی لذت کا دل اپنا نہیں ہوتا
نالوں سے مرے بھاگتے ہیں اپنے پرائے	سچ ہے کوئی آفت میں کسیکا نہیں ہوتا
آہ اس مرضِ عشق کا دستور یہی ہے۔	بیمار جو ہوتا ہے تو اچھا نہیں ہوتا
رنج وغم ناموس نہ کر اوج بلاکش	عاشق نہیں ہوتا ہے جو رسوا نہیں ہوتا

انکی ایک دوسری غزل کا مطلع زبان زد ارباب عظیم آباد ہے جو بیمہری معشوق اور وفائے عاشق کا کامل نمونہ اور سوز وگداز میں ڈوبا ہوا ہے اور اس مقام پر تبرکاً درج ہے۔ شعر

پھینکدو چاہو جہاں قبر میں اب مرنا کیا
وہ جنازہ ہی نہ دیکھیں تو مرا مرنا کیا

مرزا صاحب نے ۵۴ برس کی عمر پاکر ۱۲۵۵ھ میں انتقال کیا اور درگاہ شاہ ارزاں میں زیر خاک پنہاں ہیں۔

سید علی سجاد (دہلوی عظیم آبادی)

نیشنل کانگرس کا بیسواں اجلاس بمقام بمبئی

اس سال نیشنل کانگرس کا بیسواں اجلاس بمبئی میں ۲۶-۲۷-اور ۲۸- دسمبر کو بڑی کامیابی اور شان وشوکت کے ساتھ ختم ہوا۔

ہندوستان کے ہر حصے سے ہر قوم کے ڈیلیگیٹ اس عظیم الشان ملکی جلسے میں شرکت کی غرض سے جمع ہوئے تھے۔ ان بہی خواہان قوم کی تعداد ۱۲۰۰ کے قریب تھی

ڈیلیگیٹوں کا استقبال اور اون کی جائے قیام بمبئی کے مختلف کالجوں کے پرجوش طالب علم والنیٹر کی حیثیت میں ایک خاص قسم کی وردی اور نشان سے مزین ریلوے اسٹیشنوں پر مہمانوں کے استقبال کے لیئے موجود رہتے تھے۔

ٹرین سے اُترتے ہی مہمان مع اسباب بآرام و اطمینان تمام کانگرس کی مقرر کردہ گاڑیوں میں کیمپ تک پہونچ جاتے تھے۔

یہ ڈیلیگٹس کیمپ۔ بی۔ بی۔ سی۔ آئی۔ آر۔ کے اسٹیشن قلابہ سے بالکل ملا ہوا عین سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ اس مقام کی آب وہوا بمبئی بھر میں سب سے زیادہ صحت بخش اور فرحت افزا تھی۔

کیمپ کے مصنوعی پھاٹک سے نکلتے ہی داہنی جانب انکوائری آفس (خیمہ برائے دریافت حالات) اور بائیں جانب ریڈنگ روم نظر آتا تھا ریڈنگ روم میں۔ انگریزی کے تقریباً تمام تازہ اخبار موجود رہتے تھے۔

انکوائری آفس میں آنریبل مسٹر ایچ اس وکشت کا بنفس نفیس نہایت سادہ لباس میں موجود ہونا اور ہر شخص کے سوالوں کا جواب دینا عجب پسندیدہ نظارہ تھا۔ حقیقت میں کام کرنے والے لوگوں کی یہی شان ہونا چاہیئے کہ ظاہری تکلفات اور خود داری بیجا سے آزاد ہوں۔

یہاں ہر مہمان آنریبل موصوف سے اپنے قیام کے متعلق جملہ امور طے کر کے اپنے مقررہ خیمے میں پہونچ جاتا تھا۔ ہر خیمے میں متعدد سفری پلنگ۔ کرسیاں۔ میز۔ ایک لیمپ ایک لالٹین اور دیگر ضروری چیزیں موجود تھیں۔ شبکو خیموں میں اور باہر تمام کیمپ میں گیس کی روشنی ہوتی تھی۔

انتظام طعام

صبحکو ہر ڈیلیگیٹ کے جائے قیام پر چائے پہونچتی تھی اور ۹ بجے کھانے کی گھنٹی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے لیئے انتظام ہوٹل میں کر دیا گیا تھا۔ لیکن انمیں سے اکثر نے بغرض ملاقات احباب کیمپ ہی میں رہنے اور پوری۔ ترکاری مچھلی کھانے کو ترجیح دی۔

کھانے سے فارغ ہو کر لوگ کانگرس پنڈال کیطرف روانہ ہونے لگتے تھے کیمپ سے پنڈال تک جانے کا انتظام بھی کانگرس کیطرف سے کر دیا گیا تھا!

کانگرس کے اجلاس میں دو۔ اور تین بجے کے درمیان لوگوں کو ریفرشمنٹ کے لیئے کچھ دیر کی فرصت ہوتی تھی

اس غرض کے لیئے ایک علیحدہ خیمہ نصب کیا گیا تھا جسمیں ڈیلیگیٹ اور رپوٹر حسب خواہش چائے۔ لیمونڈ۔ مٹھائی۔ میوے۔ آئس کریم سے شغل کرتے تھے۔

یہ سب چیزیں ایک فراخ حوصلہ سوداگر کی جانب سے مفت پیش کی جاتی تھیں۔

شام کو کیمپ میں واپس آنے پر ایڈوکیٹ آف انڈیا کی کاپی ہر ڈیلیگیٹ کی میز پر

موجود ہوتے تہے جنمیں اُس روز کی کارروائی درج ہوتی تہی۔

پہلا دن

۲۶ تاریخ کو کارروائی کا آغاز ایک بجے سے ہونا چاہیئے تہا لیکن پنڈال ۱۱ بجے سے ڈیلیگیٹوں اور وزیٹروں سے پُر ہوگیا تہا۔ ۲۰۰ کے قریب ڈیلیگیٹ اور ۱۰۰۰ سے زائد وزیٹروں کا مجمع اور پہر کیسا مجمع جسمیں سے تقریباً ہر شخص تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق تہا۔ اور جنمیں سے تقریباً ہر شخص کا دل قومی اور ملکی جوش سے لبریز تہا حقیقت میں وہ نظارہ بہی قابل دید تہا جبکہ پہلے سر فیروزشاہ مہتا۔ اور مسٹر گوکہلے کی آمد پر۔ اور پہر سر ہنری کاٹن بالقابہ اور سر ولیم ویڈر برن کی تشریف آوری پر تمام ہال پرجوش چیرز کی آواز سے گونج اوٹہا تہا۔

راقم حروف اسوقت لوگوں کے چہروں کو بغور دیکہہ رہا تہا اور حُبِ ملک وحب قوم کی اس نرالی شان کو دیکہکر جو حاضرین کے سچے جوش او اولوالعزمی کی صورت میں نمایاں تہے۔ بلا مبالغہ ازخود رفتہ ہوا جاتا تہا۔

حق یہ ہے کہ اگر کانگرس سے اور کوئی بہی فائدہ مرتب نہو تو صرف اس پاک جوش اور شریفانہ حمیت وخودداری کی نمودار حالت کو پیش نظر رکہکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو جلسہ نوجوانان ملک کے دلوںمیں ایسی جائز حوصلہ مندی اور آزاد جوش پیدا کرے اور بزرگان ملک کی توجہ اور خیالات کو ملکی امور کی جانب ہمیشہ مائل رہنے اور نوجوان کے سامنے اپنی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا نمونہ پیش کرنے کا موقع دے، وہ کسیصورت میں بیکار نہیں ہوسکتا۔

یہ جوش وخروش اور بہی زیادہ ہوگیا جبکہ سر فیروزشاہ مہتا، استقبالی کمیٹی کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے اپنا ایڈریس سنانے کے لیئے آمادہ ہوئے۔

سر فیروزشاہ کی ذاتی بلند پائیگی کے ساتہ اون کے ایڈریس کے پرشکوہ الفاظ، اون کے انداز بیان کی خوبی، بیا بجا اُن کی فطرتی مذاق آمیز گفتگو کی چاشنی۔ ان کا آزادانہ لہجہ اور سب سے زیادہ اس ایڈریس کے لاجواب مضمون۔ ان سب نے مل جلکر حاضرین کے اوپر ایسا اثر کیا تہا کہ اسکی کیفیت اندازِ تحریر سے بالاتر ہے۔ کاش کہ قلت گنجایش کی

بنا پر ہم مجبور ہوتے اور اس قابل ایڈریس کا ترجمہ اسی ماہ کے رسالے میں پیش کر سکتے۔

اسکے بعد مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے اپنی معمولی پرزور تقریر کے ساتھ مسٹر ہنری کاٹن کو پریسیڈنٹ بنانے کی تجویز پیش کی۔ اور جناب ممدوح کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے پریسیڈنٹ کا افتتاحی ایڈریس بلا مبالغہ متانت الفاظ پختگی مضامین۔ وزن رائے جامعیت مطالب اور درستی انداز کے لحاظ سے اپنا آپ ہی جواب تھا۔

لیکن افسوس کہ صدر موصوف کی بزرگی سن اور نحافت آواز کیوجہ سے دور کے لوگ اسکے لطف استماع سے محروم رہے۔

ایڈریس کے ختم ہونے پر حسب دستور قدیم انتخاب مضامین کے لیے سبجکٹس کمیٹی مقرر ہوئی اور اجلاس برخاست ہوا۔

روز دوم

پہلے دن کی کارروائی کے آغاز سے قبل پارسی لیڈیوں نے نیشنل انتھم بڑی خوش الحانی کے ساتھ گایا تھا۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر کو دوسرے اجلاس میں بھی ویسا ہی ہوا۔ گیت گجراتی زبان میں تھا۔ لیکن چونکہ یہ معلوم تھا کہ اسکا مضمون ملک وقوم سے متعلق ہے۔ اسلیے ہم اردو دانوں پر بھی اسکا کچھہ کم اثر نہیں ہوا۔ بعد میں اسکا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہوا اور ساتھ ہی ایک فہرست ان رزولیوشنوں کی ملی جو آج پیش ہونے والے تھے۔

ہر رزولیوشن کے آخر میں اسکے پیش کرنے والے اور تائید کرنے والے اور تائید مزید کرنے والوں کے نام درج تھے۔ ان سب ناموں کی ترتیب اور رزولیوشنوں کے الفاظ وعبارت کی درستی سبجکٹس کمیٹی کی رائے کے مطابق ہوئی تھی۔ اور اس سے تقریر کرنے والوں اور سننے والوں دونوں کو آسانی اور اطمینان ہوتا تھا۔

پہلا رزولیوشن ہندوستانیوں کو ملازمت سرکار میں زیادہ حصہ ملنے کے متعلق تھا اسکو پیش کرتے وقت مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے جو اسپیچ دی تھی وہ حقیقت میں خوبیٔ تقریر کا اعلی نمونہ تھی۔ انشاءاللہ ماہ فروری کے پرچے میں اسکا اردو ترجمہ ناظرین اردوئے معلی کی نظر سے گذرے گا۔

آجکا باقی دن رزولیوشنوں کے پیش ہونے اور حسب معمول بحث ہوکر پاس ہونےمیں گذرا۔ مسٹر بنرجی کی تقریر کے علاوہ باقی دوسری اسپیچیں ہماری رائے میں معمولی تھیں۔ بلکہ بعض مدراسی دوستوں کے لب ولہجہ سے ہمارے بعض دوستوں کو جو کانگرس میں پہلی ہی بار شریک ہوئے تھے اور ان اسپیچوں کی نسبت اپنے ذہن میں بہت اچھی رائے قائم کرچکے تھے، مایوسی ہوئی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بات کچھ کانگرس ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ایسا جلسہ جسمیں متواتر رزولیوشن پیش ہوں اور جہاں بولنے والوں کے لیئے ۱۰ منٹ اور ۵ منٹ وقت مقرر ہو خصوصاً ایسی حالت میں کہ مضمون زیر بحث پیش پا افتادہ ہو، اس قسم کی کمزوریوں سے بچ نہیں سکتا۔

تاہم یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ بہت سے اہل کانگرس جو قلم کے زبردست ہیں اور جن کی تحریروں کا سکہ بہتوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، تقریر کے بھی ویسے ہی دھنی نہیں ہیں۔

ایک بات اور بھی ہمارے خیال میں گذری۔ وہ یہ کہ مسلمان اگر چاہیں تو تقریر کے میدان میں بہتوں سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے ایسے بہت سے نوجوان دوستوں کے نام لے سکتے ہیں جو اگر تیار ہوکر بولیں تو لوگوں کو حیرت میں ڈالدیں۔ خیر۔ آج جسقدر رزولیوشن پیش ہوئے اور جو کل سبجکٹس کمیٹی میں پاس ہونے کے بعد پیش ہوں گے ان سب کی مفصل فہرست آخر میں درج کردی جائے گی۔

روز سوم

آجکا دن بھی رزولیوشنوں کے معاملے میں گذرا۔ محاصلات ملک میں سے جو رقم بعد اخراجات، فاضل بچتی ہے، اسکے متعلق رزولیوشن پیش کرتے وقت آنریبل مسٹر گوکھلے نے، جامعیت اور دریافت و واقفیت کے لحاظ سے ایک نہایت عمدہ اسپیچ دی جسکو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ مسٹر گوکھلے کی روانی بیان میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن ایک بات ضرور معلوم ہوئی کہ مسٹر موصوف اسپیکر ہیں۔ آ...ٹر نہیں ہیں۔ خیر۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔

آج چونکہ کانگرس کا آخری دن تھا اسلیئے آخری رزولیوشنوں میں جوش و خروش کا بہت کچھ اظہار ہوا۔

راقم کے دل میں جوش کے ساتھ رنج بھی تھا یعنے اسلیئے کہ آج اس عزیز اور گرامی قومی جلسے کا آخری دن تھا جس سے اب گویا سال بھر کے بعد پھر کہیں بنارس میں ملاقات کا موقع حاصل ہوگا۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

متفرق

جو لوگ شرکت کانگرس کی غرض سے بمبئی آئے تھے انہوں نے کانگرس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھا۔ مثلاً بمبئی کی صنعتی نمایش جسکی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور جسکا مختصر بیان بھی ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔

ہم اس موقع پر صرف اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ اگر لوگ صرف اس نمایش کو دیکھنے کی غرض سے بمبئی کا سفر اختیار کرتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ درآنحالیکہ کانگرس والوں کے لیے اس لاجواب نمایش کی سیر، جسکی وسعت اور خوبی ترتیب نمایش دہلی سے بھی بڑھکر تھی، یک کرشمہ دو کار۔ کے مصداق تھی

۲ بجے دن سے لیکر ۱۱ بجے رات تک نمایشگاہ میں ناظرین کا ہجوم رہتا تھا۔ اور سیر کرنے والے کے لیے اصلی نمایش سے بڑھکر، ہر قوم و مذہب، ملت و مشرب کے لوگوں کو بہ طرز و پوشاک و گفتگو کے مختلف یکجا دیکھنا عجب دلچسپ نظارہ تھا۔ شاید ہم نمایش کے تفصیلی حالات آیندہ پیش کرسکیں۔

۲۹ دسمبر کو بوقت سہ پہر کانگرس پنڈال میں کنورسے ثریان کا جلسہ تھا جسمیں ہر حصہ ملک کے لوگ باہم ملکر ایک دوسرے سے تعارف محبت کا لطف حاصل کرتے تھے۔

یہاں پر ہر قوم کے لوگ اسطور پر شیر و شکر ہوگئے تھے کہ ملکی اتحاد کی ایک نمایاں تصویر پیش نظر ہوگئی تھی۔ کانگرس سے فرصت پاکر لوگوں نے بمبئی کے مشہور مقامات کی سیر شروع کی۔ بعض نے اسٹیمر پر سمندر کا بھی لطف اٹھایا۔ لیکن یہ سب باتیں علیحدہ بیان کرنے کی ہیں۔

دوسری رات شب کو پروفیسر چھتری نے کانگرس کے مہمانوں کو اپنی مشہور سرکس میں مدعو کیا اور بہت اچھے تماشے دکھلائے۔

۳۱ دسمبر کو سوشل کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا جسمیں مہاراجہ بڑودہ

دام اقبالہ کی قابلانہ اور وزنی تحریر اس مرتبے کی ہوئی کہ اب تک غالباً کسی والی ملک نے ایسا عمدہ ایڈریس نہ دیا ہوگا۔ یہ ایڈریس بجائے خود ترجمے کے قابل ہے اور ہم شاید کسی موقع پر اسے پیش بھی کریں۔

سوشل کانفرنس کا اجلاس ہر سال کانگرس کے اجلاس کے بعد ضرور ہوتا ہے اور اور کچھ دنوں سے نمائش بھی ہونے لگی ہے۔ پس نیشنل کانگرس گویا مجموعہ ہے تمام مفید ملک تحریکوں اور تجویزوں کا اور ایسی حالت میں اسکے مقاصد سے ہمدردی نہ رکھنا ہمارے نزدیک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔

مسلمان شمالی ہندوستان کے مسلمان ہنوز کانگرس سے ناواقف ہیں ہم ناواقف کا اور کانگرس لفظ دانستہ استعمال کرتے ہیں کیونکہ جب یہاں کے مسلمان مقاصد کانگرس سے آگاہی نہیں رکھتے تو اون کو اس جلسے کے خلاف کہنا غلطی ہے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ جاہل اور خودغرض اور کورانہ تقلید کرنے والے مسلمانوں کے سوا باقی تمام تعلیم یافتہ مسلمانان بمبئی۔ مدراس و برار و بہار کانگرس سے ہمدردی رکھتے ہیں اور انہیں سے بہت سے لوگ عملی حصہ بھی لیتے ہیں۔

ہمکو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم کسی پرانی وضع کے اخبار میں کانگرس کے متعلق یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف ہے۔

ہم نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ جو انگریزی سے ناآشنائے محض ہونے کے علاوہ کبھی کانگرس میں شریک بھی نہیں ہوتے، انکو کیا حق حاصل ہے کہ اس جلسے پر کسی قسم کی رائے کا اظہار کریں۔

ریاض الاخبار کے شاعر اڈیٹر اور البشیر کے ناواقف مدیر جب محض رسم قدیم کے پیروی کے طور پر کانگرس کو بلا وجہ برا بھلا کہتے ہیں تو ہم اپنے غصے کو محض اس خیال سے پی کر رہ جاتے ہیں کہ ان پرانے لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ جا و بیجا جسطرح ممکن ہو اپنی قدیم وضع کو نباہے چلے جائیں۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ لوگ بالکل ناواقف ہیں تو ظاہر ہے کہ اونکی رائے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

۵ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ ہمکو بیان یہ کرنا ہے کہ ہمنے کانگرس کے پبلک اور پرائیویٹ تقریباً تمام جلسوں میں شریک رہ کر غور سے دیکھا اور معلوم کیا کہ وہاں ایک لفظ بھی کسیکی زبان سے ایسا نہیں نکلا جو مسلمانوں کے اغراض کے خلاف ہو۔

اصل یہ ہے جو لوگ وسیع النظر نہیں ہیں یا جنکی معلومات صرف ادنے درجے کی کچہریوں تک محدود ہے وہ کسی کلرکی کی جگہ کے لیئے ہندو اور مسلمان اُمیدواروں کے درمیان کشمکش دیکھکر اپنے قیاس کو وسعت دیتے ہیں اور ہر ملکی تحریک کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ کوتاہ بینی افسوس کے قابل ہے۔ کسی عہدے کے لیئے امیدواروں کا لڑنا عام اس سے کہ سب اُمیدوار ہندو یا سب مسلمان یا کچھ ہندو ہوں اور کچھ مسلمان۔ ایک شخصی اور ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ اور نیشنل کانگرس ایک بہت بڑا ملکی مجمع ہے جسکے مقاصد اسقدر عام اور بلند ہیں کہ ان تک ذاتی یا قومی اختلاف کا اثر مشکل سے پہونچ سکتا ہے۔

ہمنے بڑے غور سے دیکھا اور کانگرس کے تمام تقریر کرنے والوں کی تقریروں سے دریافت کیا کہ ان میں سے کسی ایک کے دلمیں بھی اسوقت ملکی اغراض کے سوا شخصی اغراض کا شائبہ تک نتھا۔ اور نہ اس جلسے کے اعلیٰ مقاصد میں اسکی گنجایش تھی۔

رزولیوشن ہم ذیل میں ایک فہرست اس سال کے تمام رزولیوشنوں کی درج کرتے ہیں جس سے ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہوجائے گی۔

رزولیوشن نمبر (۱)۔ پبلک سروس میں اہل ہند کا تقرر

(الف) اس کانگرس کی رائے میں گورنمنٹ ہند کا اصول اور اوس کی پالیسی ہندوستانیوں کے اعلےٰ عہدہائے گورنمنٹ پر مقرر ہونے کی نسبت (جسکا اظہار ۲۴ مئی ۱۹۰۴ء کے رزولیوشن میں ہوا ہے) پارلیمنٹ کے قانون ۱۸۳۳ء اور ملکہ معظمہ انجہانی کے اعلان

شاہی ۱۸۵۸ء کے خلاف ہے۔ یہ کانگرس مودبانہ مگر پر زور طور پر ان تمام کوششوں پر اعتراض کرتی ہے جو ان باوثوق وعدوں کے معطل کر دینے کے لئے کیجاتی ہیں جو بادشاہ وقت اور پارلیمنٹ نے اس ملک کے ساتھ کئے ہیں اور نیز ان کوششوں پر اعتراض کرتی ہے جو ان انتظاموں سے تعریض کرنے کے لئے کیجاتی ہیں جن کو گورنمنٹ نے پبلک سروس کمیشن کے غور و فکر کے بعد قرار دیا تھا۔

(ب) اس کانگرس کی رائے ہے کہ موجودہ مالی اور انتظامی بدنظمیوں کا واقعی تدارک اسطرح ہوسکتا ہے کہ ملک کے اعلیٰ شعبہائے ملازمت میں ہندوستانی بکثرت مقرر کیے جائیں۔ یہ کانگرس اس امر میں گذشتہ کانگرسوں سے اتفاق کرتی ہے کہ پارلیمنٹ کے رزولیوشن ۲ جون ۱۸۹۳ء پر (اس بارے میں کہ ایک ہی سا امتحان سول سروس کے لئے انگلستان اور ہندوستان میں ہوا کرے) فوراً عملدرآمد شروع کیا جائے اس اتفاق رائے کے اظہار کے ساتھ یہ کانگرس اتنا زاید کرتی ہے کہ اس مسئلے کا قابل اطمینان حل اسیوقت ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی سول سروس کی تجدید مقامی حالات کے اعتبار سے ازسرنو کیجائے اور اسی اثنا میں جوڈیشل خدمات بتدریج ان لوگوں کے سپرد کیئے جائیں جنہوں نے قانونی تعلیم حاصل کی ہو۔

(ج) یہ کانگرس اس امر پر افسوس ظاہر کرتی ہے کہ اکثر صوبجات ہند میں امتحان مقابلہ بند کر دیا گیا۔ گذشتہ تجربے سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ نامزدگی کے قاعدے سے اس ملک میں یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف حکام رسی سے ملازمت حاصل ہوسکتی ہے اور اسطرح نالایق لوگ بھرتی ہوتے ہیں جسسے انتظام میں نقایص پیدا ہوتے ہیں اور بعد کو یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے قابل نہیں۔

مجوز:۔ بابو سریندرو ناتھ بنرجی (کلکتہ)

موئد:۔ مسٹر سبرامینا آیر (مدراس)

تائید مزید { مولوی ابوالقاسم (بردوان بنگال)
آنریبل مسٹر کرشنان۔نیر۔ (کالی کٹ۔مدراس)

رزولیوشن نمبر (۵)

(الف) یہ کانگرس گورنمنٹ آسٹریلیا کی کارروائی پر اپنا اطمینان ظاہر کرتی ہے کہ اسنے ہندوستانی سیاحوں کے لیے آسان قوانین بنائے ہیں مگر ساتھ ہی اِس امر پر سخت افسوس کرتی ہے کہ شاہنشاہ معظم کی نوآبادیوں میں اُن کی ہندوستانی رعایا کیساتھ سخت برتاؤ کیا جاتا ہے اور انکو معمولی حقوق بھی برٹش رعایا کے نہیں ملتے۔

(ب) یہ کانگرس اِس امر پر خاصکر اعتراض کرتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ اِن قوانین کے اجرا کی دھمکی دیتی ہے جو سابق بوئیر گورنمنٹ نے ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے خلاف وضع کیے تھے اِس اعتبار سے کہ جنگ بوئیر کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ ٹرانسوال گورنمنٹ ہندوستانیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتی ہے نیز اِس اعتبار سے کہ ہندوستانی تارکان وطن ایام جنگ میں گورنمنٹ کے وفادار رہے اور عمدہ مدد پہنچائی۔

یہ کانگرس بہت زور کے ساتھ برٹش پارلیمنٹ سے التجا کرتی ہے کہ وہ مساوی برتاؤ کے لیے اصرار کرے گی۔

(ج) کانگرس اِس بارے میں گورنمنٹ ہند اور سکرٹری آف اسٹیٹ کا دلی شکریہ ادا کرتی ہے کہ اونھوں نے ہندوستانی تارکانِ وطن کے فائدے کے لیے سخت کوشش کی اور کانگرس امید کرتی ہے کہ جبتک کوئی معقول بندوبست نہوگا وہ لوگ اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔

مجوز:- مسٹر وی۔ ان مدن جیت (جنوبی افریقہ)

موید:- مسٹر ان بروچا (کلکتہ)

تائید مزید:
مسٹر ان۔ سی۔ کلکر (پونا)
مسٹر وی۔ سی۔ شیشا چاری (دیلور۔ مدراس)
مسٹر عیسےٰ حاجی سمار (جنوبی افریقہ)
مسٹر ایس۔ سی۔ مکرجی (کلکتہ)

تائید مزید۔ ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجی۔ (ناگپور)

رزولیوشن نمبر (۹) تنخواہ سکرٹری آف اسٹیٹ

یہ کانگرس اس ناانصافی پر متعرض ہے کہ انڈیا آفس کا بار ہندوستان کے خزانے پر ڈالا جائے حالانکہ کلونیل آفس کا بار نوآبادیوں پر نہیں ڈالا جاتا۔ لہذا اس کانگرس کی رائے ہے کہ سکرٹری آف اسٹیٹ کی پوری تنخواہ خزانہ انگلستان سے دیجائے۔

مجوزہ مسٹر بہال چندر کرشن (بمبئی)

موید۔ آنریبل جی سری نواس راؤ۔ (مدورا۔ مدراس)

موید۔ مسٹر ایم۔ کے پادھیا۔ (ناگپور)

رزولیوشن نمبر (۷) بجٹ

(الف) اس کانگرس کی رائے میں جو بجٹ گزشتہ چھ برسوں میں قریب بیس ملین پونڈ کے ہوئی۔ اوس سے ملک کی خوش حالی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس ضرورت سے زاید ہے اور یہ بجٹ خاصکر روپے کی عارضی قیمت مقرر کردینے سے ہوئی ہے اور اسطرح ان اخراجات میں جو ہندوستان سے انگلستان کو دیئے جاتے ہیں۔ تین یا چار ملین سالانہ کی بجٹ ہوئی ہے۔

(ب) جن گروہوں کو گورنمنٹ کی سکے کی پالیسی سے نقصان پہنچا ہے انکی تلافی کے لیے اور اس خیال سے کہ گورنمنٹ کو خرچ بڑھانے کا موقع نہ ملے۔ اس کانگرس کی یہ رائے ہے کہ (۱) محصول نمک میں اور تخفیف کیجائے (۲) ان صوبجات میں جہاں متواتر قحط سے نقصان پہنچا ہے مالیہ اراضی کم کیا جائے (۳) روئی کا محصول برطرف کیا جائے۔

(ج) جبتک کہ اس تخفیف محصول پر عمل نہ کیا جائے اس بجٹ کا ایک حصہ اس طرح صرف ہونا چاہیئے جس سے بلاواسطہ رعایا کو فائدہ پہنچے۔ مثلاً سائنٹفک۔ زراعتی اور صنعتی تعلیم کی ترقی، طبی امداد میں آسانی، اور باقی لوکل اور میونسپل بورڈ کی مدد میں

صرف کیا جائے۔ خفکو پلیگ کے سالانہ اخراجات کے سبب سے بہت زیر باری ہوئی ہے
تاکہ یہ بورڈ حفظان صحت کے وسائل میں ترقی کر سکیں، اور ذرائع آمد و رفت کو وسیع
کیئے جائیں۔

مجوز۔ آنریبل مسٹر جی۔ کے۔ گوکھلے۔ (پونا)

موئد۔ مسٹر امبالال شنکر لال دیسائی (احمد آباد)

تائید مزید
- مسٹر جی سبرامنیا آئر (مدراس)
- راؤ بہادر وی ایم۔ پاٹھک (ستارا)
- مسٹر علی محمد بھیم جی (بمبئی)

رزولیوشن نمبر (۸)

یہ کانگرس مسٹر جے۔ ان۔ ٹاٹا کی وفات حسرت آیات پر اظہار ملال کرتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی ترقی صنعت و حرفت میں متوفی کے خدمات عظیم اور اس کی ہمدردی انسانی وحب الوطنی اسکی یاد کو ملک میں بہ سپاس و منت تازہ رکھے گی۔

از جانب صدر انجمن۔

رزولیوشن نمبر (۹)

اس کانگرس کی رائے میں وہ وقت آگیا ہے کہ اس ملک کے لوگ اپنے ملک کے معاملات کے انتظام و انصرام میں زیادہ اختیارات پاویں۔ اس طرح کہ:-

(ا) ہندوستان کے ہر صوبے یا ہر احاطے کو اسبات کا استحقاق دیا جائے کہ وہاں سے انگلستان کے ہاؤس آف کامنس کو کم از کم دو ممبر روانہ کیے جایا کریں۔

(ب) سپریم اور پراونشیل دونوں لیجسلیٹو کاونسلوں کو وسعت دیجائے۔ یعنے ان میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد بڑھا دیجائے۔ اور انکو یہ اختیار دیا جائے کہ جب اُن کے سامنے معاملات مالی پیش ہوں تو وہ کاونسل کو ووٹ کے لیئے تقسیم کر لیا کریں اور مسودہ قانون کا نفاذ سوا اُس گورنمنٹ کے حاکم اعلیٰ کے اختیار میں رہے جس سے یہ مضمون متعلق ہو۔

(ج) لندن کی انڈیا کاونسل اور گورنمنٹ آف انڈیا اور گورنمنٹ بمبئی ومدراس کی اکزیکٹیو کاونسلوں کی ممبری کے لیے ہندوستانی قایم مقام مقرر ہوا کریں۔ اور یہ قایم مقام لیجسلیٹو کاونسلوں کے منتخب ممبروں کی جانب سے نامزد ہوا کریں۔

مجوز :- مسٹر وی۔ کرشنا سوامی آئیر (مدراس)

موئد :- آنربل پنڈت مدن موہن مالوی۔ (الہ آباد)

موافق :- مسٹر جہانگیر بوما جی پٹیٹ۔ (بمبئی)

رزولیوشن نمبر(۱۱) معاملات تبت اور پیشقدمی کی پالیسی۔

یہ کانگرس اس امر کی نسبت اپنا دلی افسوس ظاہر کرتی ہے کہ گذشتہ حملہ تبت میں منشائے قانون ۱۸۵۸ء کی سراسر خلاف ورزی کی گئی۔ جسکا مفہوم یہ تہا۔ کہ حدود ہندوستان کے باہر محاصلات ہند، حملہ بیرونی کے سوا اور کسیصورت میں بلامنظوری پارلیمنٹ صرف نہوں گورنمنٹ اس حملے کو پولیٹکل مشن بتاتی رہی یہاں تک کہ بلحاظ واقعات پارلیمنٹ کے لیئے اس مشن کے ضروری اخراجات کا نامنظور کردینا قطعی ناممکن ہوگیا۔ اور اسی طرح پر محاصلات ملک ناواجبی طور پر ایکٹ ۱۸۵۸ء کی قانونی اور باضابطہ حفاظت سے محروم رہے۔

نیز یہ کانگرس اس امر کی بابت مزید افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ ہاوس آف کامنز نے اس حملے کے متعلق اخراجات کا ایک جزو بہی خزانہ شاہی سے ادا کرنے سے انکار کیا حالانکہ یہ حملہ شاہی اغراض کو پیش نظر رکہہ کر امپیریل پالیسی کی تائید میں کیا گیا تہا۔

یہ کانگرس اس ناانصافی پر اس بنا پر اور بہی زیادہ سختی کے ساتہ اظہار ناراضی کرتی ہے کہ اُسے خوف ہے۔ کہ حملہ تبت پیشقدمی کی پالیسی کا صرف ایک جزو ہے اور اُسے یہ بہی خطرہ ہے کہ افغانستان اور ایران کی مشنوں کیساتہ ملکر کہیں وہ ہندوستان کو ایسے جہگڑوں میں نہ پہنسا دے جو اعلیٰ فوائد ملک کے سخت مضر ہوں اور جن سے محاصلات ہند پر ناقابل برداشت بار پڑ جائے۔

مجوز: مسٹر ایچ۔ اسے واڈیا۔ (راجکوٹ)

موید۔ لالہ مرلی دہر (پنجاب)

موید۔ مسٹر۔ این۔ بی۔ راناڈی۔ (بمبئی)

رزولیوشن نمبر ۱۱۔ پولیس ریفارم

یہ کانگرس اپنا دلی افسوس ظاہر کرتی ہے کہ گورنمنٹ نے ابھی تک پولیس کمیشن کی رپورٹ کو پبلک سے پوشیدہ رکھا ہے۔ حالانکہ کمیشن کو اپنی رپورٹ پیش کیئے ہوئے دو برس کا عرصہ ہوچکا ہے اور اسکے بعض حصے ان اخباروں میں شائع بھی ہوگئے جن تک قانون رازداری کا اثر نہیں پہونچ سکتا۔

پس اس لحاظ سے کہ پولس کی کمل اصلاح، ملک کے لیئے بہت ضروری ہے اور اس بات کو پیش نظر رکھکر کہ پبلک کے بہت سے اغراض و فوائد اس مسئلے کے قابل اطمینان فیصلے سے وابستہ ہیں اور اسلیے قبل اسکے کہ ارکان گورنمنٹ اصلاح پولس کی تجویز طیار کریں۔ پبلک کو اظہار رائے کا کافی موقع ملنا بلاشبہ نہایت ضروری ہے نیز اس لحاظ سے کہ اس مسئلے پر گورنمنٹ ہند اور سکرٹری آف اسٹیٹ کے غور کرچکنے کے بعد پبلک کی تمام نکتہ چینیاں غالبتہً بیکار رہوں گی، یہ کانگرس باصرار تمام ملتجی ہے کہ کمیشن کی رپورٹ بلا توقف مزید شائع کردیجاسے۔

مجوز۔ بابو سرسچیندر سری بادھکاری۔ (بنگال)

موید۔ مسٹر کے۔ پراجپ (مدراس)

موید۔ مسٹر وی۔ جی۔ جوشی (ناگپور)

رزولیوشن نمبر ۱۲ فوجی اخراجات

(ا) یہ کانگرس اس امر سے نہایت ہراساں ہے کہ فوجی اخراجات کا بار سال بسال برابر بڑھتا جاتا ہے اور اس کانگرس کی رائے میں موجودہ فوجی اخراجات ہندوستان کی قوت برداشت سے باہر ہیں۔

(ب) یہ کانگرس ہراس انگیز افسوس کے ساتھ ان تجاویز کو دیکھتی ہے جنکی وجہ سے

اخراجات افواج کے متعلق محاصلات ہند پر مزید بار پڑنے والا ہے اور لارڈ کچنر کی تجویز کے مطابق جدید ترتیب افواج میں جو صرف ہوگا اُسکے خزانہ ہند سے ادا کیے جانے کی سخت مخالفت ہے۔

(ج) چونکہ افواج متعینہ ہند کی قوت کا اندازہ اور بہ اوقات مختلف اُنکی فوجی قابلیت کے بڑھانے کی تجویزیں ہندوستان کی فوجی ضرورتوں کے لحاظ سے نہیں کیجاتیں۔ بلکہ ان سے جملہ ممالک مشرق میں برٹش اقتدار کا قیام مدنظر ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس امر کو دیکھکر کہ حال ہی میں عارضی طور پر ہندوستان کی بہت سی فوج حدود ہند کے باہر گئی اور اس سے نہ کسی قسم کا خطرہ پیش آیا نہ ملک کی حالت امن مخدوش ہوئی، اس کانگرس کی رائے میں اسکا وقت آگیا ہے کہ برٹش پارلیمنٹ اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے کہ انصاف مقتضی اسکا ہے کہ فوجی اخراجات ہند کا ایک معتد بہ حصہ انگلستان ادا کرے۔

مجوز:۔ مسٹر ان۔ ایم۔ سمارتھ۔ (بمبئی)

موید:۔ مسٹر جی۔ آر ابھانکر (سانگلی)

رزولیوشن نمبر (۱۳) اگزیکوٹیو۔ اور جوڈیشل انتظامات کی علیحدگی

یہ کانگرس گذشتہ کانگرسوں کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتی ہے اور گورنمنٹ اور سکرٹری آف اسٹیٹ سے درخواست کرتی ہے کہ فوجداری معاملات میں اگزیکوٹیو اور جوڈیشل انتظاموں کی علیحدگی میں اب اور زیادہ توقف روا نرکھا جائے۔ جبکہ اس علیحدگی انتظامات کے مناسب ہونیکو گورنمنٹ بارہا خود بھی تسلیم کرچکی ہے اور جبکہ یہ بات بکرات ثابت کردی گئی کہ صرف برائے نام زیادتی اخراجات کے ساتھ اس تجویز کا عمل میں لانا ممکن ہے۔

مجوز:۔ مسٹر ہرچیند رائے بشنداس۔ (سندھ)

موید:۔ مسٹر ان۔ کے۔ رام سوامی۔ (چیتور مدراس)

رزولیوشن نمبر (۱۴) مسئلہ تقسیم بنگال

یہ کانفرنس بہرصورت تقسیم بنگال کے متعلق گورنمنٹ ہند کی تجویزوں سے سخت

اختلاف کرتی ہے۔ اس تجویز کو لوگ نہایت خوف وہراس کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ بنگالی قوم کے کئی علیحدہ حصوں میں تقسیم ہوجانے سے انکی ذہنی اور معاشرتی غرضکہ ہرقسم کی ترقی میں بہت سے موانع پیش آجائیں گے اور ان کے بہت سے ایسے قانونی حقوق مفقود ہوجائینگے جو اب تک انکو حاصل رہے ہیں۔ علاوہ بریں اس تجویز سے ملک پرخرچ کا ایک بہت بڑا بار پڑے گا جسکو ہندوستانی ٹیکس اداکرنے والے کسی طور پر برداشت نہیں کرسکتے۔

اس کانگرس کی رائے میں اسوقت تک کوئی معقول وجہ اس تقسیم کے باب میں پیش نہیں کی گئی ہے۔ ہاں اگر بنگال گورنمنٹ کا موجودہ کانسٹی ٹیوشن اس صوبے کے عمدہ انتظامی حالت کے لیے ناکافی خیال کیا جاتا ہے تو اسکا علاج یہ نہیں ہے کہ اسکے حصوں کی دوبارہ ترتیب وتقسیم کی جائے بلکہ اسکی تدبیر یہ ہے کہ مدراس وبمبئی کے مانند لفٹنٹ گورنری بنگال کے بجائے گورنری بنگال مع انتظامی کونسل قایم کردی جائے۔

مجوز:۔ آنریبل مسٹر امبکاچرن مزمدار (بنگال)

موئد:۔ مسٹر اے۔ چودھری۔ (بنگال)

بابو بنے کمار رائے۔ (بنگال)

تائید مزید مسٹر آر۔ ایم۔ مدھولکر (امراوتی)

رزویوشن نمبر ۱۵ انگلینڈ کے لیئے ڈیلیگیٹس کا انتخاب

اسبات کو پیش نظر رکھکر کہ انگلینڈ میں عام انتخاب کا زمانہ قریب ہے۔ اور اس نازک موقع پر الکشن کے امیدواروں، ووٹ دینے والوں اور پولیٹکل لیڈروں کے سامنے ہندوستان کے حقوق کا پیش کیا جانا ضروری ہے۔ یہ امر قرین مصلحت ہے کہ کانگرس مختلف حصص ملک سے قابل اعتماد اور تجربہ کار قائم مقاموں کو اسی غرض سے انگلستان روانہ کرے تاکہ وہ الکشن کے زمانے میں اور اس سے قبل وہاں موجود رہیں اور ڈیپوٹیشن کے اخراجات کے لیئے ۔۔۔۔۳۰ روپئے کا ایک فنڈ جمع کیا جائے۔

مجوز:۔ سر ولیم ویڈربرن۔ (لندن)

موئد :۔ مسٹر بال گنگا دہر تلک ۔ (پونا)

موئد :۔ مسٹر ایس سنہا ۔ (الہ آباد)

رزولیوشن نمبر (۱۶) ممبران پارلیمنٹ کا انتخاب

یہ کانگرس دلی خوشی کے ساتھ نارتھ ایسٹ ہیمپسٹیڈ، نانگہم ۔ راکس براشائر کی طرف سے مسٹر دادابہائی نوروزجی ۔ مسٹر ہنری کاٹن اور مسٹر رہان جارڈین کی امیدواری پارلیمنٹ کی نسبت اظہار اتفاق کرتی ہے اور مذکورہ اضلاع انگلستان کے منتخب کرنیوالوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ان حضرات کو پارلیمنٹ کا ممبر ضرور منتخب کریں تاکہ یہ لوگ نہ صرف انکی ریاست کریں بلکہ ایک حدتک ایک ایسے ملک کے باشندوں کی بہی قایم مقامی کریں جو باوجودیکہ برٹش امپائر کا ایک حصہ ہے۔ لیکن پہر بھی اسکا کوئی بلا واسطہ قائم مقام پارلیمنٹ میں نہیں ہے ۔

مجوز :۔ مسٹر ایس سنہا ۔ (الہ آباد)

موید :۔ مسٹر ڈی ۔ پی ۔ واڈیا ۔ (بمبئی)

رزولیوشن نمبر (۱۷)

یہ کانگرس کی نیازمندی کے ساتھ ان بغیر غرض خدمتوں کی نسبت جو انہوں نے ہم لوگوں کی پولیٹکل ترقی کے لیئے کی ہیں سر ولیم ویڈربرن ور دیگر ممبران برٹش کیٹی کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

اور منظور کرتی ہے کہ ... پونڈ اس کیٹی کے اخراجات کے لیے دیئے جائیں اور اسکے لیئے ہر صوبہ اپنا مقررہ چندہ ادا کرے ۔

مجوز :۔ مسٹر ڈی ۔ ای ۔ واچا ۔ (بمبئی)

موئد :۔ آنریبل بابو بہوپدرو ناتہ بوس ۔ (کلکتہ)

رزولیوشن نمبر ۱۸ ۔

سال آیندہ کے لیے یہ کانگرس مسٹر اے ۔ او ۔ ہیوم ۔ سی ۔ بی کو جنرل سکرٹری اور مسٹر واچا اور مسٹر گوکھلے کو اسسٹنٹ جنرل سکرٹری مقرر کرتی ہے ۔

از جانب صدر انجمن۔

رزولیوشن نمبر (۱۹)

یہ کہ کانگرس کے کانسٹی ٹیوشن کا مسئلہ بغرض رپورٹ ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے جسکے ممبر حسب ذیل ہوں۔

بمبئی
۱۔ سر فیروز شاہ مہتا۔
۲۔ مسٹر ڈی۔ ای۔ واچا۔
۳۔ آنریبل مسٹر گوکھلے۔
۴۔ آنریبل مسٹر ابراہیم رحمت اللہ۔

مدراس
۱۔ آنریبل نواب سید محمد۔
۲۔ مسٹر سی شنکرنیر۔
۳۔ مسٹر کرشنا سوامی آئر۔
۴۔ مسٹر ویرراگھو چاری۔

بنگال
۱۔ بابو سریندر ناتھ بنرجی۔
۲۔ آنریبل مسٹر امبکا چرن مزمدار۔
۳۔ بابو بیکنٹھ ناتھ سین۔
۴۔ مولوی ابو القاسم۔

پنجاب
۱۔ لالہ لاجپت رائے۔
۲۔ مسٹر دھرم داس۔
۳۔ لالہ ہرکشن لال۔

ممالک متحدہ
۱۔ بابو گنگا پرشاد ورما۔
۲۔ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی۔
۳۔ مسٹر۔ ایس سنہا۔

برار و ممالک متوسط
۱۔ مسٹر آر۔ ایم۔ مدھولکر۔

۲- مسٹر ایم - وی - جوشی -
۳- مسٹر - ایم - کے - پادھے
از جانب صدر انجمن -

رزولیوشن نمبر (۲۰) آئندہ اجلاس کانگرس

یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کا اکیسواں اجلاس ۱۹۰۵ء میں بمقام بنارس منعقد ہو

رزولیوشن نمبر (۲۱)

استقبالی کمیٹی اور تمام کارگزاران کانگرس کا شکریہ ادا کیا جائے — از جانب صدر انجمن

رزولیوشن نمبر (۲۲) بشکریہ صدر انجمن -

مجوز :- سر فیروز شاہ مہتا - (بمبئی)
موئد :- بابو بھوپندر ناتھ بسو (کلکتہ)

پریسیڈنٹ کے آخری جواب کے بعد جلسہ برخاست ہوا -

انتخاب بیاض مولوی سید اکبر حسن صاحب موہانی خمسہ حکیم محمد یوسف صاحب موہانی بر غزل کافی

تیرے کوچے میں گذر ہوتا جو آتے جاتے
آنکھ سے آنکھ سر راہ ملاتے جاتے
سرگذشت دل بیتاب سناتے جاتے
دیکھتے جلوۂ دیدار کو آتے جاتے
گل نظارہ کو آنکھوں سے اٹھاتے جاتے

قابل دید اگر ہم کہیں پاتے آنکھیں
راہ میں تیری بصد شوق بچھاتے آنکھیں
کرتے دریوزہ گری مانگ کے لاتے آنکھیں
قدم پاک سے ہرگز نہ اوٹھاتے آنکھیں
روکنے والے اگر لاکھ ہٹاتے جاتے

شوق دیدار میں تیرے جو نکلتے گھر سے
ہاتھ پھیلائے ہوئے وجد میں گرتے پڑتے
ہند سے ہم عربستاں میں پہونچتے سیدھے
دشت یثرب میں ترے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اُڑاتے جاتے

عشق میں قید محبت سے بہلا کیا ڈرتے
کچھ بھی ہوتا مگر اکبار تو جیتے مرتے
لب پہ آجاتا جو دم بھی تو ترا دم بھرتے
سر شوریدہ کو گیسو پہ تصدق کرتے
دل دیوانہ کو زنجیر پنہاتے جاتے

سر بالیں جو تم آجاتے تو اچھا کرتے
پرسش خستگی عشاق رشید اکرتے
دل بیمار محبت کا مداوا کرتے
کاکی کشتۂ دیدار کو زندا کرتے
لب اعجاز اگر آپ ہلاتے جاتے

رباعی میرزا ابراہیم

درآتشے کہ ہیچ دل داغدار سوخت　　میسوخت آنچناں کہ دل روزگار سوخت
ہریک در آتشے من و پروانہ سوختیم　　اورا وصال شمع و مرا ہجر یار سوخت

زاہد علی سخا

شمۂ از گل روئے تو بہ بلبل گفتیم　　آن تنک حوصلہ رسوائے گلستانم کرد

محمد مسیح

رفتی ز بزم و سنگ بر خسارہا شکست　　ہمچوں حباب شیشۂ دل بر صد شکست

رباعی طالب آملی

ہر جا کہ روی مہر و وفا یار تو باد　　آرام و فراغت ہمہ جا یار تو باد
از نامہ و پیغام فراموش مکن　　یاد آوریم بکن خدا یار تو باد

تنہا

ناحق کی رنجشیں اب ہم سے نکالیاں ہیں　　اس دل نے تیری صفیں ساری اوڑالیاں ہیں
شاید گیا وہ گل رو گلگشت گلستاں کو　　رنگ رخ خزاں پر پھر کچھ بحالیاں ہیں

رباعی طالب آملی

طالب دل و دین در رہ سودائیش ریز　　جان در سر کوچہ تمنائیش ریز
دل را کہ بصد پردہ نہاں میداری　　یک قطرۂ اشک ساز و در پائیش ریز

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ

اس مرتبہ کانفرنس کا اجلاس بہت سی رکاوٹوں اور اختلافوں اور بدانتظامیوں کے بعد آخرکار لکھنؤ میں منعقد ہوا اور جہانتک اس کا معاملہ تعلق ہے امید سے بڑھکر کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

سب سے پہلی بدانتظامی تو مقام اجلاس کا متعین نہوتا تھا۔ یعنی پہلے پٹنے کی خبر تھی اسکے بعد لکھنؤ کی خبر ہوئی اور پھر کچھ دنوں تک علیگڈھ کی بھی شہرت رہی۔

ہم لوگونکو اس بارہ میں کانگرس سے سبق لینا چاہئے کہ ہر اجلاس میں دوسرے سال کیلئے مقام اجلاس کا تجویز کرلینا بھی ضروری سمجھ لیا جائے اور جس مقام کے لوگ اس ذمہ داری کو اپنے سرلیں پھر اس سے خلاصی حاصل کرنیکی ناقابل مضحکہ کوشش نکریں۔ خیر ہزار دقت آخر وقت میں لکھنؤ مقام قرار پایا اور کمی وقت پر نظر کرکے ہم منتظمین کانفرنس لکھنؤ کی ہمت و کوشش کی تعریف کرتے ہیں کہ مہمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ صرف بعض پنجابی حضرات کو کھانے کے متعلق ذرا شکایت رہی کہ انکو خیرنی باسی اور زردہ ٹھنڈا ملا کیا۔ خیر۔

دوسری ابتری صدر انجمن کے انتخاب سے متعلق رہی۔ ہر رئیس یہ چاہتا تھا کہ میں پریسیڈنٹ بنایا جاؤں۔ گویا ان میں سے ہر شخص کانفرنس کو ذاتی نمود، شہرت و وقعت کے حصول کا ذریعہ سمجھتا تھا اور ہم انکو قابل الزام نہیں سمجھتے کیونکہ بظاہر صورت بعض اہل نظر کو بھی کانفرنس کی یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

خیر یہ مرحلہ اس طور پر طے ہوا کہ شکاریوں کو شکار پر جھگڑتا دیکھ عین وقت پر کسی دوسرے ہی نے اس عظیم الشان کانفرنس کی صدر انجمنی کی عزت حاصل کرلی۔

آخری اور سب سے بڑا اختلاف گروہ علما کی جانب سے ظاہر ہوا۔ لیکن ہمارے نزدیک ان علما سے بڑی غلطی ہوئی کیا معنی کہ جو لوگ فتواے کفر کو تمغاے افتخار ریفارمری کی سند اور قومی ہمدردی کا سرٹیفکٹ سمجھتے اور اسپر ناز کرتے ہوں انکو بے دین ٹھیرانا اپنا سر کھپانا ہے اور بس۔

اسی اختلاف نے علما کے رہے سہے اقتدار یعنی خیالی اقتدار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ اور انکی قوت کی کائنات معدوم ہوگئی۔

تعلیم مسلمانان کا مسئلہ ہیچ قابل امداد ہے۔ اسکے تعلق علما کا بطور حل و معقولات فتوے شائع کرنا بالکل بیجا تھا اور ہم خوش ہوئے کہ ان فتوونکا کانفرنس کی کامیابی پر بہت کم اثر ہوا کامیابی سے یہاں ہماری مراد مالی کامیابی ہے ورنہ حقیقی کامیابی کے لحاظ سے ہماری کانفرنس ہنوز ناکام اور بالکل ناکام ہے۔ یعنی ابتک نہ اسمیں پابندی اوقات کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ تقریر کرنیوالونکے لئے کوئی ضابطہ مقرر ہے نہ کل رزولیوشن پبلک کی رائے زنی کے لئے پیشتر سے شائع ہوتے ہیں۔ خوشکہ کوئی کام درست نہیں ہوتا یہانتک رزولیوشنوں کی اردو عبارت تک صحیح نہیں کیجاتی۔

بہت سے مفید رزولیوشن ابتک بلاوجہ مسترد کر دئے جاتے ہیں۔ اور ابتک خوشامد حد سے زیادہ کیجاتی ہے اور سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ تعلیمی کانفرنس بجائے تعلیمی کانفرنس کے کانفرنس زرکشی کے خطاب کی مستحق ہوتی جاتی ہے۔

غالباً انہیں سب باتونکو دیکھکر معصر اودھ پنچ نے ظریفانہ الفاظ میں اس کانفرنس کا نام کانفرنس ہیچکاراں رکھدیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب تک علیگڈھ کی پالسی میں خوشامد کا مادہ باقی ہے اسوقت تک کانفرنس سے اس سے زیادہ امید رکھنا فضول ہے۔

موجودہ حالت میں یہی غنیمت ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کچھ روپیہ سالانہ وصول ہوجایا کرتا ہے اور مختلف صوبوں کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوکر اپنی سادہ تقریرونکو پالٹکس کا بدل سمجھکر دل خوش کر لیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ قومی جوش اپنے دلوں میں پیدا کرلیجاتے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر کانفرنس کی کارروائی درج کرتے ہیں۔

بتاریخ ۲۷-۲۸-۲۹- اور ۳۰ دسمبر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ عموماً یہ اجلاس تین روز تک ہوا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ چونکہ سنڈ ولیوشنونکی تعداد زیادہ

تھی اور اہلِ لوگ بھی راے دینے کے سئے بکثرت تھے اسوجہ سے پروگرام میں ایک دن کا اضافہ کرنا پڑا۔ ایک روز قبل جبکہ مسٹر ماریسن پریسیڈنٹ صاحب تشریف لائے تھے اُنکے استقبال کے لئے لکھنؤ اسٹیشن پر نہایت پُرتکلف انتظام کیا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر مخملی فرش بچھا دیئے گئے تھے اور پریسیڈنٹ صاحب کے گلے میں فرطِ انبساط اور جوش میں حامیان کانفرنس نے پھولوں کے ہار ڈالے۔ اب تاریخ ۲۷۔ کے اجلاس اول میں حسب دستور استقبالی کمیٹی کے پریسیڈنٹ نے تمام معزز مہمانوں کی ہمدردی اور تشریف آوری کی زحمت برداشت کرنے کا شکریہ ادا کیا۔ آنریبل راجہ علی محمد خاں صاحب خان بہادر رئیس محمود آباد نے تحریک کی کہ مسٹر ماریسن پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ اس اٹھارویں کانفرنس کے پریسیڈنٹ قرار دیئے جاویں۔ آپکے خدمات اور قومی ہمدردی جو ہمارے کالج اور قوم کے ساتھ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اتنے میں مسٹر ماریسن تشریف لائے اور زرنگار کرسی پر کارچوبی شامیانے کے نیچے رونق افروز ہوئے تمام مجلس نے اُن کی صدر نشینی پر نہایت جوش میں چیرز دیئے۔

مسٹر ماریسن کا ایڈریس

حسب معمول آپ نے اس عزت افزائی کے صلہ میں دلی شکریہ ادا فرمانے کے بعد افتتاحی ایڈریس پڑھا۔ آپ نے دل خوش کُن اور چکنی چپڑی باتیں بیان کرکے حاضران مجلس کے دلونکو خوش کرنا مناسب نہ سمجھکر اصل حقیقت صاف صاف بیان کرنے میں تامل نہ کیا آپ کی راے میں مسلمان دو مرضوں میں مبتلا ہیں۔

اول مالی افلاس۔ دوسرے دماغی واخلاقی پستی۔ اور یہی دو عوارض ایسے سخت ہیں جو کہ قومی ترقی اور قومی مقاصد کے حصول میں مانع آتے ہیں۔ ان دونوں امراض میں سے مالی افلاس کی طرف آپ کی راے میں ہمکو سب سے اول توجہ کرنی چاہئے کیونکہ وہ سب سے اہم ہے اور اُسکے اثر کو ہر شخص محسوس کرتا ہے"

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمکو تعلیم محض علم کی غرض سے حاصل کرنا چاہیئے۔ یعنی طلبا کے کالج میں تعلیم پانے سے غرض محض دماغی ترقی ہونا چاہیئے۔ آیندہ اُس سے کوئی دنیاوی نفع حاصل ہو یا نہو بیشک تعلیم کے متعلق یہ ایک عمدہ خیال ہے اور بعض ایسی لطیف طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جنکی نظروں میں دولت کے محسوس فائدے کے مقابلے میں علم کی خشک مسرتیں زیادہ قابل قدر ہوتی ہیں۔ مگر عموماً لوگوں کے ایسے خیالات نہیں ہوسکتے اور اسی لئے اس اصول پر کسی عام تعلیمی پالیسی کو مبنی کرنا مناسب نہیں۔ یورپ میں بھی عام طور سے تعلیم کا یہ مفہوم نہیں ہوتا ہے۔ اکثر متوسط الحال لوگ (اور یہی جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے) اپنی اولاد کو بہتر سے بہتر تعلیم اس غرض سے دیتے ہیں کہ اُس کی بدولت وہ عزت سے اپنی معاش حاصل کرسکیں۔ دولت کمانیکے دو ہی بڑے ذریعے ہیں۔ اول اس قسم کے پیشے جیسے ڈاکٹری وکالت انجنیری وملازمت وغیرہ دوسرا ذریعہ تجارت وحرفت ہے۔ پس ان لوگوں کے لئے جو کہ اول ذرائع سے اپنی معاش حاصل کرنا چاہتے ہیں اُنکو تعلیم کم از کم بی۔ اے۔ تک ہونی چاہیئے۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم بی۔ اے۔ کا مرکز علیگڈھ ہونا چاہیئے۔ اس سے ہم اُن لوگوں کو صریح نقصان پہونچاتے ہیں جو کہ اپنا وطن چھوڑکر کسی دوسری جگہ پر رہنے کا صرف کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ہمکو چاہیے کہ لوکل کمیٹیوں کے ذریعے سے ایسے طلبا کے لئے جو گورنمنٹ اور مشن اسکول میں تعلیم حاصل کررہے ہیں وظائف بہم پہونچانے کی کوشش کریں۔ کسب دولت کے لئے تجارت وحرفت بہترین پیشوں سے ہے لیکن شمالی ہندوستان کے مسلمان اسکو بالکل ترک کئے ہوئے ہیں۔ یورپ جاپان وغیرہ سے نئی نئی کلوں کی ترکیبوں کو دریافت کرکے ہونہار نوجوانوں کو چاہیئے کہ جو اُن کو عوام میں رائج کریں۔ آپنے دماغی اور اخلاقی پستی کو دور کرنے کے لئے محمڈن یونیورسٹی کا قائم ہونا ضروری قرار دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی رائے ظاہر کی کہ وہ یونیورسٹی ایسی یونیورسٹی نہ ہونی چاہیے جو محض امتحان لینے والی جماعت ہو بلکہ وہ ایسی یونیورسٹی ہو جو حقیقت میں علم وفضیلت کا گھر ہو جہاں مختلف علمی شعبوں کے اہل کمال یکجا فراہم ہوں اور وہ اپنے خاص علموں کی تعلیم دیں اور خود اُن علوم میں جدید تحقیقات کریں۔ وہاں اعلیٰ کتب خانے آلات خانے اور تمام دنیا کے علمی رسالوں

اور اخبارات کا موجود رہنا بھی لازمی ہے یہ لوگ جب علمی آب و ہوا میں رہینگے تو ایک سے دوسرے کو تقویت ہوگی اور نئے نئے اصول کی اشاعت کتابوں کے ذریعے سے ہوگی۔

اس محمدن یونیورسٹی کا خیال عملاً اس طرح پورا ہونا چاہیئے کہ (۱) تین چار عالم شخص مقرر کئے جاویں جو خاص خاص علوم کو پڑھاویں اور خود بھی ان میں اپنی معلومات بڑھاویں۔ (۲) ایک ایسی لائبریری فراہم کیجاوے جس میں حتی الامکان اُس علم پر تمام کتابیں موجود ہوں (۳) چند فیلوشپ یا وظائف کا انتظام کیا جاوے تاکہ جو لوگ کسی خاص مضمون میں امتحان پاس کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کو بڑھانا چاہیں تو اُن نوجوانوں کو ان وظایف سے مدد مل سکے۔ پہلے فیکلٹی عربی کی اعلیٰ تعلیم کی ہونا چاہیئے۔ اور اسکے بعد سائنس کی فیکلٹی ہونا لازمی ہے اور اسیطرح جسقدر زمانہ مدد دیتا جاوے اُس میں توسیع اور ترقی ہونی چاہیئے۔ آخری صلاح جو فلاح قوم کی بابت پریسیڈنٹ صاحب نے دی اور جو غالباً فی الحال نہایت ضروری تھی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ تنگدلی کو بالکل ترک کردیں اگر وہ قومی زندگی کا ایک شایان مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔

اس ایڈریس کے بعد رزولیوشن پیش ہوئے۔

رزولیوشن نمبر ۱

رزولیوشن نمبر ۱ سید جعفر حسین صاحب ڈویژنل انجنیر ریاست گوالیار نے پیش کیا۔ اس رزولیوشن کا ماحصل یہ تھا کہ ہماری قوم کو سب سے زیادہ جنرل ایجوکیشنل کی ضرورت ہے لہذا ہمیں اپنی پوری مشترکہ اور متفقہ قوت سے مغربی علوم و فنون کی تعلیم کے نہایت مکمل ذرائع بہم پہونچانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ہمکو مدارس صنعت و حرفت کی زبردست ضرورت ہے اور معمولی مدارس ہماری قوم کے واسطے مفید ہو سکتے ہیں نہ انکے خیال پر پڑکر ہماری قوم کو اپنی قوت منتشر اور متفرق کرنا مناسب ہے۔ اس رزولیوشن کی تائید مرزا محمد ہادی صاحب پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ نے کی۔ اسکے ہر پہلو پر نہایت گرماگرمی سے بحث ہوئی اور آخر کار رزولیوشن منظور ہوا۔

رزولیوشن نمبر (۲)، کوجسکا مقصد یہ تھا کہ اُن نوجوانوں کے لئے جو تعلیم کا حصل سرکاری ملازمت یا وکالت وغیرہ نہیں سمجھتے یونیورسٹیوں اور سرکاری سررشتہ ہائے تعلیم کے حلقوں کے باہر انتظام ہونا چاہئے۔

نواب وقار الملک بہادر نے پیش کیا۔ سمیع اللہ بیگ صاحب وکیل لکھنؤ نے اس رائے سے سخت اختلاف کیا اُنکی رائے میں رؤسا اور اُمرا کے لئے علٰحدہ انتظام کرنا خلاف مصلحت ہے کیونکہ غربا اور اُمرا کے ایکساتھ تعلیم پانے سے کچھ نہیں تو یہ ضرور ہوتا ہے کہ اُنکو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ امیر ہی معلوم کرسکتے ہیں کہ دنیاوی تفکرات کیا ہوتے ہیں اور وہ کیا آسایش ہیں جنسے کہ غریب طلبا امیر ہوسکتے ہیں۔

علی الدین صاحب اور سید واجد حسین صاحب وغیرہ نے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

اسی اثنا میں نواب صاحب بہاولپور کی آمد کی خبر گرم ہوئی اور اُنکے خیر مقدم کے لئے اکثر رؤسا تشریف لے گئے۔ جسوقت کہ وہ بارہ دری میں آئے سب حاضرین نے کھڑے ہوکر چیرز دیئے اور نہایت اعزاز کے ساتھ پلیٹ فارم پر آپکو جگہ دی گئی۔

رزولیوشن نمبر (۳) حسب ذیل ہے۔

یہ کانفرنس ہز آنر سر جیمس ڈگس لاٹوس صاحب لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی اُس دلی توجہ اور فیاضی کا شکریہ ادا کرتی ہے جو جناب ممدوح نے عربی کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں ظاہر فرمائی ہے۔ اور کانفرنس کی رائے میں مجوزہ اعلیٰ تعلیم عربی کے لئے ایک عمدہ عربی کتب خانہ مدرسۃ العلوم علیگڈہ میں قایم کیا جائے اور اُسکے لئے چندہ کیا جاوے۔

آنریبل راجہ تصدق رسول خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی نے اس رزولیوشن کو پیش کیا اور صرف پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس مقصد کے سرانجام دینے کے لئے مبلغ بیس ہزار روپیہ بھی عطا فرمایا اس فیاضانہ ہمدردی اور امداد پر نہایت جوش و مسرت کا اظہار کیا گیا۔

چیرمین ریسپشن کمیٹی نے اس تجویز کی تائید کی۔

حکیم محمد عبد الولی صاحب رئیس لکھنؤ نے بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا اور چند رسالے اپنے

بھی عطا فرمائے۔

رزولیوشن نمبر (۴) جس میں کہ یہ تجویز تھی کہ ایسی لوکل کمیٹیاں قائم کیجاویں جو سرکاری سررشتہ تعلیم کے ملازموں کو اپنے اغراض سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں۔

اس رزولیوشن کو نواب وقار الملک صاحب بہادر نے پیش کیا۔

آنریبل مسٹر شاہدین صاحب اور دیگر اصحاب اسکے موئد تھے۔

دوسرے روز رزولیوشن نمبر (۵) صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب بیرسٹر ایٹ لا نے نہایت فصاحت سے پیش کیا۔

رزولیوشن کے الفاظ یہ تھے وہ کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ بلحاظ حالات ملک و قوم مسلمانوں میں سائنس کو ترقی دینے کے لئے عملی کوشش شروع کیجائے اور اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان میں جو ہر لحاظ سے قومی تعلیم کا مرکز ہے ایک اعلیٰ درجہ کا سائنس کلاس کھولا جائے۔ انہوں نے جاپان کی تاریخ سے ثابت کر دیا کہ جاپان کی موجودہ عظمت اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے نفاق کو ایک تخت بالائے طاق رکھکر تمام دنیا کے علوم کے حصول کی کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ مسلمانوں کی قومی ابتری صرف نفاق اور موجودہ معاملات سے لاعلمی کے سبب سے ہے جب تک ان عیوب سے ہم اپنے کو پاک نہ کرینگے قومی نجات ناممکنات سے ہے۔

انکی رائے میں ان مقاصد کا حصول اسیوقت میں ممکن ہے جبکہ ایک قومی مرکز یا اسٹینڈرڈ قرار دیا جاوے جو کہ خوش قسمتی سے اسوقت علیگڈھ میں موجود ہے تاکہ سب افراد قوم اسی سانچے میں ڈھلجاویں اور اسی رنگ میں ہوجاویں۔

نواب محسن الملک اسکی تائید کو کھڑے ہوئے اور آپنے چیدہ الفاظ میں اسبات کو آیات قرآن سے ثابت کر دیا کہ سائنس کی تعلیم کا حاصل کرنا نہ صرف دماغی ترقی اور دنیاوی بہبودی کے لئے ضروری ہے بلکہ مذہباً ہمپر فرض اور واجب ہے۔ آپ نے نہایت افسوس ظاہر کیا کہ ہماری قوم کسقدر بدنصیب ہے کہ تمام قومیں تو ترقی کے بیسد ان میں سرپٹ جارہی ہیں اور ہم ہیں کہ ہر قدم پر جائز و ناجائز و مباح و ممنوع کے وادل میں اپنے کو خواہ مخواہ

پہنچاتے ہیں۔ ہمکو چاہئے کہ نہ صرف عقبیٰ کی فکر میں پڑے رہیں بلکہ دین و دنیا دونوں کے لئے برابر کوشش جاری رکھیں خواجہ غلام الثقلین صاحب نے بھی اس راے سے اتفاق کیا اور پولٹیکل اکانمی اور فن زراعت سکھائے جانے کی بھی تحریک کی۔ مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواری نے بھی تعلیم سائنس کو مذہبًا واجب قرار دیا۔ خواجہ غلام الحسنین صاحب ممتاز حسین صاحب بیرسٹر۔ واجد حسین صاحب۔ اور دیگر اصحاب نے اتفاق کیا۔ محمد شفیع صاحب نے جو کہ خود جاپان وغیرہ میں تعلیم پاچکے ہیں اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے صنعت وحرفت کی تعلیم کی تجویز پیش کی۔ بعد اسکے چندہ جمع کیا گیا۔ چودہری فتح بہادر صاحب تعلقدار نے مبلغ پانچسو روپیہ عطا کیے۔

آنریبل شاہدین صاحب بیرسٹر نے تین ہزار پانچسو روپیہ مع ایک مستقل اسکالرشپ کے عربی کے لئے دئے۔

چودہری التفات رسول صاحب تعلقدار سندیلہ نے جو کہ علیگڈہ میں تعلیم پاچکے ہیں پانچہزار روپئے سائنس کے لئے عنایت فرمائے۔

مولوی محمد نسیم صاحب نے ایکہزار روپے نقد دئے۔

اور چھوٹے چھوٹے چندے بھی جمع ہوئے۔

رزولیوشن نمبر ۹ حسب ذیل ہے۔

چونکہ طب یونانی نہایت مفید اور سائنٹفک اصول پر قائم ہے اور اسکا طریقۂ علاج آج بھی ہمارے ملک میں مفید ثابت ہوتا ہے اور اسکے ساتھ یہ شریف علم بجاے طب یونانی کے طب اسلامی کے لقب کا زیادہ مستحق ہے اسلئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اس ضروری ایشیائی علم کی نہایت قدر و منزلت کرتی ہے اور ہرگز اسکو اس تحقیر کا مستحق نہیں سمجھتی جو بدنصیبی سے ہمارے نئے تعلیم یافتہ گروہ کے دلوں میں لاعلمی کی وجہ سے بطور فیشن کے پیدا ہوتی جاتی ہے"

اس رزولیوشن کو حکیم محمد عبدالولی صاحب رئیس لکھنؤ نے پیش کیا اور مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی اسکے موید تھے۔ اس رزولیوشن کے ہر پہلو پر نہایت

وضاحت سے بحث ہوئی۔ اکثر لوگوں نے اس سے اختلاف کیا کہ کانفرنس ہرگز اس بات کے کہنے کی مجاز نہیں کہ طب سائنٹفک اصول پر مبنی ہے یہ تو سائنٹفک سوسائٹی کا کام ہے کہ وہ اصول کی تحقیق کرے اور اوس کے نسبت کوئی راے قرار دے۔ اکثر لوگوں نے اس سے اختلاف ظاہر کیا کہ طب ہرگز طب اسلامی کے لقب کی مستحق نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں یہ علم زیادہ تر مسلمانوں ہی میں رہا اور مسلمانوں نے اکثر اسمیں ترقی کی اور نئی کتابیں لکھیں لیکن محض یہ امر اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ اسکو طب اسلامی کا لقب دیا جائے۔ دنیا میں سمجھوتا کر لینا دوسری بات ہے۔ ان نوجوان مسلمانوں نے جنپر کہ اس علم کو حقارت سے دیکھنے کی تہمت لگائی گئی تھی اس رزولیوشن سے کلیۃً اختلاف ظاہر کیا۔ اونکی راے تھی کہ ایسی کانفرنس کے لیئے یہ رزولیوشن بالکل غیر ضروری ہے۔ انکا دوسرا اعتراض یہ بھی تھا کہ اسمیں موجودہ علوم کی روز افزوں ترقی کا کچھ بھی اثر نہیں پایا جاتا۔ جو شیخ لکھہ گیا وہ ابتک امنّا وصدقنا قرار دیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اگر ہم لوگ اسکو حقارت سے دیکھتے بھی رہے تو حامیان طب کو چاہیے کہ وہ اپنے کو عزت کے قابل بنا دیں۔ جسوقت وہ موجودہ معیار کے مطابق عزت حاصل کریں گے تو ہم لوگ اسقدر تنگ خیال نہیں کہ پھر بھی اسکی تحقیر کریں۔

محمد عبد الرزاق صاحب ڈاکٹر سید الظفر صاحب۔ رشید الدین صاحب شوکت علیم صاحب اور دیگر اصحاب نے بھی اسپر تقریریں کیں۔ سمیع اللہ بیگ صاحب وکیل لکھنو نے اس سے اتفاق ظاہر کیا۔

رزولیوشن نمبر (۷) میں تکمیل الطب لکھنو کی اغراض سے اتفاق ظاہر کیا۔ اس رزولیوشن کی مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی نے تحریک کی اور نواب وقار الملک اسکے موئد تھے اس سے بھی اکثر اصحاب نے اس بنا پر اختلاف کیا کہ اس کانفرنس کی طرف سے اس رزولیوشن کے پاس ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ یہ ایک مقامی انسٹیٹیوشن ہے اور علاوہ اسکے جسوقت کہ کانفرنس اسکے اغراض سے پورے طور پر واقف نہیں ہم اوسکے متعلق کیونکر راے قایم کرسکتے ہیں۔

رزولیوشن نمبر (۸) کانفرنس کی رائے ہے کہ فارسی زبان یونیورسٹی کورس سے خارج نہ کیجاوے بلکہ جسطرح ہمیشہ اسکول وکالج کے نصاب میں رہی ہے اسیطرح قایم رہے۔ اسکی تحریک شیخ عبد اللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ نے کی۔ اور منشی واحد علی صاحب اسکے موئد ہتے۔ ظہور الدین صاحب بیرسٹر نے اس رزولیوشن سے اختلاف ظاہر کیا۔ لیکن ووٹ لینے پر یہ پاس ہوگیا۔

اجلاس چہارم میں رزولیوشن (۹) آنریبل محمد شاہدین صاحب نے پیش کیا۔ رزولیوشن حسب ذیل ہے۔

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ قوم میں اعلے العلوم کی بنیاد کو پختہ کرنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ قابل اور ہونہار مسلمان گریجوئیٹس کو معقول وظائف دیئے جاویں تاکہ بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ کے بعد فکر معاش سے بیفکر ہوکر وہ مختلف علوم میں کامل ترقی حاصل کرسکیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اسکے موئد ہتے۔ اس رائے سے ہی سبکو کلیتاً اتفاق تھا صرف ایک اعتراض یہ تھا کہ ابھی اسکا موقع نہیں ہے اور علاوہ اسکے اسکو عمل میں لانا ابھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ابھی کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں جہاں باقاعدہ ایم۔ اے۔ کے بعد تعلیم دیجاتی ہو اور ممالک دور دراز میں بذریعہ وظائف طلبار کو تعلیم کے لیئے بھیجنے کی ہم میں ابھی مقدرت نہیں اسکے لیئے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ پچاس روپے ماہوار میں غیر ممالک میں کوئی طالب علم اپنی بسر اوقات بافراغت نہیں کرسکتا۔

رزولیوشن نمبر (۱۰) کے ذریعہ سے جناب ڈبلیو بل صاحب ایم۔ اے۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کا شکریہ ادا کیا گیا کہ جناب موصوف نے مسلمان مدرسین اور طلبار کو جمعے کی نماز کیواسطے ایک گھنٹہ تعطیل دینے کے لیئے حکم صادر فرما دیا ہے۔ کانفرنس نے یہ بھی استدعا کی کہ صوبجات متحدہ آگرہ واودہ میں بھی یہی قاعدہ ہونا چاہیے۔ مولوی نور احمد صاحب مدرس بخت گڑہ ضلع دہلی نے اس رزولیوشن کی تحریک کی اور اے آر احمدی سکنڈ ماسٹر گونڈہ ضلع بہرائچ نے اسکی تائید کی۔ اسمیں کوئی امر لائق بحث نہ تہا اور یہ رزولیوشن بالاتفاق

پاس ہوگیا۔

آخری رزولیوشن مسٹر گارڈ براون پروفیسر مدرسۃ العلوم علیگڈہ نے پیش کیا۔ آپنے یہ تجویز پیش کی کہ تعلیمی اخراجات کے لیے ایک فنڈ مہیا کیا جاوے اور اوسکی ذریعہ سے ایک ایجنٹ مقرر کیا جائے اور ایک سنٹرل آفس قایم کیا جاوے اور ایک تعلیمی معلومات کا دفتر قایم کیا جاوے جسمیں ایک لائبریری گورنمنٹ رپورٹوں اور تعلیمی کتب کی ہو۔ اس سے سب نے کلیتاً اتفاق کیا۔ نواب محسن الملک نے اسکی تائید کی اور "ایجنٹ نورانی" کے لیے دست طلب پھیلایا۔ اسپر خود نواب محسن الملک اور مارین صاحب کی ٹوپی چندہ جمع کرنے کے لیے گشت کرائی گئی۔

رزولیوشن ختم ہوجانے پر سید جعفر حسین صاحب ڈویژنل انجنیر ریاست گوالیار نے ون روپی فنڈ کی کارروائی مفصل بیان کی۔ آپکے بیان سے معلوم ہوا کہ صرف ممالک متحدہ آگرہ و اودہ سے سولہ سو بیس روپیہ جمع ہوگئے اور منشی آصف زماں صاحب نے اپنی تنہا کوشش سے اسقدر روپیہ جمع کرادیا۔ اِس قومی خدمت کے صلہ میں منشی صاحب موصوف کو طلائی تمغہ کانفرنس کیطرف سے عطا کیا گیا۔ آپنے ایک نظم میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا فرمایا مسٹر نعمت اللہ صاحب (پنجاب) اور مس نصیر الدین حیدر بیگم خاندان تیموریہ کو بھی طلائی تمغے عطا کیے گئے۔

چوتھے روز مولانا نذیر احمد صاحب کی تقریر ہوئی۔ آپکی علمی لیاقت اور فصاحت کا اسقدر شہرہ تھا کہ اسروز بہت زیادہ مجمع تھا جو لوگ کبھی روز نہ آتے تھے آج خاص طور سے تشریف لائے اسقدر مجمع تھا کہ رپوٹر تو کیا بڑے بڑے معزز سامعین بیٹھنے تک نہ پائے مولوی صاحب نے پہلے ایک نظم پڑہی بعد کو مارین صاحب سے کہا کہ وہ ولایت جانے پر مسلمانوں کیطرف سے تمام غلط فہمیوں کو انگریزوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کریں اور اون کے دلوں پر نقش کردیں کہ ہم لوگ گورنمنٹ انگلستان کے بدل و جان خیر طلب ہیں اور مطیع و فرمانبردار ہیں اور اس تقریر میں مولوی نذیر احمد صاحب نے بیرسٹروں پر نہایت نامناسب الفاظ میں حملہ کیا۔ اور حالت غضب میں جو کچھ منہ میں آیا کہتے چلے گئے جس سے کانفرنس کے مقاصد کو نقصان پہونچنے کا

اندیشہ ہے لکچر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ ڈھائی بجے کارروائی شروع ہوئی۔

خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اصلاح تمدن پر لکچر دیا۔ مرزا حبیب حسین صاحب نے اُردو شارٹ ہینڈ کی اسکیم پیش کی جسکو کانفرنس نے اپنی حمایت میں لینے کا وعدہ کیا۔ نواب محسن الملک صاحب نے اہل لکھنؤ اور دیگر احباب کی شکرگزاری میں اسپیچ دی اور پریسیڈنٹ کی آخری اسپیچ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

کانفرنس کے متعلق ایک اور امر قابل ذکر ہے بارہ دری کے برابر کی عمارت میں نمائش کے لیے معزز خاتونوں کی صنعت و حرفت کے نمونے جمع کیے گئے تھے۔ اکثر اشیاء انہیں خاص تعریف کی مستحق ہیں۔ نورجہاں بیگم کی ایک تصویر کسی خاتون نے بن کر بنائی تھی۔ اسکے کمال کو دیکھکر سب ثنا خواں تھے۔ چکن کے کام بھی اکثر نہایت باریک اور نفیس رکھے تھے۔ فقط

ضمیمہ مضمون حضرت شاد"

(بقیہ مضمون مندرجہ اُردوئے معلےٰ بابت دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲۵)

میری تحریر کو اُردوئے معلّے میں بعض شائقین نے پڑھکر مجھکو لکھہ بھیجا ہے کہ بذریعۂ ویلیو پے ایبل میں اُردو تعلیم اُنکو بھیجدوں میں اُن کی عنایت کا شکریہ ادا کرکے ادب سے عرض کرتا ہوں کہ "جامہ ندارم دامن از کجا آرم" بعض عالی خیال بزرگوں نے یہ تحریر فرمایا ہے وہ ایک جلد جو تمہارے پاس ہے عاریۃً مجکو بھیجدو بلاشبہ اِس شرط سے میں کتاب حاضر کرسکتا ہوں کہ صرف چار دن اپنے پاس رکھہ کر بذریعہ رجسٹری مجکو واپس عنایت کریں۔ جو روشناس مُلک بزرگ اِس استدعا کو ملاحظہ کرکے پہلے مجھ سے طلب کریں گے میں بھی پہلے اُنہیں کی خدمت میں حاضر کردوں گا۔ ہرچند اپنی گرم بازاری خود کرنا، اپنی محنتوں اور اوس کے ضمن میں اپنی تعریف آپ کرنا کسی قدر سخیف ہے مگر اب یہاں تک زمانے نے مجبور کردیا ہے کہ جب تک میں خود اِن تصانیف کا

حال کسیقدر صراحت سے ظاہر نہ کروں خود مجھپا الزام آتا ہے بنا برآں نہایت ضروری کتابوں
اور بعض تصانیف کی کیفیت کو بغیر بیان کیے اب چارہ نہیں ہے ہمارے اسلامی بھائیوں
اور خصوص شرفا کو واجب ہے کہ ان نوٹوں کو بغور تمام پڑھیں۔ ہرچند میری عمر کا
طویل حصہ (۴۵ برس) فنون شاعری کی تحصیل اور مشق سخن ہی میں گذرا علاوہ عاشقانہ
و عارفانہ بطرز قدیم و جدید نظموں کے اخلاقی و اصلاحی مضامین کے اشعار یا جہانتک
ضرورت دیکھی مولود و مراثی کے جمع کرنے میں زندگی بسر کرتا رہا تاہم اپنے شہر کے
مسلمان خاندانوں کی بربادی اس پر ان کی فضول خرچیاں اور بعد چندے قرض
کا ہجوم پھر معاشوں کا کوڑیوں کے مول بکنا سوا حصہ زمینداری میں صرف دو حصہ مسلمانوں
کے ہاتھ میں باقی رہنا۔ بقیہ از روے کاغذات سرکاری دوسری قوم کے ہاتھ میں چلا
جانا جن رئیس زادوں کی شادیوں میں دوشالے تقسیم ہوئے انہیں کو ایک پھٹی رضائی
تک جاڑوں میں میسر نہ ہونا یہ کل دلخراش مصائب ایسے نہ تھے کہ میں آنکھوں سے
دیکھتا اور دل پر اثر نہ ہوتا اسپر تقریبوں اور شادیوں میں اسی کشادہ پیشانی اور دھوم
دھڑکے سے قرض لیکر خرچ کیے جانا غرض ۴۴ برس ہوئے کہ میں نے اپنے
گھر میں ایک کمیٹی منعقد کی قریب قریب شہر کے کل شرفا و رؤسا اس کمیٹی میں جمع ہوئے
میں نے (جہانتک میری زبان نے یاری دی) یہ کل کوائف سب کے سامنے بیان کیے
اور عرض کیا کہ خدا کے لیے اب بھی چونکیئے اور اس غلط خیال نام و نمود و توہمات
بیجا سے جو شادیوں اور اداے رسوم اور بیاریوں اور مرنے میں کیے جاتے ہیں باز آئے
اتفاق سے جو دو ایک اہل زر موجود ہیں ان کی دیکھا دیکھی متوسطین شرفا اور بھی مٹے
جاتے ہیں اگر آپ حضرات نے توجہ نہ کی تو یقین جانیے کہ بچیس تیس برس کے
اندر ایسی تباہی آئے گی کہ پھر چارہ نہ ہو سکے گا،، مذکورہ بالا بیان کچھ اسطرح کا موثر تھا کہ بعض
عالی خیالوں کے علاوہ میں خود بھی روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔
ایک دولتمند بزرگ یہ دیکھکر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ جو بزرگوں اور ایک
زمانے سے ہوتا آتا ہے تم چاہتے ہو کہ یہ بھی نہ رہے اور غربت و افلاس کو جو کہا یہ خدائی

بات ہے مگر یہ علم غیب کہاں سے آگیا جو تم کہہ رہے ہو کہ ۲۵-۳۰ برس میں مسلمان مٹ
جائیں گے۔ اُن بزرگ کی دولت مندی اور پیری کی عظمت کے سبب سے میں کچھ بول
سکا اور نہ اُن رؤسا نے کچھ کہنا مناسب سمجھا جو میری غرض سمجھ گئے تھے اگر وہ بزرگ
اس وقت تک زندہ رہتے تو میں دکھاتا کہ کیوں جناب آپنے ملاحظہ کیا کہ خود آپ ہی کی
دولت اور زمینداری کا کیا حال ہوا) ۴۵-۴۶ برس اُدھر خود میرے والد مرحوم و عم محترم
کی صحبت میں روزانہ سہ پہر کو تیس چالیس شرفا جمع ہوا کرتے تھے اب جو میں خیال
کرتا ہوں تو ان میں کم سے کم جسکی آمدنی پانچ سو ماہانہ کی تھی ورنہ ہزار دو ہزار تین چار
بلکہ پانچ چھ ہزار ماہانہ تک کی آمدنی والے تھے غالباً انہی شادیوں اور غلط نام و نمود
میں اُن کی زمینداریاں مٹ گئیں اور اب اُن کی اولاد جس افسوسناک حالت میں
ہے کیا بیان کروں۔ خلاصہ کلام اُس کمیٹی میں میرے بیان پر بعض صاحبوں نے
یہ کہا کہ تم بیشک سچ کہتے ہو مگر جب تک اس کا اثر عورتوں پر نہ ہو مردوں کے کیئے کچھ
نہیں ہوسکتا۔ ہاں تم کوئی ایسی کتاب لکھ کر چھپوا دو جسمیں مؤثرانہ طریقے سے اِن
رسومات کی بُرائیاں درج ہوں تو ضرور اِس خرچ کا سدباب ہو جائے گا۔ میں نے
بھی اِس راے کو پسند کیا اور اِس کتاب کے لکھنے میں سرگرم ہوگیا۔ جہاں تک
تقریبوں اور بیماریوں اور موتوں میں بدخیالیاں اور بیہودہ رسومات اور فضول
اخراجات اِس شہر میں ہوتے ہیں قریب قریب سب کو تفصیل سے انہیں عورتوں
کی زبان اور لب ولہجہ میں اس طریقے سے مذکور کیا کہ اُن کی بُرائیاں عورتوں پر اور ہر
طبقے کی عورتوں پر اثر کریں محض برائیوں ہی پر کفایت نہ کی بلکہ ایک پُرانے زمانے کی
بڑھیا کو سامنے اُن کے بٹھا دیا وہ بڑھیا اِن رسومات کے موافق ہو کر اُن کی بھلائیاں
ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مذکور کرتی ہے۔ مگر آخر کو لاجواب ہو جاتی ہے۔ بارہ تیرہ جزو
کی یہ کتاب تیار ہوئی میں نے اُس کی کئی ہزار جلدیں چھپوا کر دوستوں کی خدمت میں
نذر کیں ایک امیر خاندان کی بعض عورتوں نے کتاب کو جب پڑھوا کر سُنا تو اُن کو
اسقدر غصہ آیا کہ سولہ یا سترہ کتابیں منگا منگا کر جلا ڈالیں آخر کہاں تک جلاتیں بعض

کیا بلکہ دس بارہ[۱۲] خاندان کی مستورات نے تو قطعاً اِن رسومات سے کنارہ کیا لیکن افسوس ہے کہ مردوں نے بھی سُنے تو جہ نہ کی ورنہ اگر وہ حضرات اِس کتاب کو خود پڑھ پڑھ کر عورتوں کو بار بار سنایا کرتے اور ہر تقریب کے آغاز میں اِس سے کام لیتے تو شاید پچھتائی خاندان سارے صوبہ بہار کا سنبھل جاتا اگرچہ مشکل تمام کتاب لی بھی تو طاق پر رکھ دی پڑھنا یا سنانا کسے کہتے ہیں لطف یہ ہے کہ میں نے بعض احباب کو کتاب چھپتے ہی بطور تحفہ دی اور بڑے شوق سے اونہوں نے لی بھی چھ سات مہینے بعد کسی نے کتاب ہذا کی تعریف جو کی تو میرے نام سے خط لکھا کہ تم نے مجکو یہ کتاب نہ دی۔ غرض تین دفعہ یوں ہی مجھ سے کتاب منگوائی اور کبھی توفیق نہ ہوئی کہ خود دیکھتے اور عورتوں کو کہاں تک سُناتے یہ کتاب چونکہ عظیم آباد کی شریف عورتوں کی زبان ولب ولہجہ درسومات میں لکھی گئی ہے ممکن ہے کہ دوسری جگہ کے عادات یا زبان سے کچھ تفاوت ہو مگر چنداں فرق نہیں ہے۔ اب تک اوس کی بیس پچیس جلدیں میرے پاس پڑی ہیں قیمت بھی اتنی ہے جتنا خرچ ہوا ہے یعنے فی جلد (۸) جن عالی خیالوں کا دل چاہے اِس افسوسناک منظر کو منگا کر ملاحظہ کریں اور مسلمان خاندانوں کے بیہودہ رسومات اور فضول اخراجات اور عورتوں کی جہالتوں کی تصویریں دیکھیں۔ اب بھی کسیقدر وقت باقی ہے دس برس بعد یہ بھی نہ رہے گا۔

افسوس ہزار افسوس۔ سولہ سترہ برس ہوئے کہ میں نے بھی اپنے لڑکے کا مکتب کیا ایک مثنوی بنام ثمرۂ زندگی تصنیف کی لڑکے کو مخاطب کرکے دینی و دنیاوی نصائح عام فہم زبان و اشعار میں بیان کیے غالباً ایک جزو کی مثنوی ہے ایک ہزار جلدیں چھپوائیں اور تقریب کے جلسے میں جو محض سادہ تھا مٹھائیوں وغیرہ کے ساتھ ایک ایک جلد اسکی بھی تقسیم کی شاید پانچ سات اب بھی باقی ہیں لڑکوں کے پڑھانے کے لایق ہے۔

پھر میرے ایک عزیز قریب کی شادی درپیش ہوئی رسم کے بموجب مجکو بھی مانجھا یا بدھوا کرنا اور دو چار جوڑے سلوا کر دھوم دھڑکے کے ساتھ ان کے گھر لے جانا (بموجب رسم) ضرور تھا مگر میں نے بعوض اِس کے ایک کتاب لکھی اُس میں زن وشوہر کے حقوق

واصلاح طرز معاشرت اور سسرال والوں سے برتاؤ کرنے کے ہدایات وغیرہ مذکور کیئے
اور فصل وباب کی جگہ جوڑے قائم کیئے کتاب کے پانچ سو نسخے چھپواکر زر نقد اور قیمتی انگوٹھی
خانچوں میں لگاکر اور شرفا کا مجمع ہمراہ لیکر اُن عزیز کے گھر گیا اور جلسہ مذکور میں کتاب
پڑھکر اُن کو سُنائی وہ کتاب دست بدست تقسیم کردی گئی کتاب کے مضامین نے
حسن معاشرت باہمی پر بہت اثر ڈالا یہ بھی تعریف اُن عزیزوں کی ہے کہ جب باخود نا
کوئی نزاعی امر پیش آتا تہا تو کتاب کی طرف رجوع کی جاتی تھی اور اسی کتاب کی صلاح
کے بموجب عمل کیا جاتا تہا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۴۰-۴۵ برس سے جہاں تک مجھ سے
ہوسکا اور اپنے نزدیک جو جو ضرورت دیکھی قوم کے لیے برابر کرتا رہا۔ اِس شہر میں
حضرات وہابیوں کا ایک مشہور خاندان ہے پہلے تو اِس خاندان میں بہت سے علما اور
ذی اثر لوگ ہتے مگر اب گنتی ہی کے لوگ رہ گئے ہیں۔ مولوی احمد اللہ صاحب مرحوم
کے جزیرہ انڈمان بھیجدیئے جانے پر اس خاندان پر سخت مصیبت پڑی مولوی صاحب
ممدوح کے حقیقی بھانجے مولوی محمد حسن مرحوم عجب عالی خیال ہوشیار بزرگ تہے اُنہوں
نے اپنے ہم مذہب و دیگر فرق اسلام کے اُمرا کو سمجھا بجھا کر یہ چاہا کہ انگریزی و
عربی و فارسی کی تعلیم کے لیئے ایک کالج قایم کریں اور وہی زمین جہاں ان حضرات
کے مکانات ہتے اور گورنمنٹ نے اُن کو ضبط کرلیا تہا گورنمنٹ سے مانگ کر وہاں
کالج بنائیں۔ ہرچند کالج تو بن نہ سکا مگر ایک اسکول انٹرنس تک کی تعلیم کا چندے سے
کہولا گیا اگر مولوی صاحب کچھہ دنوں اور زندہ رہ جاتے تو یقین ہے کہ اُن کے اکثر
منصوبے پورے ہوجاتے بایں ہمہ جب یہ اسکول قایم ہوگیا اور گورنمنٹ نے بھی
ریڈ دینا منظور کرلیا تو جب اسکیم مذہبی تعلیم کا بھی کلاس کہولا گیا شیعہ سنی وہابی
سب کی تعلیم کے لیے علما رکہے گئے مولوی صاحب نے سید مہدی نواب مرحوم سے
کہا کہ ایک کتاب مذہب شیعہ کی تعلیم کے لیئے عربی زبان میں ایسی تصنیف کروا
دیجے کہ جسمیں اعتقادات و اصول و فروع سب بحثیں ہوں اور کتاب مذکور عربی
زبان میں ہو ساتہ اسکے چند قیود ایسے بھی ظاہر کیے جس کا سرانجام ذرا مشکل تہا

سید مہدی نواب صاحب نے بہت کچھ کوشش کی اور حضرات علما کو متوجہ کیا مگر ایک
سال تک کسی نے کتاب تصنیف نہیں کی ۔ چار مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر دو چار
مہینے اور بھی ایسی کتاب مجکو نہیں ملے گی تو میں مذہب شیعہ کا تعلیمی کلاس مجبوراً
اٹھا دوں گا۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں تصنیف کروا دونگا مگر آخر میں بھی ناکامیاب ہوا
تب ناچار ہو کر مولوی صاحب سے وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ اس پنجشنبہ تک جسکو کل تین
دن باقی ہیں۔ ایسی کتاب میں آپکو دوں گا جس کتاب کے بھروسے پر میں نے وعدہ
کر لیا تھا۔ ہر چند تلاش کی مگر ہاتھ نہ آئی غرض دو دن یوں گزر گئے تب خود منصوبہ
باندھا اور چارشنبہ کے دن صبح کی نماز کے بعد سے خود بیٹھ گیا عربی عبارت کے
دیکھنے کی عادت اور نہ فقہیات میں حسب خواہ دخل باانیہمہ شام تک ایک سو صفحہ کی
کتاب تصنیف کر دی اور پنجشنبہ کے دن مسودہ مولوی صاحب کے سامنے پڑھ کر سنایا
مولوی صاحب نے کتاب کو فقط پسند ہی نہیں کیا بلکہ دیر تک حیرت زدہ ہو کر منہ دیکھا
کیے اس مختصر رسالے کا نام یومیہ رکھا گیا۔ میں نے صاف کر کے بعض علما
کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش کیا، رضوان جناب تاج العلما مولانا سید علی محمد مغفور
مجتہد نے صرف دو جگہہ مزین بہ اصلاح فرمایا پھر جو تقریظ اسپر لکھی ہم اسپر مجکو ہمیشہ فخر رہیگا
کتاب کی پانچسو جلدیں چھپوا کر مدرسے کی نذر کیں اب بھی دو چار نسخے پڑے ہیں۔ زبان
اردو کی شاعری کو ایک طرز خاص پر لانے کی دھن تو مجکو ابتدا ہی سے تھی چنانچہ
انگریزی اشعار اور سنسکرت و بھاکھا زبان کے دوہروں وغیرہ کے ترجمہ کر دینے کے
سیلے پانچ برس تک میں نے ایک ذی علم انگریزی داں اور ایک پنڈت جی کو نوکر رکھا
دس برس تک رات کے وقت ان ترجموں اور ساتھ اس کے عرب کے شعرا و اساتذہ فارس
کے دیوان آگے رکھ لیا کرتا تھا تمام شب کبھی اس طرز میں کبھی اس انداز میں مشق کیا
کرتا تھا پھر صبح سے تحصیل علم میں مشغول رہا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں (جسکو غالباً
۲۷-۲۸ برس ہوتے ہیں) میر انیس مغفور اس شہر میں بہ طلب نواب سید قاسم علیخاں
مرحوم محرم کے مجالس پڑھنے کو تشریف لائے خوب خوب مجلسیں ہوئیں اور میر صاحب کی

عام وخاص نے وہ وہ مرثیے اور غزلیں کہیں کہ غالباً اب کسی باکمال کی ایسی آؤبھگت دشوار ہے
ایک مجلس میں میں اور میرے مخدوم مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مشہور و نامی
وکیل بھی شریک تھے میر صاحب مرثیہ پڑھتے تھے اور اہل مجلس کو ایک وجد تھا بڑے
بڑے علما و وکلا و رؤسا کا یہ حال تھا کہ میر صاحب پر سے تصدق ہو رہے تھے۔ میں
متحیر دیکھ رہا تھا اور اپنے دل میں کہتا تھا اگر خدا مجھکو مجاز کر دے کہ سلطنت لے یا یہ کمال
تو میں اس کمال ہی کو قبول کرونگا مجلس کے بعد مولوی صاحب میرے گھر تشریف
لائے اور دیر تک میر انیس کا ذکر ہوتا رہا اسی ضمن میں مولوی صاحب نے کہا کہ اگر ساتھ
اس اعلیٰ درجہ کی شاعری کے روایات صحیحہ اور اظہار صبر اہل بیت بھی کیا جاتا تو بہتر تھا
مولوی صاحب کے اس کہنے کا پہلے تو برخلاف اثر ہوا۔ اور میں نے محل مذہبی تعصب پر
کیا مگر بعد کو سوچا کہ سچ کہتے ہیں جس بیان سے اظہار صبر و استقلال نہو بلکہ برخلاف
اسکے ظاہر ہو اسکو (علاوہ اسکے کہ تاریخی واقعات اور صحیح روایات کے برخلاف ہے)
زبان پر محمول کرنا کب صحیح ہے عوام تو اسکو برحق اور صحیح سمجھیں گے اور مخالفین مذہب
اسلام بھی یہی سمجھیں گے کہ ان کے پیشوا ایسے بے صبر تھے۔ جب میں نے یہ سوچا تو
میر مونس مرحوم سے خود جاکر ان تقریروں کا اعادہ کیا میر مونس مرحوم نے وعدہ کیا
کہ اپنے بڑے بھائی میر انیس صاحب سے اسکو بیان کر کے جواب لکھ بھیجوں گا۔ لکھنؤ
سے مجکو میر مونس مغفور نے یہ لکھ بھیجا کہ بھائی صاحب نے فرمایا کہ اول تو کل مرثیہ گو یونہی
کہتے آئے ہیں اور بالفرض تاریخی واقعات و صحیح روایات کا التزام کیا جائے تو ہرگز موثر
و تبکی نہیں ہوسکتا جو صاحب ایسا اعتراض کرتے ہیں مہربانی کر کے دس بند خود کہکر
دیکھ لیں۔ اس تاریخ سے (جب سے یہ خط آیا) مجکو دھن اسکی بھی ہوئی کہ حسب خواہ مرثیہ
بھی نظم کر کے سناؤں جہاں اور اور مضامین اور مضمون نظم کرتا تھا وہاں دو ڈھائی
بیس برس کامل مرثیے کے بند کہتا تھا آٹھ سات بند کہکر جب دیکھتا تھا تو حسب خواہ نہ پاتا
تھا اور سخت عاجز ہوتا تھا۔ ان کاوشوں پر بھی بیس برس تک کوئی بند حسب خواہ نہ
ہوسکا۔ چودہ برس ہوئے کہ میں غزلوں اور متفرق نظموں کا کلیات مرتب کرنے لگا

ایک مسدس بطور مرثیہ بھی اسمیں داخل کرنے کا خیال ہوا۔ جب اُسکے ایک سو بند نظم ہو گئے اور حسب خواہ پایا تو بقیہ ایک سو دس بند اور بھی نظم کیے اِس شہر میں بعض بزرگوار ایسے بھی موجود تھے جو میر انیس کے مرثیوں پر حاوی تھے اور کوئی شک نہیں کہ میر انیس کے اور دوسروں کے مرثیوں میں دو ہی چار بند کے بعد وہ فرق کر سکتے تھے میں نے میر انیس کے نام سے یہ مرثیہ اِن کے سامنے پڑھا۔ جب ان حضرات نے میر انیس کا مرثیہ سمجھ کر حسب خواہ داد دی تب میں نے ظاہر کیا کہ میرا مرثیہ ہے۔ غرض نواب بہادر سید ولایت علیخاں۔ سی۔ ای۔ آئی۔ جنت آرام گاہ نے، اپنی امام باڑے میں میر انیس و میر مونس برابر پڑھا کیئے) بڑے شوق سے مجلس قرار دی اور مرثیہ پڑھا گیا نئے اور پرانے خیال کے اہل علم سب شریک تھے اور بڑی خوشی یہ ہے کہ میرے مخدوم مولوی محمد یحییٰ صاحب (جن سے میں پچیس برس قبل گفتگو ہوئی تھی) وہ بھی موجود تھے۔ مرثیے کی بعید تعریف ہوئی اور خاصکر مولوی صاحب نے تو ایسی خوشی ظاہر کی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تب سے میں برابر مرثیے کہنے لگا اب تک ۶۵ مرثیے اور پانچ مولود حضرت پیغمبر صلعم کے دو دو اور ڈھائی ڈھائی بلکہ تین تین سو بند کے نظم کر چکا ہوں۔ بیشتر عنوان میں مذہبی۔ فلسفہ اور دیگر ضروری و کار آمد مضامین نظم کرتا ہوں تاکہ کسیقدر وضاحت سے سمجھ میں آئے مختصر طور سے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً ایک مرثیے میں یہ بات دکھائی گئی بلکہ دلیل سے ثابت کیگئی کہ دنیا میں مذہب کی کیا ضرورت ہے پھر مذاہب مختلفہ کیونکر بنے ہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم خدا کو واحد جانیں پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کے برحق ہونے کی دلیل عقلی کیا ہے ایسے مقام پر دفع دخل بھی کرتا گیا ہوں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں نبوت میں مثلاً یہ بند دفع دخل کے طور پر نظم کیے ہیں۔ ۵

جو وقت کہیں ہم کہ وہ ایسے تھے پیمبر ۔۔۔ رستے میں کلام اُن سے کیا کرتے تھے پتھر
چھتری کی طرح ابر سا کرتا تھا سر پر ۔۔۔ کرتے تھے سلام آپ کو اشجار بھی اکثر
۱۰ تسلیم کرے وہ نہ اگر اس کے اثر کو

ہم پیش کریں معجزۂ شق قمر کو

کہدے گا مخالف کہ غلط کل ہے یہ گفتار　　مانگے گا ثبوت اور ثبوت اسکا ہے دشوار
ہم پیش کرینگے جو کتابیں کئی ناچار　　اسپر بھی مخالف کو رہے گا یہی اصرار

کہدے گا غلط ہیں یہ کتابیں رد و کد کیا
خود تم نے کیا جمع انہیں انکی سند کیا

پھر پیش کرے وہ بھی جو ایسے ہی دلائل　　اعجاز یہی تمہارے ہادی کو بھی حاصل
پھر پیش کریں اپنی کتابوں کو وہ عاقل　　کس منہ سے کہیں ہم کہ ترا دین ہی باطل

جب ہاتھ میں اپنے کوئی معیار نہیں ہے
غصے سے کہیں کچھ یہ سزاوار نہیں ہے

یا ہے مثلاً ایک برہمن کا یہ ایمان　　لنکا کو ہتھیلی پہ اٹھا لائے ہنومان
اپنی بھی دلیلوں کا اگر ہے یہی عنوان　　انکار کروں اس سے یہ کب ہے مرے شایاں

تسلیم میں یا اسکے کوئی عار نہ سمجھیں۔
اس بات کو یا دین کی معیار نہ سمجھیں

یوں پیش کریں یا مثلاً اون سے دلائل　　مذہب میں تمہارے ہیں بہت لغو مسائل
ہوتی نہیں خاطر کو تسلی کوئی حاصل　　یہ دین تمہارا ہے اسیواسطے باطل

تا وسع مخالف بہت انہیں بھی لڑیگا
خود لغو ہے کیا چیز یہ بل آکے پڑیگا

اس کے بعد دلیلیں حقانیت نبوت کی مذکور کی ہیں۔ غرض کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نہ کسی معرکۃ الآرا بحث مثلاً جہاد و تعدد ازدواج وغیرہ وغیرہ کو ضمناً نظم نہ کیا ہو یہ بات نہیں ہے کہ مرثیے کی جگہ کوئی علمی لکچر یا مباحث کی کتاب تصنیف کی ہو مرثیہ ہے جسمیں چہرہ رخصت بین رزم میدان جنگ تلوار اور گھوڑے وغیرہ سب باتیں ہیں۔ غرض مرثیے میں جو ہونا چاہیئے سب ہے ساتھ اس کے مذہبی معلومات بھی ہے (باقی آیندہ)

غزل جناب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی

بحسب طرح مشاعرہ جناب سید بادشاہ نواب صاحب

کٹ گئی شب لو مبارک تمکو ہو تنویر صبح
بھیس بدلا چاندنی نے لاکھ کی تدبیر صبح
کارہا ہم سے رہی ہے آج گو تاخیر صبح
منہ بنا کر جب کرونگا شکوہ تاخیر صبح
دل لگی کرتی ہے آزادوں سے اے تاخیر صبح
رات کی رکھی ہوئی ساقی سے لے لو تو دے
یا حقیقت میں ہے باقی رات ابتک اے فراق
کوٹ کر بھر دے مرے سینے میں بھی صدق و صفا
کم نما تارے کئی ہیں یا کہ پریاں غوطہ زن
حسن پر آشوب جاناں کو نہ دیکھا ہو تو دیکھ
کٹ گئی فرقت کی یہ شب یا بلائیں کٹ گئیں
ہر طرف تسبیح خواں ہیں بلبل و دراج و کبک
کیوں دلا بانگ موذن ہی کہ شور پاسباں
گل ترس جائینگے ہنسنے کو شب غم میرے بعد
الصبوح الصبوح کی صدا ہے صاف صاف
میری پرنج اے مہر حاجت سے زیادہ تیز ہے
پیل جس وہن میں مقید ہے اسی میں مور بھی
بینی بینی بو گلوں کی لے چلی باد صبا

اے موذن اے شفق اے آہ پر تاثیر صبح
پھر تو کہانی منہ کی آخر تجھ سے اے تاخیر صبح
کل نہیں ہا تھونکو دیکھوگے گریباں گیر صبح
کھل کھلا کر ہنس پڑی مجھ پہ خود تنویر صبح
ہو رہے جائے اگر میں ہوں گریباں گیر صبح
بادہ کش چونکے صباح الخیر اے تنویر صبح
یا دبا شور فغاں میں نعرۂ تکبیر صبح
تیرے صدقے مجھکو اپنا کر کہ اے تاثیر صبح
موج خیز اک نور کا دریا ہے یا تنویر صبح
اک یونہی سا ہے نمونہ حسن عالمگیر صبح
کوکب اقبال ہے میرا کہ ہے تنویر صبح
باغ میں گلبانگ کا ہے شور یا تکبیر صبح
فی الحقیقت صبح ہے اے چشم یا تدبیر صبح
روئینگے برسوں لپٹ کر صبح سے تاثیر صبح
تو بھی سن ساقی خدارا نعرۂ تکبیر صبح
جوش کھاتا ہے ابل کر گر نہ جائے شیر صبح
اک رسن میں تو نے جکڑا سب کو اے زنجیر صبح
عطر بیزی دشت میں کرنے لگی تاثیر صبح

اے قمر گو چاند ہے تو بھی اندھیری رات کا
تیرا اسیر بچا کرے گا حسنِ با توقیر صبح ٭

سامنے بھی صفحۂ گردوں کی دکھلا اے خدا
ہے کبھی تصویرِ شب اسپر کبھی تصویر صبح

جب شبِ غم کی درازی سے چلی جانِ عزیز
تب سنا اللہ اکبر نعرۂ تکبیر صبح

تشنگی اصلی چلی جائے یہ ہے امر محال
پھیرتی ہے رنگِ نو عالم پہ کیوں تاثیر صبح

قصہ خواں قصے سے تیرے نیند مجھکو آ چکی ٭
وہ عمل بتلا کہ جس سے کر سکوں تسخیر صبح

کس کے خوں کی اے شفق چھینٹیں ہیں تجھ پر ہیچ تا
ہائے کس بیکس کی گردن پر چلی شمشیر صبح

باز آئی وصل کی شب بھی نہ اپنی چال سے
چاندنی میں چھپ کے آئی دیکھنا تدبیر صبح

کلبۂ احزاں تمہارا دشمن نالۂ شب سے مرے
بجھ گئی یہ شمع بھی آخر دمِ تکبیر صبح

کچھ تو کر غور اس تلون کا ٹھکانا ہے کہیں
خود لکھی اور خود مٹا دی اے فلک تحریر صبح

کچھ تو میرا ساتھ دے اے شمع رونے میں ابھی
یوں نہ گھبرا خود بجھا دیگی تجھے تاخیر صبح

جھوٹتے ہیں نیند سے ساقی ترے شب زندہ دار
چونک جائیں گر صبوحی بھر کے دے تنویر صبح

کر مرا خونِ تمنا بھی شفق میں مل گیا ٭ ٭
رنگ نو پیدا کرے گا صفحۂ تصویر صبح

اے فلک کیونکر نہ بکھرے دل ہوا اپنا باغ باغ
ہے خطِ گلزار میں لکھی ہوئی تحریر صبح

اٹھ کھڑا ہو خاک پر پھر رکھ سرِ عجز و نیاز
اپنی عزت چاہتا ہے تو تو کر توقیر صبح

اے شبِ فرقت خیال اسکو بہت پھیلائے گا
کھینچ لی ہے پتلیوں نے آنکھ کی تصویر صبح

کیوں نئے سر سے ہوئی قلعی نہ مطلب کچھ کھلا
کیوں ہی کیوں ڈھ گئی اے آسماں تعمیر صبح

وصل کی شب کے تو جانیکا نہیں چنداں ملال
جاگتا ہے چھپ کے سورج آنکھوں اے تنویر صبح

کھل رہے ہیں سوسن و نسرین و ریحان و انار
نور تن پہنا گئی ہے باغ کو تاثیر صبح

ہم تو عبرت نامۂ عالم سمجھتے ہیں اسے
منشیٔ گردوں نے لکھی ہے عجب تحریر صبح

اے صبا چونکا نہ خوابِ ناز سے وہ گلبدن
رہ گئی منہ دیکھ کر خالی گئی تدبیر صبح

جسطرف آنکھیں اٹھاؤ عالمِ تصویر ہے ٭ ٭
چھا گیا سارے جہاں پر حسنِ عالمگیر صبح

کیا کہوں کون آج تھی جس سے حجاب آیا مہر
نقرہ ہائے خام کی معدن بنی تنویر صبح

بات کہتے کر دیا دنیا کی دنیا کو مرید ٭
تیرا بایاں پاؤں لینا چاہیے اے پیر صبح

مسے شب غم اب کی پٹی نہ رکھے گی کبھی ؟ — جانتی ہے تیری سب مکاریاں تو نویدِ صبح

شاد چونکو گے نہ پھر تم تو وہ سونا سو گئے
میری جاں آخر تمہیں ہی سے مری تاخیرِ صبح

از جناب محمد نوح صاحب تخلص نوح از قصبہ بارہ ضلع الہ آباد

آن کا خنجر نظر نہیں آتا — کوئی سینہ پر نظر نہیں آتا
حال میں تیر کے داغِ دل میرے — فرق تل بھر نظر نہیں آتا
کر گئی کام تیغِ ناز مگر — زخم و پھر نظر نہیں آتا
بیٹر اتنی ہے جان نثاروں کی — وہ ستمگر نظر نہیں آتا
اسکا جلوہ ہے ذرّے ذرّے میں — اور اسپر نظر نہیں آتا
کیا کہوں اپنے دل کی بیتابی — وہ جو دم بھر نظر نہیں آتا

نوح میری نظر میں کوئی بھی ہاہا
اُنسے بہتر نظر نہیں آتا

غزل از جناب رضا علی صاحب وحشتؔ متوطن کلکتہ

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا — طور شہید ہو گیا جلوۂ دلنواز کا
پایہ بہت کیا بلند اُسنے حریمِ ناز کا — تا نہ پہونچ سکے غبار رہگزرِ نیاز کا
خستگی کلیم نے نکتہ عجب سمجھا دیا — ورنہ حریف میں بھی تھا اُس مژۂ دراز کا
دیر ملا تھا راہ میں کعبے کو ہم نکل گئے — جذبۂ شوق میں مانع کسکو ہوا امتیاز کا
بندگی اور صاحبی اصل میں دونوں ایک ہیں — جسکا غلام ایاز ہے وہ ہے غلام ایاز کا
کوتہی نصیب نے دور رکھا تو کیا ہوا — بندۂ خانہ زاد ہوں اُسکے قدِ دراز کا

شوق ترا ہے موجزن ذوق ترا ہا نہ جو
کھول نہ دیں بزم کہیں پردگیانِ راز کا

مستی بیخودی سے یاں آنکھ کبھی نہ شرمگیں
یعنی یہی جواب تھا نرگس نیم باز کا

آہ و فغاں کے ساتھ ساتھ چپا گئی ایک بیخودی
قطع زبان ضرور تھا شمع زبان دراز کا

خاک میں مل گئے دہتے آنکھ اٹھی نہ شرم سے
ہم سے ہوا نہ حق ادا اُس کی نگاہ ناز کا

مضطربِ جلد کیا سنائے وحشتِ خستہ کیا سنے
معتقد یم ہے زمزمۂ حجاز کا ؍ ؍ ؍

غزل از جناب میرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

اشارہ کرتے ہی تسکین ہوگی بیقراروں کی
تری چشم عنایت جان ہے امیدواروں کی

ہر اک غم دہو گیا دل سے اگر دم بھر کو جا بیٹھے
قیامت تک رہے آباد محفل بادہ خواروں کی

وہی اچھا ہے پوچھا جس کسی کو تیری رحمت نے
نہ جنت بادہ خواروں کی نہ ہے پرہیزگاروں کی

جفائے عشق نے راحت اُڑا دی ساری دنیا سے
زمیں سو بار کانپ اُٹھی تڑپ سے بیقراروں کی

قیامت اک عذابِ تازہ ہے خلوت پسندوں کو
اذیت دیگی اہلِ قبر کو صحبت ہزاروں کی

کریں معشوق قتلِ عاشقاں کہنے کی باتیں ہیں
نزاکت نے حیا رکھ لی تمہارے اوچھے واروں کی

ترے دیدار نے محشر میں بھی فتنے کئے برپا
نگاہیں لڑ رہی تھیں ہر طرف امیدواروں کی

مناسب حال کے جو کوئی شئے ہو لطف دیتی ہے
کرے غم فاتحہ خوانی لحد پر سوگواروں کی

زمانہ اسکا عاشق اور مزا بھی ضروری ہے
جگہ نکلے کہاں تک کوچۂ جاناں میں مزاروں کی

مقدر کو دعائیں دیکے اُٹھے بزم جاناں سے
کسی نے بات بھی پوچھی نہ جب امیدواروں کی

یہ کس انداز سے تلوار کھینچی اس ستمگر نے
فدا پہلے ہوئیں اُٹھ اُٹھ کے نظریں جانثاروں کی

بصورت سراپا چشم و دل ہیں شکل آئینہ
زباں منہ میں نہیں ہوتی تمہارے رازداروں کی

دلِ بیمار کے مرتے ہی ارماں پا گئے فرصت
کشاکش سے ہوئی محشر رہائی غمگساروں کی ؍؍

کسی کو دخل ہی کیا ہے خدا کے کارخانے میں ✽ وہ جو چاہے کرے قادر ہے سب کچھ کر دکھانے میں
اُسے کیا دیر لگتی ہے بنانے میں مٹانے میں ✽ فسانہ ہو گیا حسن و محبت کا زمانے میں

نہ لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے نہ ناقہ ہے نہ محمل ہے

خدا نے جو چیز بنائی ہے اُسکو فنا ضرور ہے۔ یہ جتنے جسم ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ جتنے خیال ہماری نظر کے سامنے وقت سے دوڑتے پھرتے ہیں صانع قدرت نے ازل میں جسوقت انکی دلفریب صورتیں بنائی تہیں اُسی وقت اُنکے قد و قامت کے موافق ایک فنا کا برقع بھی تیار کر لیا تھا۔ غیب کے بہوت فرشتے اُس برقع کو لئے ہوئے منتظر بیٹھے رہتے ہیں کہ کب خدا کا مقرر کیا ہوا وقت آ جائے۔ اور ہم اُڑا دیں بہتسے ناموروں کا حال ہم دیکھتے ہیں جنکے زمانے نے اُنہیں خدا جانے کس عظمت کو پہونچا دیا تھا۔ مگر اب ڈہونڈہتے ہیں تو دنیا میں اُنکا کوئی نشان بھی نہیں معلوم ہوتا۔ اُنکے تہوڑے ہی دنوں کے بعد وہ چیزیں بھی سب مٹ گئیں۔ جنکو اُنسے تعلق تھا۔ اسی وجہ سے ہمنے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے کہ منشی اسمعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی مرحوم کے حالات زندگی اپنی ٹوٹی پہوٹی زبان میں تحریر کریں۔

خاکسار ماد ہو رام تاثیر اٹاوی

آپ کا نام اسمعیل حسین اور تخلص منیر ہے قوم کے نقوی سید ہیں۔ وطن شکوہ آباد۔ ضلع مین پوری ہے۔ آپ زبان اردو کے ایک نہایت نامور شاعر تھے آپ کے جد اعلیٰ حضرت سید بہاؤ الدین تھے جو سلطان علاء الدین غوری کے زمانے میں ایک مشہور ولی اللہ ہو گئے ہیں وہ اپنا اصلی وطن ترک کرکے ہندوستان میں تشریف لائے اور یہیں قیام پذیر ہوئے۔ چونکہ آپ علوم ظاہری و باطنی میں یگانۂ روزگار تھے۔ اسلئے ہندوستان میں بہت وقیع نظر سے دیکھے گئے۔ اور آپکے بعد آپکے لائق جانشین علمی فضیلت و جوہر شرافت کے اعتبار سے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ چنانچہ منشی منیر کے پردادا سید شرف الدین علیخاں کو عہد محمد شاہی میں شکوہ آباد و فیروز آباد کی حکومت عطا ہوئی اُسوقت سے آپ کے خاندان نے شکوہ آباد میں سکونت اختیار کی۔ منشی منیر کے والد سید احمد حسین شاد انہیں شرف الدین علیخاں کے پوتے تھے سید احمد حسین شاد

کو مرزا رفیع سودا سے تلمذ حاصل تھا اور شاعری دنیا میں اُنکا پایہ وسیع سمجھا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ حضرت شاہ صاحب کلیات تھے۔ مگر افسوس کہ وہ کلیات چھپا نہیں اور نہ ہماری نظر سے گذرا جب ایک معاہدۂ باہمی کی رو سے سرکار بہادر نے نواب لکھنؤ سے ملک میان دو آب تا کہن پور لے لیا۔ تو اسی عہد یعنی ۱۲۵۰ہجری میں منشی منیر کے والد ماجد فوت ہو گئے۔ منیر کی عمر اس زمانے میں ۱۷ سال کی تھی۔ وقت بندوبست آپکے بزرگوں نے کسی مصلحت سے اپنی زمینداری کو ایک بقال کے ہاتھ فرضی بیع کر دیا۔ آخرش زمینداری سے دست بردار ہونا پڑا اگر ستارہ اوج اقبال پر تھا مسٹر اسٹاکول صاحب بہادر حاکم آگرہ دین پوری نے آپ کے والد کو سررشتہ دار مقرر کیا۔ بہت عرصے تک آپ کے والد عہدۂ جلیلہ پر سرفراز رہے۔ پہلا عقد آپ کے والد کا جا نغلی صاحب قاضی اٹاوہ کی دختر سے ہوا۔ اُنسے مولوی سید اولاد حسین صاحب پیدا ہوئے جو اپنے زمانے کے مجتہد تسلیم کئے گئے اور مدرسہ ہوگلی ضلع کلکتہ میں بمشاہرہ ۸۰۰ روپیہ ملازم رہے۔ انکا عقد حکیم ظفر علی خاں رئیس اعظم لکھنؤ کے یہاں ہوا اور اُنسے اولاد بھی ہوئی مگر اب اُن میں کوئی باقی نہیں ہے۔ دوسرا عقد آپ کے والد کا ایک رئیس آگرہ کی دختر سے ہوا کہ جس سے آپ ۱۲۳۳ہجری میں بمقام شکوہ آباد پیدا ہوئے۔

آپ نے فارسی اور عربی کی کتابیں اپنے والد سے اور دینیات وغیرہ کی کتابیں اپنے برادر معظم سے جو علامۂ عصر سمجھے جاتے تھے پڑھی تھیں۔

آپ کی فطرتی ذکاوت اور خدا داد ذہانت کم سنی کے زمانے میں بھی زبان زد خلائق تھی۔ ایک مرتبہ جو سُن لیتے تھے وہ بھی بخوبی یاد رہتا تھا طرّہ یہ کہ باوجود مسلمان ہونیکے ہنود کی مذہبی کتابیں از بر یاد اور نوکِ زباں رہتی تھیں۔

منشی منیر کو لڑکپن سے شاعری کا شوق تھا۔ تکمیل علوم کے بعد اس شوق کو اور ترقی ہوئی نوجوانی کا عالم تھا۔ سبزہ آغاز تھا اسی دہن میں آگرے تشریف لے گئے۔ آگرے میں اُسوقت مشاعروں کا بڑا زور شور تھا اور لوگ غزل گوئی اور غزل سرائی کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے منشی منیر کو بھی غزل کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ حسن اتفاق سے اسوقت نواب نظام الدولہ خلف الصدق وزیر شاہ اودھ بطور سیر آگرے میں قیام فرماتے تھے اور اُنکی دلچسپی کے لئے

مہاراجہ صاحب بہادر کاشی کے دولتکدے پر محفل مشاعرہ منعقد ہونیکی دھوم تھی اس مشہور اور معرکہ آرا مشاعرے کے لئے منشی منیر نے بھی غزل تیار کی اور بغیر کسی اُستاد کو دکھلائے مشاعرے میں لے گئے آخر جب یہ غزل مشاعرے میں پڑھی گئی۔ تو نکتہ سنج اہل کمال نے منیر کی امید سے زیادہ اس کی داد دی اور عام طور سے شعراے اہل کمال منیر کی نازک خیالی شستگی زبان اور حسن بیان پر فریفتہ ہوگئے۔ بعض حاسدوں نکو منیر کی یہ آو بھگت دیکھ کر سخت قلق ہوا اُنہوں نے تعریف تو کی مگر جلے کٹے الفاظ میں۔ منیر نے اس طرز تعریف کو تاڑ لیا۔

عنفوان شباب تو تھا ہی۔ دلی جذبات کو نہ دبا سکے منتظمان مشاعرے کو مخاطب کر کے کہا کہ شاعری کا امتحان تو فی البدیہہ شعر گوئی پر ہے کوئی مصرعہ طرح کا اسیوقت دیا جاوے اور جن صاحبونکو شاعری کا دعویٰ ہو اُسنے اسیوقت شعر کہلائے جاویں۔ میں بھی کچھ عرض کرونگا۔

اسپر نواب صاحب نے فارسی کا مصرعہ۔ اور مہاراجہ صاحب نے اردو کا مصرعہ تجویز کیا۔ منیر نے دونوں مصرعوں پر برجستہ مصرعے لگائے۔ اور اُسیوقت اہل مشاعرہ کو سنائے۔ سب نے اس خداداد طبیعت کی داد دی۔

نواب صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں منیر نے جواب دیا کہ میں ابھی تک تو کسی کا شاگرد نہیں ہوں مگر اُستاد کامل کی تلاش ضرور ہے۔

نواب صاحب نے فرمایا کہ اگر تم ہماری مصاحبت قبول کرو تو ہم تمکو شیخ ناسخ کا شاگرد کرادیں۔ منشی منیر نے منظور کرلیا۔

غرض اس تقریب سے منشی منیر نواب صاحب کے ہمراہ آگرے سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے شیخ امام بخش ناسخ سے غزل میں اصلاح لینی شروع کی۔ چند ہی روز کے بعد ناسخ سے باکمال شخص نے اپنے نئے شاگرد کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ ایسے ذہن وذکا اور فہم رسا کا کوئی شاگرد میرے شاگردوں میں نہیں ہے منشی منیر کے لئے اُستاد ناسخ کا یہ ریمارک شاعری کی یونیورسٹی کا ایک گرانبہا اور قابل قدر ڈپلوما ہے۔

منیر کو بحث و مباحثہ کی بیماری تھی جس سے استاد ناسخ چڑاتے تھے۔ تاہم وہ **خواجہ وزیر** اور منشی **منیر** کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور جانتے تھے۔

زمانے کے انقلاب نے جب استاد ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کیا تو منیر نے ناسخ کے اشارے سے **میر علی اوسط رشک** کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اور انہیں کے ساتھ **کانپور۔ لکھنؤ۔ مرشد آباد۔** وغیرہ کے شاعروں میں شریک ہوتے رہے آخر مختلف حوادث میں گرفتار ہو کر پھر لکھنؤ میں آکر قیام فرمایا چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردیدہ بہ بیت السلطنت لکھنؤ پیوستہ شتافتم۔ بقول فخر المتاخرین مرزا **غالب** دہلوی۔

اندراں بقعۂ معمورہ دل تنگی خویش ؎

حسرت آگیں چو گنہگار بزنداں رفتیم ؎"

لکھنؤ میں چند روز مسائل معاش کی طرف سے پریشان رہے۔ آخر نواب **اصغر علیخاں** صاحب بہادر نے کچھ مدد کی۔ پھر نواب **معین الدولہ** ولد سید باقر علیخاں ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ نے انہیں فکر معاش سے آزاد کر دیا۔

چند روز فارغ البالی کے ساتھ گذرے ہی تھے کہ بدقسمتی نے آکر پھر منہ دکھایا۔ اس مرتبہ مولانا **احمد حسن خاں** بہادر عروج نے بڑی امداد کی۔ اسی زمانے میں سید **محمد ذکی خاں** بہادر عرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی نے آپ سے اصلاح لینی شروع کی۔ دو سال اس حالت سے گذرے تھے کہ نواب **تجمل حسین خاں** بہادر ظفر جنگ فرمانروائے ریاست فرخ آباد نے آپ کو نہایت تزک و احتشام سے جیسا کہ آپ کے قطعۂ ذیل سے ظاہر ہے۔ زاد راہ بھیجکر طلب کیا۔ ؎

امیر عہد **تجمل حسین خاں** نواب ‌ ‌ ‌ خطاب جنکا ظفر جنگ نام ہے اعلیٰ

زمانے میں انھیں کہتے ہیں لوگ حشمت جنگ ‌ ‌ ‌ سپہر کرم فیض و علم میں یکتا

انہوں نے شقہ معہ صرف زاد راہ بھیجا ہے ‌ ‌ ‌ طلب کیا ہے کمال اشتیاق سے بخدا

چلا ہوں لکھنؤ سے سوے فرخ آباد آج ‌ ‌ ‌ ہزار ہوں حسرتیں رنج و ملال ہیں صدہا

فراق لکھنؤ سے ہے منیر یہ تاریخ
بہشت ہند سے افسوس ہائے میں نکلا
۱۲ ۷۰

جب منشی منیر والی فرخ آباد کی سرکار میں پہونچے۔ تو وہاں آپ کے کمال کی نہایت قدر ہوئی آپ نے اسی زمانے میں ایک قصیدہ حضور پرنور میں پیش کیا۔ جسپر فصاحت اور بلاغت دونوں قربان ہوتے تھے۔

یوں تو گلزار نظم کا ہر پھول کچھ نہ کچھ آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں سادگی کا جوبن۔ کہیں شوخی کا رنگ۔ کہیں رنگینی کا نکھار اپنے اپنے موقع پر اسیطرح مزہ دیتا ہے جسطرح سے چند گل اندام صورت و وضع کے اختلاف سے قدرت کی نیرنگیاں دکھانے، اور تماشائیان حسن ازل کو محو جمال بنانے کے لئے کسی ایک جگہ مجتمع ہوکر محفل آرا ہوں۔ مگر واقعی امر یہ ہے کہ حقیقی شاعری ایک ایسی پیاری دلہن ہے جو بیشتر نازک خیالوں کے خوشنما زیوروں سے آراستہ کیجاتی تھی۔ دیکھئے عندلیبان فارس کی زمزمہ سنجی۔ طوطیان ہند کی خوشنوائی کانوں کو کیسی بھلی اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم مضمون آفرینی کے پردے میں نئی نئی تشبیہیں اور نئی نئی ترکیبیں پاتے ہیں تو مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔ القصہ منیر کے حسن کلام سے کمال کے باغ کی خوشبو آتی ہے۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے وہ قصیدہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

قصیدہ

قلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر
اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر

دستگیری ہوئی پاپا لوں کی کسکو منظور
آبلو نے ہوئے کسواسطے پیدا گوہر

کس خداوست کے ہاتوں میں پہونچنے کیلئے
کرتے ہیں دانۂ تسبیح سے رشتا گوہر

غسل صحت کی خوشی کونسے فیاض نے کی
کس کے صدقے کیلئے لائے ہیں دریا گوہر

یارب آئی ہے یہ کس کی شب جشن صحت
آج تاروں کو لٹاتا ہے مسیحا گوہر

محفلِ رقص میں کس نے یہ گہرباری کی
چرخ سے لوٹنے کو آئی ہے زہرا گوہر

وہ فلک مرتبہ نواب نصیرالدولہ
صدفِ قدرتِ حق کا ہے جو یکتا گوہر

فیض والا سے نہیں اہلِ عدم بھی محروم
فرطِ بخشش سے نہیں بیضۂ عنقا گوہر

آپکے فیض نے جب ابرِ کرم برسایا
رعد کے بدلے گرجنے لگے کیا کیا گوہر

نہ ہوا تو نے جو اسے مہرِ سپہرِ ہمت
سرد مہری سے ہوا کانپ کے نیلا گوہر

ہو اگر واسطے تسبیح کے حکم والا
بیدہ دے نوکِ مژہ سے ابھی زہرا گوہر

آبروِ اہلِ صفا کی یہ بڑہی تیرے حضور
ہو گئی خاکِ کفِ پا سے مصفا گوہر

زالِ دنیا نے بھی بالوں میں پروئے موتی
روز لوٹے تری سرکار سے صدہا گوہر

بسکہ ہے عام ترا فیض مجھے کھٹکا ہے
نہ بنے شوق میں ناقوسِ کلیسا گوہر

لبِ دریا جو کرے گرم روی توسنِ خاص
اڑ چلیں بطنِ صدف سے شررآسا گوہر

ق
یہ ایسا ہے یہ گھوڑا دمِ رفتار اگر
پھینکدو ڈہال جگہ میں کوئی پھیلا گوہر

شش جہت میں یہ فلک سیر ہر آئے جا کر
ایک پہلو بھی نہ بدلے ابھی اصلا گوہر

ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جسکے
ٹوٹنا کیا کہ نہو نام کو میلا گوہر

پانی خرطوم سے پھینکا تو بنا دُرِ خوش آب
برسے اس ابرِ سیہ مست سے کیا کیا گوہر

دیکھکے موتیوں کی جھول یہ سب کہتے ہیں
پہنے پھرتی ہے عروسِ شبِ یلدا گوہر

تیری شمشیرِ شرر دم کی جو تیزی سُن پائیں
قطع کردیں صدفِ بحر سے رشتا گوہر

عشق کیا حسن کو ہے موتیوں کے ڈاب سے فیض
ملگئے عاشق و معشوق کو کیا کیا گوہر

کوئی اس سیف سے تشبیہ اگر موج کو دے
اپنے روزن میں چھپائے پھریں دریا گوہر

جوہر ایسے ہیں مصفا کہ سمجھتے ہیں سب
آبِ شمشیر میں شاید ہوئے پیدا گوہر

آپکا نام جو اطفال کریں وردِ زبان
دودھ کے دانت بنیں مُنہ میں مصفا گوہر

ختم کرتا ہے دعا پر تری تعریف منیر
ہاتھ آتا نہیں اب نظم کا اچھا گوہر

ابر نیساں رہے جب تک کہ درخشاں یارب
قلزمِ دہر میں جب تک کہ ہوں پیدا گوہر

میرے نواب ہمیشہ ہوں صحیح و سالم
مسند آرا رہے تا حشر یہ والا گوہر

جو اقبال زیادہ ہو عطا ہو فرزند — روز برسیں در دولت سے خدایا گوہر
اپنے مداح کی اب عرض خداوند سنیں — نذر کے واسطے لایا ہوں میں کیا کیا گوہر
سچ یہ ہے آپ سخن گو بھی سخن فہم بھی ہیں — دیکھیئے ان میں سے کوئی نہیں جھوٹا گوہر
آبرو آپ کی خدمت میں بڑی ہے ایسی — بنگیا اختر تقدیر ہمارا گوہر

منیر کو نواب صاحب نے اس قصیدے کے صلے میں ایک خلعت زریں اور ایک زنجیر طلائی عطا فرمائی اور معقول مشاہرہ مقرر کر دیا اس گرانقدر صلے سے منشی منیر کی کمال عزت افزائی ہوئی۔ اور شہر میں آپ کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا لوگ بخوشی خاطر آپ کے شاگرد ہونے لگے۔ مگر ان تلامذہ میں سے دو شخصوں کے سر سہرا رہا۔ ایک نواب **واجد علیخاں** رضواں حرم ابن نواب نجابت علیخاں صاحب بہادر مغفور نواسہ نواب مظفر جنگ بہادر۔ دوسرے منشی **مادھو رام** صاحب جوہر مرحوم فرخ آبادی۔ یہ دونوں شاگرد منشی منیر کے نہایت قدر و منزلت کرتے رہتے تھے۔ اور حد درجے کی خاطر و مدارات سے پیش آتے تھے۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ کسی صاحب نے طرح کا یہ مصرعہ تجویز کیا۔ ؎

اسکا شیدائی ہوں جسکا کوئی شیدائی نہیں

محفل مشاعرہ بڑی دہوم دہام سے منعقد ہوئی منیر نے بھی غزل لکھی اور مشاعرے میں پڑہی اس غزل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی جدائی منیر مرحوم کو شاق گذری تھی۔

وہ غزل یہ ہے۔

غزل

اور مجھ سا جان دینے کا تمنائی نہیں — اسکا شیدائی ہوں جسکا کوئی شیدائی نہیں
ناصحو کیوں صبر کرنے کیلئے کرتے ہو تنگ — اسقدر دل تنگ ہے جا سے شکیبائی نہیں
زار ہوں طاقت سے ملجانیکو طاقت چاہیئے — ناتوانی سے جدائی کے توانائی نہیں
دشت وحشت میں نہیں ملتا ہے سایکا پتا — میں ہوں سودائی مرا ہمزاد سودائی نہیں

اتنی شیشے کی عینک ہو ہماری آنکھ میں
ہم تمہاری گرمیاں دیکھیں یہ بینائی نہیں

دونوں نشؤوں سے ہیں باہر مست صہبائے الست
اپنے میخانے میں دورِ چرخِ مینائی نہیں

میرے دل کی تجھکو بیجا ہے شکایت غیر سے
اپنے گھر کا حال کہنا طرز دانائی نہیں

ہے مرادِ دستِ جنوں سات آسمانوں سے بلند
ربع مسکوں وادیِ وحشت کی چوتھائی نہیں

لکھنؤ کی آرزو میں جان دیتا ہے منیر
سلطنت کا بھی زمانے میں تمنا ئی نہیں

رفتہ رفتہ تقدیر نے آپ کو رامپور پہنچایا۔ خلد آشیاں نواب **کلب علیخاں** کا مبارک زمانہ تھا۔

منیر نے خلد آشیاں کی فرمایش سے مدح ممدوح میں ایک قصیدہ لکھا ہم ناظرین اردوئے معلیٰ کی دلچسپی کے لئے اس قصیدے کے چند دلچسپ مقامات نقل کرتے ہیں جو نیچرل مذاق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

؎

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موجزن جھیلیں ندیاں جاری

بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر
اودی اودی سنہری زنگاری

کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے
سبز مخمل سے ہے سوا پیاری

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پروائی
لہریں لیتی ہیں ندیاں ساری

ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں
روح پر ہوتی ہے خوشی طاری

کوکلا۔ بگلے۔ کوئلیں۔ طاؤس
اپنی تانیں سناتی ہیں پیاری

قازیں۔ مرغابیاں۔ بطیں۔ سرخاب
جھیلوں کے ساتھ کرتے ہیں یاری

کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دلداری

سیر بھی بن کی چلکر دیکھہ
کیا نمایاں ہے قدرتِ باری

ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں
نہر یا جوئے شیر ہے جاری

مہندیوں سے ہتیلیاں گلنار
ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری

سبھے چاندی کے ریشمے جوڑے
ساز عشرت کی گرم بازاری

لکھ چکے ہیں منیر کی غزلیں — اب ہے ساون ملار کی باری
نقل ہر ایک ہے مطابق اصل — رنج و غم پر بہی ہے خوشی طاری
ہاتھ آتا نہیں کوئی مضموں — ذہن کرتا نہیں مددگاری
روئے خورشید ہو گیا پنہاں — شام نے کھولی زلف طراری
مینہ برستا ہے میں ہوں کرییں — شمع روشن ہے رات اندھیاری
خامہ و کاغذ و دوات و کتاب — دل میں فکر آنکھوں میں ہے بیداری
ناگہاں کھل گئی مری قسمت — بار غم سے ملی سبکساری
دیکھتا کیا ہوں شاہد معنی — محو ناز و ادا و طراری
شفقی ہونٹھ چمپئی رنگت — سرمئی آنکھیں ڈورے گلناری
لغزش برق جلوۂ طاؤس — چال رفتار کبک کہساری
پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے — عرق شرم جسم سے جاری
کچھ رکھائی بہی کچھ لگاوٹ بہی — چتونوں سے عیاں ستمگاری
آنکھیں پتھرا گئیں تحیر سے — دل پہ اک بیخودی ہوئی طاری
اٹھ کے افتادگی نے کی تسلیم — پائے بوسی نے کفش برداری
خاکساری نے فرش کیں آنکھیں — سر نے کی پاؤں کی پرستاری
ہاتھوں نے دوڑ کر بلائیں لیں — دل نے کی بڑھ کے منت و زاری
عجز نے دور کی خوشامد سے — بد مزاجی غرور کی ساری
پہر گئے گالیوں کے تیر الٹے — جب خموشی نے کی سپرداری
ہو گئی کند تیغ استغنا — دیکھکر ضبط کی جگرداری
بیگناہی نے گرد پہر پہر کر — خفگی کو بہی کر دیا عاری
بل نکالے بہوؤں کی منت نے — کی نیازوں نے ناز برداری
کچھ نصیحت جو کی غریبی نے — دل میں ڈر ڈر گئی ستمگاری
جیت لی التجا نے کھل مل کر — شرم بیجا سے شرط خودداری

گور کہائی سنے اسکو بڑکا یا | پر لگاوٹ نے کی طرفداری
رحمت کچھ مری سفارش کی | کچھ مروت نے کی مددگاری
خلق نے آنکھہ دی تبسم کو | خوش مزاجی کی آگئی باری
بخت خفتہ سے آ لی ملنے کو | ق | اسکی ٹھوکر کے ساتھہ بیداری
کچھ کچھ آنکھوں میں جب طلوع ہوئی | شب ہستی سے صبح ہشیاری
میں نے پوچھا کہ اسے نہ بے مہر | فلک ظالم جفا کاری
خاک چھنوا رہی ہے عالم میں | شعرا کو تری طلسمگاری
کو سنے برج میں ستارا گر ہے | کس فلک پر ہے شوق سیاری
ہنسکے اس بت نے یوں جواب دیا | لب شیریں سے کی شکر باری
میں ہوا ان شاعروں کی خدمت میں | جو کہ نواب کے ہیں درباری
دیکھہ تو رامپور کی برسات | کیا نمایاں ہے قدرت باری

رامپور کے اوصاف

کیا کروں باغ بے نظیر کا وصف | جس سے ظاہر ہے قدرت باری
رنگ ہر پھول سے ٹپکتا ہے | شاخ ہر گل بنی ہے پچکاری
دل عارف کی طرح کروں میں | روشنی نور حق کی ہے ساری
دامن گل کے پھیلنے میں ہے | شفق چرخ کی نمود اری
ئیں گھونگھٹ میں ہے عروس بہار | کہیں مثل بتاں بازاری
کیا عمارات خاص کا ہو وصف | جن سے شرمائے چرخ زنگاری
چوکشا جیسے آئینے کا ہوئے | ایسی عمدہ ہے چار دیواری
خوشنما ہیں عمارتیں عالی | در و دیوار پر طلاکاری
وہ جو خورشید منزل ایوان ہے | جس سے نادم بتان فرخاری
بام عالی کی نور افشانی | در و دیوار کی ضیا باری
چاند نور اقتباس کرتا ہے | صبح کرتی ہے آئینہ داری

کیا طلسمی پری ہیں تصویریں ٹو
سونے چاندی کے چوکھٹے بھاری
بوتی ہی نہیں ہیں نخوت سے
کیجئے لاکھ منت وزاری

وصف علمار

علما ایسے نامور ہیں یہاں
جن کی مداح خلق ہے ساری
حکمائے فلاسفہ کو بھی
فخر ہے اُنکی کفش برداری
وہ اطبا ہیں عیسوی اعجاز
نام سے جنکے بھاگے بیماری
فرد یکتا حکیم ابراہیم
کرے بقراط جن کی عطاری
حافظوں کا شمار حد سے فزوں
شرح کرنیں حد کی دشواری
الغرض ہیں تمام اہل کمال
صاحب منصب نمک خواری
مجمع شاعران نامی ہے
شاعری کی ہے گرم بازاری
تجر منشی اسیر اور امیر
ہمسر انوری وعطاری
طبع پاک عروج وداغ سے ہے
منفعل ابر کی گہر باری
ہے جلال وحیا وشاغل سے
محفل نظم جلوہ گر ساری
مثنوی میں حیا و خواجہ بشیر
رونق شاعری وسرشاری
ہندشاوان عیش غنی ہر دم
رہتے ہیں مدح خوان سرکاری
فارسی گو نثار شیرازی
ترزبانی میں ابر آزاری
فن تاریخ میں رسا منصور ہے
جان صاحب کی ریختی پیاری

سب سے بڑھکر منیر کو حاصل
یکتائی دہر زہ گفتاری

خوبی ترکیب میں منشی منیر اپنے ہمعصر ناسخ ورشک دونوں سے کہیں بڑھ گئے ہیں۔ پس اس سے انکی قدرتی ذہانت ولیاقت کا خداداد کا پتہ چلتا ہے۔ ہم اس موقع پر انکی چند غزلیں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

غزل

مرے دل سے جب اُنکا پیکان نکلا ۔ پکاری اجل ابتو ارمان نکلا

گئی چور کی طرح چھپ کر جوانی ۔ دغا دیکے گھر سے یہ مہمان نکلا

کسی کی جگہ تیر سے دل میں نہ رکھی ۔ نصیبوں سے یہ گھر بھی ویران نکلا

زمانے کے بیگانہ پن سے ملا میں ۔ یہی تو مرا جان پہچان نکلا

منیر آگے تا عمر کا کہنا بھی مشکل تھا
اب الحمدللہ آسان نکلا

ولہ

کعبے کے سامنے دلِ خانہ خراب تھا ۔ یہ جھونپڑا حضورِ محل کا جواب تھا

دنیائے دیں سے جسنے نکالا کھڑے کھڑے ۔ یادش بخیر وہ دلِ خانہ خراب تھا

ہشیار مست دونوں تھے ممنونِ حسنِ یار ۔ بوئے گلاب تھا کہیں کیف شراب تھا

افسانۂ شباب خدارا نہ پوچھیے ۔ دیکھا ہے جسکو جاگتے میں یہ وہ خواب تھا

دنیا و دیں کو چھوڑ کے کس سمت کو گیا ۔ ڈھونڈو وہیں کہیں دلِ خانہ خراب تھا

مہمان ایک رات رہا صبح چلدیا ۔ خوشبوئے دلہن کی ہمارا شباب تھا

کیونکر نہ ہوتی صبحِ بہشت اپنی ہڈیاں
میں اے منیر خاکِ رہِ بوتراب تھا

ولہ

دنیا سے ہے باہر دلِ دیوانہ کسی کا ۔ بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

ساقی نگہِ مست تری لڑتی ہے دل سے ۔ کیوں چور نہو نشے میں پیمانہ کسی کا

محجوب ہے کس مست کی گستاخ نظر سے ۔ شرمائی ہوئی آنکھ ہے پیمانہ کسی کا

یا رب کوئی محبوب دلِ زار اُٹھا لے ۔ رستے میں پڑا ہے دُرِ یکدانہ کسی کا
سرگشتہ ہے کونین میں کیوں پیکِ تصور ۔ عالم ہے زمانے سے جدا گانہ کسی کا
کعبے سے چلے آتے ہیں میخانہ کو باول ۔ پہونچا ہے کہاں نعرۂ مستانہ کسی کا
نیند آتی ہے ہر ایک کو آغوش لحد میں ۔ شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا
سرمست نزاکت ہو تو دل ہاتھ میں رکھو ۔ ہلکا ہے کہیں پھول سے پیمانہ کسی کا

عاشق ہوں منیرؔ اپنے ہی اندازِ سخن کا
وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

ولہ

کیا جانئے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج ۔ جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گذر آج ۔ اے بیخبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج
اے ضعف کیا تیر ستم نے تو کنارا ۔ پھر کس کے سہارے سے اُٹھے درد جگر آج
ڈرتا ہوں کہ بو خونِ تمنا کی نہ پھوٹے ۔ ہر سانس پہ آتا ہے مرے منہ کو جگر آج
غصے میں نزاکت نے کیا ہے عجب احسان ۔ وہ پھیرتے ہیں پھر نہیں سکتی ہے نظر آج
ہے آنسوؤں کا تار رگِ جانِ نزاکت ۔ آنکھوں میں مری کس کی سمائی ہے کمر آج
آہوں کا دھواں سرمۂ تسخیر بنا ہے ۔ پڑتی ہے تری آنکھ دلِ سوختہ پر آج

ہمسا کوئی نادان منیرؔ اور نہ ہو گا
کل زاد کی تدبیر ہے دنیا سے سفر آج

ولہ

اجل اس گلی میں ہو کر مری گرد کارواں آئے ۔ دمِ واپسیں سے شاید مجھے بوئے یار آئے
کبھی خواب میں خوشی سے جو وہ گلعذار آئے ۔ تو بہشت ساتھ لیکر مرے گھر بہار آئے
مری بیکسی سحر تک یہ پکارتی تھی در پر ۔ کہ سوائے نعش نہ کوئی شبِ انتظار آئے

ہ نزع کہہ رہا ہے کہ نہ ہیتے پہیروآنکہیں
تیرے ایسے بہولے پن پہ مجہے کیوں نہ پیار آئے

ولے خلش کی لذت کہ جنواں بہی ہو نہ چاٹے
مرے آبلے کے مُنہہ میں جو زبان خار آئے

ردں آہ بہی نہ مُنہہ سے جو اُڑا اسے کوئی پر سے
دلِ گم شدہ کسی پر اگر اپنی بار آئے

وئی آرزو تو پوری دلِ بے نصیب کی ہو
وہ نہ آئیں تو اجل ہی شب انتظار آئے

رے تن میں جان بنکر نہ رہوگے تم ہمیشہ
کہو عہد زندگی کا کسے اعتبار آئے

نہ ملا ترا ٹہکانا کہیں اسے منیر وحشی
در یار پر بہی اکثر تجہے ہم پکار آئے

ولہ

رے شیریں لب کو شوق صنعتِ فرہاد ہے
تیشۂ مایوس کو جائے مبارکباد ہے

چیسے اس گل کے قدم پہ ہے سر جوشِ جنوں
دستِ نازک بوسہ گاہِ نشتر فصاد ہے

لم انداز و ادا و دلفریبی بہول کر
مکتبِ الفت میں درس ہر چہ باد آباد ہے

ل شکستہ شیشے ہیں ہر جام ہے چشم پر آب
وہ پری ساغر کش خونِ دل ناشاد ہے

ہائے کیا مٹی ہوئی برباد میرے خون کی
اندنوں بیزار مہندی سے کفِ جلاد ہے

روانی میرے دل کی اب کرینگے کس کو تیر
سینۂ قاتل نشانِ ناوک بیداد ہے

س کے خنجر سے گلا کٹواؤں جا کر اے اجل
دوسرے قاتل کے قبضے میں مرا جلاد ہے

لم غلط کرتا ہے وہ دیوانگی سے اندنوں
جوشِ وحشت ضامنِ عیشِ دلِ ناشاد ہے

نب سے اسکے کان مشتاقِ پیامِ یار ہیں
آشیاں گم کردہ میرا طائرِ فریاد ہے

ہر گہڑی صورت نئی ہے کہینچ سکے تصویر کیا
صورتِ انگشتِ حیرت خامۂ بہزاد ہے

تشنہ لب جسکو سمجہتے تہے صراحی نور کی
وہ گلا مشتاقِ آبِ خنجرِ فولاد ہے

ضعف کے ہاتہوں میں بل کہاتی ہوئی نازک کمر
مثلِ نبضِ ناتواں رفتار کی روداد ہے

ہتے گلے کا ہار اسکے آنسوؤں کا سلسلہ
غازۂ رخسار گردِ خاطرِ ناشاد ہے

س لبِ نازک کو تہا بارِ تبسم بہی گراں
پائمالِ نالہ ہے جولانگہ فریاد ہے

عشق نے گو حسن کو لوٹا ہے پر باقی ہے شان
اب بھی رونق پاسبان خانۂ برباد ہے

قافیہ بھی بحر بھی دونوں بدلکر اے منیر
اُس سے کچھ کہہ جو ترے صیاد کا صیاد ہے

وله

طبیعت میرے گل کی تیری زلفوں نے پھنسائی ہے
ہما ایسا ملا ہے تیرے طالع کی رسائی ہے

بچھا دے پائے نازک کے تلے چشم نیاز اپنی
سمجھ سرمہ جو گرد راہ اُسکی ساتھ آئی ہے

خموشی شرم کی ہر اسکو کچھ کہنا نہیں آتا
وکالت کی نگاہ شوق نے تمہید اٹھائی ہے

ادہر سے کچھ لگاوٹ ہے اُدہر سے کچھ کچاوٹ ہے
ادہر سے آشنائی ہے اُدہر سے کچھ رکھائی ہے

ادہر سے التجا کی شرح ہے نیچی نگاہوں میں
اُدہر سے پاس استغنا خیال میرزائی ہے

اُدہر تیار انداز و ادا ہیں دل پھنسانے کو
ہر اک کو دوسرے سے بڑھکے لاف دلربائی ہے

نگہ کہتی ہے میں پہلے گئی ہوں پیشوائی کو
صف مژگاں نے بھی وردی سلامی کی بجائی ہے

اُدہر ہے سوجھی آنکھوں کی اپنے بس میں لانیکو
نگاہ شرم کو اس سمت عذر نارسائی ہے

کبھی ہے سحر آنکھوں کا کبھی اعجاز ہونٹوں کا
کبھی ہے قید کی صورت کبھی شکل رہائی ہے

شراب جلوہ بھر دی حسن نے مینائے گردن میں
پیالی نور کی ہر چشم میگوں نے اٹھائی ہے

کنارہ کرتی ہے بیگانگی اب دونوں جانب سے
زبان حال پر کچھ کچھ پیام آشنائی ہے

عروس گفتگو کا منہ ہے خاموشی کے گھونگٹ میں
ہنسی پردہ اٹھانے کے لئے ہونٹوں پر آئی ہے

لب رنگیں کو اُسکے نذر دیدے اپنے ہاتھوں سے
گلوری تونے جو دست حنائی سے بنائی ہے

اسی پردے میں تھیں شب کو نیاز و ناز کی شکلیں
مرقع نور کی تصویر کا تیری رضائی ہے

یہ دونوں سست غزلیں لے ارادی سینہ موزوں کیں
طبیعت اپنی قاصر ہے اسیکی نارسائی ہے

نہایت ہے منیر افسردہ دل طول اسیری سے
مدد کو یا علی آؤ دم مشکل کشائی ہے

علم منطق

جو علم انسان کو خطائے ذہنی سے بچاتا ہے، رائے کو غلطی کی گمرہی سے روکتا ہے قیاس کی تصحیح اور طریقۂ استدلال کی تکمیل کرتا ہے وہ علم علم منطق کہلاتا ہے۔

جسطرح زبانوں کے لئے علم صرف و نحو وضع ہوا ہے اُسیطرح خیالات کے لئے علم منطق موضوع ہے۔ جب علم منطق کا اصلی مقصود قیاس کی تصحیح یا یوں کہا جائے کہ عقل انسانی کی تکمیل ہے تو یہ ایک نہایت اعلیٰ اور گرانبہا مقصود ہے اسلئے کہ انسان صرف اسی عقل کی وجہ سے لقد کرمنا بنی ادم کا مصداق اور کائنات میں سب سے ممتاز ہے اور جو چیز اُس شئ کی تصحیح کرے جسنے انسان کو تمام مخلوقات سے بالاتر بنا دیا ہے وہ فی الواقع انسان کی انسانیت کے معاون، اُسکے تفوق کی محافظ، اور بے انتہا قدر کے قابل ہے۔

یہ بے بہا علم اگرچہ اپنے مقصود اور نتائج کے لحاظ سے ایک گرانمایہ علم ہے لیکن بعض حضرات اسے کج بحثوں کا آلہ سمجھتے ہیں، اپنے غلط مقدمات اور استدلال سے آدمی کو گدہا، لکڑی کو پتھر، اور آسمان کو زمین زمین کو آسمان ثابت کر دینے کا ادعا کرتے ہیں اور اسی بیجا وہ روی کو مایۂ ناز اور اپنی قابلیت کا معیار قرار دیتے ہیں ہم اسوقت ایسے فوق الانسان لوگوں سے بحث کرنا نہیں چاہتے جو شاہراہ کو چھوڑ کر خار دار جہاڑیوں کے جنگل کی خاک چہانتے ہیں اور اس بھٹک جانیکو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا ہفتخوان رستم طے کرلیا۔ لہذا اس امر کے بتا دینے پر قناعت کیجاتی ہے کہ علم منطق کے حدود عمل صرف یہ ہیں کہ نفس طریقۂ استدلال اور ترتیب مقدمات میں جو غلطی ہو اُسکی اصلاح کرے اور شکل کی ہئیات کو انتاج کے لئے آمادہ کرے لیکن مقدمات اگر فی نفسہٖ غلط ہوں تو منطق کو اس سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ جو کوئی غلط مقدمات مان لے اور انکو صحیح فرض کرے تو منطق سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ اس غلطی کی اصلاح کا ذریعہ ہے اسلئے مقدمات کے صحیح الانتاج ہونے کے لئے فی نفسہٖ انکا صحیح ہونا بھی لازم اور ضروری ہے۔

اس امر کا پتہ لگانا کہ یہ علم کب ایجاد ہوا اور اسکے ایجاد کا سہرا کس نامور سر کا سرتاج بنا نہایت دشوار ہے۔ زمانہ ایک بحر زخار کی طرح ہر وقت اپنے پیہم تموج سے ہمکو حدوث عالم اور انقلاب ایام کے عبرتناک مناظر دکھا رہا ہے تو موں کے اقبال و تنزل کے سیکڑوں جہاز اس بھنور میں آتے اور غائب ہو جاتے ہیں اور یقینی پہلو سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اُن اقوام کے علوم کیا تھے. معاشرت کیا تھی، تمدن کیا تھا، اور اُنکے عروج و زوال کے اسباب کیا کیا ہوئے، وتلک الایام نداولھا بین الناس یہی وجہ ہے کہ اکثر علوم کی ابتدا، ایجاد اور اُنکے موجد کی نسبت بھی جب سوال کیا جاتا ہے تو جواب نفی میں ملتا ہے اور امتداد و مرور ایام کے لحاظ سے اس جواب کے تسلیم کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔

تاہم یونان ان علوم کا پہلا مرکز مانا جاتا ہے اور یونانیوں میں جن حکماء کے خیالات ابتدا میں موجودات عالم کی تحقیقات کی طرف متوجہ ہوئے، اور جنہوں نے اس امر کے سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ خود کیا ہیں، اُن میں کیا کیا قوتیں ہیں اور موجودات کا موجد کون ہے اُن سب میں پہلا شخص اسقلیبوس (اسکلیپس) ہے علم طب کا بانی اور سب سے پہلے اُسکے بعض مسائل مدون کرنے والا بھی یہی اسقلیبوس مانا جاتا ہے اسقلیبوس اعظم کی نسل میں بڑے بڑے نامور حکما پیدا ہوئے جو علم منطق کے مسائل کی تدوین میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے یہانتک کہ سن ہجری سے نو سو سرسٹھ برس قبل حکیم افلاطون کے مشہور اور نامور شاگرد ارسطو نے علم منطق کی تدوین کو مکمل کر دیا اور اس لحاظ سے وہ معلم اول کہلایا۔

اُس زمانے میں ایک گروہ نے علم منطق کو صفحۂ عالم سے مٹا دینے کی نہایت گرمجوشی کوشش کے مغالطوں سے لوگوں کا دم ناک میں کر دیا اور ابطال قیاس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ارسطو نے ان ابلہ فریبوں کے رخ سے نقاب الٹ دیا اور انالوطیقا (کتاب القیاس) کتاب قاطیغوریاس (کتاب التصورات) کتاب بارمناس (کتاب تصدیقات) اور کتاب انالوطیقا الثانیہ (کتاب البرہان) وغیرہ کتابیں تصنیف کر کے علم منطق کی بنیاد کو استوار اور مستحکم کر دیا اسلئے ہم پر فرض ہے کہ ان لوگوں کے احسان کو دل سے نہ بھلائیں مگر قانون قدرت کے اقتضا نے یونانیوں کے آفتاب کمال کو بھی جہالت کی گھنگھور گھٹا میں چھپا دیا

وہ اوج ترقی سے ایسے گرے کہ گر کر پھر نہ سنبھلے اسکندریہ، انطاکیہ، بیروت، قیاریہ کی درسگاہوں میں زمانۂ دراز تک اُنکے علوم کی مشعلیں روشن رہیں اور پھر کچھ ایسی گل ہوئیں کہ آج ایک چراغ بھی ٹمٹماتا ہوا نظر نہیں آتا یونان کے علوم کی شمع اقبال کو خاموش ہوئے ایک زمانہ گذر لیا تھا کہ اسلام کے مہر نیمروز نے اُفق پر طلوع ہوکر اپنے گرد و پیش کے تمام ذرّوں کو جگمگا دیا اور اُن تمام علوم میں نئی روح پھونکدی جو قریبا مرچکے تھے۔ دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے اور علوم کے ساتھہ علم القیاس کی طرف بھی خاص توجہ کی اور اسکا نام منطق رکھا خلافت عباسیہ کا دور نہ صرف اپنے پرشوکت جاہ و جلال کے لحاظ سے بلکہ اسوجہ سے بھی کہ علوم کے ساتھہ اُن کو کسقدر شغف تھا اور اُنہوں نے کسقدر اعتنا کیا ابدالاباد تک ہم مسلمانوں کے اور تمام اقوام مستقبلہ کے لئے قابل عزت اور باعث نازش ہے اور بنی نوع انسان کو اس احسان کا ہمیشہ مشکور رہنا چاہیئے۔

علم منطق کی ابتدا اور اُسکے موجد کا حال اگرچہ تاریکی میں ہے لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس علم کی بنا قیاسات پر ہے اور قیاس ایک فطرتی چیز ہے انسان نے فطرتاً قیاس سے کام لیا اور رفتہ رفتہ علم القیاس (منطق) کی عالیشان بنیاد قائم ہوگئی مثلاً ابتدا میں انسان نے اشیاء کے حدود سمجھنے کی کوشش کی تب اُسنے بعض اشیاء کو اُنکے تشخصات خارجی سے مجرد کرلیا اور پھر جو کچھہ مفہوم رہا اُسکا نام اشیاء کی ماہیت رکھا یہانتک کہ ہر شے کی ماہیت کے سمجھنے کا یہی طریقہ قرار دیا۔

فرض کرو ایوب ایک شخص خاص لاغر اندام، متوسط القامت اور گندمی رنگت وغیرہ اوصاف سے متصف ہے اور یہ سب اُسکے تشخصات خارجی ہیں جب لاغر اندامی متوسط القامتی اور گندمی رنگت وغیرہ کو علٰحدہ کردیا تو ایوب نرا انسان رہگیا جو اُسکی ماہیت ہے۔ پس موجودات عالم میں جسقدر اشیاء کی ماہیت دریافت ہوئی اُن میں سے جتنے افراد پر پوری ماہیت صادق آئی اُن افراد کا بلحاظ ماہیت ایک ایک گروہ قرار دیا اور اُسکا نام نوع رکھا اور ایسی انواع موجودات میں سے جتنے انواع کسی ایک ماہیت میں عام طور داخل ہوسکتے تھے اُن انواع کا بھی ایک ایک گروہ قرار دیا اور اُسکا نام جنس رکھا یعنی وہ

کلی جو داخل ماہیت ہو مگر اپنے انواع سے عام تر ہو وہ جنس ہے اور جو داخل ماہیت بھی ہو اور اس کی تخصیص بھی کرے وہ فصل ہے اسیطرح جو بات موجودات عالم کے کسی ایک نوع کے افراد میں انسان جیسے پائی اسکا نام خاصہ رکھ لیا اور جو بات موجودات عالم کے متعدد انواع کے افراد میں پائی اسکا نام عرض عام رکھ لیا مثلاً کتابت ایک صفت ہے جو سوائے افراد انواع انسانی کے اور کسی نوع مخلوقات میں نہیں پائی جاتی لہذا یہ صرف انواع انسان کے افراد ہی کا خاصہ ہے یا بالارادہ حرکت کرنا ایک فعل ہے جو تمام انواع ذوی الارواح میں پایا جاتا ہے لہذا یہ عرض عام ہے۔ الحاصل یہ کہ فطرت انسانی نے اس گرانمایہ علم کے سنگ بنیاد رکھنے کی ابتدا کی پھر رفتہ رفتہ مصطلحات فن کا مصالحہ جمع ہوتا رہا یہانتک کہ یونانیوں کے صنعت کار ہاتھوں اس عالی قصر کی تکمیل ہوئی اور مسلمانوں نے اس میں طرح طرح کی گلکاریاں کرکے انواع و اقسام کے گلدستوں سے سجا دیا۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ علم منطق وہی ہے جس کی تدوین ارسطو کے جادو نگار قلم نے کی تھی لیکن فارابی کیسے ارباب کمال کی یادگاروں پر بھی زمانہ ہمیشہ دعاؤں کے پھول چڑھائیگا اور یاد دلاتا رہیگا کہ وہ مسلمان جو اسوقت زندہ درگور ہیں ان میں بھی کبھی حیات ابدی کی روح موجود تھی کاش ہماری رگوں میں پھر وہی خون جوشزن ہو کہ تقلید محض کی زنجیر و بند سے ہمیں نجات ہو ہم اپنے نصاب تعلیم کی ترمیم و اصلاح کریں اور میدان ترقی میں اپنے حریفوں سے پیچھے نہ رہیں۔ اسے میدان سعی کے یکہ تازو! ذرا چیتو زمانے کے شہسوار کی رفتار کو پہچانو اور ہمت کے صبارفتار کی باگیں اٹھا کر ان کڑی منزلوں کو طے کر جاؤ۔ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے اگر کرنا چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو کیونکہ وہ سب قوتیں جو اگلوں میں موجود تھیں تم میں بھی موجود ہیں۔ ع

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

خاکسار حکیم محمد یوسف نیر سابق طبیب ریاستہائے مالیرکوٹلہ و نوہارو وغیرہ۔ از ضلع بیڑ

ابر پر شاعرانہ خیالات مشرقی و مغربی

مشرقی خیالات

دریائے گردوں پر ابر تیرہ اٹھا چہرہ اسکا زنگیوں کی طرح کالا شب تاریک کی طرح سیاہ دیدہ عاشق کی طرح اشک ریز۔ زلف معشوق کا ہمرنگ۔ تن میں قیر آلودہ دل میں شیر آلودہ باہر سرمہ آلودہ اندر دھوئیں سے آلودہ۔ دل میں گلشن۔ تن میں زنداں۔ کبھی گردباد کی طرح ہوا میں دھوئیں کی طرح پراگندہ۔ بو کی طرح مست و آشفتہ۔ اپنی بدمستی سے غبار اڑا دے سفتہ کرائے۔ خورشید انور کو نہاں کرے اجرام فلکی کو پنہاں کرے۔ آسماں پر ماہ کو ظلمت ا دکھائے۔ لب غنچہ پر پھپولے ڈالے۔ گلشن و صحرا میں ژالہ برسائے۔ اپنے فیض سے پھولوں کو بڑھائے۔ سنبل پر طرے لگائے۔ گل کے گالوں کو خراشیدہ کرے۔ اور خط ریحاں کو تراشیدہ۔ ژالہ بیضا سے الماس گرائے۔ اطراف خارستاں کو بہارستاں بنائے۔ سمن پر سایہ ڈالے۔ دمن کو سرمایہ دے۔ چمن کو شاہد رعنا کا پیرایہ پہنائے۔ تن ہاموں پر سنبل ہی کسوت سیاہ اور ژالے سے خلعت دیبا پہنائے۔ اپنے فیض سے بوستاں میں گل دکھائے دکھائے۔ چمن کو گلہائے گوناگوں سے انگلیوں بنائے۔ لالے کے رنگ سے زمین کو زیبا اور سمن کی بو سے ہوا کو روح افزا بنائے۔ گل کو باد وزاں سے لرزاں کرے جس سے بلبل کے ہوش پراں ہوں۔ لولوے لالا کو بحار میں رواں اور قلزم میں معلق کرے۔ اژدہے کی طرح غرائے۔ دیو کی طرح دہاڑیں مارے جسکے خوف سے دل دہل جائے۔ چرخ پر خروش کرے جس سے زہرہ پھٹنے لگے۔ غرض ابر بھی عجب جوہر خیزی و گوہر ریزی کرتا ہے

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

ابر پر مغربی خیالات

ان خیالات کے سمجھنے کے لئے کچھ تھوڑا سائنس جاننا چاہئے۔

ابر کہتا ہے کہ میں دریا اور سمندر سے پیاسے پھولوں کے پاس اُنکی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی بوچھاڑ لاتا ہوں۔ دوپہر میں جو پتے سوتے ہیں اُنپر اپنا ہلکا سایہ ڈالتا ہوں۔ جب میں اپنے بازوں سے اُوس کو ہلا کر آفتاب کے سامنے پہنچاتا ہوں تو وہ ہر ایک پیارے پرند کو جو اپنی ماں کی چھاتی کے تلے آرام سے سوتا ہے جگاتی ہے۔ میں اولے برسا کر سبز کھیتوں کو سفید رو بناتا ہوں اور پھر اولوں کو گلا کر اڑا دیتا ہوں اور خود قہقہہ لگا کے گرج کے برج میں چلا جاتا ہوں۔ پہاڑوں پر برف بیزی کر کے اُنکے صنوبروں کو پریشان کرتا ہوں اور اسنے آہ و فغاں کی صدا نکلواتا ہوں۔ جب میں ہوا کے جھونکوں کی آغوش میں سوتا ہوں تو اپنے گرد سفید تکیے لگاتا ہوں۔ اپنے قصر آسمانی کے اعلیٰ برجوں پر بجلی کو بٹھا کے اپنا رہنما و ہادی بناتا ہوں اور گرج کو ایسا مقید بخیر بپا کرتا ہوں کہ وہ بیتاب ہو کر غل شور و غوغا مچاتی ہے۔ بحر و بر پر یہ میرا رہبر اپنی نرم نرم حرکتوں سے میری رہنمائی کرتا ہے۔

یہ رہنما سبزگوں سمندروں کی تہوں میں ندی نالوں پہاڑوں اور پہاڑونکی چوٹیوں جھیلوں میں جو عالم چھپا رہتا ہے اُسکی سیر کرتا ہے اور اسکے عشق کے دکھوں اور رم بازی سے کو وہ دریا میں سو جاتا ہے مگر اس کی روح جو اسکو عزیز ہے باقی رہتی ہے اور میں اسکے اس سیر کے سارے وقت میں آسمان نیلگوں کے تبسم میں دھوپ کھاتا ہوں اور اپنے رہنما کو بارش میں تحلیل کرتا ہوں

جب صبح کو آفتاب اپنے آتشیں دیدے دکھاتا ہے اور اپنے جلانے والے پروں کو پھیلاتا ہے تو وہ میرے مرکب رواں پر سوار ہو کر رواں ہوتا ہے۔ جب پہاڑ کی چوٹی پر صبح کا ستارہ جھلملاتا ہے یا زمین کو زلزلہ ہلاتا چلا جاتا ہے یا باز نیچے اُتر کر اپنے زریں پروں کی روشنی میں بیٹھتا ہے یا روشن سمندر کے نیچے آفتاب کا غروب ہونا سانس لیتا ہے اور گرم جوشی سے آرام کرتا ہے یا آسمان کے اوپر سے شام کی قرمزی پال اسپر پڑتی ہے تو میں اپنے پروں کو

سمٹکر اپنے ہوائی آشیانے میں اس طرح بیٹھتا ہوں جیسے کہ فاختہ اپنے انڈوں پر بیٹھتی ہے۔

***

چندرما کی کنیا اپنا نورانی لباس پہنے ہوئے میرے نرم اونی فرش پر جو آدھی رات کی نسیموں سے آراستہ ہوتا ہے درخشاں خراماں ہوتی ہے جہاں اسکے پاؤں کی آہٹ فرشتوں کے سوا کوئی نہیں سنتا تو وہ میرے باریک خیمے کی چھت میں چھید کرتی ہے جس میں سے ستارے پیچھے سے جھانکتے ہیں اور اپنے تئیں دکھلاتے ہیں میں انکو یہ دیکھکر کہ سنہری مکھیوں کی طرح پراں ہیں بہت ہنستا ہوں جب میں اپنے خیمے میں جو میں نے ہوا میں لگایا ہے ایسا کشادہ روزن کرتا ہوں جسکے اندر سے میری وساطت سے خاموش دریا اور جھیلیں اور سمندر پارہاے آسمانی کی طرح اوپر بلندی پر چڑھ جاتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک پر چاند اور ستاروں کا فرش بچھ جاتا ہے۔

میں آفتاب کے تخت رواں کو منطقہ درخشاں سے باندھتا ہوں اور ماہ کی کمر میں موتیوں کا پٹکا لگاتا ہوں۔

جب طوفان باد میرے پھریروں کو ایک راس سے دوسرے راس تک پل کی شکل بنکے سمندر کے تلاطم پر پھیلاتا ہے تو میں سورج کی کرنوں کے حجاب کو چھت کی طرح آویزاں کرتا ہوں۔ جسکے ستون پہاڑ بن سکتے ہیں۔

***

جب میری کرسی کے ساتھ ہوا کے قوا پا بزنجیر ہوتے ہیں تو لاکھوں رنگ سے وہ خمیدہ ہوتے ہیں اور اسکے ہلکے رنگوں کے اوپر کرہ نار متوج اور نیچے نم آلود زمین خندہ کرتی ہے میرے ماں باپ زمین اور پانی ہیں میری دایہ آسمان ہے سمندر اور ساحل سمندر میرے گذرگاہ ہیں میں اپنے تئیں بدلتا رہتا ہوں مگر مر نہیں سکتا۔

اسلئے کہ مینہ کے بعد جب آسمان کا شامیانہ صاف ہوتا ہے اور اس میں کوئی داغ دھبہ نہیں ہوتا اور ہوائیں اور سورج کی کرنیں خوب درخشاں ہوتی ہیں تو میں اپنا نیلا برج ہوائی بناتا ہوں۔

میں اپنی قبر پر چپ چاپ ہنستا ہوں اور مینہ کی خلاؤں میں اسطرح نکلتا ہوں جیسے کہ

بادل سے بچہ نکلتا ہے یا قبر سے روح نکلتی ہے اور پھر میں اپنی عمارت تعمیر کرتا ہوں۔

(ب) بادل ہمیشہ اپنی چپ چاپ حرکتوں سے اپنی حالت کو بدلتے رہتے ہیں کبھی ان میں اندھیرا ہوتا ہے کبھی کچھ اجالا۔ وہ پھولے ہوئے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں جو اپنے تئیں اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ کبھی آپس میں ملجاتے ہیں کبھی جدا ہو جاتے ہیں پھر جدا ہو کر ملجاتے ہیں اور اپنے آبی رنگ کا جوبن دکھاتے ہیں۔ اگر ہم بادلوں کو یہی جانیں کہ وہ پانی کے آنے کے راستے ہیں تو انکی حالت کے سمجھنے میں بڑی غلطی کریں اور یہ ستم کریں کہ آسمان کو بے جان بنا دیں جو شاعر آسمان کی جب وہ بالکل ابر سے معرا ہو یہ تعریف کرتے ہیں کہ اس حالت میں وہ سب سے زیادہ خوشنما اور نیک منظر ہوتا ہے وہ غلط بیانی کرتے ہیں آسمان کی تو بڑی خوبصورتی یہی ہے کہ اسپر ابر چھایا ہوا ہو۔ آسمان پر بادلونکا وہی حال ہے جو زمین پر آدمیونکا جیسے زمین پر آدمی رہتے سہتے چلتے پھرتے عورت مرد اپنا جوبن دکھاتے ہیں ایسے ہی آسمان پر بادل چلتے پھرتے رہتے سہتے اور طرح طرح کی صورتیں بدل کر اپنا حسن دکھاتے ہیں۔

(ج) بادل ہوا میں اُڑتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ کسی فرشتے نے اپنا لباس ہوا میں اڑا کر چھوڑ دیا ہے۔

(د) ابر سمندر کی تہ میں سے کسی قطرے کو نہیں چھوڑتا کہ اسکو آسمان کی سیر نہیں کراتا اور پھر اسکو زمین پر دریا بنا کے بہاتا ہے اور دریا کو سمندر میں لیجا کر قطرے کو اپنی جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔

ذکاء اللہ

از بیاض علامی میر عبد الجلیل بلگرامی عطر اللہ ضجعہ فرا گرفتہ شد

(صبایا)

ما را چو سر نوشت بخط شکستہ ہست	باز لف یار نقش درستی نشستہ است

لا یعرف

گرچه عمریست که چشم بره‌اش در راه است / بخت اگر یار شود کار بخاطرخواه است

آقا رضا

بخوبی تو سوارے بصد زین ننشست / تو تا سوار شدی فتنه بر زمین ننشست

میرزا جلال

تا کے تلاش رزق مرا دربدر کند / یک قطره آبرو چه قدر خاک تر کند

میرزا سعد الله محمد

سبک بچشم تو از شیوهٔ وفا شده ام / سزاے من که به بیگانه آشنا شده ام

سحابی

عالم بخروش لا اله الا هو ست / غافل بگمان که دشمنست این یا دوست
دریا بوجود خویش موجے دارد / خس پندارد که این کشاکش با اوست

شیخ علی نقی

هر که برخاست ازو از دگرے بهتر بود / گدایی کوی تو خاکش همه یوسف خیز است
از لبم تا بگلو گشت سیه از تف دل / چه کنم آه که آتشکده راه دهلیز است
شب که رشک انتهے هجران توے پندارم / هفت نه بال فلک بر سرم آتش بیز است
گرم عشق ست نقی چشم زدن حاجت نیست / نزنی دامن بیهوده که آتش تیز است

مولانائے روم

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

میرزا محمد مقیما

لب بستہ زحسرت طلب باش
در حضرت عشق با ادب باش

گستاخی شکوہ ہست اندوہ
فرمان رضا شنو طرب باش

خواہی کہ بروز روز باشے
شب روز کناں بکار شب باش

ساقی شو اگر نے شوی مے
گر فیض رساں نہ سبب باش

بندۂ لم یزلی علی غفرلہ
اورنگ آباد

بعض فوائد متعلق جُمَّل

اہل عرب ہمیشہ بجائے اعداد کے حروف ابجد استعمال کیا کرتے تھے مثلاً عدد مطلوب گیارہ ہے ایسی جگہ " ای " کا لفظ یا عدد مطلوب بارہ ہے ایسی جگہ " بی " بائے موحدہ ویائے تحتانی لاتے تھے الف سے ایک اور یا سے دس اور بائے موحدہ سے دو مراد ہے تاریخوں کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب نے اعداد اہل ہند سے اخذ کئے اسی لئے انکو اعداد ہندیہ کہتے ہیں۔ مذکورۂ بالا بنا پر کسی واقعے کی تاریخ کو بھی اسی ابجد کے حروف میں ادا کرنے لگے۔

بعض محققین نے حال میں ایک مشہور پرچے میں بہ جواپنی تحقیق کی رو سے لکھ دیا ہے گذشتہ ہجری یا سنہ ۹ ہجری تک ابجد کے الفاظ بے معنی سے عدد مطلوب نکالتے تھے اور بامعنی مناسب مقام الفاظ نہ لاتے تھے سنہ مذکورہ کے بعد سے عدد مطلوب کے لئے مناسب واقعہ الفاظ ابجد لانے لگے ۔ یہ کہنا انکا صحیح نہیں ہے جہانتک دیکھا جاتا ہے فارسی میں سنہ ۱۲ اور سنہ ۵۰۰ھ تک کے شعرا نے بھی الفاظ مناسب محل سے تاریخیں نکالی ہیں انشاء اللہ فرصت کے وقت میں ایسی بہت سی تاریخیں قلمبند کرونگا جو سنہ مذکورہ کی کہی ہوئی موجود ہیں ۔

علمائے فن عروض تقطیع شعر میں حروف ملفوظہ (جن حرفونکی آواز پڑھنے میں پیدا ہو) کا اعتبار کرتے ہیں برخلاف اسکے علمائے جُمل تاریخ گوئی میں حروف مکتوبہ (یعنی ایسے حروف جو کتابت میں آئیں عام ازینکہ پڑھنے میں بھی اُنکی صدا نکلے یا نہ نکلے) کا اعتبار کرتے ہیں جو تائے قرشت املا میں بشکل ہائے مدورہ (ۃ) یا ہائے مختفی (جیسے جنتہ) لکھی جائے عام ازینکہ نقطے بھی اُسپر ہوں عدد ہائے ہوز (پانچ) سے لئے جائینگے نہ کہ چار سو (یعنی تائے قرشت کے عدد نہیں لئے جائینگے جبتک کہ تاریخ کہنے والا اسکو ظاہر نہ کردے چنانچہ راقم نے ایک مسجد کی ترمیم کی تاریخ لی "ترمیم کعبۃ اللہ" اور عدد مطلوب کعبۃ اللہ کی تا کا چار سو لیا مگر چونکہ اس تا کے پانچ عدد (بہ سبب رسم الخط کے) لئے چاہیے تھے بنابریں مصرعہ یوں نظم کردیا کہ "با تائے کعبہ گفتم ترمیم کعبۃ اللہ"

باینکہ اظہار تا کا پڑھنے میں پوری طرح سے ہوتا ہے مگر جب تک کتابۃً اسکا اظہار نہ کیا جاتا پانچ ہی عدد اسکے لئے جاتے ۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ لفظ اور رسم الخط میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً حتےٰ و عیسےٰ وغیرہ کہ الف پڑھا جاتا ہے مگر رسم الخط یائے تحتانی کے ساتھ ہے یا مثلاً حمزۃ و طلحۃ کہ پڑھنے میں تا کے ساتھ اور تحریر میں ہائے مختفی کے ساتھ لکھا جاتا ہے بعض محققین نے الفاظ مذکورہ میں رسم الخط کا اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ ملفوظ کا اعتبار کیا ہے تاہم متاخرین نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ "ھذا القول نادر واحد" مطلب یہ کہ رسم الخط ہی کا اعتبار کرینگے نہ کہ ملفوظ ہونیکا ۔ فقط

"بعض اساتذہ شعرائے ہندوستان"

حکیم بیگ خاں حاکم تخلص لاہوری اساتذہ شعرائے فارسی زبان میں تھے اوائل عہد فردوس آرام گاہ محمد شاہ بابری شاہنشاہ دہلی میں (غالباً سنہ ۱۱۳۳ ہجری میں) لاہور سے دارالسلطنت دہلی میں آئے اور اراکان شعرائے عصر میں محسوب ہوئے منصب امارت وخطاب خانی سے ممتاز کئے گئے۔ انکا زمانہ اور شیخ نور العین واقف متوطن پٹیالہ کا ایک زمانہ ہے اور دونو نکے آپس میں نہایت ربط بہی تہا۔ واقف بہت بڑا صاحب کمال شاعر اور فقیر منش تارک دنیا تھا ہمیشہ ایک کمبل اوڑہے سر کہلا ہوا داڑہی اور سر کے بال الجھے ہوئے اور پریشان ایک کاٹھہ کا کرشتہ بطور فقیرونکے لٹکائے اپنے دیوان کو بغل میں دابے اسی حالت سے ہمیشہ سیر و سیاحت وعزلت میں بسر کرتا رہا۔ شیخ المتاخرین علی حزین جیلانی اُس زمانہ میں ترک سیاحت کرکے بمقام بنارس تکیہ موسومہ فاطمان میں مقیم تہے۔ ہمیشہ ایک چاندی کے پائے کی پلنگڑی پر بیٹھے اپنی تکمیل میں مشغول رہا کرتے تہے کیسا ہی امیر و حاکم وقت ملاقات کو آئے اپنی پلنگڑی پر اسکو جگہ نہ دیتے تہے فرش پاک ہی پر وہ بیٹھہ جاتا تہا مختصر باتیں اُس سے کرکے اپنے کام میں منہمک ہوجایا کرتے تہے۔ انکی عالی دماغی کا یہ حال تہا کہ فردوس آرام گاہ نے کئی دفعہ پیغام بہیجا کہ عہدۂ وزارت قبول کرلیں مگر انکار کیا اور اپنی جگہ اسباب کو ظاہر کردیا کہ یہ سلطنت اب نقش برآب ہے بجز بدنامی کے اس وزارت میں اور کیا دہرا ہے۔ غرض پہرتے پہرتے واقف موصوف اُسی حالت سے کہ پاؤں میں کیچڑ بہری تہی اور بال اور چہرہ خاک آلود تہا شیخ کے پاس آیا اور صاحب سلامت کرکے جس پلنگڑی پر شیخ بیٹھے تہے بے تکلف اُسی پر بیٹھہ گیا۔

شیخ نے متعجب ہوکر پوچہا از کجائی (یعنی کہاں وطن ہے) واقف نے جواب دیا کہ از پٹیالہ پہر شیخ نے پوچہا کہ از واقف واقفی (یعنی واقف سے واقف ہو) جواب میں کہا کہ بلے واقفم۔ (یعنی ہاں واقف ہوں) شیخ سمجھہ گئے بڑے تپاک سے ملے اور برخلاف عادت شعر پڑہنے کو کہا۔ واقف نے آنکھوں میں آنسو بہر کر یہ غزل پڑہنی شروع کی۔ ؎

ہر غنچہ شگفت لا دل من | ای وادل من صد وادل من
یارب چہ سازد باسنگ طفلاں | نازک دل من مینا دل من

شیخ نے گلے سے لگالیا اور خود بہی خوب روئے۔ حاکم جنکا نام عنوان میں لیا گیا مع واقف پٹیالوی

بہ عزم حج و زیارت مدینۂ طیبہ ہندوستان سے روانہ ہوکر اورنگ آباد دکن تک پہونچے تھے کہ رستے میں واقف سخت علیل ہوکر وہیں رہ گئے اور چونکہ موسم قریب تھا حاکم بندر سورت پہونچکر جہاز پر بیٹھکر جلد روانہ ہوئے جب تک حاکم مشرف بہ حج و زیارت ہوکر پھر ہندوستان اور اورنگ آباد میں واپس نہ آئے واقف یہیں قیام گزین رہے۔ واقف کو کیمیا بنانیکا بیحد شوق تھا امرا ے عہد سے جو فتوحات ہاتھ آتے تھے اور غالباً اُس کی مقدار ہزار ہا روپیہ تھی سب کو نسخہ آزمائی میں صرف کردیا کرتے تھے تعجب تو یہ ہے کہ ایسا آزاد منش باکمال تارک دنیا اور کیمیا بنانے کی دھن میں یوں منہمک ہوجائے۔ غرض حاکم اور واقف پھر بہ راہ برار وچھتر پور عازم وطن ہوئے۔ رستے اُس زمانہ میں لٹ رہا تھا یہ دونوں بزرگ بھی لٹ گئے یہاں تک کہ روپیوں پر کیا منحصر ہے کوئی چیز پاس نہ رہی کسی طرح سے گرتے پڑتے بالاپور پہونچے اب یہ سبب بے اُلگی کے آگے جانا دشوار تھا اورنگ آباد میں میر غلام علی آزاد بلگرامی بعض مناصب پر ممتاز تھے کسی قاصد کو اچھے کے اسکے پاس طلب خرچ کے لئے روانہ کیا چونکہ بجز تھوڑے سے سیماب کے (جو اسی کیمیا کے شوق کی بدولت ساتھ تھا) اور عینک کے اور کوئی چیز پاس نہ بچی تھی یہ مطلع فی البدیہہ کہکر خط میں درج کیا۔

عینکے باپارہ سیماب باما ماندہ است
چشم بیخواب ودل بیتاب باما ماندہ است

اس مطلع کی خوبی واقفان فن سے مخفی نہیں ہے غرض ہندوستان میں ایسے ایسے باکمال گذرے ہیں کہ اگر اُنکی حکایات درج ہوں تو دیکھنے والے وجد کریں مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی خود اُنکے حالات سے ناواقف ہیں اور یہ بھی ولولہ نہیں ہے کہ اُنکے حالات سے واقف ہوں حالانکہ اگر تاریخ کی کتابوں میں تلاش کیا جائے تو قریب قریب سب صاحب کمالوں کے نام ونشان (کم وبیش ہی سہی) مل سکتے ہیں کاش کوئی جامع تذکرہ اُن ہندستانی باکمالونکا جمع ہوجاتا ہوتا افسوس یہ ہے کہ جو لوگ ایسی محنتوں اور ریاضتوں کے عادی اور بخوبی اس عمدہ کام کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ اُنکو اور اور ضروری تصنیفوں سے فرصت ہے اور نہ زمانہ کی ناقدرشناسی اُنسے یہ کام لیتی ہی رہے دوسری قسم کے اہل قلم تو اُن کو

یہ دماغ کہاں کہ محنت گوارا کر سکیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خاکسار۔ سید علی محمد شاد

رکابی مذہب

مذہب بھی دو قسم کے ہیں ایک تو آبائی یا اختیاری جسکو اسنے بخوشی قبول کیا ہے دوسرا دوسرا طبعی یا ذاتی جسکو اس کی طبیعت نے اپنی پسند سے مان لیا ہے اور وہی اسکو دل سے بھاتا ہے۔ اسی پچھلی طرز کا مذہب یعنی رکابی مذہب بہت آسان رہے۔ اس مذہب کا کوئی پیغمبر نہیں خدا بھی کوئی نہیں۔ ہاں معبود ضرور ہے وہ مطلب کے نام سے پکارا اور مانا جاتا ہے۔ یہی مذہب اُنکے لئے آسان ہے اور یہی انکی روح اور جسم کو پورا پورا آرام دیگا۔ کیونکہ اس میں نہ تو نماز فرض ہے اور نہ روزہ۔ اسکا کلمہ یہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر مطلب اور موقعہ بیشک اسکا نائب ہے۔ اس کی کتاب کتاب الغرض اور اسکے بانی آرام علیہ السلام ہیں۔ اس مذہب کا فلسفہ بھی بہت وسیع ہے۔ جس کام کو چاہو اسکے اصول موضوعہ سے پورا کرلو اور اسکا بڑا مسئلہ یا اصول یہ ہے کہ (اب تو آرام سے گذرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے) جس مذہب میں اتنی آزادی ہو کہ جو چاہو کرو اور جس طریقے سے چاہو پورا کرو وہ کیوں نہ آرام کا خزانہ اور آزادی کا بحر اعظم ہو۔ ضروری اور یقینی ہے۔

مگر شاید کسی کو خیال ہو کہ یہ جدید مذہب ہے۔ اسکا کیا ٹھیک۔ ممکن ہے اسکے عقائد بالکل وہم اور خیال پر قائم ہوں۔ نہیں نہیں یہ بہت قدیمی ہے۔ اس کی بدولت انسان نے ہر جگہ کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ آجکل ہندوستان میں اسکا زور ترقی پر ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ نہ تو کوئی انجمن ہے نہ سماج لیکن اس کی ترقی اور اشاعت آفتاب کی گردش ستاروں کی حرکت اور دریا کی روانی کی طرح ہوتی ہی جاتی ہے اور کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ اور وہ ہوتی کس طرح سے ہے مثلاً ٹمپرنس (پرہیزگاری) کا چرچا اور اس کی عام شہرت

ہے تو چلئے وہاں پیش ہیں۔ کانگرس کی شرکت سے عزت نصیب ہوتی ہے تو اب وہاں کی سمائی ہے افسروں کی خوشامد سے اپنی بازی بنتی ہے تو لیجئے یہاں بھی ایمان اور ضمیر کی ڈالی لگا سب چپراسی پرستی ہو رہی ہے قومی جلسوں کی شرکت بھائی برادری میں احسن سمجھی جاتی ہے تو وہاں بھی کود پڑے کہ یہ چاہئے وہ چاہئے۔ پردے کے خلاف ہونے میں جدید زمانے کے بہترین رہنماؤں اور اعلیٰ خیال ہمدردوں میں شمار ہوتے ہیں تو وہاں بھی مستعد ہیں۔ غرضکہ کس کس شغلے کا نام لیا جائے۔ زندگی کے ہر کام اور ہر معاملے میں ادنیٰ اور اعلیٰ ذاتی یا قومی ملکی یا انسانی مذہبی یا دنیاوی۔ سب جگہ یہی نیت ہے کہ جس کی گرم بازاری دیکھو اور جہاں فائدہ دیکھو بس اسی کا کلمہ پڑھو اور اسی پر جان دو۔

یہی مذہب یہی شائستہ طریقہ یہی رکابی مشرب یہی بیٹر یا چال ہندوستان میں پھیلی ہے اور خوب زور پر ہے۔ اوروں میں ہو یا نہ ہو ہندو مسلمانوں میں تو اس کی خاصی ترقی ہے۔ اور اسکا فلسفہ اچھی طرح سمجھا اور عمل میں لایا جاتا ہے اپنی ذات خاص سے تو یہ جلسے یہ کام بُرے نہیں ہرگز بُرے نہیں مگر جس قوم میں یہ مذہب پھیلا ہو اور اچھی طرح پھیلا ہو اسکے سدھرنے کی کیا امید۔ کیا بھروسہ۔ صرف اس قومی کام پر موقوف نہیں۔ زندگی میں ہزاروں مرحلے پیش آتے ہیں اور سب میں کامیابی کی امید ضرور کیجاتی ہے۔ کیا کامیابی اس فرضی طریقے سے ہوتی ہے۔ ہو۔ شاید یہ مذہب موصوف کا ضمیری اطمینان ہو جو معتقدوں کے دل میں گھر کئے ہو۔ ہاں حقیقی کامیابی ایسی جھوٹی باتوں سے نہیں ہوتی۔ جھوٹی شہرت۔ جھوٹے ارادے۔ بیوفائی۔ یہ سب اس مذہب اور اس مشرب کے شگوفے ہیں۔ جو طلب صادق سے کوسوں دور ہیں۔

طلب صادق کی شان یہ ہے کہ دل میں سچائی۔ مضبوطی۔ عزم بالجزم۔ نتیجے کی پروا شہرت سے کام نہیں۔ ضمیری اطمینان اور خدا کا خیال ہو یہ سب شرطیں ہیں جو آدمی کو رہ مقصود بتاتی ہیں۔ انسان کے اس ورثے کو جس میں بہترین نسل اور اولوالعزموں کے کارنامے محفوظ ہیں ذرا اٹھا کے دیکھو کہ عمر بھر اپنے ایمان۔ اپنے ضمیر۔ اپنے ارادے اور سچے ارادے پر ڈٹے رہے۔ سر فروشی کی۔ دنیاوی آرام اور نفاستوں سے دور رہے۔ کس کی خاطر؟ شہرت کے لئے نہیں۔ مطلب برآری کے لئے نہیں۔ اپنے فرض کے لئے اپنی اُس زندگی

کے لئے جسکو وہ ایک دفعہ دل میں جگہ دے چکے جس بات کا وہ ارادہ کر چکے اور جس کام میں آ
لگا چکے اسکے لئے گلے کٹوا سے۔ اسی کی یاد میں مرے جسکو اپنے دل میں عزیز کر چکے اور اسی
کے لئے عمر بھر کوشش کرتے رہے جسکو وہ اچھا سمجھتے ہے۔ یہ انسانیت اور حمیت سے
کہیں دور ہے کہ آج تو ایک شخص، قوم یا کسی خاص تحریک کا ساتھ دیں اور کل اسکو چھوڑکر
دوسرا رنگ اختیار کریں جہاں ہماری ذاتی واہ واہ ہو وہاں تو فوراً جا و ہمکیں اور جہاں آزمائش
اور مردانہ ہمت کا امتحان ہو وہاں سے کھسکیں اور چٹ دوسرے رنگ میں ہو رہیں۔ یہ وہ
خراب عادت ہے اور یہ وہ گناہ ہے جسکا مارا جسکا مرتکب نہ تو اچھا ہوتا ہے اور نہ کہیں بخشا جاتا
ہے۔ قوم کی قوم۔ ملت کی ملت۔ ملک کا ملک اسکے پیچھے برباد اور تمام جامہ انسانیت اس کی
خرابی سے آلودہ۔ انگریزی قوم جس کی مثالیں آجکل زیادہ روشن ہیں ایسے لوگوں سے بھری
ہے جو اپنی پختگی اور ارادے کی مضبوطی کے لئے مشہور اور انتہا درجے کے ہر دلعزیز ہیں۔ قوم
ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ وہ رہنما اور بڑے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ امریکہ کے مشہور
پریزیڈنٹ مسٹر روزویلٹ کا قول ہے کہ آدمی کے پورے آدمی بننے سے عمدہ چال چلن اور
روش اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے یہ نہیں کہ جدھر کچھ لوگ ہیں آؤ اسی طرف کی راہ
لیں۔ عام طور سے یورپ اور امریکہ میں قول و فعل کی طرف توجہ کیجاتی ہے کہ اس معاملے میں فلاں
کیسا ہے۔ اور یہی ان لوگوں کا اقبال اور یہی انکا جاہ و جلال ہے کہ وہ اپنے قول کے سچے خود اپنی
دل کے باوفا اور خود اپنے ارادے کے پکے اور اپنی دھن میں ایک ہیں ادھر اپنے یہاں یہ دیکھتے ہیں کہ آج
کسی نے یہ کام اٹھایا کل اسکو چھوڑ چھاڑ دوسری کی راہ لی فلاں معاملے میں قوم نے اسکا بھروسہ کیا۔ اور وہ آج کسی دوسرے
خیال میں ہے نہ تو وہ دلچسپی ہے اور نہ وہ مستعدی ہے۔ ہزاروں آدمی ایسے دیکھے
جاتے ہیں جو خدا کی قسم اللہ کی قسم۔ امام کی قسم کھاتے ہیں۔ وعدے پر وعدہ کرتے
ہیں اور دل میں مطلق پروا نہیں کرتے کہ ہمنے کیا کہا ہے اور ہمکو کیا کرنا ہے۔ جزوی معاملے
میں بہت سرگرمی ہے مذہب کی اصلیت یعنی اصلاح عادات اور روش کی تھوڑی سی
بھی پرواہ نہیں چاہتے کہ اس رکابی مشرب کو چھوڑیں۔ وہ مشرب اور وہ مذہب اختیار
کریں جسمیں پختگی۔ مردانہ ہمت۔ صدق و صفا اور خلوص نیت کا عملی نتیجہ ظاہر ہو۔

بات ہو تو ایک ہو۔ کام ہو تو مہتم بالشان ہو۔ جمعیت ہو تو کوہ ہو۔ ارادہ ہو تو مستقل ہو دل ہو تو صاف ہو۔ پھر جس جلسے کی شرکت کریں گے وہ ہمارے دم سے سرخرو ہوگا۔ اور جہاں ہمارے قدم پڑینگے وہیں سے مرحبا اور واہ واہ کی آوازیں آئیں گی ؛

نذیر ہاشمی غازی پوری

تنقید

مصباح القواعد

اُردو زبان کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے اِس بات کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسکے صرف نحو کے قواعد نیز املائے اُردو کے ضوابط ایسی مکمل صورت میں منضبط کر دیئے جائیں کہ ہر حصہ ملک کا رہنے والا اُنپر بھروسہ کر سکے اور اسلیئے اون کی پیروی کو بھی ضروری خیال کرے۔

ممکن ہے کہ اِس امر اہم کی نسبت کوشش کو بعض لوگ تضیع اوقات خیال کریں اور اڈیٹر صاحب عصر جدید کے ہمزبان ہوکر کہنے لگیں کہ ہمکو اس سے کیا کہ "رتھہ آتی ہے" صحیح ہے یا "رتھہ آتا ہے"۔ "میں نے جانا صحیح ہے" یا "مجھکو جانا ہے"۔

لیکن کیا یہ امر افسوس کے قابل نہیں ہے کہ ہم لوگ انگریزی گرامر کے تو ہر قاعدے کی پابندی کو اپنے اوپر لازم سمجھیں اور بعض ہم معنی الفاظ کے درمیان نازک سے نازک اور باریک سے باریک فرق کے امتیاز کو ضروری خیال کریں۔ لیکن اُردو زبان کے اہم سے اہم قواعد کی تحقیق کو بھی فعل عبث قرار دیں۔

اور کیا یہ بات صدہزار افسوس کے لایق نہیں ہے کہ اہل بنگال صرف ان

چند الفاظ کی تصحیح املا کے واسطے، جو عربی اور فارسی سے ان کی زبان میں شامل ہو گئے ایک خاص کمیٹی مسٹر مترا حیدر آبادی کے ماتحت قائم کریں، اور ہم لوگوں میں سے ہر ایک کا طرز املا بہت سے الفاظ میں جداگانہ ہوا ور اس اختلاف کی جانب کسیکو توجہ بھی نہو۔

ہمارے نزدیک اِن تمام ابتریوں اور اختلافوں کی بنا اِس پر ہے کہ اُردو زبان کے قواعد کی کوئی مستند کتاب موجود نہیں ہے۔ جو جس کے جی میں آتا ہے لکھتا ہے اور اپنی غلطیوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے خود ہی دلیلیں بھی قایم کرتا ہے۔

مثلاً اُردوی معلیٰ میں زبان کے متعلق۔ جتنے اعتراض شائع ہو چکے ہیں انہیں سے بعض ایسے تھے جنکی نسبت تاویل نا ممکن تھی لیکن محض کسی مستند کتاب قواعد کے نہونے کے باعث سے بعض دلیر لوگوں نے اُن کے رفع کرنے کی بھی صورت پیدا کرلی۔ اور خود قائل ہونے کے بجائے معترض کو قائل کرنے لگے۔ خیر۔

نظر بریں حالات مولوی فتح محمد صاحب جالندھری کی کوشش اور محنت قابل داد ہے جنہوں نے بکمال عرقریزی و تحقیق، قواعد اُردو کی ایک مبسوط کتاب **مصباح القواعد**[1] نام تصنیف کی اور ایک حد تک ملک کی ایک شدید ضرورت کو پورا کیا۔ اِس کتاب کو انجمن ترقی اُردو کی تحریک پر میر ولایت حسین صاحب بی۔ اے۔ منیجر الفرض بک ڈپو علیگڈھ نے چھپوا کر شائع کیا ہے۔

قابل مصنف نے شروع میں چند برگزیدہ لوگوں کے نام اور اُنکی رائیں درج کی ہیں جنہوں نے اشاعت سے پہلے اِسکو دیکھا اور پسند کیا تھا۔ چنانچہ مولوی سید ممتاز علی صاحب اڈیٹر تالیف و اشاعت، شمس العلما مولوی شبلی نعمانی، جناب مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی اور مولوی عبد الغنی صاحب عظیم آبادی نے، مصنف کی محنت اور تلاش کی داد دی ہے۔ مولوی عبد الغنی صاحب نے اپنی تحریر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "چونکہ یہ کتاب زبان اُردو کی بنیاد قرار دیجائے گی

---

[1] مصباح القواعد تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ حجم ۲۹۰ صفحے۔ عمدہ کاغذ پر خوشخط چھپی ہوئی ہے قیمت (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔ ڈیوٹی۔ بک ڈپو۔ علیگڈھ سے مل سکتی ہے۔

اسلیئے انجمن ترقی اُردو کا فرض ہے کہ اسپر نہایت غائر نظر ڈالے اور اسکی کسی فروگذاشت نقص یا تسامح سے گو وہ خفیف ہی کیوں نہو چشم پوشی نکرے۔ کیونکہ ؎

خشت اول چون نہد معمار کج ‎ ‎ ‎ تا ثریا میرود دیوار کج "

لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے انجمن مذکور کے کسی رُکن نے اسکو احتیاط سے اور تامل کے ساتھ نہیں دیکھا ہے اور اگر دیکھا ہے تو تعجب ہے کہ اِس میں ایسی غلطیاں کیوں رہ گئی ہیں جنکے ہوتے ہوئے ہم اسے مستند نہیں کہہ سکتے۔

ہمنے اِس کتاب کو سرسری ہی طور پر دیکھا ہے۔ لیکن اسپر بھی اِس کے ہر باب میں غلطیاں اور کمزوریاں پائیں جن میں سے بعض کو یہاں درج کرتے ہیں:-

(۱) مصدر کے بیان میں لکھا ہے کہ جب مصدر کے ساتھ ایسا مونث واقع ہو جو اسکا اور اسکے مشتقات کا مفعول ہو سکے تو علامت مصدر کا الف یائے معروف سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً، روٹی کھانی۔ کتاب پڑھنی۔ کوشش کرنی۔

حالانکہ یہ درست نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مصدر کا تعلق ہے، عام اس سے کہ وہ مفرد ہو یا مرکب، "نا" علامت مصدر میں کسی حالتمیں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ مشتقات میں البتہ مذکر و مونث کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔ کہینگے۔

"فقیر کو روٹی دینا ثواب کا کام ہے،، یہاں پر "روٹی دینی" کہنا اگر غلط نہیں ہے تو غیر فصیح ضرور ہے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ "زید نے فقیر کو روٹی دی۔ یہاں "روٹی دیا،، کہنا غلط ہے۔ اگرچہ پورب مثلاً نواح گورکھپور و غازی پور کی یہی زبان ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ "کوشش کرنی" بھی بولتے ہیں۔ لیکن اسکی نسبت قاعدہ کلیہ بنانا بیجا ہے۔ کیونکہ بعض لوگ اِس قاعدے کی پابندی کے خیال سے بعض وقت اِس قسم کے مصادر کا نہایت ناگوار استعمال کرتے ہیں۔ مصحفی کا ایک لاجواب مطلع ہے

؎ ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا ✣ کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ہمنے اسکو ایک لایق اور مشہور زبان داں گریجویٹ کی زبانی اسی قاعدے کی

بدولت اس طور پہ سناتا ہے ؎

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنی — کبھی اس سے بات کرنی کبھی اس سے بات کرنی

اہلِ بینش پر روشن ہے کہ خوبی شعر میں "کرنی" سے کسقدر کمی آگئی ہے - ۱۱
علاوہ بریں مصادر جعلی کی بحث میں مثال کے طور پہ اسپیچ کرنا اور بحثنا - لکھنا ہے حالانکہ اسپیچ کرنا غلط ہے اور بحثنا اب متروک و مشکوک ہے۔

---

(۲) ضمائر کے بیان میں "اپنا" کی بحث اور حالت اضافت کی مثالوں میں لکھتے ہیں

اسکی اپنی کتاب تھی — اوسکا اپنا قلم تھا
تیرا اپنا تھا۔ — تمہارا اپنا تھا
میرا اپنا تھا — ہمارا اپنا تھا

حالانکہ اظہار خصوصیت کے واسطے "اپنا" کا استعمال بالکل غلط اور خلاف محاورہ زبان ہے۔ یہ غلطی اخبار والوں کے ذریعے سے رائج ہوئی ہے۔ اور پنجاب۔ ولواح پنجاب میں اسدرجہ عام ہوگئی ہے کہ اُدہر کے بعض اہلِ زبان بھی اسکو نادانستہ استعمال کرجاتے ہیں۔

مثلاً ایک لاہور کا اخبار لکھتا ہے "یادگار آفس لاہور کی اپنی مطبوعہ و مصنفہ کتابیں"، یا جیسا کہ مولوی فتح محمد صاحب لکھتے ہیں "ہمنے ہُدہُد کے کلام سے اسلیے استثنا کیا ہے کہ وہ یا تو عیش کا اپنا نتیجہ طبع ہوتا تھا یا الخ"

"میری اپنی رائے" کے بجائے "میری ذاتی رائے" چاہیئے۔ اور "عیش کا اپنا نتیجہ طبع ہوتا تھا" کے بجائے "خود عیش کا نتیجہ طبع ہوتا تھا" چاہیے۔ اور مصباح القواعد کی مذکورہ چھ مثالوں میں اپنی کے بجائے خاص اسکی کتاب، خاص تیرا قلم وغیرہ

غرضکہ "اپنا" کا اس قسم کا استعمال قطعاً غلط ہے۔ لیکن صاحب مصباح القواعد اسکے جواز کی سند میں غالب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

میرا اپنا جدا معاملہ ہے — غیر کے لین دین سے کیا کام

حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس شعر میں "اپنا" سے تخصیص کا مطلب

نہیں ادا کیا گیا ہے۔ بلکہ زور "میرا" کے لفظ پر ہے اور "اپنا" دوسرے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جنکا تعلق ایک خاص محاورے سے ہے۔ مثلاً زید، عمر سے ساتھ چلنے کو کہے لیکن عمر زید کے اصرار پر بھی انکار کیے جائے اسوقت زید کہیگا کہ "تم ہمارے ساتھ نہ چلوگے تو کیا ہوگا ہم آپنے اکیلے ہی چلے جائینگے"

اس قسم کے موقعوں پر "آپنا" اور "اپنے" کا استعمال مشکل سے کسی قاعدے کی تحت میں آسکتا ہے۔ بہرحال ہمنے جہاں تک تحقیق کی یہی دریافت ہوا کہ اہل زبان کے نزدیک "اسکا اپنا قلم" نیز "اپنا مکان" بالکل غلط ہیں۔ تعجب ہے کہ مولوی علی حیدر صاحب اور مولوی شبلی نعمانی صاحب نے کیوں یہ اعتراض کیا۔

---

(۳) اسم اشارہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ "نظم میں کبھی وہی اور یہی کے بجائے "وہ ہی" اور "یہ ہی" بھی استعمال کرلیتے ہیں"۔ حالانکہ یہ الفاظ قطعاً متروک ہیں

---

(۴)۔ اسم مصغّر کے بیان میں لکھتے ہیں کہ مکھہ سے مکھڑا اور بچے سے بچونگڑا ہماری سمجھہ میں نہیں آتا کہ مکھڑے میں تصغیر کی کونسی شان پائی جاتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچونگڑا کس ملک کی بولی ہے۔

---

(۵) مذکر و مونث کی بحث کی نسبت ہمکو اس کتاب میں زیادہ تفصیل کی امید تھی۔ لبصورت موجودہ مصباح القواعد کا یہ حصہ بالکل نامکمل ہے۔ علاوہ بریں اسمیں غلطیاں بھی بہت ہیں۔ مثلاً قواعد تانیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ

(۱) کہیں مذکر کے الف کو یائے معروف سے بدل دیتے ہیں مثلاً چلاہا جلاہی۔ یہاں مثال غلط ہے جلاہا جلاہن بولتے ہیں۔

(۲) رائے مہملہ آخر میں ہو تو یائے معروف زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے سنارے سناری - لہار - لہاری - کہار - کہاری - چمار - چماری - یہاں بھی مثالیں غلط ہیں

چھاؤن وغیرہ بولتے ہیں۔ حلال خوری میں البتہ اختلاف ہے۔

بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے ذکر میں لکھتے ہیں۔
(۲) اُردو میں چند لفظ جنکے آخر میں الف ہے مونث بولے جاتے ہیں۔ مثلاً مالا۔ گھٹا الخ
یہاں مالا مذکر ہے یا کم از کم مختلف فیہ۔
(۲) جو عربی مصدر افعال۔ انفعال۔ افتعال۔ کے وزن پر آتے ہیں وہ باستثنائے چند مذکر ہیں مثلاً۔ اقدام۔ انعام۔ انحصار۔ انکسار۔ اقتدا۔ اقتضا۔ الخ
یہاں اقتدا مذکر نہیں ہے۔ بلکہ مونث ہے۔"
(۳) دہی کی بابت لکھتے ہیں کہ اہل لکھنؤ مذکر بولتے ہیں اور اہل دہلی مونث حالانکہ غالباً اہل دہلی بھی دہی کو مذکر ہی بولتے ہیں۔"

علاوہ ان اغلاط کے وہ جو ہمنے پہلے لکھا ہے کہ تذکیر و تانیث کا باب نامکمل ہے اسکی ایک چھوٹی سی دلیل یہ ہے کہ مصنف نے اس ضروری اور اہم قاعدے کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے کہ بعض عربی الفاظ جو بحالت وحدت مونث ہوتے ہیں وہ بحالت جمعیت مذکر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً۔

وجہہ تھی اور وجوہ تھے۔
شرط منظور کی اور شرائط منظور کئے
منزل طے کی اور منازل طے کئے

ممکن ہے کہ ہمنے جو کچھہ اوپر لکھا ہے اسکا کچھہ حصہ دہلی و لکھنو کے اختلاف کی بنا پر بھی ہو۔ لیکن اس حالت میں بھی اعتراض قایم رہے گا۔ کہ زبان لکھنؤ کی رعایت کیوں نہ کی گئی۔ جسکی وجہ سے اہل لکھنو اِس کتاب کو ہرگز مستند نہیں سمجھہ سکتے

---

(۶) منصرف وغیر منصرف کی بحث بھی ناقص اور الجھی ہوئی ہے۔ اور بعض موقعوں پر مشکوک ہے۔ مثلاً "کریا" کو غیر منصرف لکھا ہے حالانکہ "کریے کا سبق" بھی بولتے ہیں۔ اور یہ اسلیئے کہ کریے کا نام مشہور عام ہوگیا ہے۔

یا اڑدھا اور سودا (بمعنی جنوں) کو غیر منصرف بتایا ہے حالانکہ یہ دونوں منصرف ہیں۔ اگر کسی شاعر نے بضرورت قافیہ "سودا کا" بھی لکھا ہو تو اسکی سند نہیں کیونکہ شاعر بعض اوقات مجبور ہو جاتا ہے۔ مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں۔

دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

ظاہر ہے کہ اس شعر کی سند پر تقاضے کو غیر منصرف قرار دینا درست نہیں ہے۔

---

(۷) مفعول مالم یسم فاعلہ کی بحث ناقص اور بعض موقعوں پر بکلی غلط ہے۔ مثلاً "اسکو بڑی بیرحمی سے قتل کیا گیا" کو مولوی صاحب صحیح بتاتے ہیں حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ مفعول مالم یسم فاعلہ، مفعول قائمقام فاعل ہوتا ہے اور اس لیے اس کے ساتھ علامت مفعول کا لانا خطا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ "زید نے بکر کو قتل کیا" یہاں بکر مفعول ہے اسلیئے اس کے ساتھ کو علامت مفعول صحیح ہے۔ لیکن جب ہم اس مضمون کو دوسرے طور پر ادا کریں اور کہیں کہ "بکر قتل کیا گیا"، تو بکر قائم مقام فاعل ہو جائے گا۔ اور اسلیئے "بکر کو قتل کیا گیا" کہنا سخت جہالت ہے +

ہم نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے تمام اخبار و رسالہ نویس اس غلطی میں مبتلا ہیں اور اسپر بضد قائم رہنا چاہتے ہیں۔

اور اسپر طرہ یہ ہے کہ مصنف مصباح القواعد بجائے اس کے اس غلطی سے انکو آگاہ کریں اُلٹے جواز کے فتوے دیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض عوام کا یا بہ تقلید عوام بعض خواص کا طرز گفتگو وہی ہو جسکی نسبت مولوی فتح محمد صاحب جواز کا فتوی دیتے ہیں لیکن ہم دریافت

کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کی غلط گفتگو کی بنا پر، کیا کسی مصنف قواعد کو یہ مناسب ہے کہ ایک نیا قاعدہ بنا کر واقفوں کو شبہے میں ڈالے اور ناواقفوں کو اور بھی گمراہ کرے +

ہمنے اِس باب میں خاص تحقیق کی غرض سے فسانۂ عجائب و باغ و بہار کو شروع سے آخر تک ایک ایک حرف پڑھا اور بہت سی مستند نثر کی کتابوں کے علاوہ قواعدِ اُردو کے بہت سے قدیم و جدید رسالے دیکھے نیز مستند اساتذۂ اُردو کے دواوین کو بھی دیکھا لیکن کہیں اِس قسم کے غلط فقروں کی مثال نہ ملی +

بلکہ جن فقروں میں اِس قسم کی غلطیوں کا ہونا ممکن تھا اُن کو ہم نے چھانٹ کر غور کیا تو معلوم ہوا کہ "کو" کے غلط استعمال سے بچکر اِن قابلِ تعظیم بزرگوں نے ہر جگہ اپنے مطلب کو دوسرے پہلو سے ادا کر دیا ہے مثلاً باغ و بہار میں ہے۔ "اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے آس پاس چھڑک دیجیے۔ الخ" یہاں پر ناواقف "گندھک کو چھڑک دیا جائے" لکھدیگا

مصنف مصباح القواعد نے مرزا داغ مرحوم کا ایک شعر بھی لکھا ہے جسمیں "انکو بھی دبایا جاتا" موجود ہے۔ ہمکو حضرت داغ کے بعض سربرآوردہ شاگردوں کی رائے دریافت کرنیکا موقع ملا۔ لیکن بمقتضائے انصاف سب نے مرزا مرحوم کی اِس لغزش کو تسلیم کیا۔ لیکن جمہور کے خلاف کسی ایک اوستاد کا اتفاقیہ طور پر کسی لفظ یا فقرے کو غلط لکھ جانا نہ دوسروں کے لیئے سند ہوسکتا ہے اور نہ اُس سے اُستاد کی اُستادی میں فرق آسکتا ہے طوالتِ مضمون کا خوف ہے ورنہ اس بیان کے ثبوت میں صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں +

قصہ مختصر "اُنکو دبایا جائے" صحیح نہیں ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو "روٹی انکو کھایا گیا" اور "پانی کو پیا گیا" بھی صحیح ہیں حالانکہ انکی غلطی میں کوئی شبہہ نہیں ہے

اگر کسی کو اب بھی اِن فقروں کی غلطی میں شبہہ ہو تو ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنیکو تیار ہیں۔

حروف حصر و خصوصیت کے بیان میں "ہی" کے متعلق لکھا ہے کہ "ضمائر فاعل یا مفعول یا مجرور ہوں تو "ہی" اور علامات فاعل و مفعول اور حرف جر آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ جیسے اُسس کو ہی دیا تھا۔ اسپرہی رکھا تھا" حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ایسے موقعوں پر بھی "ہی" "کو" سے پہلے آتا ہے اور اسکی "ہ" حذف ہوجاتی ہے اور یوں بولتے ہیں۔ "اُسی کو دیا تھا" "اِسی پر لکھا تھا"۔

حروف تشبیہہ کے بیان میں۔ سا۔ کا سا۔ ایسا وغیرہ کے ساتھ جیسا بھی لکھا ہے۔ حالانکہ کم از کم اہل لکھنؤ "جیسا" کا استعمال جائز نہیں رکھتے ہیں مثلاً "تم جیسا آدمی" کے بجائے اہل لکھنؤ "تمسا" آدمی کہیں گے۔
یا "اِن جیسا لایق" کی بجائے "انکا سا لایق" بولیں گے۔
یا مجھ "جیسا" کے بجائے مجھسا یا "میرا سا" کہیں گے۔

بعض لوگ "جیسا کے قبیل سے اور بھی چند الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً ایک مشہور زباں داں کے تحریر میں "اُن جتنا لایق" لکھا تھا جسکا مطلب یہ تھا کہ "جسقدر لایق وہ ہے اسقدر" ہمارے نزدیک ایسے موقعوں پر سلیس محاورے میں "اُن کے برابر لائق" لکھنا صحیح ہے۔ یہ بحث تحقیق طلب ہے اِس لیئے ہم اسکو طول دینا نہیں چاہتے

ان سب کمزوریوں کے علاوہ جس زبان میں مصباح القواعد لکھی گئی ہے وہ بھی نقائص سے پاک نہیں ہے۔ حالانکہ قواعد اُردو کی زبان کا خصوصیت کے ساتھ صحیح ہونا ضروریات سے ہے۔

پوری کتاب کی غلطیاں پیش کرنا طول مضمون کا باعث ہوگا اس لیئے ہم صرف دیباچہ کتاب کے چند جملوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

صفحہ ۳ میں لکھا ہے کہ "طبقہ رجال میں شاذ و نادر ہی کوئی متنفس ایسا ہوگا جو اُردو نہیں بولتا ہوگا" یہاں "نہ بولتا ہوگا چاہیئے" "نہیں بولتا ہوگا" غلط ہے۔

صفحہ ۶ میں ہے کہ "یہی وہ اُردو ہے جسکو اُردو کہا جا سکتا ہے" یہاں "جسکو اُردو کہہ سکتے ہیں" چاہیئے "جسکو کہا جا سکتا ہے" غلط ہے۔

صفحہ ۸ میں ہے کہ "یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ قواعد میں ابتک کوئی کتاب مطلقاً تصنیف ہی نہیں ہوئی" یہاں بھی "یہ نہ سمجھنا چاہیئے" زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے وقس علےٰ ہٰذا القیاس۔

آخر دیباچہ میں لائق مولف نے لکھا ہے کہ "ایک نئی بات میں نے یہ کی ہے کہ جبکہ تمام زبانوں کے قواعد کی کتابیں روکھی پھیکی اور سیٹھی ہوتی ہیں، اس کتاب کو بے لطف نہیں رکھا گیا کہ مناسب مقام پر کہیں کہیں حکایات شیریں اور لطائف و ظرائف نمکین سے لذیذ کر دیا ہے"

حالانکہ ان حکایات و لطائف کے بےموقع استعمال سے کتاب میں بجائے خوبی کے ایک عیب پیدا ہوگیا ہے اور اکثر موقعوں پر ان سے طبیعت منغص ہو جاتی ہے۔ غالباً مولانا شبلی نے اسی خیال سے چند حکایتیں کاٹ بھی دیں ہمارے نزدیک بہتر ہوتا اگر سب حکایتیں مسترد کر دی جاتیں۔

آخر میں اس بات کا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں مصباح القواعد کے محاسن کا بیان بغرض اختصار مضمون قصداً نہیں کیا ہے۔ ورنہ حق یہ ہے کہ جس محنت، تلاش اور تحقیق سے مولوی فتح محمد خاں صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اور جس خوبی کے ساتھ لکھی ہے اس کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔
ہمارے نزدیک انجمن ترقی اُردو کو مناسب ہے کہ اس کتاب کی بہت سی جلدیں بغرض تنقید ملک کے سربرآوردہ زباندانوں کے پاس بھیجے اور انکی متفقہ رائے کے مطابق اسکی تصحیح کرکے اسے دوبارہ چھپوائے۔ اسوقت البتہ یہ کتاب مستند مفید اور مقبول ہو سکتی ہے۔ فقط

نیشنل کانگریس

۲۰ برس سے نیشنل کانگریس اپنا کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگ اوسکی طرف جھکے پڑتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ اوس کی مخالفت بہت زیادہ تھی اور وہ لوگ جو زیادہ آزاد نہ تھے اور وہ لوگ جو گورنمنٹ کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے اور وہ لوگ جو گورنمنٹ کے دائرہ ملازمت میں تھے، کانگریس سے دور رہتے تھے مگر ۲۰ برس کا زمانہ جیوں جیوں گزرتا گیا خیالات بدلتے گئے اوس غیریت کم ہوتی گئی نہ صرف ہندوستانیوں کی بلکہ انگریزوں کی بھی۔ اب سب لوگ کانگریس میں شریک ہونے لگے سر ہنری کاٹن۔ و مسٹر ولیم وڈر برن نے ولایت سے آکر شرکت کی۔ آنریبل مسٹر ابراہیم رحمت اللہ بمبئی سے و آنریبل نواب سید محمد صاحب مدراس سے و مولوی ابوالقاسم صاحب بنگال سے منجانب مسلمانان شریک ہوئے۔ ایک زمانہ تھا کہ ایک گروہ کانگریس کو محفل غیر سمجھکر اجتناب کرتا تھا مگر اب اوسی گروہ کے افراد اوسے محفل احباب سمجھتے ہیں اور شریک ہوتے ہیں اور زیادہ تر شرکت کے لیئے آمادہ نظر آتے ہیں گویا ایک پردہ تھا جو درمیان سے اوٹھ گیا اور دلچسپ سماں آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ برٹش گورنمنٹ اب اون لوگوں کی عزت کرتی ہے جو کانگریس میں بیٹھکر ہر قسم کی خواہش ظاہر کرتے ہیں چاہے وہ خواہش بمقابلہ انگریزوں کے ہندوستانیوں کے حکومت کے عہدے لینے ہی کی بابت کیوں نہو اور گورنمنٹ توجہ فرماتی ہے اون لوگوں کے بیانوں کی جانب جو گورنمنٹ کے انتظام و احکام پر عمدہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔

ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے ملک کے با قوت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی ایک عمدہ جماعت سے علیحدہ رہیں اور لطف سخن اور تبادلہ خیالات اور محبت دیکھتی کی صورتوں کی قدر نہ کریں بلکہ اوس سے محروم رہیں اور محبت کی جگہہ غیریت کو دوست رکھیں۔

بیشک یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی اوتنی قوت

نہیں ہے۔ جتنی ہنود کی ہے تو اوسکی صلاح اوسکی شرکت سے ہوسکتی ہے نہ کہ اوس کے اجتناب سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ زمانہ روز بروز قریب آتا جاتا ہے جبکہ مغائرت دور ہوکر محبت کی صورتیں نظر آئیں گی۔ اور اگر منجانب ممبران کانگریس خاص انتظام کیا جائے تو آیندہ کانگریس میں جو بنارس میں ہوگی۔ زیادہ تر وہ لوگ شریک ہونگے جو کانگریس کو مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف سمجھتے تھے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ ممبران کانگریس شاید اس امر کو مفید و مناسب سمجھیں کہ کانگریس کے متعلق وہ کارروائیاں جو پبلک کی واقفیت اور شرکت کانگریس کے متعلق کیجاتی ہیں وہ علاوہ زبان انگریزی کے اُردو میں بھی کیجائیں۔

ذاکر حسین۔

غزلیات انجم

غم نہیں رکھتے کہ انبار درم رکھتے نہیں — جو غنی ہیں احتیاج بیش و کم رکھتے نہیں
بحر رحمت سے ملے رہتے ہیں قطرے کیطرح — ہم تو عاصی ہیں مگر عصیاں کا غم رکھتے نہیں
اہل دل دل ہی میں کرتے ہیں عبادت خفی — اہل دنیا کیا کھینچینگے اس کا غم رکھتے نہیں
صاحب دولت اگر بے فیض ہیں بیکار ہیں — کچھ نہیں رکھتے اگر دست کرم رکھتے نہیں
مطبخ عالم میں اپنا ہاتھ ہے کفگیر وار — صرف کرتے ہیں جو ملتا ہے۔ ہم رکھتے نہیں
راستی سے کام ہے مثل قد زیبائے یار — صورت زلف پریشاں پیچ و خم رکھتے نہیں
دونوں عالم کے تماشے دیکھتے ہیں رات دن — جام مے رکھتے ہیں انجم۔ جام جم رکھتے نہیں

ولہ

راہ طلب میں عمر طبیعی گزار دے — دل دے اگر خدا تو غم عشق یار دے
اس رنگ کا دل اسے مرے پروردگار دے — جو موسم خزاں میں بھی لطف بہار دے
اسے جام مے کرامت پیر مغاں دکھا — ہشیار تا بہ حشر نہوں وہ خمار دے

وہ بوالہوس جو عمر کو غم میں بسر کرے
وہ خوش نصیب ہے جو خوشی میں گزار دے

آئی بہار انجم نغمہ سرا کے ساتھ
اے عندلیب تو یہ چمن میں پکار دے

متفرقات

غم دو جہاں سے نجات دے یہ کرامت مئے ناب ہے
مرے حق میں آب حیات ہی جو شراب خانہ خراب ہے

نہ ملے وہ کعبہ و دیر میں جو ملے تو محفل غیر میں
نہ سلام ہے نہ کلام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

کوئی برق تھی جو گزر گئی ادھر آئی اور ادھر گئی
دم صبح راز یہ کھل گیا شب وصل صورت خواب ہے

دیگر

انجم کہاں وہ شاہد رشک قمر کہاں
وہ دن کہاں وہ رات کہاں وہ سحر کہاں

غزل از جناب رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

قسمت میں نا امیدی و حسرت ہے کیا کروں
اُس بیوفا سے مجھکو محبت ہے کیا کروں

کسکو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب
یاں تو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں

میں بیمروت اُسکو کہونگا نہ زینہار
یہ اقتضائے رسم مروت ہے کیا کروں

تقلید وضع بوالہوساں کا کسے دماغ
میری روش سے یار کو نفرت ہے کیا کروں

شدت نے صدمہائے نہاں کی ستم کیا
تیرے ستم کی لب پہ شکایت ہے کیا کروں

ہے خار چشم اب خس و خاشاک آشیاں
ہنگامۂ بہار کی رخصت ہے کیا کروں

بگڑے جو اپنی بات تو قسمت ہے کیا بنے
آئے کسی پہ دل تو طبیعت ہے کیا کروں

قائل ہوں خوشکلامی واعظ کا میں ولے
پیر مغاں سے مجھکو عقیدت ہے کیا کروں

ہے اب یہی صلاح کہ چھوڑ دوں میکدہ
ناصح سے مجھکو سخت ندامت ہے کیا کروں

وحشت مجھے غلامی دربان قبول ہے
بیتابی فراق سے وحشت ہے کیا کروں

غزل جناب مولوی سیّد شاہ نذر الرحمن صاحب حفیظ عظیم آبادی

رات بھر جیسے تاریں گننا اور دن بھر ڈھونڈھنا
کوئی آکر مجھسے سیکھے کوئے دلبر ڈھونڈھنا

ہوگیا ہے روز کا یہ مشغلہ اب صبح و شام
کوچۂ جاناں میں دل گم گشتہ جا کر ڈھونڈھنا

وہ رگ گردن سے بھی نزدیک تر ہیں ناصحا
ہے مجازی اونکا چھپنا میرا گھر گھر ڈھونڈھنا

خوب جی بھر کر خزاں نے آکے لوٹا ہے چمن
ہے عبث اب باغ میں سرو و صنوبر ڈھونڈھنا

کیا پتا مل ہی نہیں سکتا دل گم گشتہ کا
کریہ ہے فعل عبث میرا اسے سر ڈھونڈھنا

غیر کیا جانے اسے الپس کے ہیں راز و نیاز
اونکا چھپنا مجھسے میرا اُن کو گھر گھر ڈھونڈھنا

اپنے دل میں جذب الفت کا اثر تم دیکھنا
اپنے پہلو میں ہمارا قلب مضطر ڈھونڈھنا

اور سب آسان ہے مشکل اگر ہے تو یہ ہے
ڈھونڈھنا پھر آپکو اے بندہ پرور ڈھونڈھنا

مدح خوان شاہ یثرب ہوں قیامت میں حفیظ
میرا خیمہ حوض کوثر کے برابر ڈھونڈھنا۔

غزل مولانا شفق عمادپوری تلمیذ حضرت امیر مینائی مغفور

(در طرح مشاعرہ عالیجناب بادشاہ نواب صاحب پٹنہ)

یونہیں جو اے جانستان عالم تری ادا جانستاں رہیگی
قضا کو پوچھے گا کون آخر اجل کہاں میہماں رہیگی

اگر یونہیں کروٹیں بدلتا رہے گا تا حشر یہ زمانہ
نہ انقلاب زمین رہے گا نہ گردش آسماں رہیگی

ہزار مرجھائے غنچۂ دل رہیں گے گلہائے داغ تازہ
یہ وہ چمن ہے ہمیشہ جسمیں بہار بنکر خزاں رہیگی

یہ بار احساں سے دب گئے ہیں کہ سر نہ اوٹھیگا تیرے در سے
یہ وہ جبیں ہے کہ سر بسجدہ یونہیں سر آستاں رہیگی

کھنکینگے ناقوس بتکدو میں اذان کا غل ہوگا مسجدوں میں
رہینگے ہنگامے گرم کیا کیا کہ تیری چرچا کہاں رہیگی

رہیگی ہر دل میں یاد تیری رہیگا ہر لب پہ نام تیرا
رہیگی قالب میں جان جبتک [illegible]

وہ گل کھلائیگا روز تازہ یہ پھول برسائیگی ہمیشہ
کہ داغ دل گلفشاں رہیگا تو چشم تر خونفشاں رہیگی

نہ پوچھ صیاد فصل گل میں کہ کیا اسیروں کا حال ہوگا
تڑپ تڑپ جاینگے قفس میں نظر سوئے آشیاں رہیگی

یہ عشق کی بدگمانیاں ہیں کہ آپ بیٹھے جو دشمنوں میں
یہ یاد رکھئے کہ دل تو کیا ہے نگاہ تک بدگماں رہیگی

حیا نے آن آنکھوں میں سما کر جگہ تو چھوڑی نہیں ہے دل میں
ادا یہ کہتی ہے میں نظر سے کہ اب یہ شوخی کہاں رہیگی

مزاج میں شوخیاں ہیں ایسی کبھی ہم افسردہ دل نہ ہونگے
بلا سے پیری جو آگئی ہے طبیعت اپنی جواں رہیگی

فنا کا اسرار ہے دریا حباب کہہ رہی ہے جیسے
نہ پھر اوٹھا کوئی دم کی مہماں تو خود یہ پھر کہاں رہیگی

از جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اعظم ریاست اجیگڈہ

آرزو یہ ہے کہ جب تک میرے دم میں دم رہے
دل میں تیری یاد تیرا درد تیرا غم رہے

بعد مردن کوئے قاتل میں ہمارا غم رہے
عندلیب مردہ کا گلزار میں ماتم رہے

انتہائے گریۂ حسرت نہ دیکھی عشق میں
خون آنکھوں میں جھلک آیا جو آنسو تھم رہے

چاہتے ہیں حشر میں بھی ہوش دم بھر بے نقاب
حسرت دیدار میں بیچین اک عالم رہے

حیف اے بلبل کہ تیرے اشک کے ہوتے ہوئے
دامن گل چمن میں قطرۂ شبنم رہے

پوچھتا ہے عاشقوں سے حشر میں وہ فتنہ گر
فتنۂ محشر سے کیا نقتے ہمارے کم رہے

روز اگر وہ ہماری قبر کو روندا کیئے۔
بعد مردن پائمال ناز جاناں ہم رہے

قید ہو کر کس دو عملے میں کٹی ہے زندگی
جان گلشن میں رہی اپنی قفس میں ہم رہے

عاشقوں کا دین ایمان ہے یہی تثلیث عشق
آنکھ میں آنسو جگر میں داغ دلمیں غم رہے

جذب دل کھینچے لیئے آتا تھا میرے گھر او بیر
ہائے کس دل سے عدو نے آہ کی جو تھم رہے

میں نے تو اتنا کہا تھا قتل جلدی کیجیئے
آپ کیا سمجھے جو مجھسے دیر تک برہم رہے

وہ غم عاشق میں روتے ہیں تو یہ کہتے ہیں غیر
دیکھیئے کب تک کسی کمبخت کا ماتم رہے

عشق میں پھولوں کے گر دیں چمن میں رات بھر
بلبلوں کے اشک سے تر دامن شبنم رہے

اک فتنہ مجھ نیمجاں کو قتل کرنیکے لیے
قاتلوں میں کیسے کیسے مشورے باہم رہے

یاد ابرو چشم میگوں نے بھلائی یک قلم
نکلے کعبے سے تو میخانے میں جا کر ہم رہے

صورت آئینہ اے اخگر رہو ہر اک سے صاف
دامن دل پر نہ کچھ گرد ملال و غم رہے

"داغ مرحوم"

حضرات داغ مغفور کے انتقال کی خبر یقیناً تمام ہندوستان میں ہوگئی ہوگی اسلئے بجز چند قطعات تاریخ کے میں زیادہ کیا عرض کروں۔ کون ایسا شخص ہوگا

جسکو انتقال پُر ملال کا افسوس نہوا ہو۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خاکسار سید رضی الدین حسن کیفی حیدرآبادی

قطعات تاریخ وفات حسرت آیات حضرت فردوس آشیان بلبل ہندوستان استاد جہان۔ ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک نواب میرزا خان صاحب داغ دہلوی استاد حضور نظام۔

(ہجری)

داغ بدل گذشت و داغ از جہاں برفت — سرمایہ دار نازش اردو زباں برفت
زین جانگداز سانحہ از فرش تا بعرش — فریاد آہ و نالہ و شور فغاں برفت
رفت آنچہ برمن از غم این واقعہ مپرس — ہوش و خرد تحمل و تاب و تواں برفت
از خون دل بصفحہ عالم برائے سال — کیفی نوشت "بلبل ہندوستاں برفت"

۱۳ ھ ۲۲

ایضاً

رحمت برتربت چو فصیح الملک — از پئے مغفرت دعا گفتم
سال تاریخ رحلتش کیفی — داغ نواب میرزا گفتم

۱۳ ھ ۲۲

عیسوی

حسرتا و دردا کہ در فصل بہار و یوم عید — کرد ترک عالم اسباب ناظم یار جنگ
سال تاریخ وفاتش کیفی محزوں نوشت — مُرد ہے ہے نامور نواب ناظم یار جنگ

۱۹۰۵ء

فصلی مروجہ دفاتر حضور نظام

حضرت داغ سے استاد نے رحلت کی ہے — ساری دنیا کو الم سارے زمانیکو ہے غم
فکر تاریخ وفات آپکو کیوں ہے کیفی — ایک عالم میں ہے استاد جہاں کا ماتم

۱۳۱۴ فصلی

ایضاً

اک زمانہ جسکو کہتا تہا فصیح الملک داغ — مٹ گیا وہ صفحہ ہستی سے کیفی آج ہے
یہ قیامت تک کسی کے دلسے مٹنے کا نہیں — مادہ تاریخ کا داغ فصیح الملک ہے

۱۳۱۴ ف

فقط

معذرت

اہل مطبع کی غفلت کے سبب سے
افسوس ہے کہ خلاف معمول اردوئے معلی
کا پرچہ بہت دیر میں نکلتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ
اس تاخیر کی تلافی آیندہ کسی طرح تو نسے کر دیجائیگی
امید ہے کہ ناظرین معاف فرماوینگے۔

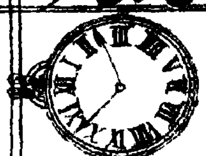
دیوان غالب

(مع شرح دیوان غالب)

جسکا اشتہار دیوان حسرت کے ٹائٹل پر درج ہے
چھپ گیا ہے صرف اسکا دیباچہ چھپنے کو باقی ہے وہ بھی عنقریب چھپ جائیگا
جن صاحبوں نے درخواست بھیجدی ہے وہ اطمینان رکھیں کہ
تیار ہونے پر دیوان فوراً آنکی خدمت میں روانہ کیا جائیگا
اور بھی جن حضرات کو خریداری منظور ہو مطلع فرمائیں۔
قیمت مع محصول و خرچ ویلیو صرف عہ

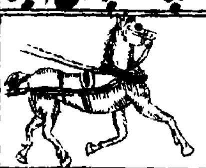
منیجر اردوئے معلی

اعلیٰ درجہ کی گھڑیان



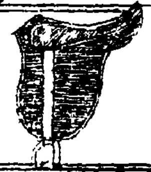
گھڑی بہت ونڈ گارنٹی ۱۰ سال قیمت
[illegible] جیبی الارم مضبوط
اور وقت پر ہوشیار کرتی ہے قیمت
[illegible] راسکوپ پیٹنٹ واچ مضبوط
قیمت [illegible] ٹائم پیس ایک روز دار
الارم قیمت [illegible]
چودہ روز کی گھڑی خوشنما قیمت [illegible]
[illegible] ارگن کلاک قیمت تنہائی کے
دل بہلانیوالا اور سریلی نغمہ کی آواز دیتا
بہت خوشنما قیمت [illegible]

کانپور کا چرمی اسباب



ساز فٹن وارنش پرزہ جرمن سلور قیمت [illegible] لانڈو بادامی
سیاہ پرزہ پیتل قیمت [illegible] کریکل ساز چمڑہ سیاہ یا بادامی براون پرزہ برنجی
قیمت [illegible] ایضاً وارنش [illegible] ساز اکہل [illegible]
بادامی سیاہ پرزہ برنجی قیمت [illegible] ساز چوکڑی چمڑہ
سیاہ بادامی قیمت [illegible] علاوہ اسکے ہر قسم کے ساز ہمارے کارخانہ میں تیار ہیں

نہایت عمدہ زین



زین ولی پائیدار قیمت مع جملہ سامان
[illegible] زین گھوڑدوڑ کی
قیمت [illegible]
زین شکاری مع جملہ سامان قیمت
[illegible] زین متوسط قیمت
[illegible] زین فوجی مع جملہ
سامان قیمت [illegible] زین
پولو قیمت [illegible] کمیشن زین
نہایت نفیس قیمت [illegible]
علاوہ انکے ہر قسم کے زین ملسکتے ہیں

نہایت مضبوط شوز



لیس بوٹ وارنش اصلی قیمت [illegible] ایضاً بادامی سیاہ مضبوط [illegible]
نسپکٹری بوٹ وارنش قیمت [illegible] براون [illegible] سیاہ و بادامی [illegible]
بھی کان وارنش قیمت [illegible] براون [illegible] بادامی سیاہ [illegible] گرگابی شوز
لیتھی یا براون کینوس قیمت [illegible] فٹ بال شوز ڈبل سول
پائیدار قیمت [illegible] علاوہ انکے ہر قسم کے شوز تیار موجود ہیں

المشتہر سید محمد عبد اللہ علم سوداگر کانپور بازار رام نرائن گھڑی والی کوٹھی

آؤ ہم بتلائیں کہ پچیس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

ممیرا کرامات — مقوی بصر محافظ بینائی دافع نزول الماء دھند اور آب وغیرہ۔ قیمت فی تولہ ۔۔ عا

حب ذیابیطس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر کیلئے کیسا ہی سستی نصیب ہو۔ فی تولہ ۔ عہ

حب دائمی قبض — ایک گولی سے دائمی قبض دور اور تمام عوارض درد سر یرقان وغیرہ کافور ۲ درجن ۔ عہ

جوہر عشبہ — صفائی خون کیلئے بے مثل۔ گندہ خون کو زہر سے صاف کرتا ہے۔ دافع پھوڑا پھنسی۔ ناسور۔ بگندہ خارش۔ شیشی کلاں ہے، شیشی خورد ۔ عہ

نور علی نور (چند منٹ میں بال دور ۴ تولہ ۔ عہ

حب دافع وجع مفاصل — درد اعضاء جوڑوں کا درد دور ہو۔ ۲ ہفتے کیلئے عا

حب دافع طحال — تلی یا بڑھنے کے دفعیہ کیلئے شرطیہ ۲ ہفتے کے لئے ۔۔ عا

ہیر آئل — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بیوقت سفید نہیں ہونے دیتا۔ نزلہ زکام کو دور کرتا ہے، ضعف دماغ کو مفید۔ فی شیشی ۔۔۔۔ سے

زودگن — اسکے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۔۔۔ سے

دوائی خارش — ران کی خارش اور بدن کے دانے دو دن میں خشک ہو جاتے ہیں دو تولہ عا

تریاق السعال — اخراج بلغم درد سینہ۔ سرفہ کہنہ اور خراش گلو نزلہ کا چھاتی پر گرنا اسکے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد ایک تولہ کی ۔۔ عا

حب قاطع قیام افیون — چار دن۔ افیون بلا تکلیف کے چھوٹ جاتی ہے ایک تولہ عہ

روغن اعجاز — ہر سو نکا زخم بھر جاتا ہے۔ بگندہ ناسور کے لئے اکسیر اور عجیب الاثر ۲ تولہ ۔ عا

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے ایک سو مریض کو کافی ہے۔ ۔۔ عہ

چورن مقوی معدہ — خوش مزہ بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے ۳ تولہ ایک روپیہ کی ۔ عہ

سنون مستحکم دنداں — ہلتے دانت مضبوط اور میل دور کرتا ہے ایک روپیہ

یدالسود دافع بخار — دور تی ہر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن ۔۔ عہ

دمہ یا ضیق النفس — سانس رکنا اور بلغم وغیرہ دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے عا

رعنا — چہرہ کے بدنما داغ وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ ۔۔۔ عا

سفوف درد گردہ — درد گردہ اور ریگ مثانہ بلا تکلیف خارج ہوتی ہے ۴ تولہ عا

اکسیر شفا — دوائی طاعون بطور علاج حفظ ماتقدم حامل مرض کی حملہ سے محفوظ رہتا ہے غربا کو مفت۔ فی شیشی ایک روپیہ ۔ عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور (موچی دروازہ)

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اُردُوئے مُعلّٰی

نمبر (۳)	بابت مارچ سنہ ۱۹۰۵ء	جلد (۴)

(مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی۔ اے)

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلّٰی علیگڈھ

باہتمام محمد خان ستار سعید احمد

مطبع احمدی علی گڈھ میں طبع ہوا

اور رسالت علی گڈھ کالج نزیل اردوئے معلّٰی

جگناتھ برادرس

یونیورسل سپورٹس ورکس سیالکوٹ شہر

آجکل اگرچہ اس کام کے کرنیوالے ہندوستان کے کسی اور مقام پر بھی پائے جاتے ہیں مگر سیالکوٹ نے جو خاص مہارت ایسے کاموں میں پیدا کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے اور یہاں کے کام کی خوبی ملک ہی میں نہیں بلکہ یورپ تک تسلیم ہو چکی ہے "نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول" ایک مسلم مثل ہے سپورٹس ورکس کو اچھے پیمانہ پر کھولا ہے جسمیں خصوصًا نہایت عمدہ اور تازہ مال خریدکر اسباب تیار کیا جاتا ہے کارخانہ کے سٹاف میں کاریگر بہت ہی لائق اور ہوشیار موجود کئے گئے ہیں حتی الامکان ہم خود اس امر کے ساعی ہیں کہ یونیورسل سپورٹس کے کارخانے کی بنی ہوئی چیزیں نسبتًا دوسرے کارخانوں سے بہت بہتر اور مضبوط ہونیکے علاوہ ایک خاص شان رکھتی ہوں۔ گندم نما جو فروش بننے سے خود ہم ہی کو بڑا نقصان نہیں پہونچ سکتا بلکہ اسکا بہت بڑا خصارہ ملک بھر کے لئے ایک عظیم نقصان ثابت ہو سکتا ہے ناظرین ایک کارڈ بھیجکر ہمارے کارخانے کی انگریزی فہرست بلا قیمت منگوا سکتے ہیں۔

اردوے معلیٰ

قیمت سالانہ مع محصول للعہ

" ششماہی " عہ

شرح اجرت اشتہارات

	صفحہ یا دو کالم	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ	سے؍
ششماہی	عہ	سے؍	سے؍
سہ ماہی	سے؍	سے؍	ہر
ایک بار	ع	عہر	فی سطر ۲ر

نمونہ کا پرچہ ۲ر کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جائیگا۔

سب سے بدگمانی اچھی نہیں

سرمہ اکسیر۔ یہ سرمہ مفصلہ ذیل بیماریوں پر جادو کا اثر رکھتا ہے یعنی ککرے جو آجکل ترقی پر ہیں ضعف بصارت، دھندلا، ناخونہ، پڑوال۔ سرخی چشم۔ آنکھوں سے پانی جانا خارش وغیرہ وغیرہ جملہ امراض کے لئے مفید ہے بلکہ تندرستی کی حالت میں اسکے روزانہ استعمال سے آنکھ کی کسی قسم کی بیماری نزدیک نہیں آتی۔ طلباء کیلئے خاصکر مفید ہے کیونکہ اسکے استعمال سے کسی عمر میں چشمے کی ضرورت نہیں پڑتی زیادہ تعریف بے سود ہے منگوا کر آزمائیے۔ دادو دیجئے قیمت فی تولہ عہ نمونہ ۳ر محصول ذمہ خریدار

المشتہر

پرتاب سنگھ اہلیو والیہ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ فدا علی عیش

آپ کا اسم شریف شیخ فدا علی عرف اچھے صاحب و تخلص عیش ہے۔ آپ کا سنہ ولادت معلوم نہیں مگر آپ کے پیر بھائی شیخ محمد جان مرحوم المتخلص بہ شاد جو پیرو میر کے نام سے مشہور تھے، اُنسے سنا گیا کہ وقت انتقال آپ کی عمر بہتر سال کی تھی۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو آپ کی ولادت سنہ ۱۲۴۴ ہجری میں ہونا چاہیے۔ اسلئے کہ آپ کی وفات سنہ ۱۳۱۶ ہجری میں ہوئی تھی۔ آپکا سلسلۂ پدری حضرت محمد ابن ابی بکر صدیق تک پہنچتا ہے اور سلسلۂ مادری حضرت عبداللہ ابن عمر بن الخطاب خلیفہ دویم تک منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ منور علی ہے جو بعہد دولت غازی الدین حیدر بادشاہ اَوَدھ اُنکے دربار میں عہدۂ کاتب و مترسل پر معمور تھے اور نواب روشن خاں صدیقی کی نسل سے تھے اور آپ نواسے تھے شیخ محمد علیخاں صاحب عرف شیخ فقیرا رئیس قدیم شہر لکھنؤ کے جو ابتدا میں مالک اصلی شہر کے مانے گئے ہیں۔ آپ کی خاندانی عظمت و جلال اور آپکے بزرگوںکے جبروت و مقاتلات کے کارنامے خصوصًا خانِ بنگش کو شکست دیکر لکھنؤ سے نکالدینا اور نواب صفدر جنگ کو پھر تختِ سلطنت واپس کردینا مفصل طور پر کتب تواریخ مثل عماد السعادت اور سیر المتاخرین و تاریخ اَوَدھ مصنفہ

محمد میر صاحب عیرۃ میں درج ہے -

اخبار سلطانی کا انتظام بعہد حضرت واجد علیشاہ مرحوم و حضرت برجیس قدر بہادر آپ کی ذات خاص کے سپرد تھا - اور آپ سلطانی اخبار نویس تھے -

اتنے بڑے معزز عہدے پر رہکر کبھی درپئے آبروئے کسی اپنے عزیز - تعلقدار یا قرابتمند راجہ یا کسی اور مسلمان رئیس و شریف کے نہیں ہوئے - خوشنویسی میں آپ بیک واسطہ حافظ نوراللہ کے شاگرد رشید تھے - اسلئے کہ خاص اس فن میں آپ کو تلمذ میر مظفر علیصاحب سے تھا اور وہ شاگرد حافظ صاحب کے تھے - اور نیز بہی میر مظفر علیصاحب بعد حافظ صاحب کے مرزا علی رضا جواہر رقم خاں کے شاگرد ہوئے اور وہ بہی شاگرد حافظ صاحب کے تھے -

فن شعر کا شوق اور ابتدائی شغل بعنوان شباب حضرت میر حسن عسکری صاحب المتخلص بہ عرش خلف الرشید حضرت میر تقی میر سے رہا اسکے بعد کسی دلسوخت کی بابت اُنسے ناچاقی ہوگئی تب آپ میر دوست علی خلیل کو اپنا کلام دکھانے لگے - چند غزلوں کی نوبت آئی تھی کہ اُنہوں نے بہی انتقال فرمایا - پہر آپنے کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا اور نہ اس کی ضرورت محسوس فرمائی - آپ کا میلان خاطر عمدگیٔ بندش و سلاست زبان کی جانب بہت زائد رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام اور حضرت آتش مرحوم کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے -

جناب مرحوم بوجہ استعداد فطری و لیاقت وہبی تمامی اصناف سخن پر قادر تھے اور ہر صنف سخن میں آپکا کلام نظماً و نثراً موجود ہے اور لاتعد و لاتحصیٰ مقامات و کتب و عمارات میں پایاجاتا ہے - اور کسیقدر خود آپکے کلیات میں بہی نظر آتا ہے - البتہ ہزل گوئی کی قسم ایسی ضرور ہے جس کی نظیر اس زمانے میں پیش کرنا نہایت دشوار ہے - صرف ایک نظیر ابتک مجھے دستیاب ہوئی ہے وہ اس مقام پر بوجہ تفنن کلام ہدیہ ناظرین کیجاتی ہے - اور وہ ایک قطعہ تاریخ[1] ہے جو جناب مرحوم نے ایک ایسے موقع پر نظم فرمایا تھا جبکہ گوہر نامی ایک کسبی کی کسی جوہری نے بصرف زرخطیر مسّی کی تھی اور اسنے اکثر شعراے شہر کو اس خوشی میں بڑی دہوم سے دعوت دی تھی مگر شامت اعمال سے وہ جناب مرحوم کو دعوت دینا بہول گئی تھی اور وہ تاریخ یہ ہے -

---

[1] اس قطعہ سے کہ چونکہ اس زمانے کے لکھنوی طرز معاشرت کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اسلئے اسکی اشاعت جائز رکھی جاتی ہے
(اڈیٹر)

جوہری کا صرف زر نے دل تہ و بالا کیا	مسی ملک جب گوہر گوہر ا بلق بنی
خوب ہی گوہر کا اس مسی نے منہ کالا کیا	رنگ اپنا کیا جما یا مصرعہ تاریخ نے

اسکے بعد وہ کبھی آپ در دولت پر حاضر ہوئی نہایت حسرت کی گر کیا ہوتا ہے وقت از دست رفتہ اور تیر از کمان جستہ باز نمی آید۔ لیکن جہانتک خیال کیا جاتا ہے یہ کافی نظیر بزلہ گوئی کی نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کا مذاق ہے۔

اور جو حضرات اپنی خوش قسمتی سے آپ کی زیارت سے اکثر مشرف ہوائے ہیں اور شریک صحبت خلا ملا رہے ہیں وہ اس امر کو خوب جانتے ہیں کہ جناب مرحوم اعلیٰ درجے کے خوش مذاق بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھے کیسا ہی کوئی شخص کسی پہلو سے اُنسے مذاق کرتا تھا فی الفور جواب کی بہ ترالی سے منہ کی کہا تا تہا۔ بعد یکہ شہر کی نامی گرامی رنڈیاں جو زمانۂ شاہی میں مشہور آفاق تھیں اور جن میں سے بعض کا ذکر خود جناب ممدوح نے اپنے گلگشت عیش میں فرمایا ہے۔ اکثر انکے جناب سے سنا گیا کہ وہ جناب ممدوح سے استقدر خائف و ترساں رہتی تہیں کہ کبھی کسی موقع پر اُنسے مذاق نہ کرسکتی تہیں۔ شاہی زمانے کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ اس انگریزی زمانے میں اتنی خبر ہے کہ موسم برشگال میں داروغہ میر واجد علیصاحب مرحوم تعلقدار رہرا متو تخلص بہ سنجیدہ شاگرد حضرت اسیر اپنے باغ میں چند قدیم شاعروں کا جلسۂ مشاعرہ کیا کرتے تھے مثلاً خود حضرت سنجیدہ اور حضرت اسیر اور میر وزیر صاحب نور اور آفتاب الدولہ قلق اور خواجہ بادشاہ سفیر اور سید حسن لطافت اور آغا حیدر افسوں اور سید عباس حسین فصاحت خلف الصدق حضرت ناسخ مرحوم۔ اور اس جلسے میں شہر کی نامی رنڈیاں بلائی جاتی تہیں اور باغ میں ہوے پڑے تھے اور ساون گائے جاتے تھے اور اس جلسے میں جناب مرحوم بہی بلائے جاتے تھے ہیں ایسی موقع پر یہ اشعار ارشاد فرمائے ہوں۔ ــ ۵

ہر پینگ سر فلک کو چہو ے	باغوں میں پڑے ہوئے ہیں جہولے
ہر ایک حسین ہے غیرت حور	جہولو نپہ برس رہا ہے اک نور
ہر تان میں دل اڑا رہے ہیں	ساون جہولوں پہ گا رہے ہیں

پہران جلسوں کی جو چشم دید کیفیت انکے بعض احباب نے راقم السطور سے بیان کی ہے

اور انکی شعرخوانی اور با بہ نشاط کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت کی میرے سامنے تصویر کھنچی ہی آنکے اختلاط و حرف و حکایات اور انکی چھیڑ چھاڑ کا حال اگر زاہد خشک بھی سن پائے تو توبہ توبہ منھ میں پانی تو ضرور بھر آئے بلکہ تر دامن ہو جائے۔ البتہ آخر عمر میں اسی سال سے، یہ سب عادتیں آپنے ترک کر دی تھیں اور سبب سے کہ آپ سفر عراق و زیارات مشاہد مقدسہ سے واپس تشریف لائے تھے ان سب امور سے توبہ کر لی تھی اور تا آخر عمر عبادت الہی میں بسر کی۔

بیت الشرف کے قریب تین مسجدیں محلہ ڈیوڑہی آغا میر میں ہیں ایک مسجد تحیۃ النسا بیگم صاحبہ دوسری مسجد نواب ممتاز محل صاحبہ تیسری مسجد میاں تحسین علیخاں خواجہ سرا واقع چاندی خانہ۔ انہیں مسجدوں میں آپ نماز پڑہا کرتے تھے اور وہاں ہی مجمع احباب بذلہ سنج رہا کرتا تھا مشاعروں میں برابر تشریف لیجایا کرتے تھے۔

آپ کی پہلی شادی قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ میں دختر حضرت شاہ فضل اللہ صاحب سے ہوئی جنمیں ہمشیرہ مولوی محمد حسن خاں صاحب صدر الصدور منسوب تھیں اور دوسری شادی بہ شہر مرادآباد دختر نواب اعظم علیخاں فاروقی سے ہوئی تھی۔ اس زمانے میں نواب محمد علیخاں مرحوم عم نواب سراج الدولہ بہادر مرحوم برادر نسبتی بادشاہ جمجاہ حضرت نصیر الدین حیدر بادشاہ اودہ نے ایک صحبت مشاعرہ جناب مرحوم کی تشریف آوری کے موقع پر بنا فرمائی تھی، شعرائے مرادآباد و امروہہ سب تشریف لائے تھے اور بخیال موسم برشگال، کفن برسات میں، چمن برسات میں، طرح قرار پائی تھی۔

اسمیں جناب مرحوم نے غزل ذیل نظم فرمائی۔

غزل

رنگ لائیگا مرے تن کا چمن برسات میں
پھر ہرے ہو جائینگے زخم کہن برسات میں

کہہ را کیونکر نہو رشک چمن برسات میں
جمع ہیں سب گلبدن گل پیرہن برسات میں

کیوں نہ روتے ہیں عدم آباد کا گذری خیال
یاد آتا ہے مسافر کو وطن برسات میں

فصل بارش کا جو سودا قبر میں آتا ہے یاد
چاک کرتا ہوں گریبان کفن برسات میں

ہر برس ہوتا ہے میلا عیش میری قبر پر
آتے ہیں سب لکھنؤ کے گلبدن برسات میں

اور بطور پیش خوانی غزل ذیل پڑھی۔

غزل

صبح کس شب کی جلوہ گر نہ ہوئی
پر شب غم تری سحر نہ ہوئی

چشم رحمت رہی رقیبوں پر
نگہ التفات ادھر نہ ہوئی

ایسے بندے بھی ہیں خدائی میں
مرگئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی

عمر کڑھنے کو کٹ گئی لیکن
چین سے ایک دن بسر نہ ہوئی

آؤ میرا جنازہ اٹھتا ہے
یہ نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

عیش یوں جان دی محبت میں
میری حسرت کو بھی خبر نہ ہوئی

ان غزلوں کو سنکر ہر شخص انگشت حیرت بدنداں تھا۔

اسکے بعد ایک اور صحبت مشاعرے کی کسی اور بزرگوار نے بنا کی اور اس کی طرح دیوان ہوتے جاتے ہیں۔ اور خنداں ہوتے جاتے ہیں۔ قرار پائی تھی۔ جناب مرحوم نے بھی اس میں غزل فرمائی مگر افسوس کہ وہ غزل دیوان اول میں تھی جو چوری گیا۔

اسی مشاعرے میں کسی صاحب نے اثنائے غزلخوانی میں یہ شعر بھی پڑھا تھا۔ ۵

جناب عیش جسدن سے یہاں تشریف لائے ہیں
مراد آباد سے شاعر گریزاں ہوتے جاتے ہیں

اس شعر پر تمام مشاعرے میں ایک قہقہہ پڑا مگر سب نے جناب مرحوم کے کمال فن شاعری کا اقرار کیا۔

---

۵ جناب مرحوم کا کلام علاوہ دیوان اول کے جو چوری گیا، اور علاوہ موجودہ کلیات نظم کے

اور علاوہ ان مختلف لاتعد و لاتحصیٰ نثروں اور خاتموں اور تاریخوں کے جو مختلف مقامات ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور مختلف تذکروں اور گلدستوں میں بھی ملتے ہیں، بہت کچھ راجہ مقیم الدولہ نواب علیخاں مرحوم والی ریاست محمود آباد کے دیوان میں ہے جو آپنے راجہ امیر الدولہ سعید الملک راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر ممتاز جنگ کی فرمایش سے اپنی زیر نگرانی چھپوایا تھا۔ اس میں بہت سے مقامات پر غزلوں کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ آپنے اپنی طرف سے غزلیں نظم فرما کر وہ کمی پوری کردی مگر اسکا پتہ ملنا بہت دشوار ہے یہی حال دیوان آغا حجو شرف شاگرد رشید حضرت آتش مرحوم کا ہوا کہ اس میں بھی آپ کو جدید اصلاح فرمانا پڑی اور وہ بھی آپ کی زیر نگرانی شائع ہوا۔

ایک دن کا تذکرہ ہے کہ جناب مرحوم، راجہ نواب علیخاں مرحوم کا دیوان درست فرمارہے تھے کہ راجہ امیر حسن خاں مرحوم آگئے اور غزل "یار بندھا" "تار بندھا" کی زمین میں تھی دیکھا کہ "مزار بندھا" کا قافیہ نہیں ہے عرض کیا کہ چچا صاحب مزار بندھا کا قافیہ ضرور نظم فرما دیجئے فرمایا اچھا اور فی الفور فرمایا کہ اگر تمہیں پسند ہو تو یہ شعر رکھدو ؎

کسی کی ہم سے نہ بر آئی بعد مرگ مراد
وہ پتلہ پھر نہ کھلا جو سر مزار بندھا

راجہ صاحب پھڑک اٹھے اور جناب مرحوم کے گلے سے لپٹ گئے۔

آپ کا کلام بہت کچھ ضائع ہوا۔ اس میں سے صرف فسانۂ دلفریب و گلگشت عیش نثر میں نثر میں چھپ چکا ہے اور مجموعہ طلسم عبرت و آتش عشق و فغان عیش بھی ایک مرتبہ چھپ چکا ہے طلسم عبرت مرزا تقی ہوس کے بندو نیر گرہ بند ہے جو انہوں نے بے ثباتی دنیا پر نظم کے تھے اور آتش عشق واسوخت کا نام ہے اور فغان عیش مسدس وفات معشوق ہے۔ مثنوی مہر درخشاں و نالۂ جانگاہ بھی چھپی ہے مگر اشک مسلسل در حالات انتقال پر ملال حضرت واجد علیشاہ مرحوم، مشیر قیصر اخبار میں شائع ہوئی علحدہ نہیں چھپی۔

اسکے علاوہ ہزارہا تاریخیں اور نثریں بطور خاتمۃ الطبع مطبع نولکشور کی کتابوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

مگر اصل کلیات یعنی دیوان مع قصائد و دیگر مثنویات و مسدسات و مخمسات و تضمینات و رباعیات و مرثیہ جات و سلام وغیرہ ہنوز شائع نہیں ہوا۔

آپنے چوبیسویں ماہ شوال ۱۳۱۶ ہجری کو بروز سہ شنبہ مطابق ۷ مارچ ۱۸۹۹ء بعارضۂ حبس بول انتقال فرمایا اور اپنے موروثی مقبرے، واقع محلہ باغ قاضی مضافات شہر لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ مختلف بلاد ہندوستان میں احباب نے فاتحہ خوانی کی مجلسیں منعقد کیں اور تمام شعرائے لکھنؤ نے تاریخیں نظم فرمائیں جنکی تعداد دو سو سے کچھ زائد ہے اور جن میں سے ایک قطعہ تاریخ منشی امیر احمد مینائی مرحوم کا بھی ہے۔

اب آخر میں جناب مرحوم کی چند غزلیں درج کیجاتی ہیں۔

غزل

گہ نے عیش چلے سوئے دشت دیوانے
بہار آئی پیام جنوں لگے آنے

جنوں کی فصل میں ناصح سے پوچھتا کوئی
یہ کیا سمجھ کے مجھے آپ آئے سمجھانے

کرم ہے پیر مغاں کا شراب لٹتی ہے
برنگ باب اجابت کھلے ہیں میخانے

بہار موسم گل ہے جنوں ہے زوروں پہ
تلے ہیں بیڑیوں کے توڑنے پہ دیوانے

اٹھا ہے ابر سیہ جمگھٹے ہیں رندوں کے
ہجوم بادہ کشاں ہے بھرے ہیں میخانے

جنوں کا جوش ہے خود رفتگی میں آ آ کر
کہاں نکل گئے وحشی ترے خدا جانے

جگا رہے ہیں کہ دیکھو مآل دنیا کا
ہلائے جاتے ہیں تربت میں اہلی شانے

خرام یار سے دعویٰ ہے خوش خرامی کا
چلے ہیں کبک دری آج ٹھوکریں کھانے

فقیر مست ہیں پلوا شراب۔ رہ آباد
دلا ہمیں بھی جو ساقی دیا ہو داتا نے

گلے میں ڈال کے بانہیں جو عیش پیار کیا
کہا کہ چھوڑ مرے ٹوٹنے لگے شانے

دیگر

عجب یہ امر محبت میں دلپسند ہوا
وہ بے نیاز ہوے میں نیاز مند ہوا

پیمبروں میں ترا رتبہ بلند ہوا
علاوہ حسن تجھے جو خدا پسند ہوا

مزا کلام میں بے مشق مل نہیں سکتا
مٹا یا آپ کو جب نیشکر نے قند ہوا

کیا ہے سر مرا قاتل نے زینت فتراک
ہزار شکر شہید وں میں سر بلند ہوا

میں زیچ ہو نگا بہت اسکے لینے وا لے ہیں
حضور پھیر دیں دل کو جو نا پسند ہوا

وہ روندتے ہیں مری قبر کو زہے قسمت
نشاں مٹا تو مٹا نام تو بلند ہوا

مرے کلام نے طرفہ مزا کیا پیدا
عدو کو زہر ہوا دوستوں کو قند ہوا

ہوا بجھے پس گریہ تصور ابرو کا
دہنک نمود ہوئی عیش بینہ جو بند ہوا

دیگر ناتمام

وہ در ہے باغ جو ہم تازہ گرفتاروں سے
بوئے گل آپ کرم کرتی ہے گلزاروں سے

قرب حق عاصیونکو حشر میں حاصل ہو گا
بے گنہ دور کھڑے ہونگے گنہگاروں سے

مرض عشق کو سمجھے ہے یہ ساری شاید
خوف آتا ہے قضا کو ترے بیماروں سے

لخت دل ہر سر مژگاں پہ دکھاتے ہیں بہار
پھول کھلتے ہیں مرے باغ میں ان خاروں سے

دیگر

کھلے ہیں بال سنبل کے گریباں چاک ہے گل کا
جوانان چمن نے سوگ رکھا مرگ بلبل کا

بہار آئی پھٹا پڑتا ہے جوبن شاہد گل کا
چمن میں خوب طوطی بولتا ہے آج بلبل کا

وہ دیوانہ ہوں پڑجاتی ہے اک ہلچل قیامت میں
نمونہ شور محشر ہے مری زنجیر کے غل کا

طریق فقر کا سالک تو ہے لیکن ذرا سن لے
کڑا پڑتا ہے اس منزل میں اک میدان توکل کا

فرشتے بھی لحد میں میری پرسش سے ہے غافل
اثر دیکھو کہاں پہونچا ہے قاتل کے تغافل کا

پھڑک جاتا ہوں میں صیاد کی منصف مزاجی پر
بنایا صید بلبل کے لئے پھندا رگ گل کا

تمہیں پروا نہیں لوگوں کی جانیں مفت جاتی ہیں
خدا کے واسطے چھوڑو کہیں شیوہ تغافل کا

کسی گل کا نہ دیکھا ہمنے پروانے کو دیوانہ
کسی بلبل کو پروانہ دیکھا شمع کے گل کا

رہے گردش یونہی ساغر کی باقی بادہ خواروں میں
نہ ٹوٹے تار اے ساقی کبھی دور و تسلسل کا

پڑے غسل جوانان چمن صحن گلستاں میں
جہاں تک دیکھئے دریا بہرا ہے اشک بلبل کا

نہ بڑھ جائے کہیں سودا گیسو کے اسیروں کی
مزاج ان روزوں کچھ برہم نظر آتا ہے کاکل کا

جنا کرتا ہے تنکے، ہو گیا صیاد کو سودا
بہار آتے ہی آخر رنگ لایا خون بلبل کا

غلامی کو مری پہنچے نہ شاہی بادشاہوں کی
کہ میں اے عیش چاکر ہوں سوا پشت دلدل کا

دیگر

پروانوں سے سوا ہوا مجمع ہزار کا
گل گر پڑا جو قبر پہ شمع مزار کا

غازہ بنا ہے عارض رنگین یار کا
کس اوج پر ہے حسن ہمارے غبار کا

کیا ہو رہے ہیں پاک ننا کر گناہگار
دریا چڑھا ہے رحمت پروردگار کا

اپنے لئے بہشت کی ہے آرزو مجھے
جنت میں ہو کے راستہ ہے کوے یار کا

اسکا تمام روز نہ فرقت کی اک گھڑی
یاں دن ہے کس حساب میں روز شمار کا

سمجھا ہوا ہے تو بہ جسے ساقی سیاہ ابر
اٹھا ہے یہ غبار کسی بادہ خوار کا

کچھ کم پڑا تھا طول میں آخر بڑھا لیا
محشر نے مجھسے مانگ کے دن انتظار کا

تیرا فراق بھی کوئی صانع ہے اے صنم
پتلا بنا دیا ہے مجھے انتظار کا

معنی یہی ہیں دست درازی کے ای جنوں
باقی رہے نہ نام گریباں کے تار کا

مجھ پر چلے جو یار کی شمشیر آبدار
مالا پہناؤں تیغ کو زخموں کے ہار کا

بلبل ہے مست اکڑتے ہیں شمشاد باغ میں
اُبلا ہوا ہے حسن عروسِ بہار کا

معراج کیوں نہ عیش ہو میرے کلام کو
مداح ہوں میں خسرو فرخ سوار کا

دیگر

روز بکا ہے میں یہ مشکل یہ الہی کیسی
مجھ سے یہ وحشت کی آہ ہو نہ محشر میں کہیں

دینگے اعضا مرے محشر میں گواہی کیسی
ہر طرف پھیل رہی ہے یہ سیاہی کیسی

قدر نعمت کی مثل سچ ہے کہ ہے بعد زوال
عیش اس عہد میں یاد آئی ہے شاہی کیسی

اب ضعف نے یہ ہجر میں حالت تباہ کی
جنت میں پھیلی جو مجھے رحمت کریم
نسبت ہوئی ملائکہ فرشتونکو روز حشر
واں بھی ہزار انکے طرفدار بن گئے

بیٹھے تو دلکو تھام کے اُٹھے تو آہ کی
زاہد کے دل میں رہ گئی حسرت گناہ کی
کام آئی تیرگی مرے بخت سیاہ کی
محشر میں جب طلب ہوئی مجھ سے داد خواہ کی

کیا جانے عیش ہجر میں کیا دل پہ بن گئی
پہلو سے آ رہی ہے صدا آہ آہ کی

سُن کے گلزار میں وصف گل خنداں ہم سے
اپنے سونے سے ہوئے قبر کے بیدار عندلیب

زمزمے سیکھ گئے مرغ خوش الحاں ہم سے
آج آباد ہوا خانۂ ویراں ہم سے

بزم جاناں سے میں کرتا ہوا فریاد آیا
بعد میرے جو بہار آئی گلستانوں میں

با دلِ شاد گیا با دل ناشاد آیا
ہمصفیران چمن کو میں بہت یاد آیا

عیش غربت میں جو یوں بھرتے ہو ٹھنڈی سانسیں
کیا تمہیں آج کوئی اہل وطن یاد آیا

فقط

نیشنل کانگرس اور مسلمان

ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء کے پرچے میں کانگرس کے متعلق جو مضمون نکلا تھا اسکا انگریزی ترجمہ کسی اخبار میں دیکھکر ہمارے ایک غائبانہ کرمفرمانے نیویارک امریکہ سے ایک فارسی تحریر اس کی تائید میں بھیجی ہے جسکو ہم بجنسہ درج رسالہ کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اردو سے مطلع اسے بنظر غور ملاحظہ فرمائینگے خصوصاً دو مقام کو یعنی اول وہ مقام جہاں سرسید علیہ الرحمۃ کی قومی خدمتوں کا پرنس بسمارک کی ملکی خدمتوں سے مقابلہ کرکے دونوں کو ایک حیثیت سے مشابہ قرار دیا ہے اور دوسرا وہ حصہ مضمون جہاں اہل ہند کی خاص خاص شکایتوں کا ذکر کرکے دکھلایا ہے کہ وہ شکایتیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی شکایتیں ہیں اور اسلئے گورنمنٹ سے ان کی اصلاح کی استدعا کرنے میں دونوں کو برابر حصہ لینا چاہیے تاکہ انکی متفقہ درخواست کی کچھ وقعت اور عزت بھی ہو۔

امر اول کی نسبت صاحب مضمون نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کہ جس طرح خلاف جرمنی متحدہ یعنی پرنس بسمارک کی پالسی کا، جو شخصی تھی، اسوقت جرمنی میں کوئی فرقہ پیرو نہیں ہے لیکن تمام قوم اسکو سلطنت جرمن کا بانی سمجھتی اور اس کی عزت کرتی ہے۔ اسی طرح سے سرسید مرحوم کی ملکی پالسی کی نسبت بھی مسلمانوں کی رائے بدلتی جائیگی اگرچہ وہ سرسید کو ہمیشہ مسلمانان ہند کی ترقی کا بانی سمجھتے رہینگے۔ کیونکہ انکو یقین رہے گا کہ سرسید نے جو نیشنل کانگرس کی مخالفت کی تھی اسوقت مخالفت ہی مناسب تھی کیونکہ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ ہمہ تن تحصیل علم میں مصروف ہو گئے اور کانگرس کو بھی انکی مخالفت سے تقویت ہوئی۔

اور امر دوم کی نسبت لکھا ہے کہ ہندو و اہل اسلام کے درمیان سب سے پہلا نقطہ اتحاد حب وطن ہے کہ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں۔ اور پھر دونوں افلاس و محنت کی مصیبتوں میں یکساں گرفتار ہیں اور یہ امر مسلم ہے کہ دو جماعتوں کے درمیان اتحاد کی

سب سے بڑی صورت یہ ہے کہ دونوں ایک ہی قسم کی مصائب میں مبتلا ہوں۔ اور پھر آگے چل کر ان مصائب کو ترتیب وار بیان کیا ہے۔ مثلاً (۱) انگلستان کے کارخانہ داروں کی رعایت سے ہندوستان کی مصنوعات پر محصول کا لگایا جانا (۲) متمولین انگلستان کا ہندوستان کی پیداوار کو ارزاں خرید کر ملک سے باہر نکال لیجانا (۳) زراعت ہند کا اصول جدیدہ کے مطابق نہ ہونا۔ مرحلۂ تشخیص کی سختی اور سرکاری حصۂ پیداوار کے بجائے زر کی صورت میں لیا جانا (۴) وزارت ہند کے اخراجات، عمال کی پنشن اور قرضہ ہند کے ادا کرنے کے لیے تیس کروڑ روپیہ کی ناقابل برداشت رقم کا ہر سال ملک سے باہر نکل جانا (۵) عہدہائے جلیلہ پر صرف اہل انگلستان کا مقرر ہونا اور ہندوستانیوں کا محروم رہنا (۶) امتحان سول سروس کے لیے اہل ہند کا انگلستان جانے اور زر کثیر صرف کرنے پر مجبور ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اسکے بعد صاحب مضمون نے دکھایا ہے کہ اگرچہ کانگرس کو ہنوز کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہر سال وہ کامیابی سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہے اور روز بروز اس کی وقعت بڑھتی جاتی ہے چنانچہ اس سال پہلی بار کانگرس کی کارروائی بذریعہ تار نیویارک کے کسی اخبار کے نامہ نگار نے بمبئی سے بھیجی اور پھر اسی میں سربراہ کاش۔ دادابھائی نوروزجی اور سرینداناتھ بنرجی کے حالات مع کانگرس کے مقاصد کے شائع ہوئے۔ اڈیٹر

حامداً و مصلیاً و مسلماً

جناب فضل الحسن حسرت مدیر جریدۂ غرا۔ اردوئے معلیٰ۔

دریں نزدیکی زمان ترجمۂ انگلیسی مقالۂ اردوئے آں مہربان بر موضوع وفاق مسلمانان با ہنود ہندوستان و شرکت آنان با ایشاں در مجلس سالانۂ انڈین نیشنل کانگرس، بملاحظۂ کاتب ایں سطور در آمد۔ مایۂ سرور فراواں گردید و بر روے وطن پروران راستباز باب امید حیات ملت اسلامیہ ہند بر کشود۔ و بر مماشات جماعت مسلمانان ہند با حرکت عالم در میدان تمدن و ترقی، دلیل ساطع شد۔ اگر میان عالم ارواح و عالم اجسام رسم نامہ و پیام ممکن بودے۔ وایں مژدہ۔ کہ در علیگڈہ مشتے روشندلاں

عالی دماغ پیدا شده اند که حبّ وطن را شعار ساخته و احیای ملت را وِثار پرداخته جریدهٔ را برائے
تعلیم اصول سیاسه و رفع اختلافات دینیه از میانِ اصناف، بل وطن اقامت کردند۔ بر روح
پُرفتوح سرسید احمد خان مرحوم رسانیدند۔ هیچ شک نیست که آن داغ حسرت که از یاس فرزند
برقامت خویش بگور برده است یکسر زائل شده۔ و آن دردِ جانکاو که از ملاحظهٔ ناقابلیت خلفانِ
ناخلفش که از پیروی اغراضِ شخصیه مدرسة العلوم علیگڑه را دار الضرب مسکوک قلب از طلای خالص
احرار قوم برائے رواج حکومت انگلیس ساخته اند، خراش جانِ شیرینش میباشد، هم کلیتهً برگشته
مقصودِ اصلی سید مغفور احیائے ملت بود۔ و از نقطهٔ هدایت برائے سعودات بر سلّم ترقی اسبابے
که مقتضائے وقت و احوال بود بعمل آورد۔ و او از عهدهٔ فرائضِ منصبیهٔ خویش مردانه وار بآن
وجه بیرون آمد۔ و قوم را برائے ابد مرهون منت خویش ساخت۔ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا
(کسے که یک انسان را به نورِ علم و معرفت زنده میکند۔ گویا زنده کنندهٔ همه انسانهاست آیه میباشد)
مادام که مطلوبِ اصلی منظر میباشد، تقلیدِ نابینایانه سالکانِ شاهراه تحقیق و حقیقت را لازم نیست۔ بوجه
و به اسالیبِ جزویه سیاسیه۔ تاریخ ادیانِ سامیه که یهودیت و نصرانیت و اسلام است نیز بصدق
این دعوی، شاهدے است عادل۔ حضرتِ کلیم کهانت را بنا نهاد و در کتاب سوم تورات همه فرائض
و شئونش را ضبط فرمود۔ اما حضرتِ مسیح بر فرقهٔ کاهنان که بموجبِ قواعد بنی اسرائیل شده بودند انتقاد
نمود۔ و جنابش حتی آب فرقه رهبانیه و کلیسائے نصرانیه۔ اگر علی رغم فرمانِ مسیحی یک شعبهٔ مقدسے
بالاتر از همه ملت شده بودند، و بجائے نورانیت سببِ ظلمت عالم گشتند، از بیخ و بنیاد استیصال
فرمودند۔ و میان خدا و بنده هیچ واسطه نگذاشتند۔ و معهذا هر سه مظاهر امر الله در اصلِ اصولِ دین متفق
بودند اَنَّمَا اللهُ اِلٰهٌ وَاحِدٌ۔ و۔ اَنْ تُحِبَّ لِاَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ۔

بیش از سی سال هنگامیکه سید احمد خان منصوبهٔ احیائے جماعتِ اسلامیه بست، و صورتِ ذهنیهٔ
مدرسة العلوم در سلکِ حضور در آغوش کشیده برائے فراهم کردن نقد لازم از در بدر میگردید۔ و از ابوابِ
مساجد گدیه میکرد۔ وزیرِ روئین و خونین المان یعنی پرنس بسمارک که در تاریخ عالم لقب خلاق جرمنی متحده
دارد، هم درین فکر بود که اجزائے پراگندهٔ دولتهائے کوچک ملکِ المان را فراهم
آورده یک ملت قویهٔ جرمنی در زیرِ حمایت شهنشاهی پروشیا پیدا کند۔ او

اشتهار او از مخالفتِ بزرگانِ سه عهد مقتدرِ یورپ بود ذریعه گرفت - اولاً با دولت آسٹریا که سیر حاصل
دولتهاے جرمنی بود جنگ نمود - و او را شکست داده با او صلح گیری کرده، ان دو دولتها را از پنجه
اثر او رہانید - ولیس از چهار سال باتفاق آن دول المانیه با دولت فرانسه محاربه نمود - و آنرا زیر و زبون
کرده و تا ایوان در سال که در جوار پارس عاصمهٔ فرانسه است بادشاهِ ولیم را شهنشاهِ ممالکِ متحده
جرمنی گردانید - و تا بیست سال دارای سیاستِ عالم گردید بوضعیکه زمامِ آشتی و جنگ همه
دنیا بدستِ او بود - اما درین مدت بیست سال حیثیاتِ حریت در ملت جرمن افزون شده
مسلکِ استبدادِ پرنس بسمارک نامقبول گشت - لهذا بسمارک از خدمت استعفا کرد - و بقیهٔ
عمرِ خویش در انزوا گذرانید - امروز در ملکِ المان فرقه نیست که پیروِ مسلکِ بسمارک یعنی استبداد[له]
باشد - اما همه قوم او را معمارِ عمارتِ جرمنی متحده می انگارند - و در دوره او را تبریک میکنند - از
نوادرِ اتفاق است که پرنس بسمارک و سر سید احمد خان در یک سال وفات کردند -

اکنون بیست سال است که انڈین نیشنل کانگریس بوجود آمد - و سید مرحوم در اوائل این تحریک
قومی، جادهٔ ناموافقت بر گزید - زیرا که اقتضاے حال چنین بود - و او را چارهٔ دیگر نبود - و خلاف
از هم براے مسلمانان و هم براے کانگریس مفید آمد - مسلمانان در پے تحصیل شدند - و کانگریس
از مخالفت ایشان تقویت گرفت - وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ - اما اکنون وقت آمد که
هنود و مسلمین باهم متفق شوند در مسلکِ اربابِ حکومت که از جنس اجنبی هستند و از ضروریات اهلِ هند
آگاه نیستند و حسبِ وطن خویش منفعتِ انگلستان را بر مصلحتِ هندوستان ترجیح میدهند، جرح
و تعدیل کنند - تا از مباحثهٔ حاکم و محکوم طریقهٔ وسطیٰ پیدا گردد - و حالتِ حالیه که همه منفعت بانگلستان
میرسد و همه نقصان نصیب هندوستان میشود، تدریجاً، بموازنه مساوات گراید -

آن عذرِ قدیم که مسلمانان در علم و معرفت از هنود متاخر اند، امروز بکار نمی خورد - درین
سی سال گذشته قوم جاپان از حضیضِ ذلت باوجِ عزت رسید - و درین یکسال که با دولت
عظیمهٔ روسیه در جنگ است یک بار هم هزیمت نخورد ـہ -

له استبداد یعنی تنها بر سر کارے استادن و منع کسے قبول نکردن - مطلب یہ ہے کہ پرنس بسمارک کی پالیسی کا
دارومدار پرنس مذکور کی شخصیت اور اسکے ذاتی راے پر تھا - اڈیٹر

زدو اندیشۂ شاہے بسے صادق توے " " "
بیں جاپاں کہ در تو نے زمین بود زماں آمد

آیا معقول ہست کہ مسلمانانِ ہند دریں سی سال ہیچ ترقی نہ کردند و ہندیاں وابستۂ خاکِ خواری ہستند و درمیان ایشان ہیچ کس نیست کہ در مجلس کانگرس مسائل متعلقہ بوطن خویش خطابہ کند! حاشا وکلاّ۔ حقیقت امر چنیں نیست۔ اِنَّ الْعَالَمَ عَلٰی حَدِّ التَّرَقِّیْ وَالتَّقَهْقُرُ مخالف قانونِ الفطرۃ۔ درمیان مسلمانانِ ہند بسیار نوجوانانِ روشن دل وعالی ہمت ہستند کہ بہ کجا بروند زیب انجمن خواہند بود۔ مسلمانان ازجاپانیاں چرا کمتر باشند۔ ہر دو اہلِ آسیا ہستند ؎

نورِ خرد بداری سیواں صفت چرائی
ممکن تراہر آنچہ ممکن بہ دیگران است

—— ✤ ——

نخستیں نقطۂ اتحاد ما بین المسلمین والہنود حب وطن ہست دوم اتحاد جنسیت۔ زیرا کہ اسلاف اکثر مسلمانان ہنود بودند وہندی الاصل۔ واختلاف دین اتحادِ اصل را از اہل نتواند کرد۔ پیغمبر از کفار قریش رعایت حقوقِ قرابت وجنسیت طلب فرمودہ بود قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔ ودر سورۂ لقمان مذکور ہست کہ اگر مادر وپدر تکلیف شرک نمایند اطاعت ایشاں نباید کرد۔ ولیکن در امورِ دنیا با ایشاں حسن معاشرت باید نمود۔ وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ اکنوں فرضِ منصبی پیشوایان جماعت اسلامیہ ہند ایں ست کہ تعلیم حسنِ معاشرت با ہنود کہ ابنائے وطن اند بہ مسلمانان فرمایند۔ تا با تفاق ایشاں بزرگی وطن وشرفِ اہل وطن حاصل گردد۔

وبزرگتریں نقطۂ وفاق بین الجماعتیں بلوائے[1] عام ہست۔ دریں دہ سالِ گذشتہ تقریباً بست ملیون نفوس در ہند از فقر وفاقہ ہلاک شدند۔ وایں کشتگانِ افلاس ہم مسلمانان بودند

[1] بمعنی بلا وزحمت۔ مطلب یہ ہو کہ دو جماعتوں کے درمیان اتفاق کی سبب سے بڑی صورت یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اڈیٹر

وہم ہنود و سوانائی این واقعہ[1] بہ آنوقت ظاہر شود کہ اعداد این مردگان را با عدد اہالی ایران مقابلہ نمائیم کہ تقریباً پانزدہ ملیون[2] باشد۔ در علم پولیٹیکل ایکانمی مسلم است کہ ملکِ آزاد آن ملک است کہ ضروریات زندگی و تنعماتِ انسانے ہاک را پیدا میکند۔ و محتاج بملکِ دیگر نباشد۔ ازین لحاظ ہندوستان در حقیقت ملکِ مستقل و آزاد نیست کہ اسباب خوردنی و پوشیدنی و آسایش و آرایشِ قوم را پیدا کردن میتواند۔ اما انگلستان ملک محتاج و ناآزاد است کہ ہمہ ضروریات و تنعماتِ اہلِ ملک را نمی تواند پیدا کردن۔ اما افلاس ہندوستان و تمولِ انگلستان قضیہ را برعکس کردہ است۔ اگر در انگلستان قحطِ غلہ دوامی باشد۔ اہالیش کہ زر دارند از دیگر ملکہا غلہ را جلب کنند۔ ولیکن در یک خشک سال ملیونہا در ہندوستان از نیستی ہلاک شوند۔

این افلاس ہند از کجا آمد؟ ’’از زمانے کہ تسلطِ انگلیسی بر ہندوستان راسخ شد۔ جبل ہمت ارباب کارخانہائے انگلیس مانند مالکان مشینہا یعنی کلہا، کہ پارچہ، و ظروف و آلات فلزات وغیرہ میسازند، در پئے افنائے صنائعِ ہندوستان شد۔ و در اواخرِ قرنِ ہیجدہم و اوائل نوزدہم پارلیمنٹِ انگلستان قانون وضع کرد کہ اگر مصنوعاتِ ہندوستان بانگلستان ارند، گمرکِ[3] فاحش تقریباً ہشتاد و ہفتاد برصد بدہند۔ و مصنوعات انگلستان بہندوستان بدون گمرک رود۔ الا قدرے قلیل برائے ضرورتِ حکومتِ ہند۔ ازین سبب مصنوعاتِ ہند از علتِ گرانی در ممالکِ اجنبیہ خریدارے نیافت۔ و در ہند خودش ارزانِ مصنوعات انگلستان گرم بازاری حاصل کرد۔ پس بنا برین تدریجاً در مدت پنجاہ سال شیرازۂ صنائع و حرفِ ہند از ہم گسیخت۔ و ہندوستان کہ از قدیم الایام مامنِ صنعت و حرفت بود۔ ملکِ زراعت تنہا ماند۔ در اواخرِ قرنِ نوزدہم بعض متمولین ہند کارخانہائے پارچہ بذریعۂ مشین در بمبئی و دیگر جاہا اقامت کردند و مصنوعات آنہا بہ اہلِ ہند ارزان آمد۔ و کساد بازاری بپارچہ ساختہ انگلستان گرفت۔ باز پارلیمنٹ انگلستان در ۱۸۹۵ء بر پارچہ ساختہ ہند محصولے نہاد تا با پارچہ ساختہ انگلستان در قیمت موازنہ بدست آید۔ ازینجاست کہ صنعت و حرفت ہندوستان نشو و نمائے نمے یابد۔ و ملیونہا نفوس معطل باشند و در چنگالِ بینوائی گرفتار۔

[1] حادثہ۔ [2] انگریزی ملین۔ دس لاکھ۔ [3] محصول۔

(۲) همه پیداواری زمین هند و مصنوعاتش را متمولین انگلستان و هند از ان میخرند- و به دیگر بلاد جلب کرده گران میفروشند- و تمولِ اهلِ هند با تمول انگلیس مسابقت نمی تواند کرد- ازین رو همه تجارتِ خارجیه هند در دستِ اجنبیان افتاده است- و سبب فلاکتِ عامه شده- علاوه ازین- چون ریلوے و سفائنِ بخاریه پیداواری ملک را بیرون می برد، ضروریاتِ زندگی گران میگردد- و حالتِ خلائق بے پول بدتر میشود- اگر این تجارت خارجیه بدست هندیان بودے- افلاس پیرامونِ ایشان نگردیدے-

(۳) زراعتِ هندوستان حسبِ اصولِ جدیده نیست- پس محاصلِ زمین چنان نیست که در ممالک متحده امریکا میباشد- و طرفه تر این که خراج زمین که بحکومت داده میشود بان بسیاری هست که هم کشتکار و هم زمیندار را در حالتِ مفلسی میدارد- و در زمان پادشاهانِ تیموریه خراج از جنس پیداوار بود- اکنون خراج بزر باید داد- پس سبب زحمتِ مزارعین و صاحبانِ عقار میباشد-

(۴) حکومت هند هر سال تقریباً سی کرور روپیه بانگلستان میفرستد برائے مصارف وزارت هند و وظائف عمال قدیم و ادائے سود قرضۀ حکومتِ هند که از صرافان لندن گرفته است وغیرها- و در عوض این زر خطیر چیزے بهندوستان عائد نمیگردد- پس این مخرجے هست که در جنبش مد خلے نیست- و چنین زیان غیر منقطع را هیچ ملکے در دنیا یارائے تحمل ندارد- و اثر این نقصان بر همه ملک راجع میشود- و لامحاله نتیجه اش فلاکت عامه میباشد-

(۵) مناصبِ جلیلۀ حکومتِ هند بانگلیسیان داده میشود- و خدمتهائے کمینه بهندیان میدهند پس این باب وسعتِ معاش نیز برروے اهلِ هند بسته شد- و این انگلیسیان غالباً زر را بوطن میفرستند و اولادِ خود را در انگلستان تعلیم میدهند- و هنگام تمام خدمت بملکِ خویش باز رفته و وظیفه از هند میگیرند- اگر ایشان در هندوستان متوطن میشدند- همه مال و زر ایشان از هند بیرون نمیرفت- و نفعش باهلِ هند میرسید-

(۶) برائے تحصیل سندِ قانون و امتحان انڈین سول سروس هندیان مجبور هستند که بانگلستان بروند- این هم یکے از جملۀ اسبابِ اضاعتِ دولتِ هند هست- پیش از سه یا چهار

سال سی و دو طلبهٔ هندی برای امتحان سول سروس در لندن حاضر شده بودند. شاید دو نادر ایشان کامیاب شدند. و هر یک کمتر از یک هزار پوند زر صرف نکرده بود. پس ملک هند این دو تا طالبهٔ کامیاب را بصرف سی و دو هزار پوند بدست آورد. این تحصیل علم خیلی گران است. و این هر دو هر قدر زر که حاصل کنند از کالای خودشان خواهد بود. و در همه عمر خویش سی و دو هزار پوند بدست آوردن نتوانند.

این پسند تازیانهٔ حکم بلوای عام دارد. و ضررش بهمه اهل هند عاید میگردد. اینجا بطور مشتی نمونه از خرواری بعرض بیان آوردیم تا آن کوته اندیشان را که از شرکت کانگرس هم خود باز میمانند. و هم دیگر مسلمانان را باز میدارند. سرمایهٔ عبرت بدست آید. و چشم خبرت گشاید. فرض هر هندی که از عقل سلیم بهره دارد این است که بر این مسائل همه و امثال آنها که مخصوص بفرقهٔ دون فرقه نیست، تفکر کند. و تدبیر رفع این مناقص ها که پیدا نماید.

اصلاح این مفاسد عظیمه بدون بدست آوردن اختیار وضع قوانین ملکیه از پارلیمنٹ انگلستان در دست وکلای اهل هند ممکن نیست. و پارلیمنٹ انگلستان این امتیاز را باهل هند آنوقت خواهد داد که همه فرقهای هندوستان از مسلمانان و هنود و پارسیان و نصرانیان هندی وغیره متفق شده درخواست کنند. چنانکه باهل کینیدا و اسٹریلیا داده است. انڈین نیشنل کانگرس تنها همان ذریعه است که صوت حال همه هندوستانیان را بسمع قبول پارلیمنٹ انگلستان خواهد رسانید. فریاد و زاری یک فرقه یا دو فرقه مانند آواز طوطی در نقارخانه میباشد. اما وقتیکه همه ابنای ملک باتفاق حال زار خویش را بیک آواز ادا کنند، یک صدای تندر[1] آسا آفاق عالم را گیرد. و به گوش نزدیکان و دوران در خورد. و در دل آزادگان حریت دوست چه در انگلستان و چه در باقی ممالک متمدنه اثری خوب پیدا کند. و زود باشد که مطلوب حاصل گردد. هرچند که در بیست سال گذشته دعای کانگرس قبول نشد. و فریاد هندیان در دل انگلسیان رحمی پیدا نمود

بناله و فریاد که کردم نشنیدی
پیداست نگارا که بلند است جنابت

---

[1] انگریزی تندر - یعنی گرج - اڈیٹر

اما ہر سال کہ میگذرد۔ مردمِ کانگرس را منزلِ مقصود یک مرحلہ نزدیکتر میکشد۔ زیرا کہ صدائے فریادِ ایشاں برگوشِ عالمیاں بلند تر میگردد۔ و مردم با ہوش را چہ در انگلستان و چہ در یورپ و امریکہ مایۂ تفکر و تدبر مہیا میشد۔ چنانچہ۔ ایں بار چوں جلسۂ کانگرس در ماہِ دسمبر گذشتہ در بمبئی منعقد گشت۔ یک نامہ نگارِ امریکی خبرِ انعقادش فوراً بجریدۂ خود بذریعۂ تیلیگرام از بمبئی بنیویارک فرستاد۔ و ایں اول بار است کہ خبرِ انعقاد کانگرس از ہند راساً بامریکا فرستادہ شد۔ و جریدۂ دیگر نیز رسم و داد ابھائی نوروز جی۔ و سر ہنری کاٹن۔ و مسٹر ہندناتھ بانرجی را بایک مقالہ بر موضوع کانگرس و حالِ زبون ہندوستان، طبع نمود۔ ازینجا ظاہر است کہ انڈین نیشنل کانگرس در نظر عالمِ متمدن اعتبارے حاصل کردہ است۔ و کوشش بانیانش ہم رائگاں نرفتہ۔

و دریں جلسۂ اخیرِ کانگرس۔ سر ہنری کاٹن۔ صدر نشین آن جلسہ ترغیب دادہ است اہلِ ہند را کہ برائے تحصیلِ استقلال در ادارۂ ملکِ خویش۔ مانند کینیڈا و اسٹریلیا و نتیال وغیرہا از مستعمراتِ[1] انگلستان۔ سعی نمایند۔ یعنی ایں مطلوب را منظورِ نظر داشتہ ہم ملت را بواسطۂ تعلیم و تفہیم برائے چنیں استقلال آمادہ کنند۔ و ہم قوم انگلیس را کہ دارائے ہندوستان است بفرستادن عرض حال ہر سال و ہمہ سال برائے عطائے ایں امتیاز راضی گردانند۔ علی الخصوص دریں زماں کہ سلطانِ مراکو نظام ملک را بدست وکلائے منتخبین ملت نہادہ است۔ و شہنشاہ چین ہم اقامت پارلیمنٹ در ملکِ خویش قرار دادہ۔

کینیڈا و آسٹریلیا و دیگر مستعمراتِ انگلیسہ مانندِ ہندوستان از جملۂ مملکتِ عظیمۂ دولتِ برطانیہ است۔ اما معاملۂ انگلستان با مستعمراتِ خویش یک طور است۔ و با ہندوستان بطورِ دیگر۔ چونکہ ہمہ رعایائے یک بادشاہند، بعضے را بر بعضے فضیلت دادن درست نباشد۔ بلے اہلِ کینیڈا از پادشاہ خود حقوقِ خویش را درخواستند و دریافتند۔ و اہلِ ہند حقوقِ خویش از پادشاہ نمی طلبند و نمی یابند۔ بلکہ در نفس الامر پادشاہ انگلستان در ۱۸۳۳ء و باز در ۱۸۵۸ء حقوقِ اہلِ ہند را بایشاں عطا کردہ است۔ ولیکن از جہلِ ایشان است کہ حکام انگلیسی در ہندوستان بآں فرمانہائے پادشاہی کاربند نمیشوند۔ اگر مسلمانان در جلسۂ کانگرس شریک شوند۔ و اصل

---

[1] انگریزی کالونی بمعنی نوآبادی ۔ اڈیٹر ،،

سیاستِ وطنِ خویش را آموزند۔ فلاحِ کل از ہنود و مسلمانان و دیگر اقوام سریع الحصول
گردد۔ و ننگِ ناوطن پروری از نام ایشاں دور شود۔ و در نظرِ اہلِ وطن محبوب و در میانِ اقوام
متمدنہ یوروپ و امیریکا موقر گردند۔ و بیخ و بنیادِ فساد و اختلافِ درونی مستاصل گردد۔
چون مسلماناں در کانگریس شریک شوند۔ و در میدانِ فصاحت و بلاغت با ہنود و برادرانِ
خویش مسابقت نمودہ گوئے نامآوری بربایند، خدمتے بزرگ باسلام کردہ باشند۔ زیراکہ در یورپ
و امریکا از سالیانِ دراز اعتقاد ہست کہ مسلماناں جانورانِ خونخوار ہستند و از عقل و درایت
بہرہ ندارند۔ و ہنگامیکہ خطابہائے ایشاں در روزنامہائے عالم رود۔ آں اعتقادِ باطل زائل
گردد۔ و چنیں مسلمانانِ وطن پرور سرگردہ و پیشوائے ہمہ اہلِ ہند، کہ عددشاں پنجم حصۂ نوع
بشر ہست، خواہند گشت۔ و ایں شرفے ہست عظیم کہ برائے حصولِ آں نوجوانانِ اسلام را
باید کہ ہرچہ تمامتر سعی دقیقہ از دقائق فروگذاشت ننمایند۔ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ
از دادا بھائی نوروزجی قیاس باید کرد۔ اگر او خدمتِ قومِ پارسیاں تنہا کردے۔ سرگردہ یکصد
ہزار مردم بودے و بس۔ اما او عمرِ خویش را بخدمتِ ہمہ اہلِ ہند صرف نمود۔ و سالارِ سہ صد
بلیون نفوس گردید۔ و در تاریخِ ابد نامِ او ہم ثبت گشت

زندۂ جاوید گشت ہر کہ نکو نام زیست

آں نوجوانانِ اسلامی کہ تمنائے حصولِ ایں منصبِ جلیل دارند۔ بدانند کہ دریں راہ خارہا باشد
اما مرداں را باید کہ از دشوارہائے طریق ہراساں شدہ پاس تن در ندہند و از منزلِ مقصود باز نمانند
ہر مطلوبے کہ شریفتر، جادۂ وصول بآں مشکل تر۔ از اتحادِ جنس بنی آدم چہ چیز بزرگتر تواند بود؟ از برائے
تحصیلِ ایں مطلوبِ اعلیٰ فداکاریہا باید کردن۔ و بارِ ہموم و غموم بسر باید کشیدن۔ اَحَسِبَ النَّاسُ
اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ۔ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ آیا مردم
گمان میکنند کہ بمحض گفتنِ ایں سخن "کہ ما قبول کردیم" ہمہ فرائض ایشاں ساقط شود۔ و حال آنکہ
جوہرِ صداقتِ ایشاں بر محکِ امتحان ننہادہ شد؟ (نہ خیر) بیشک ما کسانے را کہ پیش از
ایشاں بودند بر معیارِ امتحان نہادیم۔ پس ہمچنیں خدائے تعالےٰ کسانے کہ راستباز اند خواہد شناخت

ودر وغگویان را ہم خواہد دانست) واین نفاق وشقاق کہ الحال درمیان فرقہائے مختلفہ ہندوستان ساری ہست نباید کہ فارسان میدانِ محبت ووفاق را سنگِ راہ شود۔ واز طلب مطلوب باز دارد۔ زیراکہ قواے غیبیہ عالم را بسوے نقطۂ اتحاد سوق میکند۔ وزود باشد کہ ہمہ دنیا مانند یک عائلہ گردد۔ وکینہ ودشمنیٔ پارینہ از میانِ اقوام محو شود۔ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ [واز سینہائے ایشان کینہا را بیرون کنیم۔ وایشان برادران گردند بر تختہا نشستہ روبروے یکدیگر] درین عالم محقق شود۔ واز فیضِ علم ومعرفتِ عمومی۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ ہویدا گردد۔ پس کسانیکہ در تنویر عقولِ اہل ہند سعی میکنند، وایشان را از مغاک ناتوانی بر منصۂ توانائی میکشند۔ بوصولِ آن اَیّامُ اللّٰہ کہ پیغمبران بآن بشارت دادہ اند، ودران عہد ظلم وظلمت از جہان گم شود، عالم را اعانت میکنند۔ خوشا بحال ایشان کہ بچنین ثروتِ عظیمہ موفق شوند۔ بلے۔ آنوقت ہم دور نیست کہ ہمہ سکانِ برّاعظم آسیا بمقتضاے ضرورتِ حفظ ذات باہم متفق گردند۔ چنانکہ اہل یورپ اکنون بخلافِ غیر یوروپین متفق میشوند۔ وہنگامیکہ ترقیاتِ مادّیہ اہل غرب با تدین ومحاسن اخلاق اہل شرق مزدوج گردد نتیجہ اش صلاحِ عالم خواہد بود۔ چنانکہ اہل آسیا بتحصیل علم سیاست خصوصًا وعلوم طبیعیہ عمومًا محتاج اند۔ اہل یورپ وامریکا نیز ہنوز بتحصیل علوم روحانیہ از شرقیین محتاج اند والا اگر مادّہ پرستی ہمہ عالم را فرا گیرد۔ دنیا فاسد شود۔ وبقاے نوعِ بشر در خطر افتد۔ "آن جنگ وجدل براے ہستی" کہ در ممالکِ غربیہ موجود است ازین قیاس باید کرد کہ در سال گذشتہ سنہ ١٩٠٢ء در شیکاگو کہ سکانش از یک ملیون بیش نیست۔ آنقدر جرائم بوقوع آمد کہ در ہمہ ہندوستان کہ سہ صد ملیون نفوس دارد در ہمان سال واقع نشد۔

از جملہ مقدماتِ تعلیم سیاست بہمہ ملت این ہست کہ کتابہا در فنونِ جدیدہ۔ از جغرافیہ وہیئت وتاریخ عالم وعلوم طبیعیہ وسیاسیہ وغیرہا بزبانِ اردو باید تصنیف کردن۔ ودر ہر شہر ودہ انجمنہا بنا کردن۔ وبذریعہ خطابہا این علوم را درمیان خاص وعام رائج نمودن۔ بویژہ پیران

سال لکچر

وزنان و بچگان را بواسطۂ فانوس[1] جادو صورتِ اقالیم باید آموختن۔ و توجہ ملت را بسوے صنائع و حرف تجارت مائل ساختن و از خدماتِ حکومت حتی الامکان احتراز باید کردن۔ از فرقہ بوہرگان[2] دریں مسلک دانشے اندوختن۔ کہ از تجارت و صنعت تمول حاصل کردہ اند۔ و نیز از چینیاں عبرت باید گرفتن کہ دریں نزدیکی زماں دو صد کتاب تصنیف نمودند۔ ہمہ در علوم جدیدہ۔ زیادہ از صد کتب بر فن حرب تنہا۔ و بر کیمسٹری و قوت برقیہ قریب ہفتاد کتاب و علی ہذا القیاس۔ بدون چنیں زحمتہا احیاے ملت چگونہ متصور شود۔ ؎

ایں علم غربی کیمیا، سازد خرد بیضا ضیا — حُبِّ وطن بخشد ترا، حُبِّ وطن دُرِّ عدن

حُبِّ وطن نورِ خرد، قومے اگر دارد سزد — بر رتبۂ اعلیٰ رسد، التعلیم غرب ایں از لبن

حُبِّ وطن علمِ یقیں، لازم برائے مسلمیں — از بہر احیاے چنیں، تدبیرے باید ساختن

بنویس در ہیئت کتب، بردار غفلت را عجب — زاں عقلِ رخشاں چوں شہب، زاں ہمی یزداں عنین[3]

بگذار شرحِ چغمنی، ہم طوسی و ہم توسجی ″ ″ ″ — برگیر طرزِ مغربی، گیلیلین کپلیرین

جغرافیہ در طرزِ نو، با نقشہا اے نیک خو — بنویس با صد جست و جو، گرداں جہاں پر یک شتن[4]

تاریخِ تدریجی علو، ازیں زماں تا ارسطو — گفتن بباید مو بمو، از بہر تنویر فطن ″ ″

کبریتِ احمر ایں بود۔ زیں قوم ہا زندہ شود — زیں جاہلی یکسر رود۔ زیں پشہ گردد کرگدن

کتبہ

محمد برکت اللہ البھوپالی الہندی فی نیویرک۔ من الممالک المتحدہ الامریکانیہ۔

بست و یکم فروری ۱۹۰۵ء

---

[1] میجک لینٹرن"۔ [2] جمع بوہرہ"۔

[3] امام غزالی فرماید۔ مَن لَم یَعرِفِ الہَیئۃَ وَالتَّشرِیحَ فَہُوَ عِنِّینٌ فِی مَعرِفَۃِ اللّٰہِ تعالیٰ "

[4] شتن۔ شہر "

انتخاب بیاض محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب مدیر قند پارسی۔

(عرفی شیرازی)

جز در کنار دوش ملامت نیا رسید   این بیقرار دل کہ جگر گوشۂ غم ست

کلیم ہمدانی

دست مشاطہ اگر زلف ترا تاب دہد   خون دہا گل رخسار ترا آب دہد

جناب امیر مینائی علیہ الرحمۃ

ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ حباب   اسی انداز سے کہدے کہ نہیں تھوڑی سی

نظیری

در گریبانے کہ غم آویخت کمتر شد درست   خوشدلی کم دوخت دامانے کہ کس بر وا نشد

کلیم

بر دلم ایں ہمہ پیکان ستم بار نبود   گرہ غنچہ گراں بر دل گلزار نہ بود

نواب یوسف علیخاں۔ ناظم

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے   مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہوگیا

ولہ

نو بہار آئے اور کیا ہوگا   کچھ نکھر جائیگا خزاں کا رنگ

ولہ

میرا انکا معاملہ ناظم   کچھ جدا جنگ و آشتی سی ہے

فقط

نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی (مرحوم)

چلیگی داورِ محشر کے آگے دو بدو کیا کیا
کہونگا تجھکو میں کیا کیا کہیگا مجھکو تو کیا کیا

ہوئے ہیں عشق میں عشاق رسوا چار سو کیا کیا
مٹی ہے آبرو والوں کی اسمیں آبرو کیا کیا

یہ ہے شوقِ شہادت دیکھتے ہی شکلِ قاتل کی
مری رگ رگ سے دیکھو پھوٹ نکلا ہے لہو کیا کیا

کسی کے ناز نے مارا ہے مجھکو یہ علامت ہے
رہیگی قبر پر میری بہارِ ناز بو کیا کیا

نہ کٹتے ہی بن آتی ہے نہ رکتے ہی بن آتی ہے
ہمارے دل ہی دلمیں پھر رہی ہے آرزو کیا کیا

وہ میکش ہوں چلا جب پی پلا کر بزمِ ساقی سے
مرا دامن پکڑنے کو بڑھا دستِ سبو کیا کیا

کوئی جلسہ نہیں چھٹتا کوئی محفل نہیں چھٹتی
کیا کرتے ہیں ہم پھر پھر کے اس کی جستجو کیا کیا

جو تو ہو مہرباں کل مہرباں ہوں یہ مثل سچ ہے
ہمارے دوست بنتے ہیں کئی دن سے عدو کیا کیا

دمِ رخصت جگایا مجھکو دامن کی ہوا دے کر
بجھا ہے صبح ہوتے ہی چراغِ آرزو کیا کیا

جفا بھی کرتے جاتے ہیں وہ ڈر کر پوچھتے بھی ہیں
مرے شکوے کریگا داورِ محشر سے تو کیا کیا

وہ کہتے ہیں کہ اس میں خون کی دو چار بوندیں ہیں
کہلائیگا ہمیں مہمان رکھ کے دل میں تو کیا کیا

کبھی جو لگگئی مے تشنگی میں ایک چلو بھی
بڑھا ہے چلوؤں میرے بدن میں پھر لہو کیا کیا

نمازیں عالمِ مستی میں ہمنے ساتھ زاہد کے
ادا کیں با وضو کیا کیا پڑھی ہیں بے وضو کیا کیا

شہیدونکے لئے زیبا ہیں اے قاتل یہی زیور
ترے شمشیر و خنجر ہوتے ہیں زیبِ گلو کیا کیا

تپش سے درد سے نالوں سے فرقت میں نہیں فرصت
مرے لینا ہے دل کیا کیا جگر کیا کیا گلو کیا کیا

الٰہی عاشقی میں ہم بڑے تقدیر والے ہیں
سنے ہیں خوش گلو کیا کیا چنے ہیں خوبرو کیا کیا

دسا اندازونکے کہنے پر نہ جاؤ تم وہ کہتے ہیں
ہمارے روبرو کیا کیا تمہارے روبرو کیا کیا

کوئی جانے تو کیا جانے کہ یہ ہیں راز کی باتیں
رہی ہے دل ہی دل میں میری انکی گفتگو کیا کیا

رہی ہے داغ پر کیسی عنایت شاہ آصف کی
نکالی آرزو کیا کیا بڑھائی آبرو کیا کیا

از نسیم دکن

تارپیڈو

یہ لفظ اصل میں لاطینی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی مچھلی کے ہیں۔ چونکہ جہازونکو تباہ اور برباد کرنیکا یہ آلہ پہلے پہل مچھلی ہی کی شکل وشباہت کا بنایا گیا تھا اور نیز یہ آلہ سطح آب سے نیچے نیچے ہی چلایا گیا تھا اسلئے اس خوفناک کشتی کا مندرجہ عنوان نام ہی زیادہ مناسب معلوم ہوا۔

بڑی لڑائیوں میں کام آنے والے جہاں اور عجیب عجیب آلات حرب ایجاد ہوئے ہیں وہاں دشمن کے جہازونکو بحری لڑائی میں تباہ اور برباد کرنے کی غرض سے اس قسم کی خوفناک کشتی بھی ایجاد کی گئی ہے جو ان آلات حرب میں سے ایک عجیب وغریب ایجاد اور کمال فن انجنیری اور سائنس کا اعلیٰ ترین نتیجہ ہے۔

فلٹن۔ اور بشنل ان دو مشہور آدمیوں نے سنہ ۱۷۷۷ء میں اس خوفناک کشتی کی ایجاد کی تھی جو سنہ ۱۷۷۷ء اور سنہ ۱۸۱۲ء میں برطانیہ اعظم اور امریکہ کی جنگ میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

اس جنگ کے بعد اس میں کسیقدر ترمیم اور اصلاح کی گئی اور علاوہ اسکے دوسری اور دو طرح کی کشتیاں ایجاد ہوئیں جس میں سے ایک تو کل کے ذریعہ سے سطح سمندر سے نیچے نیچے چلنے والی تھی جسکو دشمن کے جہاز کے طرف سیدھی کرکے اور کل پھیر کر چھوڑ دیتے تھے جو پانی کے اندر اندر چلکر جس جہاز کو نشانہ بنانا مدنظر ہوتا اس سے خود ٹکرا کر پھوٹ جاتی اور اس طرح سے اسکو تباہ اور برباد کردیتی۔

اور دوسری قسم کی تارپیڈو کشتی جسکا خاص نام سب مرین مائن یعنے سمندر کے اندر پیدا ہونی والی سرنگ رکھا گیا ہے اس قسم کی کشتیاں مخالف کے جہازوں کی آمد ورفت کے راستوں میں قطار در قطار سطح سمندر سے نیچے لنگر کے ذریعے سے قایم کی جاتی ہیں اور ایک کشتی سے دوسری کشتی تک اسکے ڈائنامیٹ کی مقدار کے مطابق فاصلہ رکھا جاتا ہے چنانچہ جس تارپیڈو میں ایک سو پونڈ باروت ہوتی ہے وہ دوسرے تارپیڈو سے ایک سو فیٹ کے فاصلے پر قایم کیا جاتا ہے مگر دراصل سب مرین مائن خود اسکے قائم کرنیوالے کے لئے بھی نہایت خطرناک

ہوتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب دشمن کے جہازوں کو شکست دیکر اپنے جہازونکو آگے بڑہاتے ہیں اسوقت ایک نہ ایک سب مرین مائن سے ٹکر ہو جاتی ہے لیکن ایسے موقعوں سے بچکر نکلنا درحقیقت ایک نہایت ہوشیار امیرالبحر کا کام ہے۔

سب سے پہلے روسیوں نے ۱۸۵۵ء میں سب مرین مائن کو بحیرہ بالٹک کی جنگ میں استعمال کیا تہا۔ لیکن امریکہ کی باغیانہ لڑائی میں جو ۱۸۶۱ء میں واقع ہوئی تہی اس میں اس طرح کی دریائی سرنگیں بکثرت استعمال کی گئی تہیں۔ اور ان سرنگونکی بدولت بڑی کامیابی ہوئی تہی۔ عین وقت پر کئی جہازوں کے نیچے انکے پہوٹنے سے ہزارہا جانونکا آن کی آن میں خاتمہ ہو گیا تہا۔

۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں فرانس اور جرمن کی لڑائی میں فرانس والے اپنے جہازوں کو بندرگاہ میں لیجانے سے اسی وجہ سے ڈرتے تہے کہ مبادا کہیں راستوں میں جابجا سمندری سرنگیں نہ لگی ہوں۔

اس قسم کی سرنگوں کی جو لنگر اندازی کے ذریعے سے سطح آب سے نیچے قائم کیجاتی ہیں ایک بڑے کاریگر نے اصلاح کرکے انکی دو قسمیں کردی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی جہاز کا دہکا کہاکر خودبخود اڑجاتی ہے۔

اور دوسری وہ ہے جسکو اڑادینا اڑانے والے کے اختیار میں ہوتا ہے اور اس قسم کے تارپیڈو میں جہاں وہ لنگر کے ذریعے سے قائم کیجاتی ہے اسکے اوپر اس کی علامت کے لئے ایک غیر قابل توجہ چیز باندہ دیتے ہیں جو پانی پر تیرتی رہتی ہے اور کنارے پر کہڑے ہوکر اگر زیادہ طاقت کی دوربین سے اس علامت کو دیکہیں تو نظر آسکتی ہے علاوہ اسکے اس تارپیڈو سے کنارے تک ایک باریک برقی تار لگا رہتا ہے جسوقت کسی جہاز کو اس علامت کے قریب سے گذرتے دیکہتے ہیں تو فوراً اس برقی تار کے ذریعے سے اس تارپیڈو کے ڈائینامٹ میں بتی دیکر اسکو اڑادیتے ہیں جسکے اڑتے ہی اس پر سے یا اسکے قریب سے گذرتا ہوا جہاز دیکہتے ہی دیکہتے برباد اور تباہ ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے اڑانے اور کل کے ذریعے سے چلانے کے رازکا حق اسکے موجد نے آسٹریا روس اور برطانیہ اعظم کی سلطنتوں کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ فن جہازرانی اور خصوصاً بحری جنگ میں کام آنے والے آلات حرب

کی موجودہ زمانہ میں اس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے اور ہوتی ہی چلی جاتی ہے۔ اول اول
جسقدر تارپیڈو کشتیاں ایجاد ہوئیں وہ سب کی سب غیر اختیاری تہیں ان میں سے بعض سمندر کی
سطح کے نیچے قائم کی جاتی تہیں اور بعض کل سے چلا کر دشمن کے جہاز کی طرف چہوڑ دی جاتی
تہیں اور یہ کشتیاں چونکہ ہر طرف سے بند ہوا کرتی تہیں اسلئے ان میں کسی آدمی کے بیٹھنے کی کوئی
جگہ بنائی نہ گئی تہی۔ لیکن ۱۸۸۸ء میں پیرس کے ایک مشہور شخص گیوبٹ نے اس ماہی نما پرخطر
کشتی میں بہت بڑی ترمیم کی اور اس کشتی کے سرے پر اس کی سطح سے ذرا اونچی ایک گنبد نما
چہوٹی سی جگہ بنائی جس میں دو آدمیوں کے سروں کی آسانی سے سمائی ہوسکتی ہے اور اس
گنبد میں کہلنے اور بند ہونے والے کُلدار شیشہ کے دریچے لگائے اور اس میں ہوا کے
لئے ایک خزانہ بنایا جس میں اسقدر ہوا محفوظ کیجا سکتی ہے کہ ۶۰ گہنٹے تک دو آدمیوں کے
سانس لینے کو کافی ہوسکے اور اس میں اسقدر کاسٹک پوٹاس (ایک دوا) بہرا جاتا ہے
کہ جسقدر کاربونک ایسڈ گیاس سانس لیتے وقت نکلے وہ سارا گیاس اسی میں جذب ہوجائے۔
علاوہ اسکے اس کشتی کو سطح آب کے نیچے سے ابہارنا اور اسکو غوطہ دینا اس میں بیٹھنے والوں کے
بالکل اختیار میں رکہا گیا ہے اس میں ایک ایسا خزانہ بنایا گیا ہے جس میں اس کشتی کو سطح آب
سے جسقدر نیچے لیجانا مدنظر ہوتا ہے اُتنا ہی پانی بہر لیا جاتا ہے جسکے وزن سے وہ کشتی ڈوب
جاتی ہے اور جسوقت اسکو اُبہارنے کی ضرورت ہوتی ہے اُسوقت ایک کل سے جو پانی اس
خزانے سے کہینچکر باہر نکال دیتی ہے سارا پانی خالی کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کشتی سطح آب
پر اندر سے اُبہر آتی ہے اس کشتی کے ایک سرے پر ایک سو دس پونڈ کا ڈائنامٹ بندھا رہتا ہے
اور جب کسی جہاز کو اڑا کر برباد کر دینا مقصود ہوتا ہے تو یہ کشتی ایک مکار بط کی طرح کبہی پانی میں غوطہ
لگاتی اور کبہی ابہر کر سر نکالتی ہوئی بڑی ہوشیاری سے اس جہاز کے نیچے یا اسکے قریب پہونچکر
اپنے سرے پر بندھا ہوا ڈائنامٹ اس جہاز کے پاس چہوڑ کر اس برقی تار کو کہولتے ہوئے
جسکے ذریعے سے اس ڈائنامٹ میں بتی دی جاتی ہے خود اسقدر پیچہے ہٹتی ہے کہ اسکے
پہوٹنے سے اسکو کچہ صدمہ نہ پہنچ سکے اور اسطرح اس ڈائنامٹ کو سلگا کر اس جہاز کو
تباہی کے گہاٹ اتارتی ہے۔

یہ کشتی اسقدر چھوٹی اور ہلکی بنائی گئی ہے کہ اگر اس کی برقی طاقت جس سے وہ چلائی جاتی ہے خراب ہو جائے تو خود اس میں بیٹھے ہوئے وہی دو آدمی بڑی آسانی سے اسکو بلیوں سے کھیکر واپس لا سکتے ہیں۔

نارڈنفلٹ ایک مشہور انجینر نے اس کشتی کو بھاپ سے چلایا اور اس میں ایسے خزانے بنائے جن میں دو مرسے بائی لر (Boilers) میں تیار شدہ بھاپ لی جاتی ہے اور نیز ہوا کے لئے اس میں اسقدر کافی جگہ بنائی ہے کہ چار آدمی کئی کئی گھنٹوں تک بلا کسی قسم کی تکلیف کے رہ سکتے ہیں اور یہ خوفناک کشتی گیوبٹ صاحب کی بنائی ہوئی کشتی سے بہت بڑی ہے اس کی لمبائی ۶۴ فیٹ اور چوڑائی ۱۱ فیٹ کی ہے۔ اکثر چروٹ پینے والے شوقین لوگوں نے تارپیڈو چروٹ پئے ہونگے یہ کشتی بعینہ اس چروٹ کی مشابہ ہوتی ہے اور سمندر کی سطح پر اندر سے ابھر کر چہار طرف دیکھنے کے لئے اس میں بھی ایک چھوٹا سا گنبد بنا ہوتا ہے جس وقت گنبد اوپر نکل آتا ہے اُس وقت اس کشتی کے اندر کی ساری خراب ہوا ایک کل کے ذریعے سے اوپر اڑا دی جاتی ہے اور تازی ہوا اسکے عوض بند کر لی جاتی ہے۔

ان سب کے آخر میں قریب قریب اس قسم کی ایک اور نئی کشتی ایجاد ہوئی ہے اور اسکا شرف امریکہ کے ایک شخص کو حاصل ہوا ہے جس میں یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ نہ اسکو چلانے کے لئے آگ اور پانی سے کام لیا جاتا ہے اور نہ اسکے لئے تیار شدہ بھاپ یا برقی قوت کی ضرورت ہے بلکہ اس کشتی کا انجن چلانے کے لئے کاسٹک اور سوڈا کا ایک مرکب سیال، حرارت اور بھاپ کا کام دیتا ہے۔ اور اس طرح سے ان آبی گولوں سے دشمن کے بیڑے کو تباہ اور برباد کرنیکا کام لیا جاتا ہے۔

عبدالغنی خاں رافت

از حیدرآباد دکن

شاعری

گلشن شاعری کی بہار دید کی متقاضی ہے۔ ہر گل اپنے حسن پر پھولا ہے اور اپنی دلفریبی پر پھولا نہیں سماتا۔ غنچوں کا تبسم مجازاً اُن کی حقیقت پر شاہد ہے۔ ڈالیوں کی لچک سے یہ رونق دونی ہو گئی ہے مگر سادگی پسند طبعیتیں سبزے کے نظارے میں محو ہیں اور عاشق مزاج دل نالہ قمری اور فغان بلبل سُن سُن کر سر دھنتے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ زمین کس قدر زرخیز ہے جہاں ہر طبیعت اور مزاج کے مذاق کے موافق دلچسپیاں موجود ہیں۔ یہاں پر حکیم افلاطون پر افسوس آتا ہے جنہیں اس کی کوئی ... بھائی اور شاعر وجود معطل نظر آئے ورنہ مبدءِ فیض نے اس کی آبیاری کے لئے ایسا سامان مہیا کر رکھا ہے کہ کبھی یہ ہرا بھرا چمن خشک نہ ہوگا۔ پھر پھولوں کی مہک۔ شاخوں کی لچک۔ طائران خوش الحان کی چہک تعجب ہے جو کسی دل کو بے لبھائے رہیں۔ قوت متخیلہ اس باغ کی وہ باغبان ہے جو کبھی کسی شاخ کو ناموزوں طریقے سے بڑھنے نہیں دیتی۔ اسی نے شاعر کو تلمیذ الرحمٰن کا خطاب دلوایا اور اب وہ اسی نام سے ہر جگہ پکارا جاتا ہے۔

قوت متخیلہ یا امیجنیشن جس وقت خیالات کو الفاظ کا لباس پہنا کر اور استعاروں اور تشبیہوں کے زیور سے آراستہ کر کے بزم سخن میں پیش کرتی ہے تو اہل بصیرت کو عجیب لطف آتا ہے۔ اُس پر سے عبارت موزوں، گویا جو قدم پڑتا ہے باقاعدہ اور سنبھا ہوا۔ اس خرام کا لطف سب پر بالا ہے۔ اور محاورے کی صفائی۔ زبان کی چاشنی کیسی رنگینی پیدا کر دیتی ہے کہ زبان اُس سے کو بیان نہیں کر سکتی۔ مصور اس قوت متخیلہ کے عملوں کو ایک تختۂ کاغذ پر دکھلاتا ہے ... سنگتراش اسی کے بتائے ہوئے راستے پر اپنی چھینی چلاتا ہے مگر شاعر باتوں ہی باتوں ... وہ مرقع سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے کہ آنکھیں کچھ نہیں دیکھتیں مگر دل میں اُسکا عکس نمودار ہو جاتا ہے ... تو سہ

آئے ہیں میر مُنہ کو بنائے خفا سے آج
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اُس بیوفا سے آج (میر)

شاعری خیالات کی خوبی اور نظم اُسے خوش اسلوبی کے ساتھ الفاظ میں لاتا ہے۔ زباندانی سے مراد اس اظہار میں مدد دینا ہے اور استعارہ گویا اشاروں ہی میں اصل مدعا کو ادا کرتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت جو لطف کنایوں میں باتیں کرنے میں آتا ہے وہ کہنے میں نہیں۔ مبالغے میں کسی بات کو حد سے بڑھا دیتے ہیں پھر بھی اپنے موقع پر وہ ایک مزے کی چیز ہے۔

شاعر کو قوت متخیلہ کی ضرورت اسلئے ہے کہ یہی شاعری کا مخرج ہے۔ عبارت موزوں یعنی نظم اسلئے رکھتے ہیں کہ وہی اسکا معیار ہے۔ ورنہ جسے شاعری کہتے ہیں وہ اس پابندی سے آزاد ہے۔ زباندانی کی ضرورت یوں آن پڑتی ہے کہ ہر چیز کی تصویر لفظوں میں کھینچنی پڑتی ہے پھر الفاظ کے معنی لغت میں کچھ اور، مگر روزمرہ کے استعمال نے اُنہیں کچھ سے کچھ کر دیا ہے اور اکثر موقعوں پر ایک لفظ سے جو کام نکلتا ہے وہ سطروں میں نہیں آئیگا۔ مثلاً

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بیخزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی، میہماں (حالی)

صرف ایک لفظ بدیسی نے پورا مطلب کس خوبی سے ادا کر دیا ہے۔

تشبیہ اور استعارے سے کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک تصویر کھینچنے میں زیادہ مدد ملتی ہے اور دوسرے سے اُنکے دلنشین کرنے میں اور بھی زیادہ۔ ان دونوں کی لفظی ترکیب کا فرق صاف ہے اور معناً دونوں یکساں ہیں مگر لطف میں زمین و آسمان کا فرق ہے دیکھو کمان ابرو، تیغ ابرو، اگر اسے یوں کہو کمان کی سی بھویں اور تلوار کی سی بھویں تو بات وہی مگر مزہ نہیں اور اگر یوں کہیئے کہ تلوار کی طرح کھنچی ہوئی اور کمان کی طرح چڑھی ہوئی، تو اور ہی لطف آجاتا ہے مگر بات بڑھ گئی۔ پھر بھی کبھی کبھی سیدھی سادی بات میں وہ لطف آتا ہے جسپر لاکھوں بناوٹیں قربان اور حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا ایک موقع ہے اور یہ بتانے سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ شاعر خود تلاش کر لیتا ہے اور اُس کی بتانے والی قوت متخیلہ ہے۔

شاعر جب اپنے خیالات کی روشن دنیا میں سیر کو نکلتا ہے تو اُسے وہ نظارے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں دکھائی دیتے ہیں اور وہ اُنپر سے حجاب دور کر کے اُسے منظر عام بنا دیتا ہے وہ بے زبانوں کی زبان سے باتیں سنتا ہے اور دوسروں کو اسطرح سے اور ہر مخاطب کر دیتا ہے کہ

وہی ترانہ سننے لگتے ہیں - خوب غور کرو - ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہ لاشریک لہ گوید (فیضی)

جب وہ شاعری کے اسٹیج پر ایکٹ کرتا ہے تو ہر لحظہ نیا بھیس بدلتا ہے کبھی ایک حسن پرست عاشق کی صورت معشوق کی زلف دراز کے خیال میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور نرگسی آنکھوں کی یاد میں حیران و سرگرداں - کبھی دنیا سے برداشتہ خاطر ہو کر معشوق حقیقی کے دھیان میں محو ہو جاتا ہے ہر شے میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے - درختوں کے پتوں پر خدا کی معرفت لکھی ہوئی نظر آتی ہے اور جو آواز کان میں آتی ہے وہ حمد خدا کا ترانہ معلوم ہوتا ہے - شجاعت کا جوش اٹھا تو ایک نہیں ہزاروں اپنے جیسے میدان میں لاکر کھڑے کر دئے جنکے آگے رستم ایک بچہ معلوم ہوتا ہے اور زال کی حقیقت ایک پاسنگ سے زیادہ نہیں نظر آتی نعروں کی صداؤں سے گنبد گردوں گونج اٹھا اور تحت الثرےٰ میں گاؤ زمین تھرا گئی - یکایک بزم کا خیال آیا تو آسمان نیلگوں شامیانہ بنکر سایہ افگن ہو گیا اور ستارے حسن نگیں جو اپنی اپنی جگہ پر رقصاں ہیں - زہرہ و مشتری کی گردشیں رقص کا لطف دیتی ہیں ماہتاب جام شراب بھر بھر کر پیش کرتا ہے اور آفتاب کو صبوحی کا انتظام سپرد ہے - ایک مدت تک مجنوں بنا ہوا ریگستان میں خاک چھانتا پھرا - پھر فرہاد کا روپ بھرا اور سر پھوڑ کر جان دی مگر مرنے پر بھی محبوب سے نہ گئی اور اس کشتہ ناز کو اب بھی حسرت وصل باقی ہے - ؎

ہم غریبوں کا اندھیرے میں نکل جائے گا کام
آئیں تو وہ شمع تربت کے بجھانے کے لئے

کبھی مستی کے عالم میں باغ کی طرف جانا ہو گیا تو گلوں نے قہقہہ لگا - جام شراب بھر کر نذر کیا - غنچے سر بمہر بوتلیں سامنے لائے - سبزوں میں بھی سبز مینا کی جھلک نظر آئی اور بلبلوں نے ترنم میں زمزمہ سرائی کی - اسکے علاوہ پھولوں کا کھلنا گویا اُنکا ہنسنا ہے اور کلیاں پھولے سماتیں - ہر چند ہنسی کو ضبط کیا مگر مسکراہٹ لبوں پر آ ہی گئی - شبنم کو یہ ادا بہت بھائی اور آسمان سے موتی لٹائے - ماہتاب نے چاندنی کا فرش بچھا دیا تاکہ صبا جو اس جلسے کی تشہیر سے ہو کر گذرے تو اُسکا پاؤں نہ پھسلا ہو - مگر وہ خود خوشی میں کب زمین پر پاؤں

رکھتی ہے۔

اسی عالم محویت میں طبیعت نے پلٹا کھایا۔ دلمیں حسرت و یاس کا اسدرجہ ہجوم ہوا کہ خوشی کو رہنے کی جگہ نہ ملی۔ وہ عیش و عشرت کا سماں ماتم خانے کا نظارہ ہوگیا۔ بلبل کی صفت نالاں ہے اور شبنم الگ پتوں میں منہہ ڈہانپ کر رو رہی ہے۔ درخت اپنا سر دُہن رہے ہیں پہول ہمہ تن گوش ہوش بنے بے ثباتی عالم کا ذکر سن رہے ہیں اور

کلیاں من میں سوچ رہی ہیں جب پل کوئی کملا دیں
جو دن وا کو بیت گیو ہے وا دن ہکو آوت ہیں

سبزہ سبزۂ بیگانہ ہے۔ نرگس عالم فانی کی نیرنگیاں دیکھکر حیرت میں ہے۔ سوسن زباندرازیاں بہولی ہے اور سنبل نے اس غم میں زلفیں پریشان کر لی ہیں۔ سرو کو سکتے کا عالم ہے اور تمام اشجار کف افسوس مل رہے ہیں۔ بے اختیار ہوکر دل بول اٹہتا ہے۔ ؎

گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
حال بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکہہ کہول
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر (میر)

الغرض ہمارا شاعر ہر گھڑی ایک نیا رنگ دکہاتا ہے اور ہر رنگ کو نئے طرز سے جلوہ دیتا ہے دم میں کچہ، دم میں کچہ، مشرق کی سیر کی مغرب کی خاک چہانی۔ ابہی جنوب میں تہا۔ ابہی شمال میں نظر آیا۔ خیال کے پر کہولکر اڑا اور اوج سخن سے تارے توڑ لایا۔ پہر پستی کی طرف جہکا تو تحت الثرے سے موتی نکال لایا۔ کوہ قاف میں پریوں کا تماشا دیکہا اور پہاڑوں کے دامن سے کنکر پتہر چنکر ایک نظر میں ہیرے سے بہی زیادہ چمکایا۔ پہر ہیرے کو اٹہایا اور دم میں پتہر سے بہی زیادہ بے حقیقت کر دکہایا بازار سخن کو طرح طرح کے مضامین سے سجایا کہ خریداران لطف سخن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کوتاہ بین آنکہیں ہمیشہ عیوب کی تلاش میں رہتی ہیں۔ پہر بہی حقدار کا حق کہیں نہیں گیا ہے۔ چاہے حسد داد نہ دے مگر انصاف کا پنجہ اُس کی گردن پر مضبوط پڑتا ہے اور عدول حکمی کی سزا دیتا ہے۔ طبع سلیم کا یہ مقتضیٰ ہے کہ ہر بات کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالے نہ کہ آنکہوں پر تعصب کی پٹی باندہکر عیوب کو ڈہونڈہے یا طرفداری کی عینک لگاکر تہوڑی خوبی کو زیادہ دیکہے۔ مگر نیک نیتی کی نکتہ چینی بجائے ملامت کے مشفقانہ اصلاح ہوتی ہے۔ اور

اُس کی تحسین دلکو بڑہانیوالی - شاعری کے متعلق خود شاعر کہتا ہے - ؎

بموزونی ز دل آہ برآید ہم
گندم کوہ دزاں کاہ برآرم

مولانا فضل عظیم خیرآبادی

یہاں کسیقدر تشریح کی ضرورت ہے - اگرچہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ایک بیکاری کا شغل ہے مگر یہ گہاس کیمیا کی بوٹی ہے جو مسِ خام کو کُندن بناتی ہے -

اللہ اللہ - جن لوگوں نے محض اس توقع پر کہ لوگ اُنکے کلام سے اپنا دل بہلا کر خوش ہونگے اور داد دینگے، اپنی تمام عمر اس فن کے ترقی دینے میں صرف کردی، اُنکی اس کوشش کو رائگاں تصور کر کے اُن کی قدر نکرنا صریحاً انصاف کی آنکھ میں خاک ڈالنا ہے -

محمد فاروق دیوانہ

دُعا

اس ترقی کے زمانے میں جبکہ ہر چیز کی تشریح، تقسیم اور جانچ پڑتال کیجاری ہے عام لوگوں کے خیالات کا رجحان اس طرف پایا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف علم ہی ایک ایسی طاقت ہے جس کا انسان ہر ایک چیز کے لئے محتاج ہے - اگرچہ یہ اصول بہت کچھ سچائی لئے ہوئے ہے اور فی الواقع بمشکل کسیکو اسکے خلاف رائے ظاہر کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے تاہم یہ کہنا ہرگز غلط نہیں ہے کہ یہ اصول صرف اسی جگہ صحیح ثابت ہو سکتا ہے جہاں علم ایک جزو لاینفک تسلیم کر لیا جاوے کیونکہ درحقیقت دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جنکو علم پر ہر طرح فوقیت و فضیلت حاصل ہے -

اخلاقی دنیا میں اس خاص قوت کا نام علم نہیں ہے بلکہ آرزو ہے جسکا بازو دعا ہے - جس شخص میں آرزو کی کمی ہوتی ہے اُسکا دل پژمردہ ہو جاتا ہے اُسکی روح مرجہا جاتی اور اپنا کام کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے - ایسے انسان کی روح مثل اُس پرندکے ہوتی ہے جو پنجرے

میں بند کر دیا گیا ہو اور جسکو اپنی ہی قفس کی تیلیاں گننے کے سوا دوسرا کام نہو اور جو ذرات اپنی رہائی کی فکر میں جان گنوا رہا ہو۔

اس آرزو سے میری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایسا غرقاب ہو جائے کہ اُسے سوائے اپنے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہے یا اپنی خود غرضی میں یہانتک منہمک ہو جائے کہ یہ سمجھنے لگے کہ خدا تعالیٰ کو مجھے آرام دینے اور میری دعاؤں کو سُنکر اُنہیں قبول کرنیکے سوا کوئی اور کام ہی نہیں ہے اور یہ کہ دنیا کے سب قانون میری سہولت اور آسانی کے خاطر ہر وقت و ہر لحظہ تغیر پذیر ہو سکتے ہیں۔

دعا ہم اسلئے نہیں کرتے کہ ہماری ضرورتوں کی وجہ سے خدا کے احکامات میں ترمیم و تنسیخ ہو بلکہ دعا کرنے سے ہماری یہ غرض ہوتی ہے کہ ہماری آرزوؤں اور اُسکی پاک مرضی میں کچھ اختلاف باقی نہ رہے۔

ہم ہرگز وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اُن خاص معاملات کے متعلق جنکا منسوخ ہونا ناممکن نہیں ہے یا جو مقدر کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دئیے جانے کی وجہ سے اٹل نہیں ہوگئی ہیں ہماری دعا کہانتک کارگر ہو سکتی ہے لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ اپنی شریف فطرت کو اُس مخزن شرافت کے ساتھ وابستہ رکھنے کا اس سے زیادہ قدرتی اور موثر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم اسکے ساتھ دلی تعلق قائم رکھیں اور اپنے آپ کو ایسی عاجزانہ اور بیکسانہ حالت میں اُسپر ظاہر کریں جو مخلوق کو اپنے خالق کے روبرو شایاں ہے۔

کسی شخص کی اخلاقی اور مذہبی حالت دریافت کرنے کے واسطے اصولاً اسباب کے معلوم کرنے سے زیادہ یقینی جانچ دوسری نہیں ہو سکتی کہ اس میں دعا کرنے کی کہانتک قابلیت ہے یا وہ اس خاص جوہر کو کہانتک کام میں لاتا ہے۔

کم از کم اسلامی دنیا میں وہ شخص نہایت ہی احمق اور کور باطن خیال کیا جائیگا جو ظاہرا ذلیل نفو اور حماقت کے کاموں میں خدا سے مدد چاہنے کا عادی ہو۔ ممکن ہے کہ جہالت اور کفر کے قدیم زمانے میں کوئی شخص اپنے ضمیر کی ہدایت کے موافق لات و منات سے شرابخواری اور قتل و غارت کے کاموں میں برکت حاصل کرنے کی درخواست کرتا ہو۔ مگر خدا کا شکر ہے

کو رسول عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے وعظوں اور مذہب اسلام کی روشنی کی بدولت اب ہم اُس تاریکی سے نکل گئے ہیں اور عام تجربے نے ہم پر بخوبی ظاہر کر دیا ہے کہ خاص اور بے ریا دعا جو شریف اور بے لوث طبیعت کا زور دار عنصر ہے اور جو درِ قبول تک پہنچے بغیر کسی طرح نہیں رہتی ایک شریر النفس اور بد باطن شخص کے لیئے اُس زہریلی ہوا کے مانند ہے جسیں سانس لیتے ہوئے اسکا دم گھٹتا اور کلیجہ مُنہ کو آتا ہو۔ انسان کو ہر وقت اور ہر حال میں اُس پاک قادرِ مطلق خدا پر جو تمام نیکیوں کا منبع ہے نظر رکھنا چاہیئے۔

خالص دعا اُس عُجب اور خود بینی کا بھی جو علم حاصل ہونے کے بعد عام طور سے انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور جو اپنے مہلک اثر سے ترقی کو روکدیتا ہے سب سے زیادہ قدرتی زود اثر اور یقینی علاج ہے۔ ہر آڑے وقت میں ہمیں اُسی سے مدد لینا چاہیئے اور اسی کے بازوؤں سے اڑکر منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کی اُمید رکھنا چاہیئے۔

صابر علیخان۔ شروانی

تنقید

دیوان حفیظ معروف بہ نظم دلفریب

از تصنیفات جناب مولانا مولوی سید شاہ نذر الرحمٰن صاحب حفیظ عظیم آبادی۔ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۱۰۰ صفحوں سے زائد۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت فی جلد علاوہ محصول ڈاک عمہ مناسب ہے۔ سید مرتضیٰ حسین صاحب پٹنہ محلہ مغلپورہ سے درخواست کرنے پر ملسکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی دیوان حفیظ ایک اچھا دیوان ہے جس میں ناظرین کو ہر صنف کلام کا پسندیدہ نمونہ ملسکتا ہے۔ سب غزلوں کی نسبت تو ہم نہیں کہہ سکتے البتہ چند غزلوں کی بابت ہماری یہ رائے

ہے کہ انکا انداز بیان آجکل کے مروجہ اندازِ سخن سے بالکل جدا ہے اور اسلئے بہت کچھ قابل تعریف ہے مثلاً ملاحظہ ہو۔

بس سمجھئے نہ ہر دم یوں بیدلوں کا چرچا	لائیگا رنگ اک دن ہم کاملوں کا چرچا
ہمراہ غیر کے تو جن صحبتوں میں بیٹھا	برسوں رہا ہے ظالم ان محفلوں کا چرچا
کیا سُن رہے ہو قصہ ہم کشتگانِ غم کا	کیا بیدلوں کا قصہ کیا بسملوں کا چرچا
لیلی کے قافلے کا کیا ذکر یاں ہے ہمدم	مجنوں سے کیجئےگا ان محملوں کا چرچا
جاتے نہیں جو نالے در تک بھی اس کے کہے	بیکار ہے حفیظ اب ان کاہلوں کا چرچا

اس غزل کی روش خصوصاً ردیف قافئے کا طرز موجودہ زمانے کے پامال رنگ کے خلاف مصحفی و عیشی کے قدیم انداز سے مشابہ ہے۔ اب ایک اور غزل اور اُسکی رنگینی مضمون ملاحظہ ہو۔

باغِ جہاں کی تھی ہوس اسکی بہار دیکھکر	حشر میں ہم مچل گئے جلوۂ یار دیکھکر
جذبۂ دل فزوں ہوا کوچۂ یار دیکھکر	بک گئے ہم جنوں کے ہاتھ جوشِ بہار دیکھکر
بادہ پرست ہیں مگر واں بھی اختیار ہے	توبہ کرینگے ہم مگر ابکی بہار دیکھکر
مے بھی چلی تھی بزم میں شب کو جگہ بھی کہیں	تاڑ گئے حضور ہم کیفِ خمار دیکھکر

ہے جنوں پسند سے ضبطِ فغاں کہاں حفیظ
نالے کرینگے آج ہم جیب کے تار دیکھکر

دیگر

یہ مجازی ہے جو اک پردہ نشیں آنکھوں میں ہے	وہ حقیقی ہے جو صورت آفریں آنکھوں میں ہے
کیا ٹھکانا ہے شبِ غم میں ترے بیمار کا	حسرتِ دیدار ہے جانِ حزیں آنکھوں میں ہے
کس غضب کی کیا کہوں ہمدم یہ ہے عشوہ گری	حسن بگڑا انکا روئے خشمگیں آنکھوں میں ہے
جس سے ہو جاتے تھے سو ٹکڑے دلِ رنجور کے	اب کرشمہ بنکے وہ چینِ جبیں آنکھوں میں ہے
نزع کا عالم ہے گھبرائی ہوئی پھرتی ہے روح	دم کہیں لب پر شبِ غم میں کہیں آنکھوں میں ہے

چند ساعت ضبط نالہ کرکے بھی دیکھا حفیظ
اب تلک وہ سوز آہِ آتشیں آنکھوں میں ہے

حکیم آغا حسن آزل لکھنوی مرحوم شاگرد صبا کہ حضرت حفیظ کے اُستاد تھے انکی غزل کا کیا کہنا۔ اسپر حضرت حفیظ کا مخمس بھی اچھا ہے ملاحظہ ہو۔

یوں تو ظاہر میں باخدا ہیں ہم
سُن لے چپکے سے کتنے کیا ہیں ہم
زاہد و شیخ کے بھی پیشوا ہیں ہم
طالبِ جامِ ساقیا ہیں ہم
پر چھپا کر کہ پارسا ہیں ہم

رنج فرقت کے ہمسے اُٹھوائے
اب بھی تشریف آپ کیوں لائے
آپ سے ہمنے دکھ بہت پائے
نزع کے وقت دیکھنے آئے
جائیے آپ سے خفا ہیں ہم

دیکھنا کہ آزل مرحوم کے اس آخری شعر سے سادگی بیان و مضمون کی کیسی پُردرد اور نرالی شان پیدا ہے۔ اسی غزل میں اُنکے چند اشعار اور بھی داد طلب ہیں۔ شلاً

کون کافر یقین کرتا ہے
لاکھ یہ بت کہیں خدا ہیں ہم
آپ کے دل سے دل نہیں ملتا
پاس بیٹھے ہیں اور جدا ہیں ہم
قیس میں ہم میں فرق اتنا ہے
پیشوا وہ تھا رہنما ہیں ہم
آج گلشن میں کہہ رہے ہیں آزل
تیرے شاگرد اے صبا ہیں ہم

اس دیوان میں صرف ایک بات قابل اعتراض ہے وہ یہ کہ بعض بعض غزلوں میں زبان کی ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جنسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ غزلیں نہ تو کسی اُستاد کی نظر سے گذریں اور نہ حضرت حفیظ نے اُنپر دوبارہ نظر کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔

مثلاً لکھا ہے ؎

گلشن میں ادا سے نہ چلو چال خدارا
ہو جائے نہیں خوں کی کہیں کبک دری ہے

یہاں نہیں کے بجائے "نہ" چاہیے۔ یا لکھا ہے ؎

اسی امید پہ بیٹھا ہوں در پہ آپ کے میں
پسِ فنا مجھے کوچے میں اپنے جا دینا

یہاں "جا دینا" کے ساتھ "تمہارے در پہ" چاہیے۔ "آپ" کے ساتھ "جا دیجیگا" کا موقع تھا
دیگر ؎

جو تیر تری شفقت سے قاتل رہا ہوا
وہ میرے مرغِ جان کو تیرِ قضا ہوا

کتابت کی غلطی کے علاوہ "مرغ جان میں" بہ موجودگی اضافت، اعلانِ نون ناجائز ہے وغیرہ۔ مگر اتنے بڑے دیوان میں چند غلطیوں کا رہجانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے چنانچہ بمقتضائے انصاف آپنے ایک مقطع میں خود ہی لکھدیا ہے کہ ؎

میرا دیوان ہے قرآن نہیں ہے یہ حفیظ
کیوں کہوں میں غلطی سے ہے یہ دیوان محفوظ

(۲) گلزارِ نسیم مع انتخابِ دیوان نسیم لکھنوی

مرتبہ پنڈت برج نراین صاحب چکبست بی۔ اے۔ لکھنوی حجم تقریباً ۸ جزو تقطیع ۲۰ × ۲۶ قیمت ۸ر
پنڈت ترلوکی ناتھ صاحب کول کشمیری محلہ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

اردو زبان کی کتابوں سے متعلق ایک حد تک یہ عیب خاص ہے کہ جو کتاب جتنی زیادہ چھپے اور بکیگی اُتنی ہی زیادہ غلطیاں اُس میں پائی جائینگی۔ چنانچہ مثنوی گلزارِ نسیم کی بھی بعض نالائق مطبع والوں نے بُری گت بنا رکھی تھی بارے مقام شکر ہے کہ پنڈت برج نرائن صاحب کی کوشش سے یہ ایک صحیح نسخہ عمدہ کاغذ پر خوشخط چھپا ہے۔ مثنوی کے آخر میں دیوان نسیم کا کچھ انتخاب

بھی شامل ہے جو بجائے خود قابل دید ہے۔ اور شروع میں ایک دیباچہ پنڈت صاحب موصوف کا لکھا ہوا ہے جس میں نسیم کے سوانح زندگی درج ہیں اور اُنکے کلام پر رائے زنی کی گئی ہے۔ شائقین اس کتاب کو ضرور منگوائیں۔

نسیم کے اندازِ سخن اور مولانا حالی کے اعتراضوں کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اسکے بعض حصوں سے ہمکو اتفاق نہیں ہے۔ ہم کسی موقع پر اس بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھینگے۔

(۳) قوانین دولت

یعنی اردو ترجمہ پولیٹکل اکانومی مصنفہ ایس بل صاحب از مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب تقطیع ۲۲×۱۸ - حجم ۴ جزو قیمت ۸؍ منیجر صاحب رسالہ عصر جدید مالیر کوٹلہ سے ملسکتی ہے۔

اس کتاب میں پولیٹکل اکانمی یعنی علم سیاست مدن کے تمام ضروری مسائل اس انداز سے بیان کردیے گئے ہیں کہ مبتدی بھی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

حقیقت میں یہ کتاب اس لائق ہے کہ افسران سررشتہ تعلیم اسے ابتدائی جماعتوں کے نصاب تعلیم میں داخل کردیں۔

(۴) ڈراما پر ایک دقیق نظر

از نتائج جناب سید محمد حسین صاحب سکینڈ ماسٹر ہائی اسکول جھالراپاٹن تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۲۰ صفحے قیمت نامعلوم غالباً ۴؍ ر- مولف سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

اردو زبان میں اس مضمون پر غالباً یہ پہلا رسالہ ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھا رسالہ ہے پہلے ڈرامے کی تعریف کی ہے پھر اقسام ڈراما یعنی ٹریجیڈی و کمیڈی کا تھوڑا سا بیان ہے۔ اسکے

بعد یورپین ڈراما سنسکرت ڈراما اور اردو ڈراما پر ایک علیحدہ علیحدہ بحث کی ہے۔ اردو ڈراموں کے متعلق حضرت مولف کا افسوس بالکل بجا ہے کہ اسوقت تک سوائے اندر سبھا امانت کے کوئی ڈراما قابل ذکر تصنیف نہیں کیا گیا۔ یہ جو بعض ڈرامے تھیٹر کے لئے لکھے بھی جاتے ہیں انکے مصنف اردو زبان کی ٹانگ توڑتے ہیں اور بس۔

غرضکہ یہ رسالہ نہایت دلچسپ ہے۔ ایک نقص البتہ ہے وہ یہ کہ مولف نے صحت زبان کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔

مثلاً لکھا ہے کہ" اردو زبان میں صدہا ڈراما لکھے گئے"

یہاں" ڈرامے" بصورت جمع ہونا چاہیئے تھا۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو حروف عامل کے آنے پر ڈرامے کے الف کو بھی بدل جانا چاہیئے۔ مثلاً کتاب کا نام بجائے" ڈراما پر ایک نظر" کے" ڈرامے پر ایک نظر" ہونا چاہیئے۔

ڈراما ایک غیر زبان کا لفظ ہے اور اسلئے ممکن ہے کہ مندرجہ بالا اعتراض بیجا قرار دیا جاوے اسلئے ہم بطور نمونہ ایک اور غلطی کا ذکر کرتے ہیں جو اکثر لوگوں سے سرزد ہوتی ہے اور وہ" نہیں" اور" نہ" کے استعمال سے متعلق ہے۔

محمد سعید حسین صاحب لکھتے ہیں کہ" ایسا مضمون کسی بزرگ قوم کے قلم سے نکلتا، کہ پبلک کو جائے گفتگو باقی نہیں رہتی"۔

یہاں صاف ظاہر ہے کہ" نہیں" کے بجائے" نہ" چاہیئے۔

(۵) سوانح عمری ملکہ معظمہ و آئین قیصری

شمس العلما جناب مولانا مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی کا نام ضخیم تصانیف کے لئے مشہور ہے یہ کتابیں چونکہ حجم میں بہت زیادہ ہوتی ہے اسلئے انکی لٹریری خوبی کی جانب مولانا کو زیادہ توجہ کرنیکی فرصت نہیں ہوتی بلکہ بعض حالتوں میں، مثلاً تاریخ ہند کے بعض مقامات پر، تو غا

آپ کو نظر ثانی کی بھی نوبت نہ آئی ہوگی - بہرحال اگرچہ ادبی حیثیت سے ان کتابوں کا درجہ بہت زیادہ بلند نہیں ہوتا لیکن اُنکے مفید ہونے میں کسیکو کلام نہیں ہوسکتا - حال میں آپنے ملکہ معظمہ مرحومہ کی سوانح پانچ جلدوں میں لکھے ہیں جنمیں سے پہلی جلدمیں روز ولادت سے یوم وفات تک وہ حالات و سانحات ملکہ معظمہ کی زندگی کے لکھے ہیں جو انکی شاہنشاہی اور فرمانروائی سے چنداں سروکار نہیں رکھتے جن کی تفصیل یہ ہے - نسب - ولادت - بچپنا - تعلیم و تربیت - کم عمری کے حکایات صالح - جودت طبع و ذکاوت کی باتیں تفریح طبع کے لئے کھیل تماشے - شاہزادہ ایلبرٹ کی خاص ذات والاصفات کے حالات کا بھی بیان اسی ترکیب سے - ملکہ معظمہ کی تخت نشینی و تاج پوشی - انکا بیاہ - دونوں و شوہر کا ایک جان دو قالب ہونا - خانگی انتظامات - دونو کے ساتھ سیر و سیاحت - کل اولاد کی ولادت - ہر بچے کی تعلیم و تربیت - اس کی شوخیوں اور کھیل کود کی دلچسپ حکایتیں - انکے فرزندان ارجمند کی سیر و سیاحت - انکی شادیوں اور بیاہوں کا بیان ملکہ معظمہ کے شوہر والا گوہر کی وفات انکی بیوگی کے حالات جان فرسا - ملکہ معظمہ اور انکے شوہر کی خط و کتابت، عزیز و اقربا و فرمانروایان یورپ کے ساتھ مختلف قسم کے جلسوں میں دونو کی تقریریں - انکی رعایا پروری و عدل گستری کا بیان - غرض اس قسم کے مضامین تحریر ہوئے ہیں جن کی صرف پیشانیوں کی فہرست ۲۱ صفحوں میں لکھی گئی ہے اور کل حالات مذکورہ ۹۰۰ صفحوں میں ہیں قیمت ؏ - محصول ۵/

پانچویں جلد کا نام آئین قیصری ہے اس میں مضامین مفصلہ ذیل ہیں - مولف نے جو ترقیاں خود دیکھی ہیں - ساری دنیا میں قیصر ہند کی سلطنت کہاں کہاں ہے - ہند و انگلینڈ میں گورنمنٹ کیونکر منتظم و منضبط ہوئی - اس میں وقتاً فوقتاً کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں - بالفعل اس کی کیا صورت ہے - ہندوستان کے لئے قوانین کیونکر مدون ہوئے اور ان میں کیا کیا تغیرات ہوتے رہے - عدالتیں کیونکر مقرر ہوئیں اور اُن کی صورتیں کیا کیا بدلتی رہیں - بحری و بری حدود کس طرح مستحکم و استوار ہوئے - سپاہ کیونکر مرتب ہوئی اسکے اندر کیا کیا انقلابات واقع ہوئے - پبلک ورکس نہروں اور ریلوں کا

مفصل حال تعلیم کی اشاعت کیونکر ہوتی ہے۔ اس تعلیم کا اثر رعایا پر کیا ہوتا ہے ہندوستانی ریاستوں سے برٹش گورنمنٹ کے کیا کیا تعلقات ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں میں کن باتوں کی ترقی ہوئی۔ ہندوستانی ریاستوں کی سپاہ کا بیان۔ ہندوستان کی آمد وخرچ کا بیان ہندوستان سے انگلستان روپے جانے کا بیان ٹیکس کس کس طرح لئے جاتے ہیں۔ نمک اور افیون کے ٹیکسونکا بیان۔ برٹش گورنمنٹ کیا حصہ لیتی ہے اور ہندوستانکی گورنمنٹ کیا لیتی تہی۔ ہندوستانکا افلاس وتمول۔ کتنے سررشتے جدید جاری ہوے۔ کس کس قسم کے انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں وغیرہ۔ اس کتاب کے صفحے ۳۵۰

قیمت عہ محصول ۲ر

حصہ نظم

نتائج فکر جناب رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

دیر تک شور تبسم نمک افشاں نہ رہا	زخم کو دل سے ندامت ہے کہ پنہاں نہ رہا
کون جانے کہ یہ کافر نظری کسکی ہے	خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

ملگئی وحشت دیوانہ کو تہوڑی سی زمیں
اب وہ ہنگامہ سر کوچۂ جاناں نہ رہا

ولہ

بسان خاک رہ جب کوئے جاناں میں زمیں پکڑی	کسی نے جز قیامت پہر نہ میری آستیں پکڑی

ف جناب وحشت کی یہ غزل قدیم رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور اسلئے خاص توجہ کی مستحق ہے۔ ہم بہی آپ کی دیگر غزلوں کے لطف بیان وخوبی الفاظ کی عموماً اور اس غزل کے دوسرے شعر کی خصوصاً داد دیتے ہیں۔ اڈیٹر

ازل کے آئینہ خانے میں کسبِ رنگ ہوتا تھا
کہ میرے عکس نے اک صورتِ اندوہگیں پکڑی

برنگِ تیر آنا اور دل کے پار ہو جانا
یہ خوئے مژگاں کی تو نے اے نگاہِ شرمگیں پکڑی

ہے وقتِ واپسیں بھی دھیان تیرا تیری وحشت کو
جگہ یہ خوب تو نے دل میں اے خلوت نشیں پکڑی

ولہ

بنایا کس کی چشمِ سرمگیں کا رازداں مجھکو
کہ خود دینے لگی تعلیمِ خاموشی زباں مجھکو

دھواں اٹھتا ہے دل میں کوئی بیٹھا ہی کلیجے میں
پتا یوسف کا دیتا ہے غبارِ کارواں مجھکو

اسیری تھی نصیبوں میں اسی دن سے میں سمجھا تھا
کہ محوِ بیخودی کرنے لگا ذوقِ فغاں مجھکو

ترے جلوے سے ہے آئینۂ دل طوطیِ بسمل
نظر آتی ہے گویا آتشِ صد خانماں مجھکو

الٰہی گر نہ ذوق انگیز ہو لذت اسیری کی
نگہ صیاد کی ہو جائے برقِ آشیاں مجھکو

بنا سرتا قدم میرا زیارت گاہ حیرانی
اسیر تازہ ہوں آتی نہیں طرزِ فغاں مجھکو

غزل جناب مولانا شفق عمادپوری تلمیذ حضرت امیر مینائی لکھنوی مغفور

بطرح مشاعرہ بادشاہ نواب صاحب عظیم آبادی

ہے بیاضِ آسماں پر زرفشاں تحریرِ صبح
خانۂ تارِ شعاعِ مہر ہے تنویرِ صبح

اسقدر طولِ شبِ غم اسقدر تاخیرِ صبح
بہ تسم اللہ اکبر رحم اے تکبیرِ صبح

ہجر کی شب نزعِ دل سے ہے عیاں تنویرِ صبح
آفتابِ روزِ محشر ہے گریباں گیرِ صبح

دو شبیہوں سے ہے روشن صفحۂ لیل و نہار
اک طرف تصویرِ شام اور اک طرف تصویرِ صبح

کیا بنائے گنبدِ چرخِ بریں کا اعتبار
رات دن بنتی بگڑتی رہتی ہے تعمیرِ صبح

بجھگیا جب بام گردوں پر کنول مہتاب کا — مشعلِ خورشید روشن کر گئی تنویرِ صبح
سامنے اہلِ صفا کے تیرہ دل ہیں بے فروغ — ظلمتِ شب ہو نہیں سکتی ہے دامنگیرِ صبح
ہجر کی شب کی درازی سے جو گھبرایا ہے تو — پڑھ عمل والشمس کا اے دل پئے تسخیرِ صبح
تنگ آیا ہوں دلِ نالاں سے شب ہجر الغیاث — اے جرس اے نالۂ ناقوس اے تکبیرِ صبح
عالمِ بالا میں بھی ہے کوہکن کی یادگار — آسماں ہے بیستوں خورشید جوئے شیرِ صبح
خواب میں مجھکو نظر آیا جو وہ خورشید حسن — نیند سے چونکا کے بیتابی نے دی تعبیرِ صبح
کون ہمدردِ شبِ فرقت ہے ان دو کے سوا — نالۂ شبگیر ہے یا آہِ پر تاثیرِ صبح
کیوں شفق سے خون میں ڈوبا ہوا ہے افق — اے فلک کسکے گلے پر چلگئی شمشیرِ صبح
کم ہوا اے طولِ شبِ ہجراں کہ پہونچی کان تک — نالۂ مرغِ سحر یا نعرۂ تکبیرِ صبح
جب عروسِ شب نے الٹی روئے روشن سے نقاب — چھا گیا سارے جہاں پر حسنِ عالمگیرِ صبح
ہجر کی شب بڑھ گئی تھی واسطے زخموں کی جلن — مرہم کافور لیکن ہو گئی تاثیرِ صبح

کشتۂ بیجرم کی دیگا شہادت حشر تک
آسماں پہ ہے شفق کا خون دامنگیرِ صبح

غزل جناب حفیظ جونپوری

بیخود ہوئے ہیں جلوۂ کون و مکاں سے ہم — بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھا کے یونہیں دو جہاں سے ہم
فرصت ملے تو پوچھیں عمرِ رواں سے ہم — جانا کہاں ہے آئے ہیں آخر کہاں سے ہم
پرساں جو ہو کبھی کوئی حالِ خراب کا — اے بیخودی تو کہہ نہ سکیں کچھ زباں سے ہم
وہ دل نہ وہ دماغ نہ وہ آرزو رہی — اے عمرِ رفتہ لائیں تجھے اب کہاں سے ہم
صرصر جسے اڑا دے جسے برق پھونک دے — اچھا قفس کو کہتے ہیں اُس آشیاں سے ہم
آنکھوں نے کچھ تو دیکھ کے دل سیر ہو گیا — کیا یونہیں بے نیاز ہیں دونو جہاں سے ہم

رہنے نہ دیگا باغ میں صیاد کا خیال
اڑ کر قفس میں جائینگے خود آشیاں سے ہم

اے صبر الغیاث بس اے صبر المدد
گھبرا گئے ہیں آپ ہی اپنی فغاں سے ہم

بڑھکر کہیں فشار سے ہے انتظار حشر
اچھا ہے سر اٹھائیں نہ خوابِ گراں سے ہم

سنتا چلا ہے عیش گذشتہ کا بھی خیال
بہلا رہے تھے دلکو اسی داستاں سے ہم

پردے سے خود وہ دیکھ کے باہر نکل پڑے
حالِ خراب کہہ نہ سکے پاسباں سے ہم

پہلو میں تمکو دیکھ کے یاد آگیا ہے دل
یادش بخیر تنگ تھے اس مہرباں سے ہم

منظور حشر و نشر جو ہونا ہے آج ہو
گھبرا گئے ہیں روز کے اک امتحان سے ہم

انکو کسی کی یاد جگاتی ہے رات بھر
یہ بھی کبھی سنینگے ترے قصہ خواں سے ہم

ٹکرا سے سر زمیں سے ابھی آسمان کا
اپنے قدم اٹھالیں اگر درمیاں سے ہم

اچھے اگر ہوں شعر تو کچھ داد دیں حفیظ
اتنا بھی کیا کہیں نہ کسی قدرداں سے ہم

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب آخگر رئیس اعظم ریاست اجیگڈھ سنٹرل انڈیا

کیا کہیں فرقت میں کیسا غم رہا
روتے تھے چھپ چھپ کے یہ عالم رہا

سیکڑوں فتنے اٹھائیگا وہ شوخ
گر جوانی کا یہی عالم رہا

شمع و پروانہ کی صحبت پر ہے رشک
لطف کیسا رات بھر ماتم رہا

صحبت گل میں ہوئیں راتیں بسر
باغ میں میں صورتِ شبنم رہا

یہ خوشی فرقت میں کیا کم ہے مجھے
چین سے دل میں تمہارا غم رہا

بادشاہی کے مزے حاصل ہوے
میکدے میں لطف بزم جم رہا

عشق میں ہوں ضبط کا احسانمند
پردہ دار دیدۂ پرنم رہا

ہو چکی آخگر وہاں کی آگہی
جس جگہ محرم بھی نامحرم رہا

غزل جناب نوح ناروی

عدو کریں میری غیبت خدا کی قدرت ہے
یہ ہوگئی انہیں قدرت خدا کی قدرت ہے

کہا بگڑ کے یہ اظہار عشق پر اُس نے
تم اور میری محبت خدا کی قدرت ہے

جفائیں کرتے ہو عاشق پہ خوبرو ہو کر
یہ صورت اور یہ سیرت خدا کی قدرت ہے

وہ کہہ رہے ہیں یہ محشر میں دادخواہ ہو سنے
خدا سے میری شکایت خدا کی قدرت ہے

ہماری آنکھ سے دیکھے کوئی حسینوں کو
کہ ایک ایک کی صورت خدا کی قدرت ہے

ہم اُنپہ مرتے ہیں اغیار پر وہ مرتے ہیں
خدا کی ہے یہ مشیت خدا کی قدرت ہے

اُٹھائے ہمنے بہت عیش اب محبت میں
اُٹھا رہے ہیں مصیبت خدا کی قدرت ہے

رہا ہو جو مرے آغوش شوق میں برسوں
اُسیکو مجھسے ہو نفرت خدا کی قدرت ہے

جناب نوح جو کی ہمنے سیر تجانہ
خدا کی شان ہے حضرت خدا کی قدرت ہے

غزل حسرت موہانی

وہ جو اک شورش نہانی تھی
موجب لطف زندگانی تھی

ہمپہ جب اُنکی مہربانی تھی
شادمانی تھی کامرانی تھی

دل میں تھارات حسرتوں کا ہجوم
یاد جاناں کی میہمانی تھی

حیرت غم کا ذکر تھا۔ یعنے
شرح احوال بےزبانی تھی

مٹ گئی دل کی اب وہ بیباکی
جو غم آرزو کی بانی تھی

مرکے بھی ہم اُنہیں منانہ سکے
سرگرانی سی سرگرانی تھی

ناتوانی کو وہ سکون سمجھے
یہ بھی اک انکی بدگمانی تھی

حسرتِ دل کر مٹ گئی وہ بھی
شوقِ ماضی کی اک نشانی تھی

مر کے دکھلا ہی دی وہی حسرت
ہمنے جو بات دلیں ٹھانی تھی

قطعہ تاریخ فارسی از حضرت بیان دہلوی

شمع بزمِ شاعری خاموش شد
چوں ز دور چشم شود عالم سیاہ

سالِ تاریخش بیاں کلکم نوشت
آہ داغ دہلوی مُرد آہ آہ

۱۳ ۲۲

دیگر اردو

حیف اسے دستِ اجل توڑا کیسے
تھا جو باغِ نظم کا شاداب گل

سالِ رحلت عیسوی سنہ میں بیاں
لکھہ - ہوئی شمعِ حیاتِ داغ گل

۱۹ ۰ ۵

محمد عبد العظیم خاں بیان دہلوی تلمیذ نواب فصیح الملک بہادر مرحوم
از حیدر آباد دکن

مخمس مہر بر غزل ہوس

ہمارے ایک کرمفرما محمد عثمان صاحب مخمور نے بمبی سے مخمسات مہر کی ایک عمدہ بیاض مرحمت فرمائی ہے جس میں سے ایک خمسہ آج ہم درج کرتے ہیں اور آیندہ بھی کبھی کبھی شائع کرتے رہینگے ۔

نا... رکھتا ہے خیالِ پردہ داری اندنوں
بلبلِ جاں کو ہے پاس شرمساری اندنوں

باغ میں مشہور ہے حالت ہماری اندنوں
دل سنے کی ہے مشق ضبط آہ وزاری اندنوں

طائر بے آشیاں ہے بیقراری اندنوں

باغ میں لذت بہاروں کی ہاتھ آتی نہیں
خاک تک بھی تختۂ سنبل کی ہاتھ آتی نہیں
اب زیارت گل کی اور بلبل کی ہاتھ آتی نہیں
کیوں خزاں اک پنکھڑی بھی گل کی ہاتھ آتی نہیں

سر ٹپکتی ہے کہاں باد بہاری اندنوں

خانۂ ناموس ڈھا چکتیں مری رسوائیاں
عرش سے بھی دور جا چکتیں مری رسوائیاں
خاک عزت کی اڑا چکتیں مری رسوائیاں
اب تلک دھومیں مچا چکتیں مری رسوائیاں

ضعف اگر کرتا نہ میری پردہ داری اندنوں

کار فرمائے جہاں تھے لیکن اب ناکام ہیں
کیا ہوا بے بال ہیں بے پر ہیں بے آرام ہیں
نامور اہل وطن میں تھے پر اب گمنام ہیں
ناز پروردِ چمن تھے اب اسیرِ دام ہیں

کچھ تو اے صیاد کر خاطر ہماری اندنوں

اٹھ سکے یا کاہ یا کوہِ فلک فرسا اٹھے
غیر ممکن تھا کہ چپ رہنے سے کچھ ایذا اٹھے
تھر اتنا بوجھ اٹھا ہے آدمی جتنا اٹھے
ضبط کا دعویٰ تھا آخر ہجر میں چلا اٹھے

اے ہوس وہ کیا ہوئی شیخی تمہاری اندنوں

فقط

ریویو

(۱) باب عبرت افزا | یہ ایک نہایت عجیب کتاب ہے جس میں شاہ عالم ثانی کے دردناک واقعات، خاندان شاہی کی بربادی مع حالات غلام قادر روہیلہ
کے درج ہیں یہ حصہ حقیقت میں نہایت عبرت افزا ہے جہاں شاہ عالم بادشاہ پر انتہا درجے کے ظلم ختم کرکے آنکھیں نکلوا لینے کا ذکر ہے
مطبع ... رضا ... مرادآبادی۔ حجم ۹۶ صفحے تقطیع ۱۸ × ۲۲ - قیمت ۵ /

(۲) نقش سیرت | موسوم به اسم تاریخی کنز المغفرۃ - مرتبہ سید محمد رفیع صاحب رضوی عآلی موہانی۔ تقطیع کلاں حجم ۱۱۲ صفحے قیمت ۱۴/
یہ کتاب اس لائق ہے کہ مذہبی طعن فروں کا ایک محمد مجموعہ ہے۔

(۳) جنگ روس جاپان | حصہ اول حجم ۸۰ صفحے قیمت ۸/ حصہ دوم حجم ۱۰۴ صفحے قیمت ۸/ تیسرا زیر طبع ہے۔

مندرجہ بالا کتابیں دفتر نیر اعظم مرادآباد سے ملینگی۔

(۴) رسالہ | علاج بے دوا و جراح - حجم ۲۲ صفحے قیمت ۱۲/ (۵) رسالہ حقیقی طبعی غذاے انسان تقطیع خورد حجم ۱۴ صفحے
قیمت ۸/ - یہ دونوں رسالے جرمنی کے ڈاکٹر لوئی کوہنی کی تصنیفات سے ہیں جنکا ترجمہ امیر مرزا صاحب مترجم دہلوی نے کیا ہے - ان رسالوں
کے مفید اور قابل قدر ہونیکا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ یورپ کی اکثر زبانوں میں اسکے ترجمے کے متعدد ایڈیشن چھپکر
شائع ہوچکے ہیں - دونوں رسالے مترجم صاحب سے دہلی کے پتہ سے ملسکتے ہیں -

آؤ ہم بتلائیں پچیس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

سرمہ کراماتی — مقوی البصر محافظ بینائی دافع نزول الما۔ دھند غبار۔ آب انی ذخیرہ قیمت فی تولہ عہ

حب ذیابطیس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر رک کر تندرستی نصیب ہو۔ فی تولہ۔ ۔ ۔ عہ

حب دائمی قبض — ایک گولی ہو دائمی قبض درد اور تمام عوارض درد سر یرقان وغیرہ کافور ۲ درجن عہ

جوہر عشبہ — صفائی خون کے لئے بیمثل۔ گندہ خون کو زہر سے صاف کرتا ہے دافع پھوڑا پھنسی۔ ناسور بھگندر۔ خارش شیشی کلاں (ہے) شیشی خورد عہ

نور علی نور (چند منٹ میں بال دور ۴ تولہ ۔ عہ

حب دافع وجع مفاصل — درد اعضا جوڑوں کا درد دور ہو۔ ہفتے کیلئے عا

حب دافع طحال — تلی یا لف کے دفعیہ کے لئے شرطیہ ۴ ہفتے کے لئے ۔ ۔ عا

ہیر آئل — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بیوقت سفید نہیں ہونے دیتا نزلہ زکام کو دور کرتا ہے ضعف دماغ کو مفید فی شیشی

زود کن — اسکے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

دوائی خارش — ران کی خارش اور بدن کے دانے دو دن میں خشک ہو جاتے ہیں دو تولہ عا

تریاق السعال — اخراج بلغم درد سینہ سرفہ کہنہ اور خراش گلو نزلہ کا چھاتی پر گرنا اسکے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد۔ ایک تولہ ۔ عہ

حب قائم مقام افیون — چانڈو۔ افیون بلا تکلیف اس سے چھوٹ جاتے ہیں ایک تولہ عہ

روغن اعجاز — برسوں کا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر ناسور کے لئے اکسیر اور عجیب الاثر ۲ تولہ ۔ عا

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے ایک سو مریض کو کافی ہے ۔ ۔ عہ

چورن مقوی معدہ — خوش مزہ بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے ۲ تولہ ایک روپیہ ہے ۔ عہ

سنون مستحکم دنداں — ہلتے دانت مضبوط اور میل دور کرتا ہے ۔ عہ

ید اللہ دافع بخار — دورتی بھر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن ۔ ۔ ۔ عہ

دمہ یا ضیق النفس — سانس رکنا اور بلغم وغیرہ دفع ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔ عا

رعنا — چہرے کے بدنما داغ وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ ۔ ۔ ۔ عا

سفوف درد گردہ — درد گردہ اور ریگ مثانہ بلا تکلیف خارج ہوتی ہے ۴ تولہ عا

اکسیر شفا — روانی طاعون بطور علاج حفظ ما تقدم عامل مرض کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ غربا کو مفت فی شیشی ۔ ۔ عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور

(رجسٹرڈ نمبر ال۔ ۲۵۱)

اردوئے معلیٰ

جلد (۴)	بابت اپریل ۱۹۰۵ء	نمبر (۴)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی۔ اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علی گڈھ

احسن المطابع علی گڈھ میں طبع ہوا

نم (مذکر) ؎ چھوڑا نہ کچھ بھی دل میں تپ ہجر یار نے ❊ روتے تھے زار زار اور آنکھوں میں نم نہ تھا۔

(مومن دہلوی)

یہی طرح موتیا۔ افواہ۔ جھونجھ۔ غبن اور اردو (زبان) وغیرہ کو مذکر لکھا ہے حالانکہ موتیا مونث بھی ہے جیسا کہ داغ دہلوی مرحوم نے لکھا ہے کہ "موتیا کھلی" اور اردو قطعی طور پر مونث ہے۔ افواہ اور جھونجھ بھی قطعی مونث ہیں معلوم نہیں حضرت جلال نے انکو کیونکر مذکر لکھدیا غبن بھی مشکوک ہے اور غالباً مونث ہی۔

اور وہ جو ہمنے لکھا ہے کہ بعض وقت اہل زبان بھی شبہے میں پڑ جاتے ہیں اُسکا ثبوت یہ ہے کہ شمع کے بارے میں ناسخ کے شعر سے (ہجر میں ہر شعاع شمس مجھے۔ ہوگیا ہے خدنگ سونیکا) حضرت جلال کو بھی شعاع کی تذکیر کا شبہہ ہوا۔ اور الاپ کی نسبت تو قطعی غلط فہمی ہوئی۔ کیونکہ جناب جلال الاپ کو مذکر ہی بتاتے ہیں اور سند میں قدرت کا ایک شعر لکھتے ہیں ؎

ایک ہی پردے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ
گر صدا ہے بانگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے

حالانکہ الاپ بالاتفاق مونث ہے۔ اہل دہلی میں سے میر حسن مرحوم صاحب مثنوی نے لکھا ہے ؎ وہ رقص بتاں اور وہ ستھری الاپ ❊ وہ گوری کی تانیں وہ طبلے کی تھاپ ❊
اور مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ بھی اسے صرف مونث لکھتے ہیں۔ حضرات لکھنو میں سے منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم نے امیر اللغات میں اسکو صرف مونث لکھا ہے۔ اور مرزا مچھو بیگ عاشق شاگرد رشید مرزا نسیم مرحوم نے بھی اپنی کتاب بہار ہند میں اسے مونث ہی بتایا ہے خود حضرت جلال بھی الاپ کی تانیث کے قائل ہیں اور یہ جو قدرت کے شعر کی سند پر اُنہوں نے اسکو مذکر بھی لکھدیا ہے یہ اسی قسم کا شبہہ ہے جسکا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ رہا قدرت کا شعر اُسکی نسبت ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یا تو قدرت شاگرد جعفر علی حسرت کے زمانے میں بزبان قدیم الاپ کو مذکر ہی بولتے ہونگے یا یہ شعر اسطرح پر ہوگا ؎ ایک ہی پردے کی تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ الخ یعنی "کی" بیائے معروف اور بعد "الاپ" "الاپیں" کے بجائے ہوگا۔ متقدمین کے کلام میں مونث الفاظ کی جمعیں بلا "ین" کی اکثر موجود ہیں چنانچہ ہم صرف مصحفی کے کلام سے اسکی متعدد مثالیں دے سکتے

ہیں۔ نوخلکہ الاپ کی تذکیر کے بارے میں حضرت جلال کو یقیناً شبہ ہوا اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ تذکیر و تانیث کے باب میں شخصی راے، اگرچہ وہ ایک اہل زبان کی راے ہو، ہر شخص کے نزدیک یا کم از کم کسی دوسرے اہل زبان کے نزدیک مسلم نہیں ہو سکتی۔

پس تذکیر و تانیث کی ایک مستند کتاب کے لئے ضروری ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعض اہل زبان اور کچھ دوسرے مقاموں کے زباندان لوگ جمع ہو کر ایکبار محنت کرکے ایک ایسا رسالہ مرتب کردیں جس میں تمام الفاظ کی تذکیر و تانیث محقق طور پر مع دہلی اور لکھنؤ کے اختلاف کے درج ہو۔ ورنہ جناب جلال کا رسالہ دہلی والے پسند نہ کرینگے اور حضرت حالی کا رسالہ اہل لکھنؤ اور شاید بعض اہل دہلی کے بھی ناپسند ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ کام انجمن ترقی اردو علیگڈھ میں رہکر بآسانی کرسکتی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کا سب سے پہلا فرض یہی ہے کہ قواعد اردو کی ایک مستند کتاب تیار کرائے جس میں تذکیر و تانیث کا باب بھی آجائیگا۔ علیگڈھ ایک ایسا مقام ہے جہاں دہلی لکھنؤ اور بعض دوسرے مقاموں کے مستند لوگوں کا مجمع بآسانی ممکن ہے بلکہ ایک حد تک ہر وقت رہتا ہے۔ اگر شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی کو اس تحریر سے اتفاق ہو تو ہم ایک پوری عملی تجویز پیش کرسکتے ہیں۔

(حسرت)

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی

المشہور بہ

لسان الغیب و ترجمان الاسرار

خواجہ شمس الدین محمد حافظ چودھویں صدی کے شروع میں شہر شیراز میں پیدا ہوئے

یہ اپنے زمانے کے فقہا میں سے تھے اور علاوہ شرافت خاندانی کے کمالات ذاتی کے بھی مدارج اعلےٰ پر ممتاز تھے۔ کیف شاعری و تصوف میں اسقدر ڈوبے ہوئے تھے کہ دنیا کے ظاہر اسٹیج پر قدم ہی نہ رکھا۔ نہ کبھی دنیا کے کاموں میں رغبت ظاہر کی اور نہ دنیاوی اعزاز و اکرام کی کبھی خواہش کی۔ زمانۂ شباب میں تو دوست احباب کی صحبت کسیقدر مرغوب خاطر رہتی تھی مگر شیب کے آتے ہی تمام تعلقات دنیاوی کو چھوڑ کر بالکل مذہب کی جانب متوجہ ہو گئے ہر وقت عبادت الٰہی میں مشغول اور نہایت قناعت کے ساتھ حالت فقر میں اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔

انکو اپنی فہم خداداد اور ذکاوت کا خود ہی احساس تھا اور طبیعت حد سے زیادہ نازک اور مستغنی واقع ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے انہیں سرسری ہی نظر سے دیکھا ہوگا وہ انکو آزاد خیال اور رند مشرب ہی خیال کرتے ہونگے مگر جنہوں نے ایک وسیع اور غائر نظر سے انکے دیوان کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہوگا وہ خوب جانتے ہونگے کہ یہ ایک بلند حوصلہ پرجوش عالی خیال۔ اور مذہبی آدمی ہے۔ جسے الفاظ ربانی ہوتا ہے اور جسے لسان الغیب یا ترجمان اسرار کہنا بیجا نہیں ہے۔ تقلید اور پابندی کے حدود جبر مخالف تھے اور ان عام اور جامع اصولوں پر عمل کرتے تھے جو ہر زمانے اور ہر ملک میں یکساں تسلیم کیے گئے ہیں۔

دولت شاہ سمرقندی نے اپنی تاریخ میں یوں بیان کیا ہے۔

"حافظ جو ملک سخن کا بادشاہ عالموں کا سرتاج اور دانشوروں کا سرآمد روزگار تھا اپنے زمانے کے حیرت انگیز لوگوں میں سے تھا اُسکے الفاظ پر نکتہ چینی کرنا آدمی کی قدرت سے باہر ہے اُسکا کلام سرتاسر معنی اور اسرار غیب میں ڈوبا ہوا ہے اور فقر جو درویشی کا زیور ہے اس کی ہر ادا میں جلوہ نما نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اُسے لسان الغیب کہتے ہیں ظاہرا اُسکے الفاظ سادہ اور تمام دقتوں سے مبرا معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں علم معرفت جسکے ملنی کی کوئی انتہا نہیں، اسکے کلام میں ہر جگہ سے مترشح ہوتا ہے"

حیثیت شاعری جو عام طور پر لوگ اُنکی ذات کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں اُنکے درجے سے کہیں گری ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی معانی فہمی میں اُنکا جواب نہ تھا اور

علوم ظاہری اور باطنی میں سب سے اعلیٰ اور ارفع پایہ رکھتے تھے۔ علم دین اور علم الٰہی میں استقدر شغف تھا کہ کبھی دنیا کے سامنے سر نہیں جھکایا اور تھوڑا بہت اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیشہ بلا وقت حاصل کرتے رہے۔

باوجود درویشوں اور عارفوں کی صحبت سے استقدر محبت کرنیکے بادشاہوں اور وزیروں کی بھی صحبت سے احتراز نہ تھا اور اکثر نوجوانوں کی صحبتوں میں بھی بیٹھا کرتے تھے ہر ایک کو اپنی باتوں سے خوش کرتے اور خود بھی اُس کی باتوں سے خوش ہوتے تھے

حافظ کے قطعات اور رباعیات بھی ہیں مگر غزل کے سوا مرغوب خاطر کوئی چیز نہیں تھی غزل گوئی کی تاریخ میں اُنکا نام اسطرح درج ہے۔

(۱) نظم کی ابتدا ابرام گور (ویرا نیز پنجم المتوفی سنہ ۴۳۸ء) نے کی

(۲) خلیل بن احمد بصری (المتوفی سنہ ۷۸۶ء) نے علم عروض کو اس سے وابستہ کیا اور اسکا موجد بنا۔

(۳) فریدالدین ابوعبداللہ رودکی (المتوفی سنہ ۹۵۴ء) نے پہلا دیوان ترتیب دیا۔

(۴) شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ (پ سنہ ۱۱۹۵ء المتوفی سنہ ۱۲۹۲ء) نے پہلی غزل کی بنیاد ڈالی۔

(۵) خواجہ شمس الدین محمد حافظ (المتوفی سنہ ۱۳۸۹ء) دوسری طرح کی غزل کی ابتدا کی

(۶) بابائے فغانی (المتوفی سنہ ۱۵۱۹ء) نے تیسری طرح کی غزل کی ابتدا کی۔

(۷) میر محمد علی صائب تبریزی (المتوفی سنہ ۱۶۶۹ء) نے چوتھی طرح کی غزل کی ابتدا کی جس کی تقلید اب عام طور پر کیجاتی ہے۔

اُنکے دیوان میں شروع سے اخیر تک جدت پسندی اور اپنے نئے طریقے اور نئے خیالات کا اظہار رہے سوائے فطرت کے کسی چیز کی تقلید نہیں کی۔ کسی تصنع سے کام نہیں لیا اور کسی عیب کے چھپانے کے لئے حیلے وغیرہ کو کام میں نہیں لائے۔ ان میں جو خوبیاں ہیں وہ انکی ذاتی خوبیاں ہیں کبھی دوسرے کی روش پر نہیں چلے اور اپنا راستہ سب سے الگ نکالا۔ ایک انگریز مصنف کی یہ رائے ہے کہ

اس میں شک نہیں کہ بعض باتوں میں ہم حافظ پر اعتراض کر سکتے ہیں مگر پھر بھی کسی دوسرے کو
اُنکے مقابل میں نہیں لا سکتے۔ مشکل سے کسی دوسرے ملک میں ایسے عجیب ذہن و طبیعت والا
شاعر پیدا ہوا ہوگا۔ انکی طبیعت میں ایک طرح کا نرالا پن تھا جو علما کی نشانی اور فہم و ذکاوت
کی پہچان خیال کیا جاتا ہے لیکن ان میں یہ نرالا پن اس حد تک تھا کہ اُنکو لوگ کبھی مورد الغا ربانی۔ اور کبھی مجذوب خیال کرتے ہیں۔ انکی نظم سرتاسر تصور و خیال محبوب سے بھری ہوئی
ہے۔ اپنی خیالی مضمون پردازی میں افضل ترین، انداز میں انوکھی، آمد مضامین کی خوبی سے فطرۃً
آراستہ، موتی کی مثال آبدار، سنجیدہ اور شوخی آمیز ہے، اپنے زمانے کی تباہی اور شامت
اعمال۔ دنیاوی نمائش۔ جو فروشی گندم نمائی۔ کبر و خود پسندی ارباب زمانہ۔ کثرت گناہ۔
عظمت و برتری باریتعالی۔ زمانہ شباب کی عیش پسندیاں و شادمانیاں، حظ دنیا۔ فیاضی عام
اور بے تعصبی اور آزادی طبیعت انہیں مختلف مضامین کے میدان انکے جولانگاہ رہے
ہیں اُنکی غزلوں میں کسی ذلیل اور ادنے درجے کے خیال کی بو تک نہیں پائی جاتی بنبسی مذاق
کی کوشش سے بالکل معرا اور بیہودہ مبہم استعاروں سے بالکل آزاد ہیں۔ جنکو پڑھکر اُمنگ
اور جوشش پیدا ہوتا ہے اور مسٹر کلارک کے قول کے موافق اُنکا ہر شعر لاثانی۔ درد آمیز،
طنز آمیز، شوخ، نازک۔ پر از گلہ و شکوہ شکایت سلیس۔ رواں۔ پرشوکت اپنی شان
میں ارفع ہوتا ہے۔ اُنکا طرز ادا نہایت روشن اور لغزشوں سے مبرا۔ نازک، گہرا اور کثیر المعنی
اور قلیل الالفاظ ہے۔ کوئی لفظ فضول اور بیکار نہیں، کسی جگہ سے اگر کوئی لفظ اصلی نکالدیا جاے
تو یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی دوسرا لفظ آکر اُس کی پرانی لطافت اور خوبی کو قایم رکھہ سکے۔ اُن کا
طریقہ صاف تصنع سے بالکل آزاد۔ موزوں اور عالمانہ ہے۔ علم کی پختگی اور اشیاے فطرت
کے بیرونی اور اندرونی احوال سے کلی واقفیت مترشح ہوتی ہے اور جن الفاظ میں اور جس
طریقے سے ان تمام مضامین کو ادا کیا ہے وہ ایسا دل لبھانیوالا ہے کہ اُنکے ساتھہ دعوی
ہمسری محال ہے۔ کہیں ایسا نہیں ہوا کہ آمد مضامین اور آزادی خیال اور اُس خاص فطرتی
شوخی طبع میں جو قریب قریب ہر شعر سے نمایاں ہوتی ہو کہیں کچھہ رکاوٹ واقع ہوئی ہو۔
خوبی الفاظ اور فصاحت بیان میں حافظ کے اشعار تمام زبان فارسی میں جواب

نہیں رکھتے ۔ کسی مشرب کا آدمی کیوں نہو زاہد خشک ہو یا رند خراباتی، ممکن نہیں کہ ان شوخ مضامین اور تصویر یار کی لذت سے محظوظ نا ہو۔

مسٹر چارلس اسٹوارٹ فرماتے ہیں۔

"حافظ اپنی پارسائی اور تقوی میں مشہور تھا اور عمر کا زیادہ حصہ اُنسے عبادت الہی میں اور ہمیشہ اُسی ایک قادر مطلق کے تصور میں گذارا۔ اُسکے ملک والے اسے مورد الغاے ربانی اور بزرگ اور بہت مقدس شمار کرتے ہیں اور اُسکے کلام کو صرف کلام الہی سے کم رتبہ خیال کرکے اُسکے اشعار سے تفاؤل کیا کرتے ہیں"۔

"مسٹر ولیم فورس کلارک کا قول ہے کہ اُنکا کلام سب سے زیادہ مطابق فطرت اور سب سے کم درجہ خودستائی آئینہ ہے۔ اگر کسی قسم کی خودستائی بھی اس میں پائی جائے تو وہ اسطرح کی خودستائی ہے جو ایک بے لوث اور باایمان دل کے جذبات کا نتیجہ ہوتی ہے مثلاً فرماتے ہیں ؎

بیا بخواں غزل خوب وطرفہ و پر سوز
کہ شعر لست فرح بخش و جانفزا حافظ"

سترہویں صدی عیسوی میں سوڈی ساکن بوسینیہ جو ایک بہت بڑا نکتہ رس عالم گذرا ہے بیان کرتا ہے کہ حافظ کے اشعار میں یہ اندرونی دلفریبی اسلئے ہے کہ وہ چشمہ حیات میں غوطہ دیئے گئے ہیں اور اپنی خوبی میں حورعین سے مقابلہ کرتے ہیں۔

۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کلکتہ میں اسپر مباحثہ ہوا تھا کہ آیا حافظ کے اشعار معناے لفظی میں لئے جائیں یا صوفیانہ میں؟ اسی سلسلہ بحث میں سر ولیم جونس نے بیان کیا تھا کہ "اسکا ایک عام جواب کوئی نہیں دیسکتا کیونکہ بہت سی غزلیں ہیں جنہیں بجز و دست سے بجز صوفی بھی تصوف کے معنی میں نہیں لے سکتا اور جہاں تک سمجھ کا تعلق ہے اسرار صوفیانہ کا اُس سے کوئی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا اور اسلئے لفظی معنی کے سوا ہم انکا کوئی اور دوسرا مفہوم نہیں خیال کرسکتے"

یہ سوال ایک عرصے تک لاحل رہا اور شاید ابھی تک کوئی اسباب کا دعوے

نہیں کرسکتا کہ ایک قطعی فیصلہ اس قضیہ متنازعہ فیہ کے متعلق کیا جا چکا ہے۔ اسی سلسلہ بحث میں سنہ ۱۸۰۹ء مسٹر چارلس اسٹوارٹ نے یہ بیان کیا تھا کہ " چند اشعار حافظ کے بیشک لفظی معنی میں لئے جاسکتے ہیں مگر عام طور پر تمام اسرار تصوف سے تعلق رکھتے ہیں "

حافظ کی غرض اگر طلب دنیا ہوتی تو تمام ہندوستان اور ایران کے بادشاہ اور شاہزادوں سے بتعدد انعام و اکرام ملتا، کہ ایک دنیادار کو مستغنی کردینے کے لئے بالکل کافی ہوتا مگر دنیادار ہی دولت طلب کرتے ہیں اور انہیں کے کام آسکتی ہے حافظ کو بالکل دنیا کی تمنا نہ تھی اور انکی عالی حوصلہ طبیعت ان تمام باتوں سے مستغنی تھی اسی لئے انہوں نے تنہائی اور فقر کی زندگی کو سب پر ترجیح دی اور اسی طرح اپنی زندگی کے تمام ایام روحانی مسرت کے ساتھ بسر کئے۔

انکی صوفی مشربی کے متعلق ملا جامی فرماتے ہیں " مجھے یہ علم نہیں کہ کس پیر سے حافظ نے اکتساب تصوف کیا تھا اسلئے میں نہیں کہہ سکتا کہ اہل صفا کے کس طبقے میں اُن کا شمار کیا جائے لیکن انکے اشعار سے میں اتنا ضرور مستنبط کرسکتا ہوں کہ تصوف میں وہ پایہ اعلیٰ رکھتے تھے اور بلاشک لسان الغیب اور ترجمان الاسرار تھے "

مجمع الفصحا میں مرزا رضا قلی خاں یہ بیان کرتے ہیں کہ جس پیر سے حافظ نے تعلیم پائی تھی وہ حضرت مولانا شمس الدین شیرازی تھے۔

شیراز سے چار میل کے فاصلہ پر ایک مقام، قلعہ باباے کوہی پر واقع ہے۔ پیر سبز اُسکا نام ہے اور یہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ جو کوئی یہاں بیٹھکر چالیس شب کا چلہ کھینچے ضرور شاعر ہو جائیگا۔ حافظ کا زمانہ شباب تھا انہوں نے بھی عہد کیا کہ چالیس رات وہاں جاکر شب بیداری کرونگا۔ اس زمانہ میں آپ ایک عورت مسمی بہ شاخ نبات کی محبت میں گرفتار تھے انکی آستاں بوسی بھی ضرور ہی تھی اسلئے ہر صبح اپنی اس محبوبہ کے مکان کے سامنے چکر لگاتے۔ دوپہر کو کچھ کھاتے اور آرام کرتے اور جب رات ہوتی تو باباے کوہی پر جاکر شب بیداری کرتے۔ چالیسویں صبح کو انہوں نے دیکھا کہ شاخ نبات ایک دریچے سے انہیں اشارہ کر رہی ہے اور اپنی طرف بلاتی ہے۔ انکی خوشی کی اسوقت بھلا کیا انتہا

ہوسکتی تھی۔ فوراً پہونچے۔ اُسنے بھی نہایت خاطر و مدارات سے لیا اور کہا کہ ایک شخص کو جسے خدا نے فہم و ذکاوت سے آراستہ کیا ہے شیراز کے شہزادے پر ہر طرح قابل ترجیح سمجھتی ہوں۔ شب کے وقت بھی اُسنے حافظ کو روکنا چاہا مگر چالیسویں شب تھی اور "پیر سبز" پر ابھی ایک رات اور جانا باقی تھا۔ فوراً اپنا دامن چھڑا کے بھاگے اور حسب معمول شب بیداری میں مصروف ہوئے۔ دوسرے دن صبح صادق کے وقت حضرت خضر علیہ السلام عبائے سبز پہنے اُنکے پاس آئے اور ایک جام شراب محبت الٰہی کا دیا اُسکے بعد نہ شاخ نبات کا خیال رہا نہ علائق دنیا کی پابندی۔ فنا فی اللہ کے درجے پر فائض ہوئے۔

ایک روز حافظ اپنے چچا حضرت سعدی (یہ سعدی شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی نہیں تھے جو ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۵ء میں انتقال فرمایا) کے پاس جا نکلے۔ وہ بیٹھے ایک غزل لکھ رہے تھے بیٹھے تھے ابھی صرف پہلا مصرعہ ہوا تھا ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

کہ حافظ نے برجستہ دوسرا مصرعہ کہا ؎

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

حضرت سعدی نے اپنے بھتیجے کی یہ ذکاوت دیکھکر کہا کہ تم ہی یہ غزل پوری کرو اور دعا کی کہ تمہارا کلام پڑھنے والوں کو بیخود کردیا کریگا۔

مسٹر کلارک لکھتے ہیں کہ اُسوقت سے اکثر لوگوں کا بالعموم اور شیعیان قسطنطنیہ کا بالخصوص یہ خیال ہے کہ حافظ کے کلام کے پڑھنے سے آدمی اپنے آپے میں نہیں رہتا ہے۔

امرا و شہزادے زمانہ سے ملنے کے بعد لوگوں نے انہیں ترغیب دی کہ شاہ یزد کی خدمت میں بھی حاضر ہونا چاہیئے۔ لیکن شاید شاہ نے اُنکی پوری قدر دانی نہیں کی اُسکی شکایت میں یہ قطعہ لکھا ہے۔ ؎

دل بنداے جان من بر وعدہ شاہ و وزیر — کس نمی داند کہ کارش از کجا خواہد گشاد
رو توکل کن نمیدانی کہ نوک کلک من — نقش ہر صورت کہ زد رنگے دگر بیرون فتاد
شاہ ہر موزم ندید صلے سخن صد لطف کرد — شاہ ہر دم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

کار شاہاں چنیں باشد تو اے حافظ مرنج

داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہد

خواجہ قوام الدین وزیر شاہ شجاع حاکم شیراز (المتوفی ۱۳۶۳ء) نے اُنکے لئے ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا جہاں یہ علم فقہ و دینیات پر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ کی فیاضی اور نیز دیگر قدر دانوں کی فیاضی نے انہیں مالامال کر دیا تھا گو کبھی کسی چیز کی پروا نہیں کی اور متوکلاً علی اللہ زندگی بسر کرتے رہے۔ خواجہ قوام سے جیسے اُنکے برتاؤ تھے اور جس قدر دانی سے وہ فیاض امیر ملتا تھا اُسکا پورا حال اس قطعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اپنے وظیفے کے تقاضے میں فرماتے ہیں۔ ؎

بسمع خواجہ رساں اے رفیق وقت شناس	بخلوتے کہ درو اجنبی صبا باشد
لطیفۂ بمیاں آر و خوش بخنداش	بنکتہ کہ دلش را بداں رضا باشد
پس انگہش ز کرم ایں قدر بلطف بپرس	کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

سلطان اویس جلایر حاکم بغداد (المتوفی ۱۳۷۴ء) نے پہلے پہل انکی بڑی خاطر مدارات کی اور بہت کچھ انعام و اکرام دیا مگر بعد میں بالکل خلاف امید بے اعتنائی شروع کر دی جس کی شکایت میں ضمناً فرماتے ہیں ؎

من از جاں بندۂ سلطان اویسم

اگرچہ یادش از چاکر نباشد

سلطان احمد ایلخانی حاکم بغداد (المتوفی ۱۴۱۰ء) پسر حسن بزرگ حاکم بغداد (المتوفی ۱۳۵۶ء) نے اس غرض سے کہ حافظ اس کی ثنا کریں بہت کچھ انعام و اکرام بھیجا لیکن اُنہوں نے یہ غزل اُس کی تعریف میں لکھکر تحفۃً بھیجی اور جو کچھ سلطان ایلخانی نے بھیجا تھا شکریے کے ساتھ سب واپس کر دیا ؎

احمد اللہ علی معدلۃ السلطانی	احمد شیخ اویس حسن ایلخانی
خان بن خان و شہنشاہ شہنشاہ نژاد	آنکہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی
دیدہ نادیدہ باقبال تو ایماں آورد	مرحبا اے بچنیں لطف خدا ارزانی

بہ شکن طرۂ ترکانہ کہ در کاکل تست
ا مگر بے تو برآید بدونمش بزنند
جلوۂ حسن تو دل می برد از شاہ و گدا
گرچہ دوریم بیادت قدح می نوشیم
از گل فارسیم غنچہ عیشے نشگفت

بخشش و کوشش قاآنی و چنگز خانی
دولت احمدی معجزہ سلطانی
چشم بد دور کہ ہم جانی و ہم جانانی
بعد منزل نہ بود در سفر روحانی
جند او جلہ بغداد و می ریحانی

اے نسیم سحری خاک رہ یار بیار
تاکند حافظ ازان دیدہ جاں نورانی

سلطان محمود شاہ بہمنی بادشاہ دکن خود استاد کامل تھا اور کملا اور اساتذہ زمانہ کا قدردان بھی تھا۔ عرب و عجم کے اہل سخن آآکر اسکے دربار میں عزت اور مرتبے پاتے تھے اور صرف ایک غزل پیش کر کے ہزاروں اشرفیاں انعام لیکر اپنے وطن واپس جاتے اور تمام عمر مسرت سے بسر کرتے تھے حافظ نے بھی چاہا کہ سلطان محمود کے دربار میں حاضر ہوں مگر سفر خرچ کے لئے کچھ توشہ پاس نہ تھا۔ میر فضل اللہ انجو بادشاہ بہمنی کے وزیر نے یہ خبر پاکر فوراً اپنے پاس سے روپیہ روانہ کیا اور درخواست کی کہ میرے آقا کے دربار کو زینت بخشیے۔ اس دعوت کو قبول کر کے حافظ نے روانگی کا ارادہ کیا۔ اور کسیقدر روپیہ اپنے قرضداروں کو اور کچھ اپنے بہن کے بچوں کو دیکر تھوڑا سا خود اپنے پاس تہیہ سفر کے لئے رکھا لاہور تک پہونچے تھے کہ ایک اپنے پرانے آشنا سے ملاقات ہوئی جسے تمام قزاقوں نے لوٹ لیا تھا۔ انکی فیاض طبیعت سے کسی طرح نہ رہا گیا اور سب روپیہ اُسکو دیکر خواجہ زین العابدین اور خواجہ محمد گازرونی دو ایرانی سوداگروں کے ہمراہ جو ایران واپس جارہے تھے اور جنہوں نے انکا کل خرچ صرف لطف صحبت کے خاطر اپنے ذمہ لینا گوارا کیا تھا روانہ ہوئے۔ اُنکے ہمراہ ہرمز (یعنی بحیرۂ فارس) تک پہونچے تھے کہ سلطان محمود کا فرستادہ جہاز منتظر ملا۔ اسپر سوار ہوکر حافظ نے پھر دکن کا قصد کیا مگر قبل روانگی ایک طوفان اُٹھا اور آثار بہت خوفناک معلوم ہونے لگے ناچار دکن کا ارادہ بالکل فسخ کر دیا اور میر فضل اللہ کے پاس اپنے ایک دوست کی معرفت یہ چند اشعار بھیجکر معذرت کہلا بھیجی

ع

دمے با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد ‏ ‏ ‏ ‏ بمے بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد
بشکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج است ‏ ‏ ‏ ‏ کلاہ دلکش است اما بدرد سر نمی ارزد
بس آسان می نمود اول غم دریا بیوی سود ‏ ‏ ‏ ‏ غلط گفتم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

میر فضل اللہ انجو نے بادشاہ کو اطلاع دی اور معذرت نامہ دکھلایا اس فیاض بادشاہ نے بہت افسوس کیا اور ملا محمد قاسم مشہدی کے ہاتھ ہزار اشرفیاں حافظ کو بھیجیں صرف اسلیے کہ اسکے دربار میں آنیکی انہوں نے بہت کچھ توقع کے ساتھ کوشش کی تھی۔

۱۳۵۳ء میں مبارز الدین محمد مظفر نے شاہ شیخ اسحاق حاکم شیراز کو جو حافظ کا بہت بڑا مربی و قدردان تھا قتل کرڈالا اور ۱۳۵۹ء میں اسکا بیٹا شاہ شجاع ابو اسحاق اپنے باپ مبارز الدین محمد مظفر کی آنکھیں نکالکر خود شیراز کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اسکو حافظ سے انکی ذکاوت شاعری کی وجہ سے کسیقدر نفرت دلی تھی۔ جسوقت اُس کی نظر ان کی ایک غزل کے (۵۱۶ حسب دیوان بازاری) اس شعر پر پڑی **ع**

گر مسلمانی ازین ست کہ حافظ دارد
آہ اگر از پے امروز بود فردائے

تمام علمائے شیراز کو بلاکر کہا کہ حافظ بے دین معلوم ہوتا ہے۔ انہیں جسوقت یہ خبر معلوم ہوئی فوراً اسی مجمع علما میں آئے اور اس شعر کے ساتھ ملاکر اسی کو پڑھا **ع**

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ میگفت ‏ ‏ ‏ ‏ بر در میکدۂ با دف و نے ترسائے
گر مسلمانی ازین ست کہ حافظ دارد ‏ ‏ ‏ ‏ آہ اگر از پے امروز بود فردائے

اور اس بادشاہ کی شر سے نجات پائی۔

۱۳۶۹ء میں سلطان غیاث الدین پوربی بادشاہ بنگالہ نے انہیں بلا بھیجا مگر ہندوستان کے سفر میں ایک دفعہ ناکامیابی ہوچکی تھی اسلیے کچھ عذر کہلا بھیجا اور نہ گئے۔

فتح بنگالہ کے بعد سلطان غیاث الدین کو اک مرض مزمن لاحق ہوا جس سے اسکے حواس خمسہ اور دل سب ضعیف ہوگئے۔ اسکے حرم میں تین خوبصورت لونڈیاں تھیں

جنسے سلطان کو بہت رغبت تھی۔ سرو، گل ولالہ۔ اُنہوں نے خواہش ظاہر کی کہ بادشاہ کے بدن کو سہم ملیں اور نہلائیں جسن اتفاق کہ اس غسل کے بعد بادشاہ کو صحت کامل ہوگئی جنسے بادشاہ کی محبت اُنکی جانب اور بڑھ گئی۔ دوسروں کو دیکھکر حسد ہوا اور بغرض توہین اُسکا نام غسالہ رکھا۔ بادشاہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسنے یہ مصرعہ پڑھا۔ ؎

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ میرود

دوسرے مصرعے کے لئے بہت کوشش کی گر ممکن نہوا اپنے دربار کے شاعروں سے کہا کہ اسپر غزلیں لکھیں۔ سبھوں نے طبع آزمائیاں کیں گر اپند خاطر کوئی غزل ہوئی سبھوں کے اشارے سے بادشاہ نے حافظ کے پاس یہ مصرعہ بھیجا اور غزل کی فرمائش کی۔ حافظ نے ایک شب میں یہ غزل لکھکر بھیجدی۔ ؎

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ میرود
وین بحث باثلاثہ غسالہ میرود الخ

(حسب دیوان بازاری)

بادشاہ نے شکریے کے طور پر بہت کچھ انعام بھیجا اور بُلا بھی بھیجا اگرچہ جسطرح اوپر بیان کیا گیا ہے حافظ نے ہندوستان کا سفر اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا اور بہت کچھ عذر و معذرت کہلا بھیجی۔

میر تیمور نے اس شعر پر ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ سے کہا میں نے تو اپنی شمشیر کی چمک سے سمرقند و بخارا اپنے وطن کو شاداب و پررونق کرنے کے لئے دنیا کا ایک چوتھائی حصہ فتح کر ڈالا اور ہزاروں قصر اور عالیشان محل تباہ کر ڈالے اور تو اسقدر ناقدردان اور فضول خرچ ہے کہ ایک خال کے لئے میرے ان ملکوں کو یونہی دیے ڈالتا ہے حافظ نے زمین بوسی کرکے یہ جواب دیا کہ اے

تمام عالم کے بادشاہ یہ میری اسی فضول خرچی کا نتیجہ ہے کہ اس حالت کو پہنچا ہوں۔ تیمور کو یہ جواب پسند آیا اور انعام عطا فرمایا۔

رضا قلی خاں کا بیان ہے کہ حافظ نے قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی مگر اسکا پتہ اب بالکل نہیں ہے۔

۷۹۱ھ میں اُنہوں نے بمقام شیراز وفات پائی مگر یہ سنِ تاریخ ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔

(۱) قبر پر جو پتھر لگا ہوا ہے اُس کی رو سے ۷۹۱ھ (مطابق ۱۳۸۹ء) ہے
(۲) دولت شاہ کے قول کے موافق بھی " " " " "
(۳) حاجی لطف علی " " " " " " " "
(۴) نسخہ قلمی ایشیاٹک سوسائٹی کی رو سے بھی " " " " "
(۵) محمد گل اندام کے قول کے موافق ۷۹۲ھ (مطابق ۱۳۸۹ء) "
(۶) تذکرۃ الشعرا کی رو سے ۷۹۴ھ (مطابق ۱۳۹۴ء) ہے
(۷) چارلس اسٹوارٹ کے قول کے موافق ۷۹۴ھ (مطابق ۱۳۹۴ء)

مگر دولت شاہ کے قول کے موافق امیر تیمور نے ۱۳۹۲ء میں شیراز فتح کیا تھا اور اسی سال حافظ سے ملاقات کی تھی۔

پھر ۱۳۸۸ء میں اُسنے اُنکی تاریخ وفات قرار دی ہے جو نیز کتبہ قبر سے ظاہر ہوتی ہے کسطرح صحیح مانی جا سکتی ہے؟ گبل صاحب کا بیان ہے کہ تیمور کی ملاقات حافظ سے ۱۳۸۷ء میں ہوئی تھی۔ اگر یہ بات صحیح مانی جائے تو بیشک دولت شاہ کا قول اور کتبہ کی تحریر دونوں صحیح سمجھی جا سکتی ہیں۔

کہتے ہیں یہ شعر مرقوم ہیں جن سے ۷۹۱ھ تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ؎

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ کہ شمعے بود از نور تجلی
چو در خاک مصلیٰ یافت منزل بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

شیر خاں لودی کا یہ بیان ہے کہ بعض علما کا خیال تھا کہ اُنکی بعض اشعار دین اسلام کے خلاف

ہیں اسلئے بعض وقت لوگ نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کرتے تھے اسپر بہت تنازع کے بعد یہ بات طے پائی کہ انکے دیوان میں سے چند متفرق اشعار کاغذ کے پرچوں پر لکھکر ایک تن میں ڈالدی جائیں اور ایک ناخواندہ لڑکے سے کہا جائے کہ ایک پرچہ اٹھالے اور اسی پرچے کے شعر کے موافق یہ قضیہ فیصل کیا جائے۔ بہرحال ایسا ہی کیا گیا اور یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرقِ گناہ ست میرود بہ بہشت

حافظ کے دوستوں نے ایک خوشی کا نعرہ مارکر جنازہ اٹھایا اور ایک جماعت کثیر کے ساتھ نماز پڑھکر دفن کیا۔ ایک مقام ہے شیراز سے شمال ومشرق میں دو میل کے فاصلہ پر۔ وہاں ایک چھوٹے سے قبرستان کے وسط میں انکا مزار ہے۔ یہ ایک سرو کے درخت کے سائے میں واقع ہے جسے خود انہوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ اس قبرستان سے ملا ہوا ایک باغ ہے اور ایک چھوٹا سا پھاٹک دونوں کے بیچ میں راستے کے طور پر واقع ہے۔ اس مزار کی وجہ سے اس مقام کا نام حافظیہ مشہور ہوگیا ہے۔

سنہ ۱۴۵۲ء میں جسوقت سلطان ابوالقاسم بابر نے شیراز کو فتح کیا اسکے وزیر مولانا محمد معمائی نے حافظ کے مزار پر ایک نہایت خوبصورت روضہ تیار کروا دیا اور سنہ ۱۱۸۰ء میں کریم خاں زند نے انکی قبر پر مراغہ آذربائجان سے سنگ مرمر خالص کا ایک ٹکڑا منگوا کر خط نستعلیق میں انہیں کی یہ غزل ابھرے ہوئے حرفوں میں کھدوا کر لگوادی ؎

مژدۂ وصل تو کو کز سرِ جاں برخیزم — طائرِ قدسم و از دامِ جہاں برخیزم
یارب از ابرِ ہدایت برساں بارانے — پیشتر زانکہ چو گردے زمیاں برخیزم
بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی — از سرِ خواجگیِ کون و مکاں برخیزم
بر سرِ تربتِ من بے می و مطرب منشیں — تا ببویت زلحد رقص کناں برخیزم
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — تا سحرگہ ز کنارِ تو جواں برخیزم
تو مپندار کہ از خاکِ سرِ کوئے تو من — بجفائے فلک و جورِ زماں برخیزم
سرو بالا بنما اے بتِ شیریں حرکات — کہ چو حافظ ز سرِ جان و جہاں برخیزم

اس نفاست اور خوبی کے ساتھہ یہ اشعار کندہ ہیں کہ بجاے اسکے یہ خیال کیا جاے
کسی سنگ تراش کے تیز ہتیار نے پتھر میں انکو کھودا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خوشنویس
کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔

زند نے علاوہ اسکے چند حجرے بھی علما اور فقرا کے لیئے بنوادئے ہیں اور باغ کو خوب
اچھی طرح سجایا ہے جسکے پاس ہی نہر رکنی اور تقریباً ۱/۲ میل کے فاصلے پر جانب مغرب
مسجد مصلی واقع ہے۔

انکی وفات کے بعد سید قاسم انوار نے جو انکے متبعین میں سے تھے ۵۶۹ غزلیں
جمع کرکے انکے دیوان کی ترتیب دی اور دیوان حافظ اسکا نام رکھا۔گو کہ سرگور اسلی کا
خیال ہے کہ محمد گل اندام نے انکے دیوان کو جمع کیا اور اسکا دیباچہ بھی لکھا گر پہلا بیان زیادہ
قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔

زمانہ وسطی میں جسطرح عیسائیوں میں کتب الیڈ اور اوڈیسی میں سے فال دیکھنا جاری
تھا اب بھی مسلمان حافظ کے دیوان سے اُسطرح تفاول کیا کرتے ہیں میرزا احمد خاں لکھتا ہے
کہ نادرشاہ نے فارس پر حملہ کرنے کے لیئے پہلے دیوان حافظ میں فال دیکھی تھی اور جب
یہ شعر نکلا ؎

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

تو فال نیک شمار کرکے حملہ کیا اور فتحیاب ہوا۔

انکے دیوان میں فال دیکھنے - انہیں لسان الغیب یا ترجمان اسرار کہنے کو بعض
لوگ چاہے جو کچھ سمجھیں - مگر انکے کلام کے ساتھہ ان تمام باتوں کی نسبت انکے علوے مرتبت
اور عام مقبولیت کا اظہار کرتی ہے - اور یہ عزت اور پسندیدگی عام جو انہیں دی گئی ہے ہیرو ورشپ
سے کسیطرح کم نہیں فقط

معشوق حسین خاں

بہار پر مشرقی و مغربی شاعرانہ خیالات

مشرقی شاعرانہ خیالات

(ا) بہار نے زمیں پر فرش دیبا بچھایا۔ دنیا کا چہرہ نگاریں بنایا۔ خاک سے اسرار نہاں پیدا کئے۔ پانی کو نہاں کر کے ابر بنایا اور پھر اسکو برسایا۔ ہوا سے صحرا میں مشک پھیلایا سبزے سے چمن کو روضۂ رضواں بنایا۔ دیدۂ بینا کو سرمایہ اور سینۂ غمگین کا مایۂ سود بنایا۔ عروس گل کو گلستان میں آراستہ کیا۔ بوئے گل اور رنگ گل کو ایسا بہم پیوستہ کیا جیسے مشک و مرجان۔ ابر و لالہ سے ہوا کو اسود اور زمین کو ابیض اور دمن کو احمر چمن کو اخضر بنایا۔ چمن کے سر پر کلاہ یاقوت رکھی اور زمین کو حلّۂ مینا پہنایا۔ ابر نے اپنے جیب و دامان گوہر سے پر کئے۔ قوس قزح نے پردہائے الوان تو بر تو لٹکائے۔ لالے پر اوس یا جیسے کہ شفق میں شعاع۔ درختہائے بارور، شترہائے باربر۔ ایک دوسرے کے پیچھے قطار در قطار۔ نیلوفر لنگر زمین پر رسن باز کی طرح چلا۔ اور اسطرح چڑھا جیسا کہ چور کمند پر۔ صنع خانۂ قدرت سے گوناگوں صورتیں نمودار۔ لالے کی سرخی شنگرف سے نہیں بنی۔ سبزے کی سبزی زنگار سے نہیں پیدا ہوئی۔

(ب) وقت عیش و گاہ سرور ہے۔ بار جوان ہے لیکن خدا غفور ہے شوق و صبر برق و کشت۔ ذوق و تحمل سنگ و بلور۔ عشق و شکیب ممتنع۔ رنج و صبر محال۔ زہد گناہ مے نوشی ثواب۔ ہجر، قیامت۔ وصل جناں۔ یار حور۔ بزم قصور۔ واعظ و رند بصیر و کور۔ دانش و دل سنگ و گل۔ جود و طبع بوسے و مشک۔ جودت و فکر تابش و بلور۔ خاک چمن آب رواں سے آئینہ وار۔ زاغ سبزے سے زمرد۔ باغ لالے سے مرجان۔

(ج) بہار آئی کہ گل سے گلبانگ ہزار آئی۔ ہر شاخ و برگ پر ارغوان ہے۔ گل پر خروش عندلیب ہے۔ چنار اور سرو پر نالۂ قمری ہے۔ کوئی دلبر سادہ سے بغل گیر، کوئی ساغر بادہ سے افتادہ۔ کوئی سبزے پر غلطاں۔ کوئی لالے پر رقصاں۔ کوئی بے خبر۔ کوئی ہوشیار۔ کوئی صنعت پروردگار کے دیکھنے میں محو۔ کوئی مے پیتا کوئی نے بجاتا ہر جا پر جشن و جوش ہر گام پر ایک قدح نوش۔ فصل نو بہار سے کسی میں ہوش نہیں رہا۔

(د) فصل بہار میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ نقش و نگار کہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ خاکِ تاریک سے یہ گلہائے نغز و پر نگار کہاں سے نکلتے ہیں اگر آب و خاک سے گل و ریحان پیدا ہوتے ہیں تو آب و خاک شورہ زار سے کیوں گیاہ نہیں پیدا ہوتی۔ وہ صورتگر ماہر کون ہے کہ بے تقلید غیر اسقدر صورتیں بے علت و آلہ بنا دیتا ہے پوچھنا چاہیے کہ یہ تماثیل کہاں سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ تصاویر کہاں سے آشکار۔ گل خیری کیوں زرد رو ہے۔ لالہ کیوں داغدار ہے۔ ریاحین بے زنگار کیوں سبز ہیں۔ شقائق کوہسار کیوں بے شنگرف سرخ ہیں۔ بادِ بے عنبر کیوں عنبر فشاں ہے۔ ابر بے گوہر کیوں گوہر بار ہے۔ ارغوان کے ہاتھ میں تسبیح یاقوت کیوں ہے۔ کوکنار کے سر پر تاج زمرد کیوں ہے۔ بجلی کیوں قاہ قاہ ہنستی ہے۔ ابر کیوں زار زار روتا ہے۔ ابر غواصی نہیں جانتا پھر کہاں سے گوہر لاتا ہے۔ باد رقاصی نہیں جانتی پھر بہار میں کیوں ناچتی ہے۔ چہرۂ گل غازے کے بغیر کیوں سرخ رنگ ہے۔ زلفِ سنبل بے شانے کے اسطرح کیوں تابدار ہے۔ یہ سب باتیں اسلیئے ہیں کہ عارف یزداں پرست وزاہد صنع و قدرت پروردگار کو جانے اور حکیم صنع ایزدی میں محو و حیران ہو۔

مغربی خیالات شاعرانہ

ا۔ بہار کیا آئی فضائے آسمانی سے نیر اعظم کی دختر درخشاں و تاباں جوانی کے گھمنڈ میں بھری ہوئی اور نیچر کے گہرے عشق میں ڈوبی ہوئی آئی۔ بادِ نسیم اُس کی راہ میں آگے آگے پنکھا

جلتی ہوئی چلتی ہے - اس مئے رخ چہرے کی آب وتاب کو دیکھکر جاڑا شرمندہ ہوکر بہاگا اب بہار کی حکمرانی
کو زمین وآسمان دیکھکر خنداں ہوتے ہیں -

(ب) بہار گلاب کے پہولونکو کہلاتی ہے - پرندوں سے نوا سنجی کراتی ہے - انکی آوازونکو
ہمساز کرکے روح افزا بناتی ہے پرانسے جنگلوں میں کوئلوں سے کوکو کا غل شور مچواتی ہے چشمونکو
رواں کرتی ہے - چٹانوں میں اٹہاتی بٹہاتی ہے - خوبصورت خولصورت کلیونکو کہلاتی ہے -
انپر بہونروں اور شہد کی مکہیوں کو پہراتی ہے - چنڈول کو خاموش بلندیوں پر بلند آوازی کے
ساتہہ گواتی ہے - ابر سے مینہ برساتی ہے - بہیڑوں اور انکے بچوں کے اوپر سے اون کترواتی ہے
جس سے وہ لرزتے اور کانپتے ہیں -

(د) بہار میں صبح کو جو اوس پڑتی ہے اسکو آفتاب نوشجان کرکے دوشیزگان سبزہ سے
بوسہ بازی شروع کرتا ہے - شہد کی مکہیاں بہنہاتی ہوئی پہولونپر اور سبز پتیوں پر اڑتی ہیں -
سبز پتونپر اوس گرکر اپنے ساتہہ کونپلوں اور کلیونکو لیکر زمین پر گرتی ہے - بادل آسمان کے
ستون بنتے ہیں اور پہاڑونکی سفید چوٹیوں پر اپنے قدم جماتے ہیں - اور اپنے انعکاس شعاع
سے ہوا میں آگ لگاتے ہیں - سبزہ زار لہلہاتے ہیں جانور اپنے بہانت بہانت کی بولیاں
بولتے ہیں - پہولونکا مینہ برستا ہے اور ہوا مہکتی ہے - ٹہنیوں میں پرندونکے گانے کی
آوازیں اور دور کے چشموں سے پانی نکلنے کی صدائیں آتی ہیں - سب نباتات اپنی زندگی
کا دم بہرتے ہیں چکنے چکنے پتے چمکتے ہیں - سڑکوں پر درختوں سے ہزاروں پہول گرتے ہیں -

س - جاڑا اپنی سر وسلطنت کے زور شور کو چہوڑکر جاتا ہے - بہار بادنسیم سے
سرگوشی کرتی ہوئی نرم رفتار سے چلی آتی ہے اور نیچر کو اپنی شبنم سے تروتازہ بناتی ہے اور
زمین کا حال جو ہبوط آدم سے پیشتر تہا اسکو بحال کرتی ہے یعنی بہشت بناتی ہے - وہ حسن
وجمال جو پہلے نظر سے مخفی تہے انکو آشکارا کرتی ہے اپنے نقاب کے نیچے سے ایک
عجب عالم منورہ دکہاتی ہے - ہر غنچہ وگل میں قدرت ایزدی کا جلوہ نمایاں کرتی
ہے - شاعرونکی قوت متفکرہ میں جودت پیدا کرتی ہے پانی کو ایسا آئینہ بناتی ہے کہ اس میں
روشن ستارونکے عکس پڑنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نیچے اتر آیا ہے سمندر

کی نبض کو آہستہ آہستہ نرم نرم چلاتی ہے۔ ہوا کو پاک صاف و معطر بناتی ہے۔
اوس سے پہولونکے سرونکو نیچا کرتی ہے۔ گرمی اور روشنی میں خدا کی شان و عظمت
دکہاتی ہے۔ کہیتوں میں اناجونکو لہراتی ہے۔ راتوں میں بہینی بہینی بو پہیلاتی ہے۔
پہولونپر باد نسیم کو چلاتی ہے۔ مردہ پہولونپر منہہ کو ڈلاکر زندہ کرتی ہے۔ سمندر میں مچہلیوں
کو بلورین موجونپر نچاتی کداتی ہے نباتات کا حال ایسا بناتی ہے جیسا کہ حیوانات کا حال
عین ایام شباب جوانی میں ہوتا ہے۔

ذکاء اللہ

(۲)

بیاضِ حسرت

فیضی

از بدمستی دگراں غمزۂ خود کام لبریز است	گریاں تبسم از گلِ دشنام لبریز است

سید عطا کریم صاحب بہاری شاگرد حضرت تسلیم مدظلہ

ہے فروزاں جو کنول لالۂ صحرائی کا	عرس جنگل میں ہے شاید کسی سودائی کا

لا اعلم

اے شب ہجر نہیں ہے یہ سیاہی تیری	خون گردن پہ ہے تیری کسی سودائی کا

غزل (ماخوذ از بیاض عثمان محمد صاحب مخمور)

دل تمنائے وصل او دارد	چہ بلا مشکل آرزو دارد

دل گرفت و ز بد معاملگی — پیشم انداخت کیں رفو دارد
شورِ عشقیں دست و خنجر تست — زخم باز خم گفتگو دارد
اے خوشا سرخوشیکہ ہر شب درون — دست در گردنِ سبو دارد
گل ز طرفے و بلبل از طرفے — در چمن گفتگوے او دارد
بلبلاں ہم مزاجِ دل نشدند — کس چہ داند کہ گل چہ خود دارد
ناصحا آرزو مپرس از من — ہر کہ دل دارد آرزو دارد
نسبتی دل بہ درد معتبر است — لالہ از داغ آبرو دارد

نظیر اکبر آبادی

شور افگنِ جنوں ہو جس جا نگاہ کرنا — رکتا ہے کام ای دل ان ضبط آہ کرنا

داغ دہلوی

اسی کے ساتھ میں بھی ہوں یہ لیجائے جہاں مجھکو — نہ چھوڑوں آسماں کو میں نہ چھوڑے آسماں مجھکو
ادہر جاؤں اُدہر جاؤں - کدہر جاؤں تری حالت تھی — جب اپنے در پہ اُسنے دیکھہ پایا نا گہاں مجھکو

مخمس مہر بر غزل آتش

(ماخوذ از بیاض مخمور)

آپ پہلو سے اگر جائینگے ہا — ہم نگاہوں سے اتر جائینگے
کسکو دیکھینگے کدہر جائینگے — یہ نہ فرمائیے گہر جائینگے
ہم تو اس بات میں مرجائینگے

سہیں کب تک تعبِ جور و ستم — ظلم بے صرفہ و بیداد و الم
سنتے ہو اے قلق و محنت و غم — عشق کے رنج یہی ہیں تو ہم

ایک دن جی سے گذر جائینگے

قافلے سے ہوئی دوری یارب — اُس منزل کی بہی ٹوٹی یارب
اب تو رہبر نہیں کوئی یارب — گم ہوئی بانگ جرس بہی یارب

ہیسے واماندے کہ ہر جا رہینگے

اب نہیں رہنے کے صابر شاکر — کرینگے جوہر ذاتی ظاہر
بیٹھ گئے بیکش رندو کافر — تنگ سے ہاتھ اٹھاکر آخر

نام ہم عشق میں کر جائینگے

استقدر آنہ ہوا پر صیاد — خوش نوا اپنی جفا پر صیاد
یاں توکل ہے خدا پر صیاد — تا چمن ودمن صبا پر صیاد

مرسے اڑتے ہوئے پر جائینگے

مت رہنے تابع دل اے علیشی — تب تو رہتا ہے خجل ای علیشی
دل پہ رکھہ صبر کی سل اے علیشی — خوبرو یونسے نہ مل اے علیشی

صاف دل لیکے مگر جائینگے — فقط

دیگر غزل ظہوری

وا نمے گردد پئے شکوہ لب اظہار ما — بیشتر از فرط بیکاری برآید کار ما
راحت ما بخ ما باشد گل ما خار ما — روے آسانی نہ بیند مطلب دشوار ما

وڑدا درمان ما آرام ما آزار ما

بات مستحکم ہے جو ہمنے کہی روز الست — چپکے چپکے کر رہے ہیں ہم اُسی کا بندوبست
ہے اشارہ سے ہمارے رتبہ گفتار پست — وحدت انشائیم از بس قول و فعل ما یک است

از خموشی می تراود چون قلم گفتار ما

ہیں تہیدستی میں ہم اہل دول سے پیشدست — کہتے ہیں حاجت روا ہمکو سبھی ہشیار مست

اپنے گھر میں ہم نہ کیوں صبح و مسا کرلیں نشست
در کمین تیرہ بختی دولت آسائش است
سایۂ بال ہما شد سایۂ دیوار ما

ہمکو دنیا کا نہیں آتا ہے ہرگز رشک و شید
سرد و گرم دہر کی باقی نہیں ہے ہمکو قید
اے قناعت ہم کریں کس زندگی پر مکر و کید
بسکہ وا ردیا س اینجا در بغل جنس امید
آہ سرد ما نماید گرمئ بازار ما

ورد سے لیتے ہیں اکثر کار و بار عافیت
بوستان غم میں پاتے ہیں بہار عافیت
موت سے بدتر ہے ہمکو انتظار عافیت
ہمت عالی نگردد شرمسار عافیت
جز نمک مرہم نباشد بر دل افگار ما

جلوہ فرمائی مری خالق کو جو منظور تھی
ہوگئی موجود صورت عالم ایجاد کی
شمع وہ پیدا ہوئے فانوس اسکے ہم سبھی
شوخیش نہفت جز در پردۂ بے پردگی
کرد پنہاں خویش را در پردۂ اظہار ما

ہمرہاں محو رخ پاک تو اے سرگشتہ ایم
در فقیری زیں سبب ہمرتبۂ مہ گشتہ ایم
بسکہ از افعال خود یک شمہ آگہ گشتہ ایم
باظہوری در سلوک اے درد ہمرہ گشتہ ایم
پارہ پیش است از گفتار ما کردار ما

منشی منیر مرحوم شکوہ آبادی

فروری کے اردوئے معلیٰ میں مادھو رام صاحب آبادی نے جو کچھ حالات زندگی منشی منیر مرحوم کے تحریر فرمائے ہیں وہ ناقص ہیں۔ مجھے جو کچھ واقعات معلوم ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

منیر کا لکھنؤ پہونچنا اور براہ راست وہاں سے فرخ آباد جانا صحیح نہیں ہے۔

جب منیر لکھنؤ پہونچے ہیں تو انکی عمر ۱۷ سال کی تھی انھوں نے لکھنؤ جاکر علوم و فنون میں کمال حاصل کیا اور ناسخ کے شاگرد ہوئے اور بعد ناسخ کے جناب رشک سے فیض پاتے رہے جبتک

اُنکے کلام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں اُنکی کچھ شہرت و قدر نہوئی تب یہ کانپور چلے گئے وہاں ایک رئیس نے فکر معاش سے اُنہیں آزاد کیا تھوڑے دن وہاں رہے اور پھر کسی بات پر اُسنے ناراض ہوکر لکھنؤ آئے۔ تب نواب فرخ آباد نے اُنکو طلب کیا اور یہ وہاں گئے۔ اُنکے فرخ آباد پہونچنے کے تھوڑے عرصے کے بعد نواب تجمل حسین خانصاحب اُنکے قدرداں نے انتقال فرمایا اور یہ بعد اس واقعے کے فرخ آباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ آئے۔ اپنے استاد رشک کی خدمت میں کچھ دنوں حاضر رہے۔ اور اُنہیں کے ساتھ ایک بڑے مشاعرے میں کرکر کانپور گئے جس میں بہت سے رؤسا اور نواب علی بہادر خانصاحب رئیس باندہ بھی موجود تھے جو انہیں اپنے ہمراہ لے گئے اور انکی بڑی قدردانی و قدر افزائی کی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کرکے اپنا اُستاد بنایا۔ غدر میں جب نواب باندہ نے برٹش گورنمنٹ سے بغاوت کی اور بہ طلب امداد فرخ آباد تک پہونچے تو منیر بھی اُنکے ہمراہ تھے نواب فرخ آباد و باندہ معزول کئے گئے۔ باندے کے وزیر اعظم میرزا ولایت حسین خانصاحب اور منشی سید اسمٰعیل حسین صاحب کو سزائے حبس دوام بعبور دریائے شور ہوئی اور یہ انڈمان بھیجدیئے گئے۔ بعد فرو ہونے غدر کے الہ آباد میں جو جلسہ خیرخواہان برٹش گورنمنٹ کا منعقد ہوا اُسمیں نواب یوسف علیخانصاحب رئیس رامپور بھی بغرض شرکت بلائے گئے۔ الہ آباد میں اُسی زمانے میں ایک گویا لکھنؤ کا (جو کسیوقت سلطان عالم واجد علیشاہ بہادر کے یہاں تھا) موجود تھا والی رامپور نے اُسے طلب فرمایا اور گانے سنے۔ اُسنے منیر کی مشہور غزل بالوں کے سامنے غزالوں کے سامنے گائی جسے نوابصاحب موصوف نے پسند فرمایا اور اُس سے منشی منیر کے حالات دریافت فرمائے اور خود بھی ایک غزل اُسی ردیف قافیے میں نظم کی جسکا مقطع یہ ہے کہ۔ ؎

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

یہ لحاظ رہے کہ منیر نے اپنے مقطع میں فرمایا تھا۔ ع

شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

گو بیٹے کو منیر کی قید کی حالت معلوم نہ تھی اُسنے لکھنؤ میں آپکی موجودگی بیان کی۔ قدردان نواب نے اُسکو اپنا نوکر بنا یا اور منیر کے بلانے کو معہ ایک شقہ وزراورراہ کے روانہ فرماکر خود اپنے دارالسرور کو تشریف لے گئے اور وہاں پہونچکر انتقال فرمایا۔ اب چھ سال منیر کو قید میں گذر چکے ہیں اور اس عرصے میں وہ ہزارہا مناقب و مناجات کہہ چکے ہیں ساتواں سال بھی نصف ختم ہوچکا ہے۔ ایک قصیدہ جناب رسالتمآب کی شان میں انڈمان میں لکھنا شروع کیا ہے اور اُس میں التجا کی ہے کہ۔

اسی نو یحجہ تک مطلب مرے دل کے عنایت ہوں

کرے اب کا محرم ہند میں یہ بندۂ جانی

آپ کی اس خوش اعتقادی کا اثر ظاہر ہے کہ ۱۲۷۶ھ محرم تک قید سے رہا ہو گئے۔ رہائی پر پہلے الہ آباد پہونچے اور میر غلام عباس صاحب رئیس نے وہاں انکی قدر کی تب اُنھوں نے نظم مثنوی معارج المضامین شروع کی اور وہاں سے مکان گئے جہاں پہونچکر عیال و اطفال کی مرگ کی خبر پاکر صدمہ جانکاہ ہوا اور وہاں سے پھر لکھنؤ آ گئے۔ یہاں نواب یوسف علیخاں مرحوم کے انتقال کی خبر انہیں اُسوقت ہوئی جبکہ وہ اُس غزل پر مصرعہ اور جواب شقہ تحریر فرما چکے تھے۔ اپنی بدقسمتی پر افسوس کیا۔ لکھنؤ میں اُسوقت بھی انکی ویسی قدر نہوئی جیسی ہونا چاہیے تھی تاہم آغا علی حسن خانصاحب نے انکو بڑی مدد دی اور کچھ روز بے فکری سے شاعری میں مصروف رہے۔

اُسی زمانے میں اُنہیں جشن ولادت ولیعہد رامپور کی خبر ملی اور ایک تہنیت نامہ مع قطعات تاریخ و عرضی کے نوابصاحب کی خدمت میں ارسال کیا جب قدردان نواب نے انہیں فوراً طلب فرمایا اور اپنا مصاحب خاص بنایا سو روپیہ تنخواہ مقرر کی۔ اسکے بعد آخر وقت تک رامپور میں رہے۔ مشہور ہے کہ کسی نے زہر سے ہلاک کیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہیضے سے انتقال فرمایا۔ سال رحلت اس مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ع

انتقالِ منیر عالی قدر ہا

۱۲ ھ ۹۷

منیر مرحوم کی یادگار انکا کلام فصاحت بلاغت نظام اور لایق شاگرد موجود ہیں۔ ایک بیٹے اکبر
ابو محمد صاحب جو کسی ممتوعہ کے بطن سے تھے رامپور میں فوت ہوئے۔ آپ شعر و سخن غزلیات
میں امام الشعرا جناب شیخ امام بخش ناسخ اور جناب سید علی اوسط رشک سے اور مرثیہ و سلام میں
حضرت سلطان الذاکرین میرزا دبیر مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔

مجھے افسوس ہے کہ منشی مادہورام صاحب نے کلام منیر کا اچھا انتخاب شائع نہ کرایا۔
کلیات منیر کے دیکھنے سے ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور جملہ اصناف
سخن پر قدرت رکھنے والا استاد تھا۔ ہر رنگ کا کلام انکے کلیات میں موجود ہے۔ اکثر
رام پور کے مشاعروں کے حالات مشہور ہیں کہ نواب کلب علیخاں بہادر نے حکم دیا ہے کہ آج منیر
سب سے پہلے غزل پڑہیں اور منیر نے عرض کیا ہے کہ ظل اللہ بعد میرے مجھے امید نہیں کہ
کوئی دوسرا پڑہے اور ایسا ہی ہوا ہے کہ بہرے مشاعرے میں تنہا منیر کی غزل پڑہی گئی ہے

راقم الحروف نے اکثر واقعات ازدمان شیخ فضل احمد مرحوم مختار عدالت رئیس بدایون
سے (جو انکے ہمراہ قید تھے اور ساتھ چھوٹکر آئے اور جو انہوں نے میرے حقیقی خالو منیر کے شاگرد
رشید سے بیان کئے) اور مولوی راشد علی صاحب ضیا مرحوم رئیس بدایون و دکیل چی کر
اور لکھنؤ و رامپور کے حالات مرزا محمد زکی خانصاحب رئیس لکھنؤ اور حضرت تسلیم لکھنوی سے معلوم
کئے ہیں۔ آیندہ بشرط فرصت انشاءاللہ انتخاب کلام منیر نذر ناظرین کرنیکی کوشش کرونگا۔

راقم حسن فضل ال بدر ایڈیٹر ہر روزہ اخبار۔ لکھنؤ

(❀)

خاندان مشترکہ

(❀)

ان تجاویز کے زمرے میں، جو اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں "خاندان مشترکہ" کا

مسئلہ بھی نہایت اہم و نتیجہ خیز ہے۔ مگر برعکس دیگر مسائل کے ابھی تک اسپر مصلحان قوم کے سخنگاریوں اور آتش بیانیوں کا جادو نہیں چلا۔ کئی مسئلوں کی اہمیت تو امر مسلمہ ہوگئی ہے اور انکا کچھ نہ کچھ عملی اثر بھی ہوچلا ہے۔ مسئلہ ازدواج بیوگان ہی کو لے لیجئے۔ گو ابھی تک اسکا رواج عام نہیں ہوا اور نہ ایک صدی تک ہم یہ امید کرنے کی جرات کرسکتے ہیں تاہم گاہے ماہے ہمکو ایسی شادیوں کی مثالیں ملجایا کرتی ہیں اور گورنمنٹ نے بھی ازدواج بیوگان کا ایکٹ پاس کرکے اُن تمام تردوات و تنازعات کو جو ایسی شادیوں سے ضرور واقع ہوتے، رفع کردیا ہے۔ ایک اور مسئلہ انسداد شادی صغرسنی کا ہے۔ اس امر میں رفارمرونکو قابل اطمینان اور قابل مبارکباد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ چند ہندوستانی سربرآوردہ ریاستوں نے اس کی قانونی امداد کی بلکہ اصلاح معاشرت کے ہر جلسے میں اسپر بڑے شد و مد کے ساتھ بحث کیجاتی ہے اور کوئی ایسی مجددانہ جماعت نہوگی جسنے اس مسئلہ کو عملی ہیئت میں لانیکی کوشش نہ کی ہو۔ علی ہذا اور بھی چند مسائل ہیں جو ابھی مناظرہ و مباحثہ کے سخت مدارج طے کرکے امر مسلمہ کے پاسے تک پہونچ چکے ہیں۔ مگر "خاندان مشترکہ" کا مسئلہ کچھ ایسا پیچیدہ ہے اور ہمارے قومی علاوات خجستہ کا ایک ایسا اچھا نمونہ ہے کہ اُسکے خلاف کچھ کہتے یا لکھتے طبیعت ہچکچاتی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ طرز معاشرت و طرز تعلیم نے اسکے اثر کو کمزور کرنا شروع کردیا ہے مگر تاہم ابھی تک باستثنائے اُن حضرات کے جو غیر ممالک سے اعلیٰ درجے کی تعلیم پاکر آئے ہیں متوسط طبقے میں اسکا رواج اگر بڑھتا نہیں ہے تو گھٹ بھی نہیں رہا ہے۔ اسکے کئی اسباب ہیں اصلاح کے جتنے دوسرے مسئلے تھے۔ اُنکی تائید و تسکین کم و بیش مذہبی کتابوں سے کی گئی۔ علماے دینیات کے فتوے لئے گئے۔ یہ زور دیکر کہا گیا کہ ہم رفارم سے نئے رواج نہیں پھیلانا چاہتے بلکہ سلف کے رواجونکے مردہ قالب میں از سرنو روح پھونک رہے ہیں۔ مسئلہ جوائنٹ سسٹم کی تائید کسی کتاب سے نہ ہوسکی۔ دوم یہ کہ دوسرے مسئلوں کا وجود مدت دراز سے ہے۔ مثلاً عقد بیوگان کا مسئلہ ایشور چندر ودیا ساگر مرحوم و مغفور کے دور بینیوں کا نتیجہ ہے۔ مسئلۂ زیر بحث کی عمر ابھی بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں۔ اور اس زمانے میں بھی اُسکی پرورش و پرداخت پر کافی توجہ نہیں کی گئی۔ سب سے بڑی رکاوٹ

جو اس مسئلے کی ترقی میں ہوئی وہ غالباً ہمارے طرز معاشرت کی جانب سے ہوئی۔ کیونکہ برعکس دیگر مسائل کے اس میں اور دستور التمدن کے اصولوں میں نہایت قریبی تعلق ہے۔

یہ تو تمام باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ ہر ملک کے تہذیب کا ابتدائی زمانہ جنگ و جدل کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔ کیونکہ اسوقت رزق کا دار و مدار حرب و ضرب پر ہوتا ہے یہی حال ہندوستان کا بھی تھا۔ جب کسب معاش کا بجز شکار کے اور کوئی دوسرا وسیلہ نہو۔ اور شب و روز وحشی جانوروں کے حملے کا اندیشہ ہو تو مقتضائے فطرت یہی ہے کہ انسان وحشی بجائے۔ چنانچہ اسوقت آدمیوں اور جانوروں میں سوائے شکل و شباہت کے کوئی دوسرا فرق نہ تھا۔ ورندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا۔ بات بات پر خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ مرنا مارنا ایک دلچسپ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں لازم آیا کہ انسان بھی جانوروں کی طرح جتھے بنا بنا کر رہے۔ اور اپنی جماعت کو گزندوں سے بچائے جب تہذیب کی یہ حالت ہو تو عورتوں کی حالت کا کیا ذکر! وہ کنیزیں خیال کیجاتی تھیں اور انکا کام تھا کہ مردوں کو کھلائیں پلائیں اور حتی الوسع انکی خدمت کریں۔ حقوق نسواں، تہذیب کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔

امریکہ کے مشہور فلاسفر ایمرسن کا قول ہے کہ ہر ایک ملک کی تہذیب کا سب سے اعلیٰ مقیاس یہ ہے کہ وہاں عورتوں کی کیا حالت ہے۔ یہ رسم جو کسی زمانے میں بقائے وجود کی غرض سے نکالی گئی تھی اب بگڑتے بگڑتے خاندان مشترکہ کی موجودہ حالت کو پہونچ گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ قدیم میں یہی رسم ہمارے وجود کے قائم رہنے کا باعث تھی۔ اسی کی پابندی پر زندگی کا دار و مدار تھا۔ اور گو اب ہمارا طرز معاشرت بالکل بدل گیا ہے تاہم اس رواج کی پابندی سے ملک کو بڑا فائدہ ہے۔ ہمارے یہاں بیوائیں کسب معاش کے لیے مجبور نہیں کیجاتیں۔ اگر ایک گھر میں چار بیوائیں ہوں اور کمانیوالا صرف ایک تو وہ ان چاروں کی پرورش کرتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو زمانہ اُسکو مطعون کرتا ہے۔ یورپ میں یہ حال ہے کہ اگر شوہر نے مرتے وقت تک اپنی عیال کی کفالت کا کوئی معقول انتظام

دکیا تو بیچاری بیوہ کی حالت نہایت نازک ہو جاتی ہے۔ عزیز و اقارب اسکی دستگیری کرنے کو رحم خیال کریں تو کریں فرض نہیں خیال کرتے۔ وہ تحصیل معاش کے لئے دربدر خاک پھانکتی پڑتی ہے۔ تاوقتیکہ اُسکا کوئی دوسرا خریدار نہ پیدا ہو جاوے اور اگر بدقسمتی سے وہ جوانی سے گری ہوئی ہے تو بیچاری کی بقیہ زندگی روتے ہی کٹتی ہے۔ بوڑھے جوان بیٹوں کے ہوتے چکی پیستی ہیں۔

یہ اسی رسم کی پابندی کا فیض ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں باپ ماں کے سامنے حقہ پینا یا ہنسکر بولنا۔ کنگھی آئینہ کرنا بے ادبی میں داخل ہے۔ ہم چاہے اپنی جان دیدیں گر والدین کا کہنا نہیں ٹالتے۔ غرض اسی رسم نے سخاوت، غربا پروری، نفس کشی اور بزرگوں کی تعظیم نیز دیگر خصائل حمیدہ ہماری سرشت میں خمیر کردئے ہیں۔

مگر جب ہم ان فوائد کا اُن نقصانات عظیم سے مقابلہ کرتے ہیں جو اس رواج کے باعث سے پیدا ہو گئے ہیں تو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس رسم کی پابندی ہمارے لئے جانگداز ہے ایک تجربہ کار فلاسفر کا قول ہے کہ جس قوم کے افراد کو سادہ خانگی خوشیاں میسر نہیں ہیں وہ کبھی پایۂ عروج پر نہیں پہونچ سکتی اور جسنے یہ کہا ہے بہت ٹھیک کہا ہے۔ ہملوگ خانگی مسرتوں سے محروم ہیں۔ ہمارے گھروں میں آئے دن ہم تخ تخ مچی رہتی ہے۔ کبھی ساس بہو سے منہ پُھلائے بیٹھی ہے کبھی بہو ساس سے روٹھی ہے نند اور بھاوج کے جھگڑے ہمارے یہاں گیتوں۔ قصوں اور کہانیوں میں عام طور پر مشہور ہیں۔ اگر گھر میں بیچاری ایک بہو ہے اور مرد اسکے مین دس آدمی تو وہ اُن دسوں کی کنیز بھی جاتی ہے۔ اُسکے لئے کھانا پکانا اُن کی وہی ضروریات کو رفع کرنا اُسکا فرض سمجھا جاتا ہے۔ بیشمار ایسی بیویاں ہونگی جو اس زندگی پر کنیزوں کی زندگی کو ترجیح دیں۔ اور جو کہیں گھر میں کوئی بوڑھی ساس ہوئی تو اُس گھر کی کیفیت نہ پوچھو۔ دنیا میں کوئی بادشاہ ایسا مطلق العنان ایسا خود رائے۔ ایسا طاعت خواہ ایسا خوشامد پسند۔ ایسا ظالم اور کٹر۔ ایسا زود رنج اور اپنے رتبے کو ایسی حاسدانہ نگاہ سے دیکھنے والا نہوگا جیسی یہ بوڑھی ساس ہوتی ہے۔ اسکے مارے بیچاری بہوؤں کی زندگی دوبھر

ہوجاتی ہے۔ اور زیادہ وقت تک اُسکے کئی بچے نہ ہو جائیں اور انکی بیویاں گھر میں نہ آجاویں اس بہو کی قسمت واقعی ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ صدہا نازک اندام۔ نئی نویلی بہوئیں انہیں مظالم کا عین جوانی میں شکار ہو جاتی ہیں۔ اور صدہا اگر نہیں جاتیں تو اپنی تندرستی ضرور کھو بیٹھتی ہیں۔ بیچارہ نوجوان شوہر اپنی ماں کے مقابلے میں بیوی کی ذرا بھی طرفداری نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو کچھ تو خود اُسکو ناگوار معلوم ہوتا ہے اور کچھ اہل زمانہ اُسکو بدنام و رسوا کرنے لگتے ہیں۔ جب عورت کی زندگی ایسی ہو کہ اُسکو کبھی دلی خوشیاں حاصل نہوئی ہوں۔ اُسے کبھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہوا ہو وہ جب بیٹھتی ہو تب گھونگٹ نکالکر اور سات پردوں کے اندر۔ تو وہ خود کیونکر تندرست رہ سکتی ہے اور اُسکی اولاد کیونکر تندرست ہو سکتی ہے۔ اور وہ اپنے شوہر کو، جو بیچارہ سارے کنبے کی معاش کی فکر میں اپنے جسم کو گھلا رہا ہو، کیا خوش کر سکتی ہے۔ شوہر بیچارہ ساس اور بہو۔ نند اور بھاوج کے جھگڑے سُن سُن اپنی قسمت پہ روتا ہے۔ غرض سارا خاندان، ناخوشی بدمزاجی اور اُداسی کا مسکن معلوم ہوسکتا ہے۔

یہ تو خانگی زندگی کا حال ہے۔ تمدنی نقصانات جو ملک کو اس رسم سے ہوتے ہیں اُنکا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ ہمارے یہاں بہت کم ایسے کمانیوالے ہونگے جن کے گھر پر آئے دن دس پانچ مہمان اڑے نہ رہتے ہوں۔ کوئی خالہ زاد بھائی ہے۔ کوئی ماموں زاد بھائی کوئی پٹی وار ہے۔ کسی کا سسرال سے تعلق ہے۔ غرض بیچارہ صاحب خانہ گو ان اتنے مہمانوں کے تصرفات کے بوجھ سے دبا جاتا ہے مگر اشارۃً کنایتاً بھی اپنی بے بسی کا اظہار نہیں کرسکتا۔ سیکڑوں اچھی تنخواہ والے تو انہیں مہمان نوازیوں ہی میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور دیہاتوں میں زمینداروں کے یہاں تو گویا ہمیشہ سخاوت کا دریا بہتا ہے۔ سیکڑوں جاگیریں۔ تعلقے اعزا و اقارب کی نازبرداریوں میں تباہ ہوگئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ جب ہمارے تمام ضروریات زندگی بلا ہاتھ پیر ہلائے رفع ہو جاویں تو ہمکو کیا غرض ہے کہ خواہ مخواہ محنت و مشقت کریں۔ ان میں زیادہ تر تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کو عالی خاندان و معالی دودمان بتلاتے ہیں اور محنت و مشقت کرنیکو کسر شان سمجھتے ہیں۔ اگر مفت کی پھلوریاں ملنے کی امید نہو تو یہی حضرات جھک ماریں اور نوکری ڈھونڈیں۔ اسطرح پر کاہلوں کی مدد کے "خاندان مشترکہ"

کاہلی اور آرام طلبی کی تحریک کرتا ہے - اتنا ہی نہیں - آرام طلبی اور مفت خوری کے نتیجے ہمیشہ بُرے ہوتے ہیں - یہ حضرات ہمیشہ ناکردنی حرکات کیا کرتے ہیں اُنکے خیالات نہایت گندہ ہوتے ہیں - اُنکے افعال نہایت قبیح - خود تو کیا بدنام ہونگے - صاحب خانہ کو البتہ بدنام کرتے ہیں - بلا مشقت کی روٹی ہمیشہ خون فاسد پیدا کرتی ہے - صاحب خانہ جب تک جیتا ہے انہیں لواحقین کی ساز و پرداخت میں اپنی تمام کمائی صرف کرتا ہے - اور جب یکا یک پنجۂ اجل میں گرفتار ہوجاتا ہے تو اُسکے بال بچونکا کوئی پرساں حال نہیں ہوتا -

رعایا کی تمدنی حالت کبھی مستقل اور اطمینان بخش نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ ہر فرد بشر اپنی ضرورتیں آپ رفع کرنیکی کوشش نہ کرے - ہر شخص کو آزادی حاصل کرنے اور اُس سے فائدہ اُٹھانیکی کوشش کرنا چاہیئے - دوسرے کی دی ہوئی روٹی کھانے سے چاہے اور ہر طرح کا آرام ہو مگر انسان کا نفس متحمل - ڈرپوک اور دبّو بنجاتا ہے - حالانکہ ہر ایک قوم کی عظمت و عروج کے لیئے ضروری ہے کہ اُسکے افراد جوشِ آزادی و خودمختاری سے بھرے ہوں اور جب اپنے ہاتھوں سے آزادی کو چھنتے ہوئے دیکھیں تو اُسکو ہاتھ سے نہ دینے کی پر زور کوشش کریں - جس شخص نے خود اپنی روزی نہیں حاصل کی وہ آزادی کا مزہ نہیں جان سکتا - اور جب آزادی کے مزے سے واقف نہیں ہے تو اسکو اس سے محروم ہونیکا افسوس کیونکر ہوسکتا ہے - اب اس کشاکش کے زمانے میں جبکہ گورنمنٹ کل اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے رعایا کا صبر و تحمل اور بزدلی نقصانات سے خالی نہیں - ضرورت ہے اسکی کہ قوم میں آزادی کی روح آجائے کیونکہ جب تک یہ جوش ساری قوم کے دلوں میں موجزن نہ ہو قومی اتحاد و اتفاق ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے - جس شخص میں اپنے پیٹ میں پالنے کی قوت نہیں اُس سے قومی بہبود کی کیا اُمید کیجا سکتی ہے - مفت خوری انسان کو بے شرم - بیحیا - بُزدل اور خوشامدی بنا دیتی ہے -

بعض اوقات "خاندان مشترکہ" کے مخالفین سے اعتراضاً یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی ہماری قوم اس رسم کو اُٹھا دینے کے لیئے مطلق تیار نہیں ہے کیونکہ درحالیکہ ایک کی کمائی دس کھاتے ہیں، روزگار عنقا ہورہا ہے اور جبکہ متلاشیانِ روزگار کی تعداد اور بڑھادیگی

تب تو اور بھی مشکل آپڑیگی - یہ اعتراض بالکل بیجا ہے - روزگار انسان کے پاس نہیں آتا - انسان خود اُسکی تلاش کرتا ہے - جب ہم روکھی روٹی اور پتلی دال پر قناعت کرکے دوسرے کے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں تو وہ حوصلہ اور وہ ہمت جو آزاد مزاجوں میں ہوتی ہے مردہ و افسردہ ہوجاتی ہے - اگر آدمیوں کو اپنی بیکاری و بے شغلی محسوس ہونے لگے تو وہ ضرور کسب معاش کے نئے راستوں کی ٹوہ لگائیں اور قوم کے الدار و مرفہ حال اشخاص دوسروں کے بار سے ہلکے ہوکر اپنا پس ماندہ حرفت و صنعت کی ترقی میں خرچ کریں سرمائے کی بڑھتی ہو - کارخانے کھلنے لگیں اور تحصیل معاش کا راستہ وسیع ہوجاسے - تیس کروڑ کی آبادی میں کم ازکم دس کروڑ عورتیں اور پانچ کروڑ لڑکے ایسے ہیں جو کوئی کام نہیں کرسکتے - اگر مفت خوروں کی تعداد پانچ کروڑ اور بڑھا دیجیے تو بیکار طبقہ بیس کروڑ ہوجاتا ہے - باقی دس کروڑ کی آبادی میں کتنے ہی بوڑھے کتنے ہی مریض کتنے ہی گداگر کتنے ہی بھک منگے کتنے ہی سادھو شامل ہیں - اس حساب سے کمانیوالوں کی تعداد مشکل سے پانچ کروڑ تک پہونچتی ہے اور ایک آدمی کو بحساب اوسط چھ آدمیوں کی پرورش کرنا پڑتی ہے - پروفیسر منوہر لال صاحب زتشی نے "زمانہ" کے دسمبر نمبر میں اسی مضمون پر لکھتے ہوئے یوں فرمایا ہے -

"کسی رواج کے حسن و قبح کو جانچنے کے لئے ہم دو معیار مقرر کرسکتے ہیں اول یہ کہ وہ افراد کو خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرنے میں مدد دیتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ عام جماعت میں متفقہ کوشش یا ملکر کام کرنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے" سطور مندرجہ بالا میں ہمنے یہ دکھانیکی کوشش کی ہے کہ اس رسم سے ان دو فائدوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہوتا - پس جتنی جلد قوم اس رسم کو خیرباد کہے اتنا ہی اچھا ہے -

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس رسم کے اٹھ جانے سے اعزا و اقارب میں وہ مضبوط رشتہ قائم نہ رہیگا جو اب ہے - ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ دن جلد آئے جب یہ رشتے کمزور ہوجائیں - کیونکہ اس سے قوم کو بیحد نقصان ہورہا ہے یورپ کا ایک بیس برس کا نوجوان گھر سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بلا کھٹکے چلا جاتا ہے - نہ اُسکی ماں روتی ہے نہ باپ آنسو بہاتا ہے - ہمارے یہاں یہ حال ہے کہ اگر ماں سنے کہ بیٹا بہکا جارہا ہے تو وہ سینہ پیٹنے

دانہ پانی ترک کر دے اور یا تو بیٹے کو روک دے اور یا اپنی جان دیدے - یہی وجہ ہے کہ خاندان مشترکہ عملاً معدوم ہے کیونکہ ایک آدمی کی کمائی صرف اُسی کو کافی ہو سکتی ہے - گھر کا ہر شخص اپنی روزی کماتا ہے - عورتیں اور بچے بھی بیکار نہیں بیٹھ سکتے - اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُن میں حوصلہ اور جوش باقی ہے - لاکھوں اہیر - چمار - کُرمی - کہار اپنے وطن کو خیرباد کہکر افریقہ - امریکہ - کی راہ لیتے ہیں - اور وہاں روپیہ کما کر اپنے ملک کو مالامال کرتے ہیں - نہ تو ماں دامن پکڑ کر روتی ہے اور نہ باپ - برعکس اسکے شرفا ہرگز یا بمشکل اُسی حالت میں جانا پسند کر سکتے ہیں جب اپنے وطن میں روزی ملنے کا کوئی سہارا نہو - اور امریکہ یا افریقہ کا نام سنکر تو اُنکے ہوش ہی پراں ہو جاتے ہیں اس بودے پن کی یہی وجہ ہے کہ وہ خاندان مشترکہ کی قیود میں اچھی طرح جکڑے ہوئے ہیں -

اس رسم کا اٹھ جانا اصلاح معاشرت کے اور کئی مسائل کے حق میں بھی آبحیات ہو جائیگا - مثلاً صغر سنی کی شادیاں آپ ہی آپ بند ہو جائینگی - ضرورت معاش بیوائوں کو بھی ازدواج پر راضی کرلیگی - اور تعلیم نسواں روز افزوں ترقی کرنے لگے گی - جب اس ایک اصلاح سے اتنی اصلاحیں خود بخود ہو سکتی ہیں تو کیوں نہ اسکی تقویت میں اور زیادہ توجہ کیجائے - ؟

(نواب رائے)

تنقید

(۱) حسنا اتفاقی حصہ اول | ۷۰ صفحے کے اس رسالے میں شیخ حنا حسن علی صاحب متوطن شاہ آباد ضلع ہردوئی نے ناول کے پیرائے میں اکثر تمدنی اور ملکی مسائل کے متعلق نہایت

خوبی سے کے ساتھ بحث کی ہے - یعنی ایک بگڑے ہوئے نواب کی محفل میں ایک انگریزی خواں اور روشن خیال "منشی صاحب" یا مصاحب اتفاقی" نے مختلف مسائل پر ایسی تقریریں کی ہیں کہ آخر میں نواب صاحب راہ راست پر آگئے ہیں - کتاب بہت دلچسپ ہے اور مصنف سے ۱/ کا ٹکٹ بھیجنے پر مفت ملسکتی ہے -

ہم حضرت مصنف کی اس ملکی ہمدردی اور بلند ہمتی کی داد دیتے ہیں -

ایک موقع پر خاموشی کی پالیسی پر اعتراض کرتے ہوئے "مصاحب اتفاقی" صاحب کہتے ہیں کہ " بڑے بڑے معاملات میں یہ ثبوت کو پہونچگیا کہ رعایا کو آزادی دی گئی ہے وہ ہر طریقے سے آداب شاہی کو ملحوظ رکھکر عرض معروض کر سکتے ہیں مگر ہم ایک ذرا سا معاملہ دکھلانیکی کوشش کرینگے کہ اسکی خاموشی توڑنے میں کیسی ہیلوتی ہو رہی ہے جسکا اثر تمام حصہ ملک پر پڑ رہا ہے - ہم عرصے سے ملک میں یہ بحث سنتے آتے ہیں کہ مسلمان پولیٹکل معاملات میں کیوں نہیں زبان کھولتے ہیں اور مثال کے طور پر کانگرس کی نسبت پوچھا جاتا ہے کہ اس میں وہ عام طور پر کیوں شرکت نہیں کرتے - صاحبو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مسلمانوںکا کانگرس میں شرکت کرنا گناہ ہے بعض اُسے خلاف گورنمنٹ کہنے کو تیار ہوتے ہیں - بعض سرسید صاحب بہادر کی پالیسی کو پیش کرتے ہیں - کہ اُنکی رائے بھی اسکے خلاف تھی -

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ سرسید واقعی ملک کے خیر اندیش تھے اور یہ ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے کہ اُنکی ذات بابرکات نے ملک اور خاصکر مسلمانونکو ایک عظیم فائدہ پہونچایا - لیکن یہ کہنا بالکل میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانونکو قطعًا جدوجہد سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے - صاحبو اس معاملے میں ایک عقلمند اور ایسے اعلے خیالات کے آدمی کی نسبت کسطرح ایسا خیال ممکن ہو سکتا ہے - ہاں وہ اپنی ذاتی قوت اور پرانے خیالات پر اگر ایسا کہتے اور کرتے تھے تو بیجا نہ تھا - مثلاً زید کے ایک دوست بکر نے دہلی جانیکا ارادہ بغرض خرید جواہرات ظاہر کیا جن کی اُسکو ضرورت بھی ہے اب زید مانع ہوا کہ دہلی نہ جاؤ تو زید کا مانع ہونا دو سبب رکھتا ہے - ایک تو ہمدردی اور دوسرے

سوداگران دہلی کے ساتھ ایسا ارتباط کہ خط لکھنے پر فوراً جواہرات لیکر اُسکے پاس آجا وینگے۔ اور بغیر سفر اور تکالیف کے گھر بیٹھے جواہرات بکر کو ملجائینگے۔ دوسرا سبب مانع ہونیکا یہ ہوسکتا ہے کہ چونکہ زید بکر کے ساتھ بیحد محبت رکھتا ہے۔ اور بکر کی مالی حالت سے بھی واقف ہے۔ پس وہ خیال کرتا ہے کہ اسقدر کثیر روپے کا دہلی تک لیجانا جہاں درمیان میں طرح طرح کے اندیشے ہیں خالی از حکمت ہے۔ اور یہ خیال کہ اگر خدانخواستہ راستے میں کوئی جوکھوں پڑگئی تو بکر کہیں کا نہیں رہیگا۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ اندیشہ زید کو اپنی ذاتی آزمائش کی بنا پر ہے کیونکہ اُسنے قافلے کے قافلے کسیوقت اسی راستے میں لٹتے ہوئے دیکھے ہیں۔ پس اگر سرسید کا خیال اسی قسم کی ہمدردی کے ساتھ ہو تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ بیجا نہیں۔

اس میں کسکو کلام ہے کہ گورنمنٹ میں اُنکی بڑی عزت تھی۔ سنتے ہیں کہ جو مسئلہ وہ تنہا حل کرسکتے تھے آج اُسے بہت سے صاحب ملکر بھی نہیں حل کرسکتے ہیں۔ ماجو یہ سب صحیح مگر کسیوقت بھی اُنہوں نے اپنے خیال کو اس خاموشی کی طرف رجوع نہیں کیا۔ وہ خود خاموشی پسند نہ تھے مگر اُنہوں نے بوجوہات مذکورہ بالا مسلمانونکو باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں اور گورنمنٹ کے درمیان تنہا وکیل کافی سمجھتے تھے لیکن اب تو نہ سرسید زندہ ہیں نہ اُنکے خیالات۔ نہ انکا سا کوئی شخص ہے جو اسوقت اس بارگراں کو جو کچھ کہ ہے تنہا اُٹھا سکے پس مناسب وقت ہے کہ صاف طور پر تحریک کیجاے کہ مسلمان کانگرس میں شریک ہوں۔ بحالت کامیابی تمام ہانڈیاں جو مختلف جگہ پک رہی ہیں ٹوٹ جائینگی۔ اور خاموشی اس گروہ سے کوچ کرجاویگی۔

(۴)

نواب فصیح الملک داغ مرحوم

(۲) رسالہ دبدبۂ آصفی حیدرآباد دکن | ذیحجہ کے پرچہ میں حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مہتمم دبدبۂ آصفی نے

داغ مرحوم کے ذکر میں، اُن کے کلام کی نسبت نہایت عمدہ اور پختہ راے ظاہر کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "سلجھی ہوئی بندش۔ فصاحت الفاظ۔ روزمرہ اور بیساختہ پن ذوق مومن و غالب کے اشعار میں خال خال نظر آتا ہے اور داغ کا کلام تمام تر ان محاسن سے بھرا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن شعرا کے اگر دس بیس شعر زبانوں پر ہیں تو مرزا داغ کے صدہا اشعار لوگوں کو یاد ہیں البتہ جدت مضامین۔ تشبیہات و استعارات۔ مرزا غالب کی بلاغت و نازک خیالی۔ ذوق کی اصناف سخن پر قدرت و بلند پروازی اور قابلیت و معلومات فن اور چیز ہے۔

مرحوم نے طبیعت نہایت شوخ اور گرماگرم پائی تھی۔ اصناف سخن میں تغزل کو اپنی گویائی کے لئے انتخاب کیا اور تغزل میں بھی ایک رنگ کو اختیار فرمایا جس میں اُنکی رنگین طبیعت نے خوب گلفشانی کی۔ خیالی مضامین کی طرف اُنکو توجہ بہت کم تھی معاملات کے شعر کثرت سے کہے اور نہایت حسن سے کہے جن کی تعریف جسقدر کیجائے زیبا ہے ثقیل الفاظ۔ فارسی تراکیب۔ اغلاق اور تصنع سے حتی الامکان اُنہوں نے اپنی کو بہت بچایا ہے اور اکثر محاورے اس برجستگی سے موزوں ہوے جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے۔

عشقیہ مضمون جس سے عبارت ہے یعنی دُکھے ہوے دل سے جو بات نکلتی ہے وہ درد و حسرت اور سوز و گداز سے بھری ہوتی ہے اُسکی جھلک مرزا داغ کے کلام میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ مرزا داغ کی شاعری چوچلے۔ نازنخرے چھیڑ چھاڑ۔ بےتکلفی۔ چلی کٹی۔ آزادانہ بولی ٹھولی بیباکی۔ رقیب کے گلے شکوے واعظ و ناصح پر پھبتی۔ رندانہ مزاجی اور انتہا کی شوخ طبعی کا دفتر ہے۔

ہمکو اس راے سے بالکل اتفاق ہے۔

اس ماہ کے پرچے میں دو ایک غزلیں بھی اچھی شائع ہوئی ہیں۔ پہلی غزل داغ مرحوم کی یہ ہے۔

غزل

اشارہ اُس نگہ کا روح افزا ہو نہیں سکتا ✦ کہ جادوگر سے اعجازِ مسیحا ہو نہیں سکتا

وہ دنیا تھی کہ ہمکو دیکھکر تم منہ چھپاتے تھے
یہ محشر ہے یہاں عاشق سے پردا ہو نہیں سکتا

ہوئے نا آشنا ایسے کہ تم سے اب مری جیسیں
برا بھی ہو نہیں سکتا جو اچھا ہو نہیں سکتا

(۱۰) شکایت دوست کر سکتے ہیں تیری کر نہیں سکتے
کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے ایسا ہو نہیں سکتا

الٰہی کیا قیامت میں بنیگی دادخواہوں پر
وہ فرماتے ہیں کیا دعوی یہ دعوی ہو نہیں سکتا

بگڑ جاتی ہے عادت بیوفائی آہی جاتی ہے
تمہارا ہو کے پھر یہ دل ہمارا ہو نہیں سکتا

محبت آدمی کو آدمی سے ہو ہی جاتی ہے
جو کر رکھے تو کیا کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

گئے وہ اٹھ کے پہلو سے تو یہ کہتے گئے مجھسے
ذرا سا صبر کر لو تم سے اتنا ہو نہیں سکتا

یہ جلسے جیتے جی کے ہیں اگر دم ہے تو سب کچھ ہے
کہ بہتر زندگی سے کوئی میلا ہو نہیں سکتا

لیا تھا دیکھنے کو دل انہوں نے اب نہیں دیتے
مرا یہ حال ہے مجھسے تقاضا ہو نہیں سکتا

(۱۱) مرے پاس وفا کی کاش تم مقدار ٹھیرا لو
کہ اتنا مجھ سے ہو سکتا ہے اتنا ہو نہیں سکتا

عوض دل کے وہی دینا پڑیگا انکو جو مانگوں
وہ جھگڑا کر نہیں سکتے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

جوانی کے ہیں دن کر لو وفا لو دعا ہمسے
موافق ہر زمانے میں زمانا ہو نہیں سکتا

زہے قسمت کہ اسنے وصل کی شب مہرباں ہو کر
کیا احسان ایسا جسکا بدلا ہو نہیں سکتا

پڑا تھا غیر کی گردن میں کیا کچھ ہمسے تو کہیئے
یہ کیسا ورم ہے کیوں ہاتھ سیدھا ہو نہیں سکتا

ہمیں بھی نامہ بر کے ساتھ جانا تھا بہت چوکے
نہ سمجھے ہم کہ ایسا کام تنہا ہو نہیں سکتا

عجب حیرت میں ہوں کیونکر بتاؤں میں زباں تمہیں
کہ ہو سکتا ہے جیسا اور جیسا ہو نہیں سکتا

الٰہی کیوں غم فرقت میں ہم مر مر کے جیتے ہیں
کہ دنیا میں تو کوئی مر کے پیدا ہو نہیں سکتا

بگاڑے سے تو بنجاتے ہیں سب بنے بھی بگاڑ
بنا لینے سے کیا بیگانہ اپنا ہو نہیں سکتا

ادا تیری ادا کیا کر سکے گا خوبرو کوئی
ستم بھی تو زمانے سے نرالا ہو نہیں سکتا

سوالِ وصل پر اے داغ دل کی رہ گئی دلمیں
کہا منہ پھیر کر ظالم نے ایسا ہو نہیں سکتا

چوتھے شعر میں صرف لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر میں جان ڈالدینا مرزا اسے مرحوم کا خاص انداز ہے۔ نیز گیارہویں شعر کی صفائی بیان اور بے تکلفی بھی انہیں کا حصہ ہے۔

اسی ردیف قافیے کی ایک اور بھی غزل داغ ہی کے نام سے عام طور پر مشہور ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

لیکن یہ غزل اُنکی نہیں ہے بلکہ حضرتِ مضطر خیر آبادی کی ہے جسکا رنگ بہت کچھ داغ کے طرزِ سخن سے ملتا جلتا واقع ہوا ہے۔

دوسری غزل خان بہادر مولوی شیخ احمد حسین خانصاحب مذاق تعلقدار پرپاوان کی بھی قابلِ داد ہے۔ آپ لکھتے ہیں

غزل

جب قدم دشت میں مجنوں آبلہ پا کے اُٹھے	دو قدم بھی نہ قدم بادِ صبا کے اُٹھے
آ کے بیٹھے جو سرِ گور تو آنسو رو ئے	رہ گیا تھا جو نشاں وہ بھی مٹا کے اُٹھے
پہلے انکار تھا چلتے ہوے اقرار کیا	مُردہ کر کے مجھے بیٹھے تھے جلا کے اُٹھے
واہ رے گرمیٔ بازارِ حسینانِ جہاں	جس جگہ بیٹھ گئے ہیٹر لگا کے اُٹھے

کرمِ حق سے ملے گوہرِ مقصود مذاق
اُسکے آگے جو کبھی ہاتھ دعا کے اُٹھے

(۴۳) مخزنِ لاہور | مارچ کے پرچے میں اقبال کی نظم موسوم بہ "نیا شوالہ" خوب ہے۔ اسی کے برابر حضرت احسن مارہروی کی چند رباعیاں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

کیا ڈر ہے اگر روزِ قیامت سے سیاہ	کیا خوف زیادہ ہیں اگر اپنے گناہ
احسن کمہ سن کے بخشوا دینگے ہمیں	سبطین علیہم السلام انشاء اللہ

ہمارے کرم فرما حضرت احسن یا اڈیٹر صاحب مخزن براہ عنایت فرمائیں کہ اس رباعی کے چوتھے مصرع کا وزن رباعی کے چوبیس اوزان میں سے کونسا ہے۔ شاید ایک مصرع کی جگہ گئی ہے دم ٹوٹا

(۴) العرفان | یہ رسالہ جو مولوی سعید الرحمن صاحب لکھنوی کی اڈیٹری اور مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی نگرانی میں لکھنؤ سے ماہوار شائع ہوتا ہے ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان اسکو شوق سے پڑھیں۔

روحانی مذہبی مضامین کی اشاعت اسکا خاص مقصد ہے اس قسم اور مقصد کے رسائل کی اشاعت ہمارے خیال میں نہایت مفید ہے صوفیہ اور اہل طریقت کے رموز، العرفان کے دیکھنے سے معلوم ہونگے۔ جسقدر مضامین ابتک نکلے ہیں بہت اچھے ہیں اور وہ سب اڈیٹر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

ہمکو امید ہے کہ العرفان کی ارباب ذوق بڑی قدر کرینگے اور پرچہ نہایت کامیابی کے ساتھ آیندہ ترقی کریگا۔

لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ نہایت عمدہ ہے قیمت سالانہ سے/ دفتر دلگداز کرہ بزن بیگ خان لکھنؤ سے طلب کیجیے۔

(۵) صدائے ہند لاہور | اس اخبار میں جناب حبیب کنتوری کی ایک نہایت عمدہ غزل شائع ہوئی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نتیجہ طبع رسا یکتا ز میدان سخن جناب سید محمد کاظم صاحب حبیب کنتوری

آفت جاں ہجر میں وحشت کی سرتابی رہی
دلکو بیتابی رہی آنکھوں کو بیخوابی رہی

عمر بھر حالت دل مضطر کی سیمابی رہی
چشم دریا بار گردش تیری دولابی رہی

برق کشت آرزو ہے گرمی بازار حسن
جنس الفت کی ہمیشہ اس میں نایابی رہی

سالہا یاد لب رنگیں میں رویا اشک خوں
مدتوں رنگت میری آنکھوں کی عنابی رہی

کب چھپا اشک ندامت سے سیہ کاری کا رنگ
صاف ہوکر بھی مری فرد عمل آبی رہی

دہ دیارِ تن لٹا اسے شیب جس میں تون
دب گیا آخر ہماری معصیت کاری کا شور
مختصر یہ ہے۔ اگرچہ کوئی روداد عشق
مردم دیدہ پہ تھا تاریک فرقت میں جہاں
اک جہاں اُنسے جھکا جب سے وہ جھک کر ملی

عشق کی شاہی رہی وحشت کی نوابی رہی
ہر طرح بالا اُسی کی شانِ نوابی رہی
دل گیا جانِ حزیں کے ساتھ بیتابی رہی
عمر بھر اس سرزمیں کی شکل گردابی رہی
محترم بنکر ادا کی تیغ محرابی رہی

خاک میں ہمکو ملا کر کچھ نہ ہاتھ آیا حبیب
گلشنِ عارض پہ اُنکے کب وہ شادابی رہی

(۹) رسالہ خاتون۔ علیگڈھ | اس نام کا ایک ماہوار رسالہ ہمارے قدیم کرمفرما شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ کی جانب سے جولائی ۱۹۰۴ء سے کامیابی کے ساتھ علیگڈھ سے نکل رہا ہے۔ خاتون کا مقصد عورتوں میں بتدریج علمی مذاق پیدا کرنیکا ہے اور ہم خوش ہیں کہ بصورت موجودہ یہ رسالہ اس غرض کو پورا کر رہا ہے۔ شروع میں البتہ دو ایک رسالے ایسے نکلے جنپر لوگونکو اعتراض کا موقع ملا۔ اُن اعتراضوں میں سے بعض صحیح بھی تھے لیکن ہم شیخصاحب کی تعریف کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بجائے برہم ہونے کے ان اعتراضوں سے فائدہ اُٹھایا اور رسالے کی اصلاح کر کے اسکو موجودہ قابل اطمینان حالت تک پہونچا دیا۔

فروری و مارچ کا ملا ہوا پرچہ مسز مارسین کی تصویر سے شروع ہوا ہے۔ جس میں منجملہ ۱۷ مضامین سب کے ۱۰ مضمون مختلف مباحث پر خواتین کے قلم سے نکلے ہیں۔

ہمکو معلوم ہے کہ رسالے کی کامیابی کا بہت کچھ حصہ ہمارے دوست انعام الحق صاحب کی بیغرضانہ محنت کا نتیجہ ہے جس کی بابت ہم اُنکو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہندوستان سے اُنکی روانگی کے بعد کوئی اور صاحب ہمت شیخ عبداللہ صاحب کی اعانت پر آمادہ ہو جائینگے۔

رسالہ عمدہ کاغذ پر اچھا چھپتا ہے اور ۳ جزو کے حجم پر قیمت مع محصول ۱ ہی بہت مناسب ہے

حصہ نظم

غالب مرحوم

نسیم صبحگاہی ہے کلامِ جانفزا تیرا
دلوں کو جوش میں لاتا ہے رنگِ آشنا تیرا
بہارستانِ مضموں ہے خیالِ نکتہ زا تیرا
فروغِ طبع کی معراج ہے فکرِ رسا تیرا

ترا دیوان - غالب! دفترِ نازک خیالی ہے
ترا پایہ سخندانانِ ہندستاں میں عالی ہے

ترے اشعارِ پُرمضموں کا اک عالم ہے شیدائی
تری روشن بیانی کی ہے گویا محفل آرائی
عروسِ شعر تیرے فیض سے ہے مستِ رعنائی
نگاہِ بے محابا کی بنی دنیا تماشائی

قیامت اک بپا ہے اہلِ دل بسمل تڑپتے ہیں
کہیں جانیں ہیں کچھ مضطر کہیں کچھ دل تڑپتے ہیں

ظہوری ہو کہ طالب تیرے دل کا راز کیا سمجھے
ادا دانی کو تیری عرفیِ شیراز کیا سمجھے
حزیں یہ جلوۂ فکرِ چمن پرداز کیا سمجھے
تری ترکیب کیا جانے ترے انداز کیا سمجھے

ہوا ہے رشک افزائے عجم ہندستاں تجھسے
بنی یہ سرزمیں دلی کی گویا اصفہاں تجھسے

عبارت تیری کیا ہے - سرمۂ تسخیر ہے گویا
کلام جانفزا - اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالہ کی تاثیر ہے گویا

حکایت ہے ترے لب پر غمِ جانسوزِ ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

روانی میں سوا نکلا ترا شعر آبِ گوہر سے
طراوت میں بڑھا مصرع ترا شاخِ گلِ تر سے

سخن کچھ تھا۔ ہوا کچھ۔ تیری طبع نکتہ پرور سے | صفائی نے بیاں کی آئینہ چھینا سکندر سے

دکھایا فکر نے جمشید کے جامِ جہاں بیں کو
کیا شرمندہ دیواں نے ترے بتخانۂ چیں کو

رضا علی وحشت۔ از کلکتہ

غزل نتیجۂ طبع مولوی محمد احسن اللہ خانصاحب ثاقب۔ مدیر قندپارسے

پوشیدہ مباد کہ حضرت ثاقب مذاق پارسی زبان باخود از ازل آوردہ ہست۔ استواری ترکیب، سلاست زبان۔ جدت مضمون۔ شوکت الفاظ در کلامش یاد از اساتذۂ متقدمین می دہد شعرے چند ازاو در ینجا ثبت می افتد۔ والا نظراں سخن سنج کہ ذوقے بزبان فارسی دارند اگر خواہند بیشتر ازاں افکار تازہ اش بنگرند۔ نامۂ قندپارسی از علیگڈھ طلب دارند

اڈیٹر

صفیر دلپذیرم عندلیبان محبت را
تجلی زار صد معنی ست ہر ذرّہ دریں وادی
پریشانی بجائے گرد از دیوار مے ریزد
چہ حسرتہا کہ از نا دیدن روئے تو خوں گردد
کدورے در بغل بر عتبۂ پیر مغان رفتم
زمن گرمی گرفت این انجمن آخر پس از عمرے
جمال تو ز وصف این و آں اے حسن مستغنی ست

نوائے من رواں در تن و مدار باب الفت را
بباید جا وروں دیدہ دادن گرد غربت را
مگر کردند صرف خانۂ من رنگ غربت را
اگر امروز مے سازند فردائے قیامت را
بشارت باد از من کوچہ گردان ملامت را
شراب از خون دل کردم خرابات محبت را
تماشا چیدہ در بزم ہر سو چشم حیرت را

فغان بی ثاقب من بزم بادہ بزم ماتم شد
بدوش بیخودی آرید آں رنگین طبیعت را

غزل حسرت موہانی

اس نازنیں سے ہمکو جتنے گزند پہونچے
سب دلپذیر پہونچے سب دل پسند پہونچے

تھی منزلِ محبت کتنی کٹھن کہ عاشق
خرم رواں ہوئے تھے اندوہ مند پہونچے

عالم ہی اب نہیں وہ تفریحِ بے خلل کا
محفل میں تیری ناحق ہم دردمند پہونچے

وہ پیر گلہ کسی کچھ لب تک جبھی تو آخر
آہیں بھی چند پہونچیں نالے بھی چند پہونچے

اُس بت کی بے رخی نے رنگِ وداد پکڑا
گویا عرب میں ہوکر ہم تاشقند پہونچے

میکش رہے ہم ہی جبتے تنگ آکے محتسب بھی
تہدید سے گزر کر تا وعظ و پند پہونچے

بیتابیوں نے آخر دعوائے صبر توڑا
نالے لبوں پہ پہونچے گو بند بند پہونچے

اس شوخ بیوفا سے کی راہ و رسم پیدا
شاباش ہمکو یعنی کتنے بلند پہونچے

کسکو نہیں تمنا اُس بزم جانفزا کی
نزدیک ہے کہ دل بھی ہوکر سپند پہونچے

مرغوبِ عشق اسکو منظور رنج ہم کو
یعنی پسندِ دل کو کس کی پسند پہونچے

باوصف نارسائی تا ملکِ یاس حسرت
نالے ہمارے پہونچے اور سربلند پہونچے

دیگر

پیہم مجھے پیالۂ مے برملا دیا
ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

اُس حیلہ جو نے وصل کی شب ہمنے روٹھکر
نیرنگ روزگار کا عالم دکھا دیا

اللہ ری بہار کی رنگ آفرینیاں
صحنِ چمن کو تختۂ جنت بنا دیا

اب وہ ہجوم شوق کی سرمستیاں کہاں
مایوسیِ فراق نے دل ہی بجھا دیا

اس شوخ کے فنونِ لطف و عتاب نے
گاہے ہنسا دیا مجھے گاہے رُلا دیا

اب شوق وصل دل میں ہے باقی نہ رنج ہجر
اُس نازنیں کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

حسرت غزل تو وہ ہے جسے سنکے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تونے ملا دیا

از جناب حبیب النبی خانصاحب صولت متوطن کلکتہ

اشتیاقِ وصال تھا نہ رہا	جان کا اک وبال تھا نہ رہا
عشق تھا یا جنوں تھا جو کچھ تھا	اک مزے کا خیال تھا نہ رہا
بہا گئی طرز انہیں شکایت کی	ہمکو اک انفعال تھا نہ رہا
اُس ستمگر کے دیکھکر تیور	لب پہ جو کچھ سوال تھا نہ رہا
چشم الطافِ یار کے قربان	ہمکو فکر مآل تھا نہ رہا
بجھ گیا خود بخود چراغ مزار	ایک پرسانِ حال تھا نہ رہا
مٹ گیا قبر کا ہماری نشان	اُنکو اک انفعال تھا نہ رہا

مرگِ کوکبؔ[۱] کا داغ ہے صولت
ایک ہی باکمال تھا نہ رہا

غزل (در نعت) از جناب احمد حسین خاں بہادر مذاق تعلقہ دار پریانواں

باغ عالم میں فرح بخش ہوائیں آئیں	فصل گل آئی عنادل کی صدائیں آئیں
رنگ آیا گل گلشن میں پریزادوں میں حسن	شوخیاں آئیں حسینوں میں ادائیں آئیں
روح آئی تنِ خاکی میں دلوں میں الفت	نور آنکھوں میں کواکب میں ضیائیں آئیں
ہر عرض کے لئے جوہر کی ضرورت آئی	ہر مرض کے لئے صحت کی دوائیں آئیں
باعث آمد ہر شے ہے محمد کا ظہور	جن کی قرآن میں کثرت سے ثنائیں آئیں
حق نے بھیجا اُنہیں دنیا میں ہدایت کیلئے	تاکہ مخلوق کو قدرت کے سکھائیں آئیں
آئے غلماں شب میلاد قدمبوسی کو	حوریں فردوس سے لینے کو بلائیں آئیں

[۱] یعنی مرزا احمد علی کوکب مرحوم دہلوی

پہیلا ہر سو گل [illegible] کی زمانے بہر میں
نغمۂ بلبلِ سدرہ کی صدائیں آئیں

کہل گئے غنچۂ توحیدِ خدائے واحد
تر و تازہ چمنِ دین کی ہوائیں آئیں

شور تکبیر سے ہر دشت و جبل گونج اُٹھے
اور ہر گہر سے اذانوں کی صدائیں آئیں

جل گئیں کہیتیاں رندوں کی وہ پانی برسا
بڑہ گئیں مے کی دکانیں وہ گہٹائیں آئیں

نعت میں شعر پڑہے آپنے جسوقت مذاق
مرحبا کی لبِ رضواں سے صدائیں آئیں

غزل جناب شفق عماد پوری رفیع گنج ضلع گیا

خالی خیالِ غیر سے رکہ لیں جائے دوست
اس گہر میں کوئی آئے نہ پائے سوائے دوست

آنکہیں نثارِ دوست ہیں دل ہے فدائے دوست
حاضر ہے جانِ زار بہی آگئے رضائے دوست

روشن ہوا یہ آنکہوں سے پردے جو اٹہ گئے
ہفت آسماں ہیں پردۂ دولتسرائے دوست

ناآشنائے غیر ہوئی اسقدر نگاہ
دشمن کوئی نظر نہیں آتا سوائے دوست

کیا خوب فتح ہوگئی حاصل شکست سے
ٹوٹا جو دل تو کانوں میں آئی صدائے دوست

صد چاک کیوں ہے جامۂ گل اے نسیم صبح
اُتری ہوئی کہیں تو نہیں ہے قبائے دوست

کچہ طولِ انتظار قیامت سے کم نہیں
موقوف حشر ہی پہ اگر ہے لقائے دوست

کچہ اُسکے دل سے لطف گدائی کے پوچہئے
شاہی کو چہوڑ کر جو بنا ہو گدائے دوست

سر سے کیطرح آنکہوں میں بہر لوں وہانکی خاک
ملجائے جس زمیں پہ مجہے نقشِ پائے دوست

دشمن کی بہی زبان سے سننے میں لطف ہے
کہنے کو چاہے جیسے کہے ماجرائے دوست

اُڑکر برنگِ نکہتِ گل چلتے ہیں شفق
لیجائے اب جدہر کو اُڑا کر ہوائے دوست

قطعہ تاریخ وفات نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم

ازجناب محمد شہباز خاں صاحب مسوانی متخلص بعاصی سبزآبادی معروف علیگدہ

عرشیوں نے بامرِ حق بہیجا
قاصدِ مرگ داغ کے جو قریب

چل بسے پر تو مثل نکہتِ گل
غنچہ جبینوں میں ذوق کے نہ ہوئی
بوستانِ سخن ہوا برباد
عیسوی سال انکا عاصی نے

بزمِ قدسی میں اس جہاں کے ادیب
ایسی شیریں زباں کسیکو نصیب
جس میں کھلتے تھے گل عجیب و غریب
لکھدیا یوں بنا در التر تیب

ڈہونڈھتا ہوں اب سخنور دشمن لو،
لائے خلد میں ہے داغ عجیب
۱۹ ۰۵ ۶

دیگر

چو آمد پیام خدائے جہاں
روانش بفردوس چوں بوئے گل
جہانِ سخن گشت ظلمتکدہ

بداغ فصیح و بلیغ زماں
رسیدہ زداغ زمیں بگماں
کہ مہر تنش در زمیں شد نہاں

چنیں گفت عاصی سن رحلتش
بماہِ جناں داغ جلوہ کناں
۲۲ ۱۳ ھ

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم
بلبلِ ہندوستاں استادِ جہاں - زیب اقلیم ریاست اسلامیہ حیدرآباد دکن
شاعرِ نازک خیال نور اللہ مرقدہ
۲۲ ھ ۱۳
سمت ۱۹۶۱

ہاے دنیا سے گیا شاعرِ بے مثل و نظیر
کون ایسا ہے اب اردو کی زباں کا شاعر

یہ نکلتی ہے صدا سب کی زبانسے ہے ہے
لائیں ہم داغ سا استاد کہانسے ہے ہے

آہ کے ساتھ یہ دل سے مرے مصرع نکلا
بلبل ہند گیا باغ جہانسے ہے ہے
۱۳۲۲ = ۶ + ۱۶ ۱۳ ہجری

(عثمان محمد محمود)

آؤ ہم بتلائیں پچیس ہزار مریض کسطرح صحت یاب ہوتے ہیں

سُرمہ کراماتی — مقوی بصر محافظ بینائی دافع نزول الماء و جالا، غبار، آب ربانی وغیرہ قیمت فی تولہ عا

حبِّ ذیابیطس — پیشاب بکثرت بار بار آنا خوشبو کر بند سستی دور کرتا ہے فی تولہ ... عہ

حبِّ دائمی قبض — ایک گولی سے دائمی قبض و صداع تمام عوارض درد سر، یرقان وغیرہ کافور ۲ درجن عہ

جوہر عشبہ — صفائی خون کے لئے بے مثل، گندے خون کو زہر سے صاف کرتا ہے، دافع پھوڑا پھنسی، ناسور، بھگندر، خارش شیشی کلاں سے، شیشی خورد عہ

نورِ علی نور (چند منٹ میں بال دور ۳ تولہ ... سے)

حبِّ دافع وجع مفاصل — درد اعصاب جوڑوں کا درد وغیرہ دور کرنے کے لئے ... عا

حبِّ دافع طحال — تلی بڑھنے کے دفعیہ کے لئے تیر بہدف ۴ ... عا

ہیر آئل — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بوقت سفید نہیں ہونے دیتا نزلہ زکام کو دور کرتا ہے ضعف دماغ کو مفید فی شیشی ... سے

زود کن — اسکے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ... سے

دوائی خارش — ران کی خارش اور بدن کے دانے دو دن میں خشک ہو جاتے ہیں دو تولہ ... عا

تریاق السعال — اخراج بلغم درد سینہ۔ سرفہ کھانسی اور خراش گلو نزلہ کا چھاتی پر گرنا اسکے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد ایک تولہ کی ... عا

حبِّ قاتلِ عام افیون — چانڈو، افیون بلا تکلیف ناغہ سے چھوٹ جاتے ہیں ایک تولہ عہ

روغنِ اعجاز — ہر سونکا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر ناسور کے لئے اکسیر اور عجیب الاثر ۲ تولہ عا

دوائی دردِ کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے ایک ۲ ... مریض کو کافی ہے ... عہ

چورن مقوی معدہ — خوش مزہ بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے ۴ تولہ ایک روپیہ سے ... عہ

سنون مستحکم دنداں — ہلتے دانت مضبوط اور میل دور کرتا ہے ...... عہ

ید اللہ دافع بخار — دو رتی ہر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن ... عہ

دمہ یا ضیق النفس — سانس رکنا اور بلغم وغیرہ دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے عا

رعنا — چہرہ کے بدنما داغ وغیرہ دور ہو جاتے ہیں ۴ تولہ ... عا

سفوف دردِ گردہ — ... درد اور ریگ مثانہ بلا تکلیف خارج ہوتی ہے ۴ تولہ عا

اکسیر شفا — مرض طاعون بطور علاج حفظ ماتقدم ... مرض کے حملے سے محفوظ رہتا ہے غربا کو فی شیشی ایک روپیہ ... عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما اڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور موچی د...

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اردوئے معلّٰی

جلد (۴) | بابت مئی ۱۹۰۵ء | نمبر (۵)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلےٰ علی گڈھ

حسن المطابع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ - - - - - - - - - - للعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مومن

اردو زبان کی شاعری کا سلسلہ چونکہ فارسی مذاق سے ملا ہوا ہے اسلئے اکثر شعرائے متقدمین کا یہ معمول تھا کہ دیوان ریختہ کے ساتھ فارسی دیوان بھی ضرور رکھتے تھے۔ چنانچہ شعرائے لکھنؤ میں مصحفی و حسرت سے لیکر عیشیؔ تک یہ رواج قدیم قائم رہا۔ لیکن ناسخ و آتش کے زمانے میں، اور اسکے بعد پھر بہت کم استادوں نے اِس رسم کی پابندی کا خیال کیا البتہ آخر میں منشی امیر احمد مرحوم نے اُسکو ایکبار پھر کچھ دنوں کے لئے زندہ کر دکھایا تھا۔ لیکن بس اس افاقۃ الموت کا کچھ اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل لکھنؤ نے، یا تو اس وجہ سے کہ انکو فارسی زبان سے زیادہ مناسبت نہ تھی یا اس بنا پر کہ اردو زبان کے عروج کے مقابلے میں فارسی کی قدر کم ہو گئی تھی، بہت جلد اس روش فارسی گوئی کو ناسخ و آتش ہی کے عہد سے ترک کر دیا تھا۔

برخلاف انکے اہل دہلی آخر وقت تک اپنی وضع قدیم کو نباہتے رہے چنانچہ میر و مرزا سے لیکر غالب و مومن تک بلکہ شیفتہ شاگرد مومن تک قریب ہر استاد نے

اردو گوئی کے ساتھ فارسی گوئی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اور اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں ناسخ کے وقت سے تصنع اور بے لطفی کا جو عیب پیدا ہو گیا جسنے بلا مبالغہ لکھنؤ کی شاعری کو بالکل بے رنگ و بو کر دیا اسکا سب سے بڑا سبب یہی ہوا کہ لوگونکی طبیعتیں فارسی زبان سے ناآشنا ہوتی گئیں۔ حتی کہ لکھنؤ کی شاعری نئی اور دلچسپ ترکیبوں نیز تازہ اور شگفتہ مضمونوں سے بیگانہ ہوتی گئی اور درد و اثر سے تو بالکل عاری ہو گئی۔

ناسخ کا کلام بحیثیت فن شاعری نہایت مکمل اور صحیح ہے لیکن بلحاظ لطف شاعری ملاحظہ کیجئے تو ایک گلدستہ ضرور ہے مگر کاغذی پھولونکا۔

اب اسکے برخلاف مومن دہلوی کا دیوان اٹھائیے تو باوجود زبان اور فن کی لاتعداد کمزوریونکے آپ اس میں سیکڑوں ایسے شعر پائینگے جنکو دیکھکر دل و دماغ کو فرحت و سرور، اور روح کو کشادگی اور بالیدگی حاصل ہوگی۔

حکیم مومن خاں مرحوم کے اردو کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید اسکے برابر کے ہمعصروں میں سے کسی کے دیوان میں نہ ملینگی اور غالباً اسی خیال سے حضرت آزاد صاحب تذکرہ آبحیات نے ذوق و غالب کے ساتھ انکا حال درج تذکرہ نہ کیا ہوگا۔

اگر اتنی غلطیاں لکھنؤ کے کسی شاعر سے سرزد ہوتیں تو اسکی نسبت کوئی استادی کا گمان بھی نکرتا۔ لیکن مومن خاں کی استادی کو جس چیز نے قائم رکھا وہ انکی فارسی زبان کے ساتھ طبعی مناسبت تھی جسکے زور پر انہوں نے ایسی بھی غزلیں لکھدی ہیں جنکو دیکھکر پڑھنے والا انکی لغزشونکو فراموش کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً ان چند کمزوریونکو ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

(۱)

اے محتسب نہ توڑ تو شیشے کو دیکھنا
آتی ہے مجھکو سنگدل دلشکن کی یاد

یہاں سنگدل صفت ہے اور جب تک اسکے ساتھ موصوف بھی مذکور نہو مثلاً یار سنگدل

اسوقت تک اس سے محبوب مراد لینا قطعی غیر ممکن ہے۔

ایک صورت اس خرابی کے رفع کرنیکی اور بھی ہے کہ صفت کے ساتھ " وہ " " اس " یا " ایک " کی قسم سے کوئی لفظ زیادہ کر دیا جائے مثلاً " اس سنگدل کی یاد " لیکن مومن نے اس امر کا بہت کم خیال رکھا ہے اور جا بجا اس قسم کی غلطی کی ہے مثلاً ؎

ایک ہی جلوۂ مہرو میں کا شور ہے ✽ جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں ہوگا

؎ پردۂ شوخیٔ جو سپیوند گریباں ہوگا

---

(۲) ؎

نہ چاہوں روز جزا او بے ستم دیکھو ✽ کب آزماتے ہیں جب وقت امتحان نہیں

یہاں اضافت فارسی کے ساتھ اعلان نون جائز نہیں ہے لیکن اسکی بابت یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے بھی اسکو جائز رکھا ہے اور اسلئے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے زمانے تک لوگ اسے ناجائز نہ جانتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ " آزماتے ہیں " کے ساتھ " وہ " یا " آپ " کا لفظ ضروری تھا۔

(۳) ؎ سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے

شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

یہاں " جاری " " ہی " " ی " بہت دبکر نکلتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افعال اردو میں " ی " کا دبنا غلطی نہیں ہے مثلاً " آتے ہیں " بروزن فاعلن عام طور پر اشعار میں مستعمل ہے لیکن کلام اس میں ہے کہ افعال کے علاوہ دیگر الفاظ کو بھی یہی رعایت حاصل ہے یا نہیں یعنی مثلاً " آتے ہیں " کے بجائے " حامی ہیں " یا " جاری ہیں " کو بھی بروزن فاعلن لے سکتے ہیں یا نہیں۔ راقم حروف کے نزدیک ایسا جائز نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ " جاری ہیں " مصرعۂ مومن کے آخر میں واقع ہو کر اس عیب کو اور بھی نمایاں طور پر ظاہر کر رہا ہے۔

(۴) سہ آنکھیں جو ڈھونڈھتی ہیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

یہاں "نگہ"، "کا" "دہ" پرختم ہونا اور پھر ایسے لفظ سے ملنا جسکے شروع میں بھی "ہ" موجود ہے بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے۔

مومن سے اس قسم کی کمزوری، جو شان استادی کے خلاف ہے، ایک سے زیادہ موقعوں پر سرزد ہوئی ہے۔ مثلاً سہ

ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے
شوق وصال و اندوہ ہجراں نہیں رہا

(۵) سہ تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے مرے وحشت ای رشک پری اتنی

یہاں "اے رشک پری" کے ساتھ تم کا استعمال کسی صورت سے پسندیدہ نہیں ہے مومن نے آپ، تم، اور تو کے استعمال کو جابجا خلط ملط کردیا ہے۔

(۶) کیا ہوا ہوا گر وہ بعد امتحاں اپنا۔ بے گنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا۔

یہاں ہوا ہوا کی تکرار بغایت ناموزوں ہے۔ اس قسم کی کراہت مومن کی اور اشعار میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً سہ

اے آرزوئے قتل ذرا دل کو تھامنا
مشکل پڑا مرا مرے قاتل کو تھامنا

(۷) سہ

جوں نکہت گل جنبش ہے جی کا نکلجانا ✦ اے باد صبا میری کروٹ تو بدلجانا

اس قسم کے مصرعوں میں جنکے دو ٹکڑے ہوسکتے تھوں شان استادی یہ ہے کہ دونوں ٹکڑوں کے الفاظ علحدہ علحدہ رہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو شعر کی لفظی لطافت بالکل جاتی رہی ہے۔ مثلاً مومن کے اس شعر میں "جنبش" پہلے ٹکڑے کے ساتھ چلا جاتا ہے حالانکہ اسکا تعلق معنوی دوسرے ٹکڑے یعنی "ہے جی کا نکلجانا"

ہے۔ یا ایک دوسرا مطلع ملاحظہ ہو ؎

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا
کیا ایک بھی ہمارا خطِ یار تک پہونچا

اس میں بھی وہی نقص موجود ہے۔

(۸) ؎ اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زباں غزل
جل جائیں جسکے رشک سے حاسد بسانِ شمع

یہاں "شعلہ زباں" کو جبتک "شعلۂ زباں" نہ کہئے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا۔ حالانکہ فارسی ترکیب میں اردو قاعدے کا جاری کرنا خطا ہے۔ اس غلطی میں بہت سے مشہور شعرا اسوقت تک مبتلا ہیں لیکن راقم کے نزدیک جس شخص کو لطف زبان کی ان موٹی موٹی باتوں سے بھی خبر نہو اُسکو استاد یا مشاق اُستاد کہنا درست نہیں ہو سکتا۔

مومن خاں کے کلام میں اس قسم کی لغزشیں بکثرت ملتی ہیں مثلاً ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

اس میں جا مرینگے مدواے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بیتاقتی سے ہم

ارباب بینش پر روشن ہو گا کہ یہاں "کو" کسقدر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

جہانتک ہمارا خیال ہے کلام مومن میں یہ سب نقص بربناے بے پروائی پاے جاتے ہیں نہ بسبب ناواقفیت۔

اصل یہ ہے کہ جسطرح سے اہل لکھنؤ نے صحت لفظی کے مقابلے میں لطف مضمون کا خیال کم کیا۔ اسیطرح سے اہل دہلی نے عموماً اور مومن خاں نے خصوصاً بمقابلہ مضمون صحت زبان کی جانب بہت کم توجہ کی۔ چنانچہ غالب و معروف سے لیکر شیفتہ و سالک تک کے دیوان بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو ذوق کا کلام بھی ان غلطیوں سے بالکل پاک نہ ملے گا۔

(۹) ؎ گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہو گا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہو گا

بوجہ اس فصاحت استاذ الاساتذہ حضرت میرزا اصغر علیخاں مرحوم نسیم دہلوی کو جو لکھنؤ بیان کے بادشاہ تھے اور مومن خاں کے شاگرد۔ اس شعر کے پہلے مصرع کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ استاد نے مخمل میں کمل کا جوڑ لگایا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فغان ہوتی اثر کی ترکیب خوب ہے لیکن اس شعر میں اپنی دوسری متعلقات کے ساتھ اسقدر بیگانہ نظر آتی ہے کہ مصرعۂ ثانی کی سلاست بھی اسکے ثقل کی جانب سے ذہن کو منتقل نہیں کر سکتی۔

یہ عیب غالب کے کلام میں بھی موجود ہے اور مومن و غالب کی فارسی بندش اسکی ذمہ دار ہے۔

غرض مختصر اس سے کہیں کہیں عیب ثقل الفاظ ضرور پیدا ہو گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں انکی استادی کی بنیاد بھی اسی دستگاہ فارسی پر قائم ہے۔ غور فرمایئے

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں | بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہوچکے (۲) اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں
مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا (۳) حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں
تقدیر بھی بری مری تدبیر بھی بری | بگڑے وہ پرسش سبب اجتناب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع | مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

دیکھنے والے دیکھینگے کہ گریۂ رسوا اور دل ناکامیاب کی تازگی ترکیب نے دوسرے اور تیسرے شعر کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ اور یہ بھی غور کرینگے کہ جس شاعر کی طبیعت فارسی مذاق سے بخوبی آشنا نہو وہ ایسی لطیف ترکیبیں کیونکر تراش سکتا ہے۔

اور بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل بیتاب کو گر باندھ کر رکھوں نہ ٹھیریگا | سوا اس در کی زنجیر و کے یہ مجنوں نہ ٹھیریگا
اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشم میگوں کی (۴) کف ساقی میں جام بادۂ گلگوں نہ ٹھیریگا

مانگو بنگلے ہم طولِ شب ماسے جدائی سی
طواف کعبہ کا ذکر ہے اکیو صدقے ہو دو دو

کہاں تک دیکھئے وہ حسن روز افزوں نہ ٹھیریگا
تو سمجھو ذرا مومن سے یوں نہ ٹھیرگا

دوسرے شعر کو دیکھئے کہ "کی" کی تکرار سے پہلے مصرع کی بندش کسقدر پست ہوگئی ہے۔

لیکن اسکے بعد ہی جب مصرعۂ ثانی کے الفاظ کی شادابی اور مضمون کی کیفیت پر نظر پڑتی ہے تو طبیعت سے مصرعۂ اول کی سستی بندش کا تکدر فوراً محو ہوجاتا ہے

تمہارے آگے میں شوخی ہے تغیر رنگ
غیرت سرگوشیاں کیجئے پھر ہم بھی کچھ

جوں زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں
آرزو ہای دل تنگ آشنا کہنے کو ہیں

امتحاں کے لئے جفا کب تک
التفات ستم نما کب تک

یہاں پر دیکھنا یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی میں التفاتِ ستم نما کی ترکیب کے زور سے کتنے بڑے وسیع مضمون کی گنجایش نکال لی ہے۔

غرضکہ التفات ستم نما۔ شوق شکوہ اثر۔ آہ فلک افگن۔ بیمار اجل چارۂ غفلت جرأت آزما۔ شکوۂ زخم ریزہ کوے دلکشا اور اسی قسم کی بیشمار استوار اور پسندیدہ ترکیبیں جو دیوان مومن کے ہر صفحے بلکہ ہر غزل میں ملسکتی ہیں سب انکی فارسی مذاق کی دلیل ہیں۔

اور وہ جو غالب نے مومن کی وفات پر لکھا تھا کہ ؎

شرط است کہ روی دل خراشم ہمہ عمر ٭ خونتابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

وہ بھی مرزا نے مومن کے فارسی ہی اندازِ بیان کے خیال سے تحریر کیا ہوگا۔ ورنہ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ محض اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا رتبہ مومن بلکہ غالب سے بھی بہت بلند تھا اور یہ امر مشہور ہے کہ غالب کو ذوق کی شاعری فی الجملہ پسند نہ تھی۔

مرزا غالب اور مومن کا اندازِ سخن بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ غلبۂ فارسیت اور بعض موقعوں پر بلندیِ مضمون کی بنا پر جسطرح مرزا کے بعض اشعار بہت مشکل ہوگئے ہیں اسیطرح مومن کے بھی بعض شعر کسی صورت سے آسان نہیں کیے جاسکتے ہیں شلاً مومن سے

وہ علی الرغم عدو مجھپہ کرم کرتے ہیں
ہے ستم لطف کے پردہ میں ستم کرتے ہیں

یہاں علی الرغم عدو سے مراد خلافِ خواہش رقیب ہے یعنی محبوب جو مجھپر لطف کر رہا ہے وہ صرف رقیب کو دق کھلانے اور چھیڑنے کی غرض سے ہے۔ پس مجھپر اسکا یہ لطف و کرم واقعی نہیں ہے بلکہ درحقیقت رقیب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور لگاوٹ کا ایک جزو ہے اور اسلئے اسکو در پردہ ستم سمجھنا چاہئے

دیگر سے

اسکے آنیکی جو شہرت شبِ غم دیتے ہیں
اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ ملک الموت کو یہ کہکر دم دیتے ہیں کہ تم ناحق مارتے ہو۔ محبوب آئیگا تو ہم پھر زندہ ہوجائینگے"۔

یہاں دم دینے سے جل دینا مراد ہے۔

مومن و غالب کی شاعری میں ایک اور بھی مشابہت کی صورت ہے یعنی یہ کہ جسطرح مرزا صاحب جہاں فارسی ترکیبوں سے گزر کر سہل ممتنع پر آجاتے ہیں تو سادگی اور روانی کا دریا ہی بہا دیتے ہیں بالکل اسیطرح مومن بھی جب چھوٹی بحروں میں صاف صاف کہتا ہے تو قیامت ہی ڈھا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو سے

اثر اسکو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس آخری شعر کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا غالب اسے سنکر کئی دن تک سر دھنتے رہے تھے۔

(۳)

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو

تیسرے شعر کی سادگی پُر اثر کا اندازہ قدرت تحریر سے باہر ہے۔

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے — مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیے اپنے آنے جانے کے — تذکرے جائے جائے لوگوں نے

جائے جائے یعنی جگہ جگہ۔ پرانی زبان ہے لیکن پُر اثر زبان ہے۔

کیا تماشا ہے جو ندیکھے تھے — وہ تماشے دکھائے لوگوں نے
وصل کی بات کب بن آئی تھی — دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

کر دیا مومن اس صنم کو خفا
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

دل میں اُس شوخ کے جو راہ نکی — ہمنے بھی جان دی پر آہ نہ کی
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے — تمنے اچھا کیا نباہ نہ کی
تہا تفقد میں اُس سے کم ملنا (۳) — کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

مومن اُس ذہن بے خطا پر حیف
فکر آمرزشِ گناہ نہ کی ٭

تیسرے شعر کا نازک اور نیا مضمون صد ہزار آفرین و مرحبا کہنے کے لائق ہے۔

ہمارے نزدیک اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہے۔ لیکن درد اور تاثیر کلام کے لحاظ سے مومن کا کلام غالب سے افضل اور ذوق سے افضل تر ہے۔

مومن مرحوم کی یہ چند غزلیں جنکے ایک ایک دو دو شعر ہم اشارتاً لکھتے ہیں جسنے دیکھی ہونگی وہ ہمارے قول کی تائید پر مجبور ہوگا۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تہا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں ہے — اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ

شبِ غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تہا — دم رکے تہا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تہا
یا تو دم دیتا تہا وہ یا نامہ بر بہکائے تہا — تھے غلط پیغام سارے کون یا تنک آئے تہا
کوئی دن تو اسپہ کیا تصویر کا عالم رہا — ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھکر بجائے تہا
ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی — مومنِ وحشی کو دیکھا اسطرف سے جلے تہا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اُسے بھی فکرِ ستم نہوتا — جو ہم نہوتے تو دل نہوتا جو دل نہوتا تو غم نہوتا

وہ جو زندگی میں نصیب تہا وہی بعد مرگ ہا قلق — یہ قلق ہے کیسا کہ ہے ستم گئی جان پر نگیا قلق

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا — لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا	کیوں کر اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
خاک میں ملائے یارب بیکسی کی آرزو	غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے
آج اس بزم سے طوفان اٹھا کے اٹھے	یاں تلک روئے کہ اسکو بھی رلا کے اٹھے
مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی	آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں	ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں
چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں	اضطراب دل غرض جینے نہ دیگا تو ہمیں
گر یہی شوق شہادت ہے تو مومن جی چکے	مار ڈالے کاش کوئی کافر دلجو ہمیں

کافر دلجو کی شگفتہ اور نئی ترکیب سے شعر میں جان ڈال دینا خاص انداز تھا مومن مرحوم کا۔ اور اصل تو یہ ہے کہ شگفتگی اور لطافت الفاظ کی وہ ایک خاص شان جس کی ابتدا مومن خاں نے کی اور جسکو نسیم دہلوی مرحوم نے انتہا کو پہونچایا اس خاندان شاعری کے متوسلین کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہیں۔

نشان زدہ اشعار اور الفاظ کو بطور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا		جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
شوخ تھا رنگ حنا میرے لہو سے سوا ہے		قتل اغیار کیا ہاتھ ترے یار لگا
منہ میں کیسا خم صہبا کے بھر آیا پانی	(۳)	تیرے لب سے جو لب ساغر سرشار لگا
کعبے سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن		کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

ہم چارہ گر کو یونہی پنہائینگے بیڑیاں	قابو میں اپنے گر وہ پریزاد آگیا
دل کو قلق ہے ترک محبت کے بعد بھی	اب آسماں کو شیوۂ بیداد آگیا
دیکھ لو شوق ناتمام مرا	غیر لیجائے ہے پیام مرا
سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی	لو جان کا عذاب ہوا دلکا تھامنا

اس گل کو اعتبار نسیم و صبا گیا	(۱)	بوے چمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز
چارہ گر کیوں مجھے پیچ پہ پیچ دیتے ہیں		کیا دوا ہے جو تری رنجش ہر دم کا علاج
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں	(۱)	میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں		کہتے ہیں تمکو ہوش نہیں اضطراب میں
پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں		ناکامیوں نے کام رہا عمر بھر ہمیں

ناکامی کا استعمال بصورت جمع خاص طرز ہے مومن مرحوم اور پیروانِ مومن کا اسکی اور بھی دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نقش پا پر نقشِ پا ظالم کفِ افسوس ہے		تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے
میرے سر کو سایۂ بالِ ہما منحوس ہے		ہائے یادِ مرغِ مجنوں کی جنوں آشیاں
اسکا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے "		پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے "
ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے		بدنامیوں کے ڈر سے عبث تم چلے کہ میں
بالیدگی سے جوں خم گردوں دوات ہے		لکھا جو اسکو خط میں بلا نوشیوں کا شکر
حشر کی فریاد کا اسکو گماں باقی رہا		جان دی اور اس وفا پر امتحاں باقی رہا
کیا خبر تھی یہ کہ یوں محو بتاں ہو جائیگا		تھے ہمیں مومن کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد
جوں حال دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو		آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو
تم آجکل میں شاید سوے چمن گئے ہو	(۲)	باد بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی
اب تم سے ہی چل نکلی بادِ سحری اتنی	(۱)	تو چھیڑے ہے نکہت کو گلہاے شبنیہ کی

قصہ مختصر مومن خاں کی اردو شاعری میں اگرچہ بحیثیت زبان بہت سے عیوب

پاسے چلتے ہیں لیکن اُنکی اُستادی دو وجہوں سے مسلم ہوگئی ہے - ایک تو انکی جدت انداز کی بناپر جسکے ثبوت میں ہم ابھی ابھی بہت سے شعر بطور مثال پیش کرچکے ہیں اور دوسرے اس سبب سے کہ فارسی مذاق اور ترکیبوں کی آمیزش سے انکے کلام کی ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی ہے جس کی مثال مرزا غالب کے سوا اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملسکتی۔

مومن مرحوم کی فارسی دانی کچھ اردو شعار میں چند فارسی ترکیبوں اور بندشوں کے داخل کردینے ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم شروع مضمون میں اشارہ کرچکے ہیں، انکا ایک پورا فارسی کلیات موجود ہے جس میں چھ قصیدے (قصیدہ اول ۱۰۰ شعر) ایکسو پندرہ غزلیں ایکسو اکتر رباعیاں اور پچاسی قطعات تاریخ وغیرہ موجود ہیں۔

مومن خاندانی حکیم تھے طبی استعداد کے علاوہ عربی میں بھی شاہ عبدالقادر دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور نجوم میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے چنانچہ اسکا اثر انکے کلام خصوصاً انکے اردو قصائد میں پایا جاتا ہے جن میں سے بعض بعض کو تو مشکل الفاظ اور طبی اصطلاحات کا مجموعہ کہنا چاہیے۔

فارسی قصائد کا بھی وہی رنگ ہے اور اُن میں بھی اُنکی شان بے پروائی و فراغت کے جلوے نمایاں ہیں یعنی یہ کہ حمد و نعت و منقبت کے سوا کسی رئیس یا امیر کی تعریف نہیں کی دیوان فارسی کے آخر میں اس امر کی جانب خود ہی اشارہ کیا ہے۔

بادشاہا بایں متاع قلیل دیگراں دیگرند و من دیگر	مدح چوں از منے چرا خواہی ہرچہ از بوم از ہما خواہی

حکومت اہل انگلستان انہیں بالکل پسند نہ تھی اور انکی وارستگی مزاج کا مقتضا بھی یہی تھا چنانچہ عرفی کے قصیدے پر ایک قصیدہ اسی مضمون کا لکھا ہے جسکے چند شعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ۵

اے جسم تو جانِ آفرینش
جانِ تو جہانِ آفرینش

در بحثِ دانشِ تو نادان
عقلِ ہمہ دانِ آفرینش

بر خاکِ درِ تو دیدہ مالان
والا نظرانِ آفرینش

جو بیند ز درگہت غبارے
آئینہ گرانِ آفرینش

از خلقِ تو عالم آفریں را
صد ناز بشانِ آفرینش

اے مایۂ ہستیِ دو عالم
مپسند زیانِ آفرینش

ایں عیسویاں بلب رسانند
جانِ من و جانِ آفرینش

تاچند بخوابِ ناز باشے
فارغ ز مغانِ آفرینش

مومن شدہ ہمزبانِ عرفی
از بہرِ امانِ آفرینش

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
اے فتنہ نشانِ آفرینش

مومن کی فطرتی ذکاوت اور تیز طبعی کے متعلق بہت سی حکایتیں مشہور ہیں منجملہ اسکے ایک یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے فارسی دیوان کی تکمیل مرض الموت کے عالم میں کی جیساکہ مولوی احسن اللہ صاحب دہلوی اُس دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "در ایامِ حیات بحکمِ استغنا کہ لازمہ کمال ست بگفتن شعر بزبان دری وہرچہ گفت آنرا بفراہم آوری کمتر پرداخت۔ معہذا ایں ہم از آثارِ قوتِ طبع رواں واسرارِ سرعت رسائی آں ہمہ دان ست کہ در عالم مرض الموت کہ بہ عارضہ افتادن از بام وصدمہ شکستن استخوانِ ساعد رنجور بود و از تحریر معذور۔ چوں از جانب ایں بیدستگاہ خاکسار نامہ سیاہ احسن اللہ در باب صیقلگریِ مراتِ ردیفہاے باقی حروف تہجی ابرام رفت، درچنیں ضیقِ فرصت، کہ از اں وقت تاحین وقوع فشارِ قبر یک دو ہفتہ مدت بیش نبود در قبول التماس مضائقہ نہ فرمود۔ دست بہ پیوند شکستگی حمائل

گردن، و زبان و دران خستگی غزل سرا۔ او میگفت و دگران مینوشتند۔ دانشمندان کارآگاہ دانند کہ بدینسان سخن گفتن نہ کار ہر کس است "۔

جسطرح انکی بعض اردو غزلیں خاص رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں وہی حال انکی فارسی غزلونکا بھی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ؎

ہمت ز ستیزہائے من چیست		من کیستم و وفائے من چیست
وو رست بآرزو رسیدن		اندیشۂ نارسائے من چیست
دیوانہ ام و دلے کنم شاد		از ولولہ مدعائے من چیست
عاشق شدم و ہلاک گشتم	(۴)	افسانہ و ماجرائے من چیست

(۵) مومن صنمے ز دہر خواہم
تا خواستہ خدائے من چیست

چوتھے شعر میں ماجرائے محبت کو دو مختصر فقروں میں کس خوبی سے ادا کردیا ہے سخن شناس حضرات غور فرمائیں کہ اس اجمال میں تفصیل کو کس خوبی سے پنہاں کیا ہے۔

مقطع میں تخلص کی رعایت سے صنم کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی انکا ایک انداز تھا جسکا لحاظ اُنہوں نے اردو زبان کی تقریباً کل غزلوں کے مانند اکثر فارسی غزلوں میں بھی رکھا ہے۔ مثلاً ایک دوسری غزل بقیدِ مضمونِ مسلسل لکھی ہے۔ ؎

کیستم بیقرار و غمزدہ	دو جہاں را بروئے ہم زدہ
عاشقے سخت آرزومند بے	بیدلے بیکسے ستم زدہ
پاکبازے و دامن آلودہ	غوطہ در خونِ چشم نم زدہ
مے پیمانہ کشاں بسال	بہ طربہائے جام جم زدہ
روزِ گلچینیٔ بہارِ وصال	لافِ فرماندہ ارم زدہ
بہ تمنائے قاصد و مکتوب	بر سرِ نامِ خود قلم زدہ

بستہ عہد وفا بہ بیتابی	بسر عاشقی قسم زدہ
بستر روزگار باہمہ ضعف	خویش را بر صف الم زدہ
در محبت نوزدہ رنگینی	داستانی بجوں رقم زدہ

منکر شیخ شہر مومن نام
بوسہ بر پائے ہر صنم زدہ

قطعات تاریخ کے ذکر میں صاحب تذکرۂ آبحیات لکھتے ہیں کہ "تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر انکی طبع رسانی اسے محسنات تاریخ میں داخل کردیا چنانچہ اپنے والد کی تاریخ کہی ہے

بہن الہام گشت سال وفات
اکہ غلام نبی بہ حق پیوست

غلام نبی کے اعداد کے ساتھ حق ملائیں تو پورے سنہ وفات نکل آتے ہیں
شاہ محمد اسحاق صاحب نے دلی سے ہجرت کی خانصاحب نے کہا ہے

گفتیم وحید عصر اسحاق	بر حکم شہنشہ دو عالم
بگذاشتہ دار حرب آسمال	جا کردہ بمکۂ معظم

وحید عصر اسحاق کے اعداد کو معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور دار حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو سنہ ۱۲۶۰ھ تاریخ نکلتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی تاریخ۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے ✿ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

الفاظ مصرعۂ آخر کے اول و آخر کے حرفونکو گرا دو بیچ کے حرفونکے عدد لیلو تو سنہ ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں۔"

رباعیوں میں بعض نہایت خوب ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

یارب کرم کہ شرمسار آمدہ ام	بر عہد گہی تو امیدوار آمدہ ام
عذرم بپذیر گرچہ لنگ ست ہمہ	از دور فلک شکوہ گذار آمدہ ام

چندانکہ بگرد انگوتر باشم آنجاکہ بود کار برحمت مومن	در فکر ز بازپرس محشر باشم گر توبہ کنم ز جرم کافر باشم
افسوس شکایت نہانی نہ گئی الطاف تیرے بسکہ روبرے دشمن	دل پر سے فریب کی گرانی نہ گئی اس شوخ سے مجھکو بدگمانی نہ گئی
یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید ہم سمجھے ہیں معناے حقیقی یعنی	پر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

مومن نوجوانی ہی میں مولانا اسمعیل صاحب شہید کے پیر یعنی مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے تھے اور اسلئے انکے عقائد کے مطابق تقلید و بدعت سے سخت نفرت رکھتے تھے جیسا کہ اس رباعی اور دیگر مختلف اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

ایک عاشق مزاج شاعر کی حیثیت سے مومن کی مثنویونکا شمار بلحاظ مضمون و اثر اعلیٰ درجے کی مثنویوں میں ہو سکتا ہے لیکن بلحاظ زبان انکا درجہ بہت پست ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انکو قبول عام کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ البتہ فارسی کلیات کے آخر میں ایک مثنوی بطور مناجات خوب لکھی ہے۔ جس میں سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ ؎

ایکہ بہ یثرب گذرے میکنی	رہبری و خوش سفرے میکنی
خاک براہ تو مبادا بلند	خار بپایت نرساند گزند
بخت رسا ہمرہ دیارت شود	کام رساں حامی کارت شود
تا بدر راہ برے رہ بری	سجدہ زد درگاہ شہنشہ بری
شاد شوی نیز مرا شاد کن	چوں روی از خویش زمن یاد کن

آخر از احباب قدیم توام — همدم و همراز و ندیم توام
جمله جبین گرد بران خاک سای — خاک شو و پای بر افلاک سای
پا شکن و دور رسیدن بده — جان بتعلق دل به طپیدن بده
پاس ادب دار بعرض پیام — گرد درش گرد و بگو السلام
ای بزمین تو فلک جبهه سا — ای بجناب تو ملک خاک پا
ایمن آفت زدگان درگهت — راه بر خضر غبار رهت
مسکن دریا گهران کوی تو — دیدهٔ صاحب نظران سوی تو
خوابگهت رشک بهشت برین — سرمه کش از خاک درت حور عین
هست گدای بدرت شوم نیست — هیچکس از فیض تو محروم نیست
گوشهٔ چشمی بمن زار هم — گوش بفریاد غمزا بار هم
چون نخورم غم که توئی دادرس — جمله فغانم تو بفریاد رس
خاک مرا گردش افلاک کرد — گردش افلاک مرا خاک کرد
تا بکجا دم زنم تاب کو — حوصله سوز است ستم آب کو
دیر بفریاد نپرداختم — سوختم بصد داغ دل و ساختم
حوصلهٔ طاعت دشمن کجا — بتکدهٔ هند کجا من کجا
جان نفشاندن بسرت حیف حیف — مومن و دوری ز درت حیف حیف
تا بکجا دفع دعا و صعود — تا بکی از دور فرستم درود
چون بکشم جان و جگر خون کنم — بیتو بجان آمده ام چون کنم
نفس بدم از همه سرکش تر است — گر گسلد از تو شود خوشتر است
ورنه بجای نرسد اشتیاق — گرچه برون رفته ز حد اشتیاق
بیم و هراس این همه واحسرتا — مومن و یاس این همه واحسرتا
لطف بحالش که زبون تر شده است — امت لست از همه کافر شده است
آب جبین بنگر و عذرش پذیر — پای بگل مانده تو دستش بگیر

گر گریست یا درا و سے شود	شوق درت رہبر او می شود
زود کہ لبیک زناں در رسد	گرچہ رسیدن نتواں در رسد
داد دلِ سوختہ ساماں دہد	گریہ کند نالہ زند جاں دہد

یہ مثنوی حضرت نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ کی مشہور مناجات

اے مدنی برقع و مکی نقاب	سایہ نشیں چند بود آفتاب
تیز روِ شب منتظر اں روز کن	صبح نظامی طرب افروز کن

سے ڈھنگ پر ہے اور کیا عجب کہ یہی انکی نجات اخروی کے لیے کافی ہو۔

مومن کی ہر صنف کلام پر بحث کرنے کے بعد اب ہم آبحیات آزاد سے انکے ذاتی حالات کے متعلق چند منتخب فقرے نقل کر کے اس تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

مومن خاں صاحب کا حال

انکے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں شہر کے شرفا میں سے تھے (جنکی اصل نجباے کشمیر سے تھی) اول حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوے۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلاہہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے انکی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن درثہ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاںصاحب نے اپنا حصہ لیا۔ اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اسکے علاوہ انکے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی اس میں سے ایک حصہ انکے والد کو۔ اور انکے بعد اس میں سے انکا حصہ انکو ملتا رہا۔

انکی ولادت ۱۲۱۵ھ میں واقع ہوئی۔ بزرگ جب دلی میں آئے تو چیلونکے کوچے میں رہے تھے۔ وہیں خاندان کی سکونت رہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ انکے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے توحضرت ہی نے آکر کان میں اذان دی۔ اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا۔ لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا۔

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ انہوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سنکر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسیقدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انہی کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ تیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اسنے بزرگونکے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا۔ دلمیں طرح طرح کے شوق پیدا کئے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اسکو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ انکو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سنکر بڑے بڑے منجم حیران رہجاتے تھے۔ سال بھر میں ایکبار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور انکی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا۔ نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا جاؤں۔ اسکا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔

شطرنج سے بھی انکو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی۔ اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں

کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

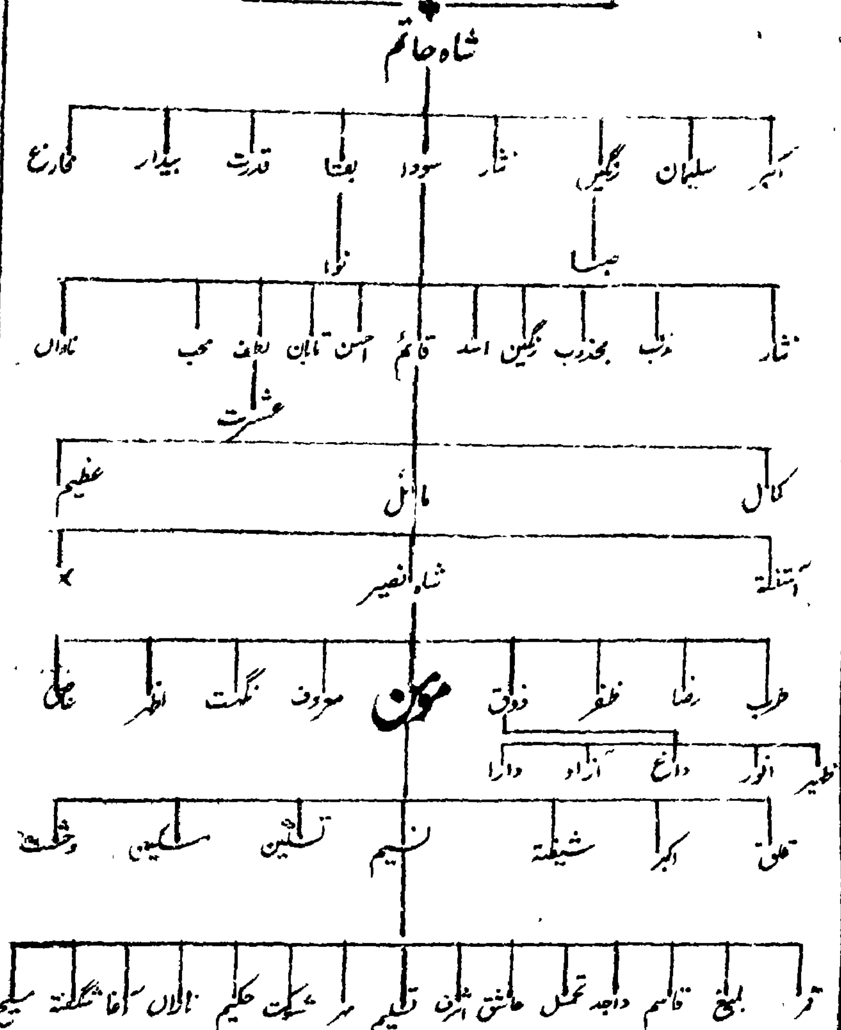
شعر و سخن سے انہیں طبعی مناسبت تھی۔ اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا
اُنہوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھلایا۔ مگر چند روز کے بعد اُنسے
اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسیکو استاد نہیں بنایا۔

رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع خوش لباس۔ کشیدہ قامت۔ سبز رنگ سر پر
لمبے لمبے گھونگر والے بال۔ اور ہر وقت اُنگلیوں سے اُنمیں کنگھی کرتے رہتے تھے۔
ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پاینچے۔ اُس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انہیں نواب
اصغر علیخاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا۔
ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا
الحمد اللہ ابتک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہوگئیں۔ باوجود اسکے
نیک خیالوں سے بھی اُنکا دل خالی نہ تھا۔

کوٹھے سے گرنے کے بعد اُنہوں نے حکم لگایا تھا کہ ۵ دن یا پانچ مہینے یا پانچ
برس میں مرجاؤنگا چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی۔
دست و بازو بشکست۔ مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہی۔ ماتم مومن۔ دلی دروازہ
کے باہر میدھیونکے جانب غرب۔ زیر دیوار احاطہ مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز
صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے

روایت۔ مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا۔ ایک
خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے۔ نواب مصطفٰے خاں نے دو برس بعد خواب میں
دیکھا کہ ایک قاصد نے آکر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے۔ اُنہوں نے لفافہ کھولا تو اسکی
خاتمہ پر ایک مہر ثبت تھی جس میں مومن جنتی لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا۔ کہ آجکل میرے
عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے۔ تم اُنکی خبر لو۔ صبح کو نواب صاحب نے
دو سو روپیہ اُنکے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا اُنکے صاحبزادے
نصیر خاں سلمہ کا بیان ہے کہ فی الواقع اُن دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف

تھی۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا۔



نوٹ۔ اس شجرے میں راقم حروف نے سلسلۂ مومن کو درمیان میں اور دیگر شعرا کو حسب ترتیب داہنے اور بائیں جانب یکے بعد دیگرے رکھا ہے اس سے ناظرین پر ہر شاعر کی درجہ شاعری کی کیفیت نوتاً واضح ہو جائیگی۔

بیاض

مخمس حضرت بیخود بدایونی بر غزل عصمت

گو طبیعت میں نہ اب ولولہ باقی ہے نہ جوش ۔۔۔ سر بسر داغ ہیں کیا قلب و جگر کیا بر و دوش
پھر بھی شوقِ مے گلرنگ سے ہو کر مدہوش ۔۔۔ سرخوش از کوے خرابات گذر کردم دوش
بطلبگاری ترسا بچۂ بادہ فروش

سیکڑوں مست وہاں پھرتے تھے مارے مارے ۔۔۔ حور غلماں سے کے میسر تھے جنہیں نظارے
محو حیرت میں سرِ رہ نگراں تھا۔ بارے ۔۔۔ پیشم آمد ز سر کوچہ پری رخسارے
کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش

اسکا چہرہ تھا مہ چار دہم بے کم و کاست ۔۔۔ پا بگل سرو جسے دیکھ کے ہوں وہ قد راست
دیکھی جاتی ہوئی جب اب نشست و برخاست ۔۔۔ گفتم این کوے چہ کوے است ترا خانہ کجاست
اے مہ نو خم ابروے ترا حلقہ بگوش

سنکے یہ پہلے تو خاموش رہا وہ دم چند ۔۔۔ اس ادا سے کہ ہوا محو دلِ حسن پسند
پھر بلا نخوت و پندار فقط از رہِ پند ۔۔۔ گفت تسبیح بخاک افگن و زنار ببند
سنگ بر شیشۂ تقوے زن و پیمانہ بنوش

ورنہ اک روز کرینگے سبھی دیوانہ طلب ۔۔۔ کہ بنا دیتی ہے اپنوں کو بھی دیوانہ، طلب
اور کرتا ہے تو کر ہمت مردانہ طلب ۔۔۔ تو بہ یکسو بنہ و ساغر مستانہ طلب
خرقہ بیروں فگن و کسوت رندانہ بپوش

وضع رکھ ایسی کہ پاس آنے نہ دے کوئی ٹھٹھے ۔۔۔ بات کر ایسی کہ جسپر نہ کوئی کان دھرے
بھول جا خانقہ و دیر کے سارے جھگڑے ۔۔۔ بعد ازیں سوے من آتا بتو گویم سخنے
راہ پیش آر اگر بر سخنم داری گوش

سنکے اس فتنۂ دوراں کا بیان دلکش ۔۔۔ جل گئے جان و جگر دل میں یہ بھڑکی آتش

الغرض اسکے ہر اک قطرے پہ ہو کر غش — دیں بر افتادہ و بیہوش و دیدم بہ پیش
تا رسیدم بمقامے کہ نہ دیں ماند نہ ہوش

بے نشاں صورت عنقا تھا جہاں حرف وجود — بھول جاتی ہے جہاں جاکے زباں حرف وجود
مٹ گیا سینہ سے مانند گماں حرف وجود — محو گشت از ورق کون و مکاں حرف وجود
نہ پری ماند نہ آدم نہ طیور و نہ وحوش

نیست ہی نیست وہاں تھا نہ فقط ہست ہی ہست — پانوں بڑھتے تھے مگر حوصلہ تھا بالکل پست
شوق نے بسکہ کیا بیخود صہبائے الست — دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست
از تف بادۂ شوق آمدہ در جوش و خروش

جس طرف دیکھئے آتا تھا نظر وجد و سماع — روز و شب عیش و طرب شام و سحر وجد و سماع
نہ مغنی نہ دف و چنگ مگر وجد و سماع — بے نے و مطرب و نغمہ ہمہ در وجد و سماع
بے مے و جام و صراحی ہمہ در نوشانوش

جھوم کر کوئی یہ کہتا تھا کہ مستم مستم — نعرہ کرتا تھا کہیں کوئی کہ ہستم ہستم
کوئی کہتا تھا شکستم کوئی بستم بستم — بسکہ سر رشتۂ تدبیر برفت از دستم
خواستم تا سخنے پرسم از و گفت خموش

لب ہلانا ہے یہاں شرب و ملت کے خلاف — حشر تک ہو نہیں سکتی ہے یہ تقصیر معاف
میرا کہنا تجھے باور نہیں تو سن لے صاف — ایں نہ کعبہ ست کہ بے پا و سرآئی بطواف
نہ کلیسا کہ در آں بادہ آئی بخروش

وہی طاعت ہے یہاں آئے جو کچھ جسکو پسند — ہیں بن جاتا ہے ناداں ہر اک دانشمند
نفع سو طرح کے رکھتا ہے یہاں ایک گزند — ایں خرابات مغاں ست دریں مستانند
از دم صبح ازل تا بقیامت مدہوش

چاہتا ہے اگر اس راز سے تو آگاہی — ترک بیخودی کی طرح کرنش و کبر و خودی
اس سے بڑھکر ہے اگر کوئی تمنا تیری — گر ترا ہست بایں جمع سر یکرنگی
دین و دنیا بہ یکے جرعہ چو عصمت بفروش

فقط

نظم ہندی

بیٹھی بن بانک سون مانک محل مدہ انگ البیلی کو اچانک تہرک پرد
بناؤ سنگار کرکے ‌‌ جسم ‌ معشوق ‌ یکایک ‌ جہجک گئی

کہیں پد اکرتہائیں تن تاپن تے ہارن کے گُنتا ہجارن درک پرد
نام شاعر ‌ اُسیوقت ‌ جسم کی گرمی سے ‌ موتی کی ہار ‌ موتی ‌ ہزاروں ‌ درک گئے

جات چہنا کو دہک ناسے کو کہہ بکتا کرٹہت گر گنا سرک پرد
حالت بیقراری ‌ دلکا دہڑکنا ‌ انتہائی حالت بوجہ جنبش سینے ‌ نوشش و آواز ‌ اتنے سے گٹکن بوجہ یکایک لانوی گر پڑا

بانسری پکر رہی سانسری سنبہارسے کون بانسری سنت واکے آنسو ہرک پرد
بوجہ درد جگر پسلی پکڑ کر رہ گئی ‌ سانس سنبہالنے کا اختیار نہیں رہا ‌ بانسلی سن کر ‌ اُسکے ‌ آنسو ڈہلک آئے

ایک عاشق نوازنے اپنے معشوق (یعنی مرد) سے وعدہ وصل کیا جگہ ملنے کی بتادی جب ہاں جانیکا وقت قریب ہوا وہ آرایش بناؤ سنگار کر رہی تہی کہ اُسکے ملنے کے لئے محلے کی اور عورتیں آگئیں اتفاقاً بیٹہنا پڑا مگر جوں جوں دیر ہوتی تہی اسکی بیقراری بڑہتی جاتی تہی کہ اسیحالت میں اُسنے بانسلی کی آواز سنی (کہ یہی علامت فیمابین قرار پاچکی تہی) بانسلی کی آواز سنے موہوم تمناؤں میں ہلچل مچادی جگر میں درد جان لبوں پر آنکہیں پرآب افشاے راز کے خوف سے دل کی بہڑاس بہی نہیں نکل سکتی تہی جلیسوں کی وجہ سے باہر جاکر اُس سے معذرت بہی نہیں کرسکتی تہی کہ ان عورتوں کی وجہ سے میں تجہ سے نہ ملسکی۔

دیگر

ناسا مورنچاسے درگ کری کگائی سون ‌ کانٹو لو کہرکت ہیہ گری کٹیلی بہوں
ناک ‌ آنکہہ ‌ کنکہی ‌ مانند ‌ دل ‌ ابرو

کڑی کٹیلی بھوَن کیس نوارت پیاری — ترچھی چتون چتی مُنو سینہ ہت کٹاری

گیسو سلجھاتی ہے — دیکھا مانند دلِ عین ہَن کی کٹاری تی ہر

کبیں ٹھان سلطان چہکرت بہے دیکھہ تماسا — جاکو سبج سبہاو اور کو بڈہ بل ناسا

بہ سو اس — اُسکو معمولی بات تھی دیکھنے والے پر نہیں معلوم کیا کچھ گذر گیا

اس میں ایک خاص ادا سے بحث کی ہے۔ کنگھی کرتے وقت بعض بال جو اُلجھ جاتا ہے اُسکی تکلیف کا اثر چہرے پر پڑتا ہے جسکا اظہار اکثر ناک بھوں چڑھانے سے ہوتا ہے۔ جب وہ کنگھی کر چکی تو اپنے گیسو کو ترچھی نگاہ کر کے جوڑا باندھکر (چونکہ جوڑا پشت کی طرف ہوتا ہے لہذا نگاہ کا ترچھا کرنا ضرور ہے) دیکھنے لگی ترچھی نگاہ اُسکی ایک تیر بے پناہ تھی کر گو اسکا ہدف جوڑا تھا مگر بیاں دیکھنے والے کا عجب عالم ہو گیا اُسکے لئے تو آسان سی ایک بات تھی بیاں قلب و جگر کے ٹکڑے اُڑ گئے۔

یہ اسی مضمون کو دوسرے اشاعر کس خوبصورتی سے اسی ادا کو زیادہ دلفریب اور دلکش سین میں دکھلاتا ہے جسکی تشریح کے لئے اردو میں بہت سے صفحے درکار ہونگے۔ کہتا ہے۔

کچ میٹ کر بیچ اولٹ ہیں سیس ٹہار — کاکومن باندہت نہ یہ جوڑ و باندہن ہار

کہتا ہے کہ اپنے سر کو ایک طرف ذرا سا خم کر کے جوڑے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا جس سے بازو کی گوری گوری ہتھیلیاں اُبھر کر اور بھی خوبصورت ہو گئیں دوپٹہ شانوں پر الگ ڈھلکا پڑا تھا اور وہ اپنے جوڑے کے بناؤ میں مصروف تھی یہ ادا تو وہ قیامت ہے کہ اس شان سے جوڑا باندھنے والا کس کس کا دل اپنے جوڑے میں باندھ لیگا۔

ہری کنچکی کس مسی مسکی رس کے ہیر — بر گسٹ کلی گلاب کی نکسٹ للت لکیر

سبز محرم نہایت تنگ چست مسک گئی جوانی کے جوش سے (تو کیا ہوا) جیسے ہی پھوٹ نکلی کلی گلاب کی تو ایک یار یک گلابی لکیر نکل آئی

—— جو حضرات ہندی زبان کو مذاق اور لطافت سے واقف ہیں وہ تو شاید اس شعر کو ہزار ہا مرتبہ پڑھینگے جب بھی انکی طبیعت سیر نہ ہو گی۔ طبیعت کا آسودہ ہونا میرے نفس مذاق شعر کی وجہ سے نہیں کہا ہے بلکہ وسعت

زبان اور شاعر کی علو فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہتا ہے کہ سبز محرم وہ پہنے ہوئے تہا جو نہایت تنگ تہا جوش شباب نے اسکو مسکا ڈالا تو ایک باریک گلابی لکیر نمودار ہوئی یہ اسکے جسم کی لطافت تہی جسطرح گلاب کے پہول کے اوپر سبز پتیاں ہوتی ہیں جب اندر سے غنچۂ گلاب کہلنے لگتا ہے تو وہ اوپر کی سبز پتوں میں ایک باریک دراز پیدا ہوجاتی ہے اسیطرح اسکے زور جوش شباب نے اُس سبز محرم کو جب مسک دیا تو ایک باریک دہاری سینے کی گلابی رنگت کی نمودار ہوگئی۔

(جواب) (سوال)

کیوں درگ بہہ ہی سونا رمم آیو بہایو نہیں لینیئے ڈگن بہال میں پیش تو ہے درس بن

قاعدہ کی بات ہے جبکہ دل پیار کرتا ہے اگر وہ کہیں سفر سے آوے تو محبت کی بے اختیاری میں آنسو نکل ہی آتے ہیں اُسی حالت کو سوال وجواب ادا کیا ہے۔

جب سفر سے محبوب آیا تو اُسے دیکہہ عورت کے بے اختیار آنسو نکل آئے اُسنے کس مزے دار چہیڑ سے کہا کہ کیوں تیری آنسو کیوں نکل آئے ہاں ہاں میرا آنا تجہے ناگوار ہوا جبہی تو آنسو نکلے تو وہ جواب دیتی ہے کہ نہیں یہ میرے آنسو نہیں ہیں بلکہ تیری جدائی میں کہ مدت سے تجہے نہیں دیکہا تہا، میری آنکہیں بیمار پڑ گئی تہیں اب جب تو آیا تو تجہے دیکہکر وہ اچہی ہوگئیں تو غسل صحت کیا ہے یہ پانی اُسی غسل صحت کا ہے انسو نہیں ہیں۔

ارزس اوسیر میں جا کے جو آدے نا سے جو ڈراوے کہو واہی کو کٹہور ہے

حالت بیکسی ومصیبت میں اگر کوئی بیدردی کرے اسکو جو دور دور کرے تو اُسکا نقصان ہے اور وہ بڑا بدقسمت ہے (بلکہ کیا کرنگی)

ہاتہ گہیں گے انگ مالہ بہرینگے ہمیں بہاوے سو کرینگے تمہیں جا میں کام در ہے

ہاتہ دابینگے اُسے نہلائینگے جو ہمارا جی چاہے اسمیں کس چیز کی کلیں اوپر حسد ہے

زین الدین محمد جو پیٹہہ ہے تہاری تو راکہو واہی اوڑ اور جو چلت نا کچہہ جور ہے

یعنی اپنی طرف زور

پیٹہہ ہے تہاری پہ ہماری ہی ہماری جان رُوسے تہارے سے ہوت ہماری اوڑ
طرف مگر نہیں ہماری ہے یہ کنوات معشوق سے خلاف ہے، خفا

اس نظم میں یہ سین دکھلایا ہے کہ مرد نے روٹھکر عورت کی طرف سے منہ پھیر کر کروٹ لیلی ہے تو اُسکی پیٹھ عورت کی طرف ہوگئی ہے عورت نے اُسکو منانا شروع کیا تو مرد پر جھنجلایا تب اُسنے جواب دیا کہ۔ مصیبت کے وقت میں (یعنی تمہارے روٹھ جانے سے بڑھکر اور کونسی مصیبت ہوگی) جو اپنا طرفدار ہو پھر اُسکی ہمدردی کی اگر کوئی قدر نہ کرے تو وہ بڑا بد قسمت ہے بلکہ میں تو ایسی حالت میں اس پیٹھ کو سہلاؤنگی دابونگی پیار کرونگی نہلاؤنگی پھر اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ تمہیں کیوں جلن ہوتی ہے یہ تو میری طرفدار ہے نا۔

اور اگر تمہاری پیٹھ ہے تو تم تو مجھسے روٹھکر کروٹ ہی میری طرف سے لے چکے ہو اسکو بھی اپنی طرف کر لو اگر ایسا کر سکتے ہو تو کر دیجئے۔ میری طرف نہ رہے اور اگر ایسا نہیں کر سکتے ہو تو پیٹھ تو یہ تمہاری بیشک ہے مگر اے میری جان، یہ پیٹھ تمہاری تمہاری نہیں ہے بلکہ میری ہے کہ جب تم روٹھ گئے تو یہ میری طرف (اور) ہو گئی۔

دیکھنا یہ ہے کہ صرف ایک معمولی تین حرفونکی نے نمک لفظ (یعنی اَور) سے کیسی دلکش اور لطیف بات پیدا کی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ہندی کی بھاشا نفنگی اثر کے لئے ایک خاص قسم کا کیف رکھتی ہے۔ جسطرح دوسری زبان کے شاعر قصیدوں غزلوں مخمس کے طولانی سلسلوں کے ذریعے سے دلوں پر ایک اثر پیدا کرتے ہیں وہی بات ہندی کا شاعر صرف ایک لفظ سے دکھلا دیتا تھا چنانچہ مندرجہ بالا نظم کو دیکھنا چاہیے کہ (ٹھور) کی بوندی اور بھدی لفظ سے جو جگہ کے معنوں میں ہے، ہندی شاعر نے کیسی پاکیزہ اور نئی بات پیدا کی ہے۔

سوال

ندی اَسنے گَن بَن گھنے اور بیچ بیچ پرے پہار
ندیاں بیشمار بن گھنی جنگل درختوں گنجان درمیان درمیان میں سیکڑوں پہاڑ
میں پوچھوں تُن اسے سکھی کہ کہہ پر کئے سنگار
کس کے اوپر

جواب

آج چندماں دُوُج ہیں کہ سیس چستورت چو ہنو اور ا
چاند — ہلال کلتے — نگاہیں تمام عالم کی ڈھونڈہ رہی ہیں
ہمری اور ورگپال کی نجسہ پرے اک ٹہور

ایک عورت بناؤ سنگار کررہی تہی کہ اُسکی اورجلیسوں نے یہ حالت دیکہی تو طنزًا کہا کہ تیرا محبوب تو اتنی دور ہے کہ جس راستے میں بیشمار ندیاں ہیں بے تعداد گنے گنے جنگل ہیں اور نہیں معلوم کتنے پہاڑ ہیں۔ اتنی دور تو وہ ہے پہر میں تجہسے پوچہتی ہوں کہ یہ بناؤ سنگار کس خیال سے ہے۔ تو وہ جواب دیتی ہے کہ ہاں ہے تو ایسا ہی جیسا تم کہہ رہی ہو مگر بات یہ ہے کہ آج تاریخ ۲۹ ہے چاند دیکہنے کے لئے تمام عالم میں ہر شخص کی نظر مطلع پر ہوگی تو کیا عجب ہے کہ میرے محبوب کی نظر بہی ہلال پر ہو اور میں بہی چاند دیکہونگی تو وہاں میری اُسکی نظر دنکا وصال ہوجائیگا۔ جہاں یہ عالی خیالی ہے وہاں درد کی پہلو کو بہی دیکہنا چاہیے کہ اسکی خوش فکری اور اثر اس عالی خیالی سے کچہ گہٹ کر نہیں رہا ہے۔

دیگر

گیورسے گیو اُجہُوں نہ پیرو دُہوں کون گہری نکسوں گہرسوں
پرسوں پیا آون کہہ جو گیو پرسوں کی بیت گئے برسوں
جب سرسوں آن ستاوت ہے اور مینہہ کست برسوں برسوں
چٹ چاہے سکہی اورجاے ملوں پہ اوڑ انہیں جات بنا پرسوں

دل
اپنی بیقراری کی حالت میں اپنے ہمراز کے سامنے اپنے محبوب کے خیال میں کر رہی ہے

کہ آخر تم ملکتا چھوڑ کر چلے ہی گئے اور پھر آجتک خبر بھی نہ لی خدا جانے وہ کون بُری گھڑی تھی کہ جس وقت تم مجھسے جدا ہوے تھے۔ (اور ہاں) تمنے تو وعدہ کیا تھا کہ میں پرسوں پلٹ آؤنگا جسکو برسوں ہوگئے اور تمہاری پرسوں ابھی تک آئی ہی نہیں۔ (میں اپنی حالت کیا کہوں) جب بہار کا زمانہ آتا ہے اور سرسوں کے زرد زرد پھول مجھے ستاتے ہیں اور ساون بھادوں میں جب اودی اودی گھٹاؤں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے بادل کہتا ہے کہ میں برسوں (تو کیا کہوں بے اختیار) جی چاہتا ہے اور دل اُمنڈتا ہے کہ ابھی ابھی اڑکر تمہارے پاس پہونچوں مگر اسے کیا کروں پر جو میرے پاس نہیں ہیں۔ اس مضمون کو فارسی اور اردو کے شعرا نے بھی دکھلایا ہے مگر آداشناس محبت جنکی پہلوؤں میں جدائی کا دکھایا ہوا دل ہے اُنسے اس نظم کی لذت کو پوچھئے۔ غرض ہندی شاعری میں جہاں خیال آرائیاں ہیں ہاں درد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فقط

(فطرت)

نوٹ جناب فطرت موہانی جنہوں نے یہ مضمون اردوے معلے کے لئے بھیجا ہے اُنکی طبعیت کو بھی ایک خاص مناسبت ہندی سے ہے چنانچہ آپنے اپنی فطرتی ذکاوت سے نئے نئے رنگ کی باریکیاں اور نزاکتیں ہندی میں پیدا کی ہیں۔ انکی ٹھمریاں اور غزلیں شوق کے کانوں سے سنی جاتی ہیں۔ منجملہ اُن اختراعات کے ایک یہ ہے کہ اکثر عربی فارسی اردو شعروں کی تخمیس اُنہوں نے ہندی زبان کے مصرعوں میں کی ہے مثلاً کسی کا ایک شعر ہے ؎

محبت ہست کہ دل را امید ہ آرام کہ
وگرنہ کیست کہ آسودگی نیخواہد

آپ نے اردو مصرعے جو اس شعر پر لگائے ہیں وہ ملاحظہ طلب ہیں فرماتے ہیں۔

نہ کوئی سحر تھا میرے لئے نہ کوئی دام ✿ اداو عشوہ کو ناحق میں کیوں کروں بدنام
کیا ہے پیار نے بس انکی بندہ بیدام ✿ محبت ست کہ دل را امید ہ آرام
وگرنہ کیست کہ آسودگی نیخواہد

اب ہندی مصرعے سنئے کہ جو اسی فارسی شعر پر لگائے ہیں ۔ ~

یہ کہیو جائے سکھی اُن سے مورا لکھکے سلام | تڑپ تڑپ کے بتی ہو تم نہ آئے سیام
کہ کب سیاں کی نہیں جات کا کردں مورے رام | محبت ہست کہ دل را نمیدہد آرام

دگر نہ کیست کہ آسودگی نیخواہد

گرہ کا مصرعہ فارسی شعر سے کیسا دست وگریباں ہے ۔ مضمون بھی کیا درد ناک ہے ۔ محبت کی بیکلی اور دل کی بیقراریوں سے مجبور ہو کر خود محبوب کا اپنے سے یہ کہنا کہ " کا کردں مورے رام "، کیا کچھ اثر پیدا کرتا ہے ۔

ناظرین خیال فرما سکتے ہیں کہ ہندی زبان میں بحور کا لحاظ نہیں پر اُسکے الفاظ کو بحر میں لاکر فارسی کی بحر سے تطبیق دینا آسان نہیں ہے ۔ اس موقع پر اسکا لکھدینا بھی خالی از لطف نہوگا کہ آپ کی جدت پسندی نے ایک نئی بات یہ پیدا کی ہے کہ فارسی اور اردو میں بولیاں کہی ہیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ مذاق اور اسکا اثر مخصوص بہ زبان ہوا کرتا ہے لیکن آپنے یہ کمال دکھلایا ہے کہ اثر جو ہندی زبان کا خاصہ ہے اسکو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے یعنی فارسی میں وہی بات پیدا کی ہے اور ہندی نازنین کو فارسی لباس پہنا کر اسکی ذاتی زبان کی تاثیرات کو محفوظ رکھا ہے ۔

حضرت موصوف اسکا بھی وعدہ فرماتے ہیں کہ وہ ہندی کجریاں (جو بنارس وغیرہ میں ساون کے مہینے میں گائی جاتی ہیں اور دلکشی کا ایک پر زور اثر رکھتی ہیں) جو پورب میں اکثر گائی جاتی ہیں اور جناب مفتی میر عباس صاحب نے جنپر عربی مصرعے لگائے ہیں اردوی معلی کے لئے عنایت فرمائینگے ۔

تنقید

(۱) مخزن لاہور | اپریل کے پرچے میں، جو " یادگار داغ "، انکے نام سے نکلا ہے،

کلام داغ پر میر نیرنگ صاحب ایک مضمون اور مرحوم ہی کے متعلق کئی نظمیں اقبال و احسن وغیرہ کی شائع ہوئی ہیں۔ میر نیرنگ کا مضمون ہلکا اور بے لطف ہے۔ اس مضمون کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے اسے بضرورت تحریر کیا ہے نیز یہ کہ اس سے پہلے اُنہوں نے کبھی داغ کے کلام کو بنظر غور و تنقید نہیں دیکھا تھا اور اسلئے اُنکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں۔ مثلاً ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ اُنکے کلام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اُنہوں نے محشر کے مضامین بکثرت لکھے ہیں جیساکہ رند نے بلبل کے مضامین کثرت سے لکھے ہیں۔ اس کثرت اور رنگارنگی کے ساتھ محشر کے مضامین کسی اُستاد کے کلام میں نہیں۔ چند مثالیں درج کیجاتی ہیں۔

نامۂ اعمال مجھسے چھین کر محشر میں وہ	کہتے ہیں اپنے لئے افسانہ ایسا چاہیئے
چال اُنکی دیکھنا گویا بڑے مظلوم ہیں	سب سے پہلے عرصۂ محشر میں حاضر ہوگئے
ہائے دنیا تو کہاں وہ عیب پوشی اب کہاں	عرصۂ محشر میں رسوائی سی رسوائی ہوئی
عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھکو	اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھکو
دیکھنا پھیر سرِ حشر مرے پاس آکر	کہتے ہیں کون ہو نہیں جانتے ہو تم مجھکو
ہے عجب اندھیر کوئی داغ کا پرساں نہیں	صبح محشر ہی آلگی شام تنہائی ہوئی
تم کو تو حشر کے دن لاکھ میں پہچان لیا	میں بھلا کون ہوں میرا تو پتا دو مجھکو

حالانکہ محشر کے ذکر میں ہر اُستاد کے کلام میں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ شعر ملسکتے ہیں۔ علاوہ بریں کلام داغ کے خصوصیات کے ضمن میں اس قسم کی معمولی باتوں کا داخل کرنا ہی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ راقم مضمون کی نگاہ بلند نہیں ہے۔

آخر مضمون میں مرزا داغ کے چند منتخب اشعار مع چند تعریفی جملوں کے لکھے ہیں۔ ان جملوں میں سے بعض درجۂ متانت سے گرے ہوئے ہیں اور اکثر سے یہ پایا جاتا ہے کہ لکھنے والا اپنی رائے بیدلی اور تصنع کیساتھ لکھ رہا ہے۔ مثلاً

" اور دیکھئے کیا بیساختہ فرماگئے ہیں "
" ایذا طلبی اور ایذا دوستی دیکھئے "
" اس شعر میں ذرا گرے ہوتے ملاحظہ طلب ہے "
" بے تکلف بیان کی ایک بانگی مثال ملاحظہ ہو "
" ذرا شوخی کے ایک دو نمونے دیکھئے "

[illegible]

نظموں میں حضرت اقبال کی نظم اچھی ہے لیکن احسن مارہروی کا طویل ترکیب بند بہت سی کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ مضمون کے متعلق سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مرزا داغ کی تعریف کے ساتھ بعض دوسرے شعرا کو بہت سخت الفاظ میں یاد کیا ہے۔ مثلاً

گلشن اردو کا ہو گیا پرخار شاعری اور شاعری ایسی نہ ہوئی ہے نہ ہو کسی کو نصیب		زغن و بوم کو مبارک باد جسکا بانی ہوا جہاں استاد سر کیا ئیں ہزار زشت نہاد	
لو فرضا وہ تھا بڑا جاہل ہم بھی دیکھیں وہ عالم و شاعر آپ اور اسکی ہمسری توبہ		اور ایسا بلائے تو سہی نام دو اک گنائے تو سہی اپنی صورت بنائیے تو سہی	

اب لفظی غلطیوں کو دیکھئے۔ لکھتے ہیں ؎

لشکر نظم سے خطاب لیا
ناظم یار جنگ کا لوٹے

خطاب ناظم یار جنگ ہیں۔ ناظم کو باضافت نظم کرنا خطا ہے۔

موت پر کوئی بس نہیں چلتا
قبضۂ دسترس نہیں چلتا

یہاں قبضہ و دسترس کی یکجائی بمعنی ہے۔ علاوہ بریں "قبضہ چلنا" کو محاورہ نہیں ہے

کلام اکبر کے متعلق تنقیدی نوٹ میں اڈیٹر صاحب مخزن لکھتے ہیں کہ "سید موصوف کو آنکھ کی بیماری نے مجبور کر رکھا ہے ورنہ ملک کے علمی ذخیرے میں معتد بہ اضافہ آج تک کر چکتے" ہمارے مخدوم جناب مولوی سید اکبر حسین صاحب سابق جج خفیفہ کو شکایت چشم ضرور ہے لیکن جن الفاظ میں یہ مفہوم ادا کیا گیا ہے وہ جناب موصوف کی ثقاہت اور بزرگی کے لحاظ سے نہایت بےموقع ہیں۔ کیونکہ آنکھوں کی بیماری اردو زبان میں خاص معنوں میں مستعمل ہے۔

(۲) ریاض ہوش | یعنی مجموعۂ غزلیات جناب سید محمد صاحب ہوش رئیس شیخوپور۔ بداؤن۔ دبیز کاغذ پر بہت اچھا چھپا ہوا ہے اور مصنف سے طلب کرنے پر بلا قیمت ملسکتا ہے۔
حضرت ہوش کی شاعری شوقیہ شاعری ہے اور اس لحاظ سے بعض غزلیں اچھی ہیں مثلاً

اُس دل میں اثر ہے نہ فغاں کا نہ دعا کا — نالے کا وہاں ٹھیک نہ کچھ آہ رسا کا
آزردۂ دل ناشاد تجھے دیکھ لیا — اثر نالۂ و فریاد تجھے دیکھ لیا
پر کبھو تم کرے ظلم اٹھائے نہ گئے — پر کہوں میں ستم ایجاد تجھے دیکھ لیا
کام اپنا تو رکا ہے نہ رکے گا ہرگز — گر اے خنجرِ جلاد تجھے دیکھ لیا
آزمانے کے لئے آج پہ کیا ہے موقوف — بارہا بانیِ بیداد تجھے دیکھ لیا

اور کچھ ہوش کی خواہش نہیں حاشا کلا
دیکھنا تھا سو پری زاد تجھے دیکھ لیا

نگاہِ نرگسِ بیمار بن گیا ہوں میں — مثالِ حسرتِ دیدار بن گیا ہوں میں
شبِ وصال کی امیدواریاں کر کے — غمِ فراق کا غمخوار بن گیا ہوں میں
تمہارے لطف سے بیکار بن گیا تھا میں — تمہارے ظلم سے باکار بن گیا ہوں میں

چڑھا دیا ہے جنہوں نے آسماں پہ مجھے
جو ہوش شاعرِ مستانہ بن گیا ہوں میں

(۳) اعجاز عشق | یہ تقریباً ۴۰۰ اشعار ایک پر زور قصیدہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب شاطر رئیس مدراس کی تصنیف لطیف سے ہے - ہم اس قصیدہ کے درمیان سے چند شعر نقل کرتے ہیں جس ناظرین حضرت شاطر کی بلند فکری اور پختگی کلام کا اندازہ کرسکینگے

ھ

اسے کیوں مرتے ہی آنکھیں بندکر دیتے میں یار
اک تغافل کیش کا ہمکو ابی ہے انتظار

جان حاضر ہے کرینگے تیرے قدموں پر نثار
جلد اے پیک قضا لا تا پیام وصل یار

رازِ الفت کیا چھپے جب دل ہی قابو میں نہو
زور تجبیر کیا چلے اے گریۂ بے اختیار

بال و پر بلبل کے ہیں اے گل ہوا میں منتشر
مژدہ لاتی ہے سنانے کسکو اب فصلِ بہار

حسرتیں گن گن کے کٹتی تھیں جو راتیں اکیاں
کیا ہوا جادہ جو تا تم ہوں وہ اے شبہا تار

کسطرح آسان ہو تیغ و گلو کا مرحلہ
کیا کریں اے تشنہ کامی کند ہے خنجر کی دھار

آخر اسکے ناز ہم کبتک اٹھائیں یا خدا
ڈوب جائینگے ہمیں اچھا نہ پیدا ہو کنار

خیر میخانے کی ساقی ہمکو بھی کر دے خراب
سخت نادانی ہے یاں مستو نہیں رہنا ہوشیار

ہم ہیں شاطر اور ہے طوف حریم میکدہ
رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار

(۴) اخبار وکیل امرتسر | نہیں معلوم کیا سبب ہے کہ کچھ عرصے سے اس اخبار کی حالت گرتی جاتی ہے یعنی اُسکے مذاق میں تنزل کی صورت نمایاں ہونے کے علاوہ اسکی عام رائیں بھی پختگی اور متانت سے عاری نظر آتی ہیں پستی مذاق کے ثبوت میں ہم آغا شاعر دہلوی اور اُنکے خلاف "ایک حق پسند" کی تحریروںکو پیش کرتے ہیں۔

اس قضیہ نامرضیہ کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ریاض الاخبار کے اڈیٹر نے کسی مضمون میں لکھدیا تہا کہ "داغ ایک خوشگو شاعر تھے" اسپر آغا شاعر صاحب اسقدر بگڑے کہ ناسخ مرحوم کو "بادی چور" اور آتش مغفور کو "نرا بھنگڑ" کہنے پر بس نکر کے یہاں تک

کہ گذرے کہ لکھنؤ میں آجتک کوئی غزلگو پیدا ہی نہیں ہوا۔
ان ناشائستہ وغیر مہذب الفاظ پر بھی اکتفا نہ کرکے آغا صاحب نے کمال افسوس کا اظہار فرمایا ہے کہ داغ کو "خوشگو شاعر" کہنے والے انسے بہت دور تھے ورنہ "زبان قلم سے جواب دینے کے بجائے وہ اُنکو ہاتھوں سے سیدھا کردیتے"
کسی شاعر کو "خوشگو" کہنا بہرحال اسکی تعریف کرنا ہے۔ پہر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپر آغا شاعر صاحب کیوں اسقدر برہم ہوے۔ مانا کہ بحیثیت شاگرد داغ ان کے نزدیک اساتذہ متقدمین ومتاخرین میں سے کوئی داغ مرحوم کے برابر نہ تھا لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ کسی اُستاد کی نسبت جو راے اسکے شاگرد کی ہو وہی سب لوگوں کی ہو۔
اس قسم کی امید رکھنا سادہ لوحی یا تعصب کی دلیل ہے۔
معلوم نہیں کہ اڈیٹر صاحب وکیل نے اپنے اخبار میں "آغا شاعر" اور "ایک حق پسند" کو اظہار جہالت کا موقع کیوں دیا۔
اب رہی راے کی پختگی اور متانت، اسکی نسبت ہم انجمن حمایت اسلام لاہور اور چند مسلمان بمبئی کے "جلسہ ہمدردی لارڈ کرزن" کو پیش کرتے ہیں۔
(۱) ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وکیل جو خود کو مسلمانوں کا سچا ہمدرد بتاتا ہے، اسلامی کالج کی تباہی وبربادی کے کیوں درپے ہے۔
اگر اسلامیہ کالج میں اصلاح کی ضرورت ہے تو اسکی سبیل یہ نہیں ہے کہ بجاے اسکی مالی اور تعلیمی حالت کو درست کرنے کے ہر طرح سے اسکی کارروائی میں رخنہ اندازی کیجائے اور اُسکے موجودہ منتظم برافروختہ اور ذلیل کئے جاویں۔
ہمنے اس خبر کو نہایت افسوس کے ساتھ سنا کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں وکیل کی جانب سے اس قسم کی کوششیں ہوتی تہیں کہ لوگ انجمن کو چندہ دینے سے باز رہیں۔
ہمکو اخبار وکیل کی روش پر زیادہ تر صرف اس سبب سے اعتراض ہے کہ وہ

طلب اصلاح کی آڑمیں در پردہ شکست کالج کا خواہاں ہے۔ اگر صرف اصلاح مد نظر ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن اصلاح چاہنے والونکے انداز کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ حمایت اسلام کالج پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں ہزاروں کے خرچ سے ایک یا دو گریجوئٹ سالانہ نکلتے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ صرف گریجوئٹونکو کیوں دیکھتے ہو۔ اس سال بی۔ اے۔ میں بیشک صرف ایک طالب علم کامیاب ہوا ہے۔ لیکن ساتھہ ہی اسکے ایف۔ اے میں ۲۲ لڑکے بہی تو کامیاب ہوے ہیں۔

اس نتیجے کو دیکھکر ہم صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ کالج کی تعلیم میں ابہی بہت کچھہ ترقی کی گنجائیش باقی ہے نہ یہ کہ کالج یکقلم توڑ دیا جائے۔

ہمکو وکیل میں یہ مضمون دیکھکر بہت تعجب ہوا کہ اسلامیہ کالج کو توڑ کر جسقدر روپیہ سالانہ اسکے تنتظام میں صرف ہوتا ہے وہ سب وظائف میں صرف کیا جاے۔ اور مسلمان لڑکے گورنمنٹ کالج میں پڑہاے جائیں۔ یہ دلیل ظاہر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے اور ہم بہی اسکو تسلیم کرینگے بشرطیکہ اڈیٹر صاحب وکیل اپنے اس اصول پر بحال قائم رہنے کا اقرار کریں۔ لیکن ہم جہانتک خیال کرتے ہیں وہ کبہی اسپر قائم نہیں رہ سکتے کیونکہ اس حالت میں انکو علیگڈہ کالج کو بہی بے سود ماننا پڑیگا جس میں ہزاروں کے بجاے لاکہونکا سالانہ صرف ہے۔

اور محمڈن یونیورسٹی کی تجویز تو بالکل لغو اور دور از کار قرار پائیگی حالانکہ جہانتک ہمارا خیال ہے وکیل محمڈن یونیورسٹی کے سرگرم حامیوں میں سے ہے۔

اس زمانے میں کہ یورسٹیز ایکٹ کے نفاذ کا وقت قریب آتا جاتا ہے ضرورت تہی اسبات کی کہ روشن خیالان پنجاب خصوصًا مالکان اخبار اسلامیہ کالج کی حمایت میں قلم اٹہاتے اور اسکی مالی حالت کے درست کرنے کی فکر کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری آرزو اور امید کے خلاف وہ اور ہی خیالات میں مبتلا ہیں۔

(۴) بعض مسلمانان بمبئی نے لارڈ کرزن کی کنووکیشن اسپیچ کی تائید میں جو جلسہ

کیا تھا اسکے متعلق اظہار راے میں بھی وکیل نے بڑی کمزوری دکھلائی ہے۔

ہمارے نزدیک تو ایک ایسے جلسے کو جسکے بانی ایک نواب زادے صاحب اور اُنکے چند متعلقین ہوں اور جسکے انعقاد کے متعلق پرائیوٹ خطوط کے ذریعے صرف چند مخصوص لوگونکو اطلاع دی گئی ہو۔ پبلک جلسہ ہی نہیں کہنا غلطی ہے۔

اخبار انڈین پیپل الہ آباد میں اس جلسے کی جو مفصل کیفیت شائع ہوئی ہے اسکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ جلسہ ابتری اور بیقاعدگی کا ایک قابل مضحکہ نمونہ تھا لوگونکا آدمی بھیج بھیجکر بلایا جانا۔ پھر بمشکل وقت مقررہ سے کئی گھنٹوں کے بعد سو ڈیڑھ سو لوگونکی موجودگی میں جلسے کا شروع ہونا اور اس قلیل تعداد میں بھی معمولی اور ناواقف لوگونکا بکثرت پایا جانا۔ پھر اُسی جلسے میں سکرٹری انجمن اسلام بمبئی کی طرف سے رزولیوشن کی مخالفت اور سخت مخالفت کا ہونا۔ پھر دوٹوں کا ٹھیک طور پر شمار نہ کیا جانا اور پریسیڈنٹ صاحب کا اس بے ضابطگی کی جانب بالکل متوجہ نہونا۔ اور آخر کار اس جلسے کا بحالت ابتری منتشر ہوجانا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جنکے لحاظ سے "البشیر" کے سے مخالف کانگرس اخبار نے بھی جلسۂ بمبئی کی نسبت اچھی راے نہیں ظاہر کی۔ لیکن ہمارے معزز ہمعصر وکیل نے اس جلسے کو نہایت وقیع سمجھ اور چند خوشامد پرست مسلمانان بمبئی کی اس قابل افسوس کارروائی پر اظہار مسرت و اطمینان کیا لارڈ کرزن نے باشندگان ایشیا کو بکقلم دروغگو قرار دیا اور ہمارے غیور ہمعصر نے اسکو حرف بحرف تسلیم کر لیا اور اسپر یہ نصیحت بھی کی کہ "ہر وفادار رعایا کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ حکام وقت کی باتونکو صلاحیت اور ادب سے مانے کانووکیشن میں بھی آپنے (لارڈ کرزن نے) طلبا کو مخاطب کرکے جو کچھ فرمایا ہوگا وہ محض بطور دلسوزی و نصیحت ہوگا اور اسلیے رعایا کا فرض ہے کہ اُسے پند سودمند سمجھکر اسپر عمل کرے۔ خصوصاً ہم مسلمانوں پر تو مذہباً حکام کا پاس ادب واجب ہے" معلوم نہیں کہ اس قسم کے غلامانہ خیالات کا اظہار کرنے والے لوگ اپنے ساتھ مذہب اسلام کو بھی کیوں خفیف اور بدنام کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک بعض ہندوستانیوں کا لارڈ کرزن کے بیجا الزام کو تسلیم کر لینا بقول امرت بازار پتر کا اُس واقعے سے بہت کچھ مشابہ ہے کہ جب انگلستان میں آزادی غلامان کا قانون پاس ہوا تو بعض مردہ دل غلامی پسند حبشیوں نے اس قانون کے خلاف عرضیاں دیں۔

اور ظاہر ہے کہ جس طرح اُن چند حبشیوں کا اختلاف قابل تعجب و افسوس تھا اسی طرح اخبار وکیل کی رائے قابل رحم و استہزا ہے۔

مسلمانان بمبئی کی اس خوشامدانہ کوشش کے متعلق اودھ پنچ و آزاد لکھنؤ نے نہایت عمدہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ محض خواہ مخواہ کے اظہار نفاق سے وہ نعمات ملجائینگے جو ہندوؤں نے اتفاق کے واسطے سینت رکھے ہیں تو انکو لازم ہے کہ پہلے نیچے کے حساب اور ضابطے میں ترمیم کی نیت باندھیں ورنہ بجز مایوسی اور انفعال کے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ بلکہ خسارہ کماتے ہیں۔"

| شیر مادر | ایڈیٹر صاحبہ اخبار تہذیب نسواں لاہور نے جنوری ۱۹۰۵ء سے تربیت اولاد کے متعلق اس نام کا ایک ماہوار نکالنا شروع کیا ہے۔ حجم ایک جزو ہوتا ہے جس میں بعبارت سلیس پانچ یا چھ کار آمد اور ضروری مضامین درج ہوتے ہیں قیمت سالانہ عہ مع محصول اور خریداران تہذیب نسواں سے صرف ۔۔ عہ

| اخبار دلچسپ | انہیں ایڈیٹر صاحبہ کی تصنیف سے پچیس با تصویر کہانیوں کی یہ کتاب بھی ہے۔ ان کہانیوں میں آسانی و سلاست زبان کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انکا مضمون ایسا رکھا گیا ہے جو لڑکوں کی سمجھ میں بآسانی آسکے۔ زبان میں البتہ پنجاب کی بعض عام غلطیاں رہی ہیں اور تصویریں بھی اچھی نہیں ہیں حجم چار جزو قیمت ۔۴ر

وفاتِ ملا محسن کاکوروی مرحوم

افسوس! اردو کے باکمال سخنداں اٹھتے جاتے ہیں۔ فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم

کے قطعات تاریخ وفات کا سلسلہ ابھی اخباروں میں جاری ہی تھا کہ محبی مولوی وصی علی صاحب علوی کا ایک کارڈ اناوے سے اس مضمون کا پہونچا کہ "میرے عم محترم مداح رسول اکرم مولانا محسن علیہ الرحمۃ نے ۱۹ صفر روز دوشنبہ ۱۰ ؎ بجے دن کو بعارضہ سہال کبدی انتقال فرمایا کوئی تاریخ ایسی چاہیے کہ لوح مزار پر کندہ کرائی جائے"

افسوس! ملاے مرحوم اس زمانے میں اپنی طرز خاص کے باکمال سخن سنج اور آپ اپنی نظیر تھے۔

نعت میں آپکی مقبول شاعری مضمون آفرینی۔ نازک خیالی۔ جدت۔ فصاحت۔ بلاغت کے ساتھ اس درجے پر تھی کہ آپکو حسان زمن کا معزز خطاب ہر طرح حاصل تھا۔

آپکے مختصر حالات مع نمونہ کمالات آیندہ لکھے جائینگے اسوقت سردست ایک قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ یہی تاریخ لوح مزار پر کندہ ہو۔ اگر دوسری تاریخ کسی کی اچھی ملجائے تو اولی ہے۔

قطعہ سال وفات

خدا کی رحمتیں تجھپر کہ رحلت کی خبر سنکر ۔۔۔ ہوے ہیں دل کو کیا کیا صدمۂ ورنج و محن محسن
دریغا! حسرتا! حصہ تھا تیرا نعت کا کتنا ۔۔۔ نہو گا تجھسا مداح رسول ذوالمنن۔ محسن
تصدق شاہد لطف سخن حسن مضامیں پر ۔۔۔ تری ہر نظم پر آمنت حسان زمن۔ محسن
زمانے سے جدا رفتار تیری طبع موزوں کی ۔۔۔ نرالا سب سے تیری فکر تازہ کا چلن۔ محسن
علوم ظاہر و باطن سے مملو ہر سخن تیرا ۔۔۔ حقیقت میں تھا تو علامۂ ہر علم و فن۔ محسن
رہا تو گلشن جنت میں طوبی آشیاں ہو کر ۔۔۔ ترے غم میں ہیں نالاں ساری مرغان چمن محسن

شفق منقوط میں لکھتا ہے تیرا مصرعۂ رحلت
چلے سوئے ارم تو خسرو ملک سخن محسن
۱۳ ۲ ۳

شفق ۔ عماد پوری

حصۂ نظم

کلامِ شہباز

غزل

مغنی ادہر دیکھہ - کیا ساز میں ہوں ۔۔۔ ذرا چھیڑ - کیا خوب آواز میں ہوں
کبھی حسنِ انجام ہوں میں ابد میں ۔۔۔ ازل میں کبھی حسنِ آغاز میں ہوں
سمجھہ میں حکیموں کے ابی کچھہ نہ آیا ۔۔۔ خدا جانے کیا بھید - کیا راز میں ہوں
سُناتے ہو کیا - عرش ہوگا نشیمن ۔۔۔ خبر کیا نہیں عرش پرواز میں ہوں
مطالب ہیں نازک اگر - ہوں نزاکت ۔۔۔ معانی ہیں گر نازنیں - ناز میں ہوں
قلم کی زباں سے ہیں نالے پیمبر ۔۔۔ اگر یہ پیمبر ہیں - اعجاز میں ہوں
نہ پرواز مضطر - نہ آواز مُنکر ۔۔۔ کبوتر نہ طاؤسِ طناز میں ہوں
جہاں ہے جہاں جو - میں آپ سلطان ۔۔۔ جہاں صید ہے مرغ - شہباز میں ہوں
قدم سر پہ رکھدو تو ہو سرفرازی ۔۔۔ خوشا میں اگر یوں سرافراز میں ہوں

قصیدہ در مدح سرکار عالیہ بہوپال

آکے رخصت ہوئی برسات - گیا آبِ رواں ۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہے ہوا - صاف ہے جاڑوں کا سماں

آنچ ہونے لگی دلمیں کوئی وہمی دہمی
بات کرنے میں نکلتا ہے جبھی منہ سے دہواں

بید کا نپا تو نہیں کوئی تعجب کا محل
صبح ہنستی ہے کہ خورشید تلک ہے لرزاں

پنبۂ ابر کا شاید ہے دہنکنا مقصود
ہاتھ میں قوس قزح کے نہیں بوجہ کماں

جزرو مد اسکو سمجھنا غلطی ہے بہاری
یہ تو سردی سے سمندر بھی ہے غلطاں پیچاں

اوڑہنے والا یہ ہے جہاگ کی روئی کا لحاف
برف ہو جائیگا جم کر یہ رہا گر عریاں

کوہ نے بھی کہ توکل میں تہا عالی تر بسر
نفع پر کرکے نظر۔ کہول دی روئی کی دکاں

پو پہٹی اور اودہر ان کی تجارت چمکی
نہیں چوٹی۔ نہیں چوٹی۔ کوئی کوٹھی ہے کلاں

اثر بردسے نوورد پہ شبنم ہے جمی
جوہری کو ہے جبھی لعل پہ ہیرے کا گماں

گل شاداب پہ ہیں یہ قطرات شبنم
دُرِ خوش آب کی یا ٹوٹ پڑی ہیں لڑیاں

گوشِ گل کان جواہر ہوے، تو بھی بلبل
گل فشانیِ بیاں سے ہو جواہر افشاں

کیمیا دیکھو کہ کیا ڈہونڈ سب ہے یہ دہوپ
دیکھو اکسیر کہ کیا شب کو مفضض ہے دہواں

دن ہے گہٹتی ہوئی طاقت کہ دہانِ دلبر
رات بڑہتی ہوئی دولت سے کہ زلفِ جاناں

دن جسے کہتے ہیں ہر رات کو جگنو کی چمک
یا پتنگا سا اُڑا سے لئے جاتا ہے وخاں

دن ہے یا ریل کا چہوٹا سا بریکی انجن
رات ہے یا کہ ہے پہیلا ہوا کوئلے کا دہواں

دن ہے یا چار گہڑی کی شرر افشانی ہے
رات یا سلسلۂ کوہ ہے اک شعلہ فشاں

شب ہے۔ یا چین میں ہے مشک کی نکہت پہیلی
یا کہ ہے سلطنتِ حضرتِ سلطانِ جہاں

وہ کہ بنکا ہے دلوں تک بھی سکہ بنیا
نقدِ رائج کی جگہ صرف یہاں نقد رواں

دلِ خوشنود سے جسوقت نکلتی ہے دعا
پہیلتا عرش تلک ہے برکت کا داماں

سلطنت پہیلتی ہے۔ پہر برکت آتی ہے
آکے پہیلاتی ہے، ہر چار طرف امن و اماں

کشت و مزرع میں بسا دیتی ہے شہر و قصبہ
دشت و صحرا کو بنا دیتی ہے باغ و بستاں

مدرسے کہولتی ہے۔ دیتی ہے علموں کو رواج
کہیں ہے عقل فرنگ اور کہیں فکرِ یوناں

گہوڑے ہانپنے کی صفت گو مجھے آتی تو نہیں
تازیانہ ہو جو موقع کا تو چلتی ہے زباں

سائکب اچھا ہے تو مرکوب بھی اچھا ہوگا
اسی موقع پہ ہیں کہتے کہ عیاں راچہ بیاں

چرخ کو روند کے رکھدے وہ نہیں پائے خیال
گاؤ ماہی کو کچل ڈالے نہیں پائے گماں

گھوڑا گھوڑا ہے یہاں تھان پہ ہاتھی ہاتھی
نہ پری ہے نہ چھلاوا نہ ہے جن و انساں

سبز گھوڑا تو وہ ہے کان کنوتی سے درست
ترکش تیر تراپوں سے۔ گردن سے کماں

یال کے بالِ ہمایوں سے ہمارے دولت
دُم کی افراطِ لطافت سے وہ طاؤس جناں

ہنہنائے تو وہ رعد اور جو چمکے تو وہ برق
باد وہ وقتِ نفس، وقتِ عرق وہ باراں

ہے جو ہاتھی تو ہے اُمڈی ہوئی ساون کی گھٹا
یا کہ دامانِ افق میں ہے پڑا کوہِ گراں

بے ستوں ہے یہ عجب جسکو ملے چار ستوں
نہیں فرہاد۔ مگر کوہ کنی ہے آساں

ابر ہے سونڈ بڑا ہے نہ فلک تک کیونکر
کوہ ہے، پانو یہ پھیلائے نہ کیوں پائے جہاں

کوہ چلتا نہیں۔ طرفہ ہے کہ یہ چلتا ہے
کوئی بھاری غلطی ہے کہ نہیں کوہ رواں

ایسا جاتا ہے دبے پاؤں کہ چیونٹی نہ دبے
جیسے سایہ کسی چڑیا کا بوقتِ طیراں

ہے یہ جھول ایسا زرپیٹ کا پانی نہ ملے
بچہ بیٹھے تو یہ سمجھے ہے لئے گود میں ماں

علم و اخلاق کی تعریف نہیں ہو سکتی
ہے عجب بات۔ خموشی ہے یہاں حسنِ بیاں

علم حیراں ہے، عجب حسنِ زباں دانی ہے
بے سبب گنگ نہیں باغ میں سوسن کی زباں

یہی اخلاق ہوں گر سارے مسلمانوں کے
لال کافر ہو تو اسلام پہ لائے ایماں

ذکرِ اخلاق سے اوراق ہیں پھولوں کی طرح
مشک بو۔ تازہ و شاداب شگفتہ خنداں

ایسے اخلاق پہ بس دل سے نکلتی ہے دعا
چاہئے زور سے آمین کہے حفظ و اماں

ہم ثناخواں رہیں جب تک یہ زباں ہے منہ میں
آپ سلطاں رہیں سلطان رہیں جبتک ہے جہاں

نتائجِ فکر جناب رضا علی صاحب وحشتؔ متوطن کلکتہ

مجھکو یہ جوشِ بہار اِکدن خزاں ہو جائیگا
موجِ گل کا جلوہ برقِ آشیاں ہو جائیگا

سوزِ پنہانی مرا تجھپر عیاں ہو جائیگا	دردِ دل حد سے سوا ہو کر زباں ہو جائیگا
رحم آجائیگا کچھ مجھکو بھی اپنے حال پر	جس گھڑی اغیار پر تو مہرباں ہو جائیگا
ہے خرابی خانماں کی فرض ورنہ اے جنوں	مانع ذوقِ خرابی خانماں ہو جائیگا
ہاں حسرتِ ستم کی خلش تھی کوئی تو تھی	تیرے ستم کشیدہ کے سینے میں دم نہ تھا
چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرزِ خاص پر	یعنی فریب خوردۂ دیر و حرم نہ تھا
تیرے ہی ذوقِ جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم	یاں ورنہ امتیازِ وجود و عدم نہ تھا
کیا کیا مجھے تغافلِ ساقی کا تھا گلہ	دیکھا تو میں ہی درخورِ لطف و کرم نہ تھا
احسان ہے طبیعتِ دقت پسند کا	یعنی کہ رہنما کوئی نقشِ قدم نہ تھا
اُس دشتِ ہولناک سے مجھکو رہا ہے کام	جس راہ میں قدم بھی مرا ہمقدم نہ تھا
گنہ میرا اگر میری خاک دامنگیر ہوتی ہے	خطا کسکی ہے چلتے چلتے دامن کا اُٹھا لینا
سنگِ طفلاں فدائے سر نہوا	آج اُس کوچے میں گزر نہ ہوا
ہم بھی تھے جوہرِ گرانمایہ	پر کوئی صاحبِ نظر نہوا
بیکسی پردہ دارِ رحمت ہوئی	خیر گزری کہ اپنا گھر نہوا
گھر کے آنے ہی سے ہے ابر کا باراں ہونا	جمع ہونا ہی ہے خطرہ کا پریشاں ہونا
دیدۂ یار سے جب تک کہ نہ ٹپکے آنسو	ہمکو تسلیم نہیں چشم کا گریاں ہونا
کیا نظر آئے اُسے جسکو نظر آیا ہو	تیرے رُخ پر تری زلفوں کا پریشاں ہونا
اللہ اللہ یہ کافر نظری کا عالم	زیب دیتا ہے تجھے دشمنِ ایماں ہونا
آہ اُس داغ کو کہئے کہ جو لب تک نہ گئی	داغ اُس داغ کو کہئے کہ نمایاں نہوا

سبب عار ہو وہ چشم گرگریاں نہوئی | باعث ننگ ہو وہ زخم کہ خنداں نہوا

علم آداب محبت میں بلا تھا وحشت
کشتۂ درد ہوا درد سے نالاں نہوا

سن چکا ہوں ماجرے حسن و عشق | بیشتر کار جہاں برہم رہا
اے تیری آشنا بیگانگی | مدتوں میں بھی ترا ہمدم رہا
عشق کی خانہ خرابی کچھ نہ پوچھ | حسن کا مجموعہ بھی برہم رہا

وائے وضع وحشت و وحشی مزاج
جس سے اُنس آشنا کو رم رہا

مبارک ہو مجھے موقع فریب تازہ کھانیکا | کیا ہے پھر مرے پیماں شکن نے وعدہ آنیکا

غزل جناب شفق عماد پوری

نہیں میرا کوئی تیرے سوا دوست | خبر لے او وفا دشمن جفا دوست
قیامت ہے غم ناآشنائی | فقط ہے اک دل غم آشنا دوست
مزہ ہے دشمنی کا دوستی میں | مرا دشمن ہے دشمن سے سوا دوست
ہے شیوہ دوستی کرنا ہمارا | اب اُس میں کوئی ہو دشمن ہو یا دوست

شفق رکھنا دل غم دوست کو شاد
یہی ہے اک مصیبت آشنا دوست

غزل از جناب رضی الدین حسن صاحب کیفی حیدرآبادی

دہن سے پھول برساتی ہے آہ آتشیں اپنی (۱) | فلک بھر لیگا دامن گود بھر لیگی زمیں اپنی
تصور سے غش آتا ہے قیامت تو قیامت ہے | وہاں کیا حشر ہو گا جب یہ حالت ہے یہیں اپنی

(۲) الٰہی جلد آنکھیں بند ہو جائیں تو اچھا ہے
کسی کے دل میں کھٹکے گی نگاہِ واپسیں اپنی

(۳) تری خاطر سے غیروں کی بھی خاطرداریاں کرتے
طبیعت گر نہ ہوتی اسقدر رشک آفریں اپنی

برے مقتل میں آئے ہو نہ سینہ سپر ہو جاؤ
سنبھالو اپنے دامن کو چڑھا لو آستیں اپنی

— جنوں میں ننگے ہم اب تو خالی ہاتھ بیٹھے ہیں
ہوئی پیوند داماں بیاباں آستیں اپنی

سفارش کیلئے کیفی کہیں کیا شرم آتی ہے
خطائیں بخشوائینگے کسی سے کچھ نہیں اپنی

نوٹ
نشان زدہ اشعار کی خوبی تسلیم طلب ہے۔ اڈیٹر

ولہ

گنجائش کلام کہاں خیر و شر میں ہے
جب تم بشر میں ہو تو سبھی کچھ بشر میں ہے

بندہ بشر ہے عفو خطا کا امیدوار
سب ہے بس معاملات قضا و قدر میں ہے

میں جانتا ہوں اب وہ مری عزت آبرو
میری نظر میں ہے نہ تمہاری نظر میں ہے

غمخوار بنگئے ہیں چھڑکتے تھے جو نمک
کچھ ایسی چاشنی مرے زخم جگر میں ہے

کی ہمنے معصیت بھی سلیقے سے دیکھ لو
توبہ کی بھی شکن کوئی دامانِ تر میں ہے

دیوانہ پن مرا ترے جلوے سے کم نہیں
یوں بھی تو ایک بھیڑ تری رہگذر میں ہے

کیفی ہے سو بروں کا برا پھر بھی سچ کہو
ایسا بھی کوئی شخص تمہاری نظر میں ہے

غزل جناب قاضی شمس الضحیٰ صاحب اخگر بی اے قاضی پوری

رات اک پیر طریقت رونقِ میخانہ تھا
وجد میں تھے رند میکش دور میں پیمانہ تھا

کم نہ تھی دنیا جہنم سے ہمارے واسطے — دل نہ تھا پہلو میں اپنے ایک آتش خانہ تھا
کیوں لئے جاتی ہے وحشت دشتِ غربت کی طرف — میں وطن میں گو کہ تھا پر صورتِ بیگانہ تھا
مجمعِ احباب، جلسہ بے تکلف، یار مست — اور میں ایسے میں جاتا کیا کوئی دیوانہ تھا
لب سے لگاتے منہ سے کیوں اُسنے جھجک کر کیا — جنبشِ گستاخ میں شاید لبِ پیمانہ تھا
وہ کہاں اگلی سی برساتیں کہاں لطفِ شراب — ٹل گیا یہ سر سے ہاں اک فرض جو سالانہ تھا
مرنے والو کچھ کہو تو لذتِ خوابِ عدم — سُنگے جو سوئے ہو تم وہ کونسا افسانہ تھا
اُٹھتے ہی محفل سے میرے بے تکلف تم نہو — ورنہ سب کے سب یہ سمجھینگے یہی بیگانہ تھا

کھل گیا اخگر معما زندگی کا بعد مرگ
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کلامِ جمیلہ

بی بی جمیلہ شمس العلما مولوی کبیر الدین احمد خاں بہادر کی صاحبزادی ہیں انہیں کی تعلیم سے یہ دختر نیک اختر آنکی بہرہ مند ہوئیں - یہ زوجہ عالیجناب خان بہادر مولوی خدا بخش سی آئی ای کی ہیں انکو عرصے سے شوق نظم و نثر ہے - انہوں نے اکثر غزلیں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی جنت مکان کے پاس بھیجیں اور جناب مرحوم نے نہایت خوشی سے توجہ فرما کر اصلاح فرمائی اسیوجہ سے اُنہوں نے قطعہ تعزیت میں مرحوم حضرت داغ کے اپنے شاگرد ہونیکا اعلان کیا ہے - وہ قطعہ ہی ذیل میں درج ہے -

نیازمند (عطیم الدین احمد)

قطعہ

بوستانِ شاعری میں حیف ہے آئی خزاں — کیا چمن سرسبز تھا افسوس ویراں ہو گیا

بلبلِ ہندوستاں کی موت سے وہ غم ہوا
گریۂ شبنم پڑا گل چاک داماں ہوگیا

آنکھ میں نرگس کی حسرت اور دلِ لالہ میں داغ
حالِ سنبل صورتِ زلفِ پریشاں ہوگیا

سرد کو سکتہ ہوا مرغانِ گلشن ہیں خموش
باغباں بھی صورتِ آئینہ حیراں ہوگیا

محفلِ شعر و سخن بھی آج سے ماتم کدہ
مرثیہ نکا رنگ غزلوں میں نمایاں ہوگیا

مثلِ پروانہ جلے ہیں غم سے شاگردوں کے دل
شعلۂ غم سے ہر اک سر و چراغاں ہوگیا

یہ فنِ شعر و سخن جاری جو اک مدت سے تھا
ہستیِ موہوم کا افسوس مہماں ہوگیا

یادگارِ اہلِ دہلی نامیوں کا ہمنشیں
داغ جو باقی تھا وہ مرقد میں پنہاں ہوگیا

اے جمیلہ خوں رُلایا ہے غمِ استاد نے
داغ دل میں صورتِ اختر نمایاں ہوگیا

غزل

سہو نکے ظلم کر دا ے تو خدا بھی ہے
تمہارے جور و جفا کی کچھ انتہا بھی ہے

اگر میں جاؤنگا پوچھونگا یہ مسیحا سے
کہ میرے دردِ جگر کی کوئی دوا بھی ہے

کبھی رہا نہ ہے لب تک کبھی وہاں پہونچا
یہ نالہ میرا رسا اور نارسا بھی ہے

مسافرانِ عدم آئے تو دو گھڑی کے لیے
سرائے دہر میں آکر کوئی رہا بھی ہے

تماشہ دیکھیئے وہ بعد قتل بول گیا
کہ میرے در پہ کوئی کشتۂ ادا بھی ہے

سفینہ بحرِ محبت سے پار کر دیگا ناؤ
خدا سمجھتے ہو جسکو وہ ناخدا بھی ہے

اُٹھاؤ شوق سے منزل میں تم قدم اپنے
کہ راہ زن جو ہے اسمیں وہ رہنما بھی ہے

نظر سے شیخ کی چھپکر چلا ہوں پینے کو
جمیلہ ابر بھی بارش ہے اور ہوا بھی ہے

قطعہ تاریخ حضرت داغ دہلوی مرحوم از محمد عبدالرحیم خاں نادر دہلوی

وہ فصیح الملک داغِ دہلوی
لے گیا اردو کو اپنے ساتھ ہی
جب ہوئی تاریخ کی نادر کو فکر
جسکے ہم مارے ہوئے ہیں وہ کہاں

اُنس تھا جنکو دلِ جاد سے
چلدیا اس عالمِ ایجاد سے
یہ صدا آئی دلِ ناشاد سے
خالی دنیا ہے جہاں استاد سے
۱۳۲۲

سے کز بوسے او موسیٰ شد از ہوش	نہ آں مے کز دل ساغر زند جوش
بنوشم بادہ گر ہمدم تو باشی	چہ بہتر زانکہ ساقی ہم تو باشی

اسطرح موسیٰ والی شراب پی جاتے اور خدا کو ہمدم اور ساقی بنانے کی خواہش ظاہر کر کے مُلا صاحب کچھ اور پاؤں پھیلاتے ہیں۔ ؎

جگر کن چاک چاک از خنجر ناز	نمک را مرہم ریش جگر ساز
بہ تیغ عشق کن رنگیں کفن را	زیارت کن شہید خویشتن را
شہید تو نخواہد شمع از کس	تو شمع تربت من باز زاں پس
مرا ہم شمع از نور تو باید	تجلی ختم پردہ سے آں شاید

یہانتک تو شمع کا نام لیکر تجلی طلب کرتے تھے اور حضرت موسےٰ سے گیے حصہ دار بنتے تھے۔ آگے خود خدا بننے کا ارادہ کرتے ہیں۔ آپکا ارشاد ملاحظہ ہو۔ ؎

انا الحق گفتنم بر تو چہ بار ست
دو منصور یم گویا قحط دار ست

خیر اتنی ہی ہے کہ آپ خدا سے صرف من خدایم کہنے کی صلاح ہی کرتے ہیں کیونکہ دو منصور ہونے میں دوسری سولی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں سے اور لوگوں نے بھی من خدایم کہنے کی کوشش کی ہے۔ منصور کو تو اسکے لئے دار پر چڑھنا پڑا ہی تھا پر شمس تبریز نے بھی ایسا کہنے میں کچھ کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اسبات کو خوب صاف طور سے شیخ فریدالدین عطار پند نامے میں کہتے ہیں۔

من خدایم من خدایم من خدا
فارغم از کبر و کینہ وز ہوا

ایسا کہنے کی وجہ سے حضرت عطار فرماتے ہیں۔

من بغیر تو نہ بینم در جہاں ❖ قادر و پروردگار جاوداں
چوں بجز تو نیست در ہر دو جہاں ❖ لاجرم غیرے نباشد درمیاں

من بوصلت عارفِ مطلق شدم ٭ عارفی رفتم تمامی حق شدم

کسی نے آپکے ایسا کہنے پر اعتراض کیا ہے تو آپ نے جز بز کر کر جواب بھی دیا ہے وہ جواب بہت صاف نہونے پر بھی کچھ خاصا ہے۔ اور مسلمانونکا کلام بھی اسی ڈھنگ کا ہے۔ مگر وہ ہمہ اوست تک رہ گئے ہیں من خدا ایم تک نہیں بڑھے ہے۔ مغربی کا کلام ہے۔ ؎

زدریا موجِ گوناگوں برآمد ٭ زبیچونی برنگ چوں برآمد
گہے درکسوتِ لیلےٰ فرو شد ٭ گہے درصورتِ مجنوں برآمد

رومی کا ارشاد ہے۔ ؎

خود کوزہ وخود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود رندسبوکش
خود برسرآں کوزہ خریدار برآمد
بشکست وروان شد
نے نے کہ ہمیں بود کہ میگفت انا الحق
درصورت منصور
منصور نہ آں بود کہ بردار برآمد
ناداں بہ گماں شد

ہمارے مولانا مسیح بھی بڑھتے بڑھتے من خدا ایم تک پہونچے تھے مگر فوراً ہی پیچھے ہٹے اور کہنے لگے ؎

خلافت دادی آدم رابعالم ٭ بمن دہ حصۂ میراثِ آدم
بہ بخشا ہر دلم کز غم حزین ست ٭ خداوندا خداوندی ہمین ست

آگے بندہ ہو جاتے ہیں اور بندگی قبول کر لیتے ہیں مگر بندہ ہو کر خدا سے جس ڈھنگ سے مانگتے ہیں اُسکی اکڑ اکڑ دیکھئے۔ گویا کچھ بھی کہہ ڈالنا آپکے نزدیک گستاخی نہیں ہے۔ ؎

گناہم گرچہ عین بے رضائیست	گذشت از وسے چہ نقصان الٰہی حد نیست
بہ بخشایش مکن ممنون رحمت	ز دریا آب می بخشی چہ منت
چراغ لطفت نپرواز د بکارم	تہی دستی تر امعذور دارم
بنومیدی چہ مرانی از درخویش	کرمی شرم دار از چشم درویش
عطایت از عطایم گشت مشہور	چراغ از ظلمت شام است پُرنور

اس سے آگے خوب عجز شروع کیا ہے۔ مگر اُس میں بھی اپنا نرالا طرز بہت خوبصورتی سے دکھایا ہے۔ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ؎

عتاب خود مکن ضائع بہ یکبار	کہ مشتے خاک را سازی گرفتار
ولے بندہ بہ یک حرفست خورسند	کہ نومیدی بود کفر از خداوند
سیہ نامہ کہ بر عصیان گواہست	جمال عفو را خال سیاہ ست

بہت سی کتابوں میں حمد دیکھی ہے۔ مگر ملا مسیح کا ڈہنگ سب سے نرالا ہے۔ اسکے بیان میں کچھ نیا ہی لطف ہے۔ مناجات میں بھی وہ نرالا پن موجود ہے۔ ؎

کرم خواہی درم دہ بہر محتاج	بہ منعم گر دہی نامش نہد باج
چو من بے مایہ را دہ گنج د گوہر	کہ حاجت نیست بخشیدن بہ محشر
بطاعت گر تو خواہم چند حاجت	مرا انعام دہ بے فرد طاعت
ز طاعت رشوتے خواہی بکارم	بکن گویا مکن رشوت ندارم

ملا مسیح صاحب نے اپنی راماین میں ایک کی جگہ دو مناجاتوں سے کام لیا ہے دوسری میں ہمہ اوست سے آغاز کیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

بنام ساقی دور پیاپے	کہ ہم جام ست و ہم ہستی و ہم مے

حریف خلوت ہر دُرد آشام — سرانجام خمار بے سرانجام

حمد کی طرح نعت بھی خوب نئے ڈھنگ سے کہی ہے وہ بھی دو ہیں۔ اور معراج کا بیان تیسرا۔ کہتے ہیں۔

دل از عشق محمد ریش دارم — رقابت با خدا اے خویش دارم
رسول اندر حقیقت جز خدا نیست — بدیں پیغام جبریل آشنا نیست
چو خورشید نختیں شد گل اندود — محمد نام کردش نجت محمود
محمد نیست جز آئینہ بیش — تو در وے می نمائی جلوۂ خویش
بداں جلوہ بجاں خاطر نہادی — بداد حسن خود انصاف دادی
زعشق خود شدی شرمندۂ خویش — کہ خود را نام کردی بندۂ خویش

اس طرح خدا اور رسول کو ایک کہتے کہتے فرماتے ہیں۔

اگر کفر ست حرفم گو مکن گوش — ازیں گفتن نخواہم ماند خاموش
بنازم کز کمال مہربانی — پیامِ خویشتن خود میرسانی

معراج کے بیان میں کہتے ہیں۔

چناں جذب محبت یک جہت ساخت — کہ خود را عاشق از معشوق نشناخت

ہندوؤں میں ویدانتی سنیاسی اپنے کو برہم یا خدا سمجھکر عبادت کرتے ہیں۔ مگر اسبات سے ہندو دہرم شاستر انکو بُرا نہیں کہتا۔ بلکہ ویدانت شاستر ہی اسکے لئے الگ ہے جو سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ ویدانتی کی ہندوؤں میں بڑی عزت

ہوتی ہے - ہندوؤں میں خدا ہم کسنا عبادت کا سب سے اعلیٰ اور اخیر درجہ ہے ایسی حالت میں انسان سنیاسی کہلاتا ہے - دنیا اور اُسکے کل قوانین سے الگ ہوکر کل مخلوق خدا کا خیرخواہ بنجاتا ہے -

ملا مسیح نے خدا اور پیغمبر کی تعریف میں اتنی بلند پروازی کی ہے کہ وہ اپنی بات کا سلسلہ تک ٹھیک قایم نہ رکھہ سکے - مگر اپنے پیر طریقت محمد باقر اور بادشاہ وقت نورالدین جہانگیر کی تعریف کرتے وقت ذرا اعتدال سے کام لیا ہے - اس سے وہ تعریف کے ڈہنگ کی تعریف ہوئی ہے - پیر صاحب کے بارے میں کہتے ہیں

نمود از پیمبر و دو عالم ۔۔۔ محمد باقر آں روح مجسم
زنام آں سرافرازی بقارا ۔۔۔ بذاتش نازدین مصطفےٰ را
مناجاتش بہ یزداں ہمکلامی ۔۔۔ زبانش نوبہار نیکنامی
شہ ملک قناعت وارث بخت ۔۔۔ کلاہش افسر و سجادہ اش تخت
چو بر آئینۂ زانو نہد سر ۔۔۔ ہمہ بیند کز آئینہ سکندر

اگر اس خوبصورتی سے وہ خدا کی تعریف کرنے لگتے تو نہ جانے کیسی کیسی عمدہ باتیں کہہ ڈالتے - جہانگیر کی تعریف میں کچھہ باتیں اُسکے عدل کی نسبت ہیں اور کچھہ بہادری کی جیسے کہ اور شاعروں کی کتابوں میں بہی ملتی ہے - کچھہ خاص ہیں جن میں اپنا طرز دکہایا ہے - کہتے ہیں - ؎

جہاں نو زندہ گشت از حسن تدبیر ۔۔۔ بعدل شاہ نورالدین جہانگیر
بخدمت بستہ پیشش دست امید ۔۔۔ صد افسر بہمن و صد تخت جمشید
بجاے دولت جمشید بخشد ۔۔۔ بذرہ منصب خورشید بخشد

دوسرے شعر میں جمشید کا نام لیکر تیسرے میں جام دکہاکر جہانگیر کی اعلیٰ درجے کی سرافرازی

کا اظہار خوب کیا ہے - یا شاید خود ہو گیا ہے -
مضمون آفرینی اور خیالات کی جدت کو دیکھئے - ؎

نہ در عہدش کسے جز عشق غم تا — بدورش کس نہ زندانی بجز راز
چناں آراست گیتی را با حساں — کہ نتواند کسے دلخستہ جز کاں
کنوں عالم چناں خوش میکند زیست — کہ کس جز طفل در زاری نہ بگریست

اپنا طرز دکھاتے ہیں - ؎

نہ گویم ذات او پروردگار ست — خلاف او خلاف کردگار ست
ترا ہمتائی حق بودی یارا — اگر مانندی بودی خدا را
خدا چوں خود نیارد آفریدن — تو مثل خود کنی در دم کشیدن

تیسرے شعر میں خوب بے اعتدالی ہے گر بڑی ہی خوبصورت ہے - اعتدال ہی بھی اعلیٰ درجے کی ہے -
ہندوستان کی تعریف کرتے وقت دو چار باتیں بہت ہی پر اثر کہی ہیں مردہ خاوند کے ساتھ ہندوستان کی عورتیں زندہ جل جاتی تھیں اُس کی نسبت کہتے ہیں -

درین کشور عروس نارسیدہ — ز جفت خود ہمی نامی شنیدہ
بہ گوشش لب نہ جنباند سخن را — نسازد تا نسوزد خویشتن را
زن ست و میکند کار جواں مرد — کزو ہنگامۂ پروانہ شد سرد
بمردن عاشقاں بے اختیار اند — مگر معشوق اینجا جاں سپارند

پپیہے کی تعریف سنسکرت اور ہندی کے شاعروں نے بہت کی ہے۔ آپ بھی
اُسکے بارے میں عجمی طرز وخیالات میں کہتے ہیں مگر کس عمدگی سے کہتے ہیں۔ ے

بآب عشق خاک ہند تر شد پپیہا جاک بعشق آب باراں	چہ جائے آدمی مرغاں اثر شد ننوشد گرچہ باشد آب حیواں

ہندوستان کے شاعر پپیہے کے لئے بارش کا پانی نہیں سواتی کا پانی یعنی وہ بارش جو سواتی نکشتر میں ہو لاتے ہیں۔ اُنکے خیال میں پپیا بارش کا پانی بھی نہیں پیتا۔ صرف سواتی میں جو بارش ہوتی ہے اُسی کا پیتا ہے۔ وہ بھی جو اُسکے منہ میں خود جا گرے۔ ملا مسیح کو شاید یہ بات اتنی دور تک معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ خیر اُنہوں نے پپیہے کی بات جانی یہ بھی بہت ہے۔

ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے پپیہے کی بات کہکر راماین لکھنے کی وجہ ظاہر کرتے ہیں۔ ے

وفا قربان این آب وہوا شد مرا باید زہندوستان سخن گفت ازاں گفتم حدیث رام وسیتا	کہ مرغ این چمن ماہی وفا شد کہ با عشق ست خاک این زمین جفت نہ این افسانہ تاریخ ست انجا

اُس زمانے میں کوئی ہندو رانہ قصہ لکھنا مسلمانوں کے لئے آفت سے کم نہ تھا ہندوؤں کی کوئی بات اپنے قلم سے لکھنے میں مسلمان مصنف کو کافر بننے کا خوف اتنا تنگ کرتا تھا کہ وہ ایکدم گھبرا جاتا تھا۔ ملا مسیح نے رامائن تو لکھی ہے مگر غریب کو بہت کچھ ثبوت دینا پڑا کہ میں پکا دیندار مسلمان ہوں کافر نہیں ہوگیا ہوں۔ شاید انکو لوگوں نے رامائن لکھنے پر آمادہ دیکھکر کافر کہا ہوگا۔ اسی سے آپ نے حاسدوں کی

ندمت میں ایک مضمون لکھکر راماین میں شامل کیا ہے۔ اُس میں اسطرح عذر گناہ کرتے ہیں ؎

کہ بسے سوئیں خواندم از افسانہ را	حرف سازم کنوں از تیر الزام
نہ پیر مجتہد اقوال کفار	بخواندتا نویسد رو انزار
گراں ناید چنیں افسانہ بر شرع	کہ نقل کفر نبود کفر در شرع
خلیل اللہ خواہد نو اسلام	نبود آں گفتگو جز بہر الزام
نہ در بتخانہ رفت از بہر تعظیم	برائے بت شکستن شد براہیم
چو من سجادہ بافم پاک زنارم	گر از زنار باشد ریسمانم

اس طرح کئی مثالیں اپنے پکے دیندار ہونیکی دیجانے اور کافرونکو کڑی میٹھی سنانے پر بھی ملا صاحب کو یہی معلوم ہوا کہ الزام کی صفائی بخوبی نہیں ہوئی۔ اس سے اور بھی دو چار سخت باتیں سنا کر اپنی بریت چاہتے ہیں۔ ؎

نہ آتش بہر ہوم افروختستم	کہ بید و برہمن را سوختستم
و بید انصاف اے نازیرکے چند	کہ چوں مومن نمودم مشرکے چند

یعنی "میں نے یہ آگ ہوم کے لئے نہیں جلائی بلکہ اس میں بید اور برہمن کو جلا دیا۔ اسے چند نالایقو! انصاف تو کرو کہ میں نے کیسے چند مشرکونکو مومن بنا ڈالا ہے" اسطرح بید اور برہمن کو جلا کر اور کافرونکو دیندار بنا کر پیر میاں اقبال کا سا شوالہ تیار کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

برہمن ہم تو منصف باش مارا	مکن کافر دلی یکدم خدارا
بگو بارے چہ داری عقل و فرہنگ	بت سیمیں نکوتر یا بت سنگ

جهادی اپرستیدن نیکوست | بُت سیمیں پرستیدن چہ نیکوست
بتو کافر نگویم ماجراها | کہ نے بت را شناسی نے خدا را
بود عاشق برہمن بر رخ ماہ | دلش آتشکدہ ناقوس زنّار
کند دنیا جان مشکین طنابش | رخش ہم بُت بود ہم آفتابش
نہیں بُت گر بیایم اے برہمن | اگر کافر نگردم کافرم من

ملّا صاحب کی اس ساری گوہر افشانی کا مطلب یہ ہے کہ کافرونکا قصہ لکھنے سے وہ کافر نہیں ہوئے۔ آپکے عذر گناہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ جہانگیر کے وقت تک بھی ہندوؤں کی باتوں کی طرف متوجہ ہونے سے مسلمان لوگ کافر سمجھے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے لٹریچر سے سدا محرومی حاصل رہی اور اسکا سلسلہ آجتک ویسا ہی چلا آتا ہے۔

میاں اقبال نیا شوالہ بنانے چلے مگر بیچارے اتنا بھی نہ جانتے تھے کہ پرانے شیوالے میں کیا ہوتا ہے۔ اس سے عجب بے ڈھنگی باتیں کہہ گئے ہیں۔ واقفیت کے بغیر کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔

جو کچھ ہو ملا مسیح کی راماین میں بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں اور بالکل ایرانی ڈھنگ کی کتاب ہوتے پر بھی اس میں کچھ راماین پن آگیا ہے۔ یہ باتیں دوسرے مضمون میں دکھانے کی کوشش کی جاویگی۔ اصل سنسکرت راماین کے مقابلے میں مسیح کی راماین بہت ہی چھوٹی ہے۔ اسکا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ تاہم ترتیب ٹھیک رکھی ہے اس سے بعض جگہ اصل سے اسکا کچھ کچھ میل ہے۔ ایسے موقعوں میں سے سنسکرت ہندی اور اردو وغیرہ کی راماینوں سے کچھ کچھ باتیں چنکر ملا مسیح کی تحریر کے ساتھ مقابلہ کرکے دکھایا جائیگا۔ اگلے مضمون میں بالمیکی راماین سے برسات کا بیان لیا جاویگا اور دکھایا جاویگا کہ سنسکرت کا شاعر برسات کا سماں کیسے باندھتا ہے۔ ہندی کا شاعر اس کی کسطرح تصویر کھینچتا ہے اور ملا مسیح کیا فرماتے ہیں۔ اس سے

یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ مسلمانوں پر سنسکرت لٹریچر کا اثر کہاں تک پڑا۔ یا وہ اس سے کیسے بے اثر رہے۔

بالمکند گپت

شیو شنبو کا چٹھا

ایک امید موہوم

ڈانگی کے عرق میں زعفرانی بسنتی بوٹی چھانکر شیو شنبو شرما کھٹیا پر پڑے موجیں سنبھال رہے تھے۔ خیالی گھوڑے کی باگیں ڈھیلی کر دی تھیں وہ آزادی سے زقندیں بھر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کو بھی پوری آزادی حاصل تھی۔ اسلئے وہ چارپائی کے طول عرض کی حد سے پار نکل گئے تھے۔ جسم چارپائی پر تھا اور خیال دوسرے عالم میں۔

ناگاہ ایک سُریلی گانے کی آواز نے چونکا دیا۔ کن رسیا شیو شنبو چارپائی پر اُٹھ بیٹھے۔ کان لگا کر سننے لگے کانوں میں یہ سُریلا گیت امرت ٹپکانے لگا۔

چلو چلو آج کھیلیں ہولی کنہیا گھر

کمرے سے اُٹھکر برآمدے میں آ رہے۔ معلوم ہوا کہ پڑوس میں کسی امیر کے یہاں گانے بجانے کی محفل ہے۔ کوئی سریلی آواز سے وہ ہولی گا رہا ہے۔ ساتھ ہی دیکھا کہ بادل گھرے ہوئے ہیں بجلی چمک رہی ہے اور رم جھم جھڑی لگ رہی ہے بسنت میں ساون دیکھکر عقل چکرائی۔ سوچنے لگے کہ گانے والے کو ملار گانا چاہئے تھا نہ کہ ہولی۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ پھاگن ختم ہوتا ہے بسنت کا نکھار ہے۔ وہ ہولی کیوں نہ گائے؟ گانیوالے

کی تو اس میں کچھ غلطی نہیں ہے فطرت کی غلطی ہے۔ جسنے بسنت کو ساون بنادیا۔ کہاں تو چاندنی کسقدر ہوتی پیاری ہے اچھلتی ہوتی کوئل کوکتی کہاں۔ بھادوں کی سی اندھیاری ہے۔ مینھ کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اوہ! عجب موسمی الٹ پھیر ہے!

یہ خیال ہٹا گر گیت کے مطلب کا خیال ہوا۔ ہولی کے کھلار کہتے ہیں کہ چلو آج کنہیا کے گھر ہولی کھیلینگے۔ کنہیا کون؟ برج کا شاہزادہ۔ کھلار کون؟ اسکی رعایا گوالے اس خیال نے شیوشنبھو کو اور بھی چونکا دیا۔ کہیں! کیا ہند میں کوئی ایسا زمانہ بھی تھا کہ رعایا راجہ کے گھر جاکر ہولی کھیلتی تھی! راجہ اور رعیت ایکساتھ ملکر خوشی مناتے تھے! کیا اسی ہند میں بادشاہ کبھی رعایا کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے تھے! اچھا اگر آج شیوشنبھو شرما اپنے دوستوں کو ساتھ لیکر عبیر گلال کی جھولیاں بھر کر رنگ کی پچکاریاں لئے اپنے راجہ کے گھر ہولی کھیلنے جائے تو کہاں جائے؟ راجہ دور سات سمندر پار ہے۔ راجہ کا صرف نام سنا ہے۔ نہ راجہ کو شیوشنبھو نے دیکھا نہ شیوشنبھو کو راجہ نے۔ خیر یہاں راجہ نہیں تو اسنے اپنا نائب ہی بھیجا ہے۔ کرشن دوارکا میں ہیں مگر اودھو کو نائب بناکر انہوں نے برج والوں کی تسلی کے لئے برج میں بھیجا ہے۔ کیا اس نائب کے گھر جاکر شیوشنبھو ہولی کھیل سکتا ہے؟

اُف! یہ خیال ویسا ہی بے تکا ہے جیسے ابھی بارش میں ہولی گائی جاتی تھی۔ مگر اس میں گانیوالیکا کیا قصور ہے وہ تو موسم سمجھکر ہی گا تا تھا۔ اگر بسنت میں مینھ کی جھڑی لگے تو گانیوالیکو کیا ملار گانا چاہیئے؟ سچ مچ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کرشن ہیں اودھو ہیں مگر برج کے رہنے والے اُنکے پاس پھٹکنے نہیں پاتے۔ راجہ ہے۔ نائب السلطنت ہے۔ مگر رعایا کی اُن تک رسائی نہیں۔ سورج ہے دھوپ نہیں! چاند ہے چاندنی نہیں! مائی لارڈ شہر ہی میں ہے مگر شیوشنبھو اسکے دروازے تک پھٹکنے نہیں پاتا! اُسکے گھر چلکر ہولی کھیلنا تو کیسا! مائی لارڈ کے دردولت تک رعایا کی بات نہیں پہونچسکتی! جہانگیر کی طرح اسنے خوابگاہ تک ایسا کوئی گھنٹہ نہیں لگایا جس کی زنجیر باہر سے ہلا کر اُس تک اپنی فریاد پہونچائی جاسکے۔ نہ آگے کو لگنے کی امید ہے۔ رعایا کی زبان وہ نہیں

سمجھتا ہے اُسکی زبان رعایا نہیں سمجھتی - رعیت کے من کی بات نہ وہ سمجھتا ہے نہ سمجھنا چاہتا ہے اُسکے دل کی بات نہ رعایا جانتی ہے نہ جاننے کی کوئی تدبیر ہے - اُسکا دیدار حاصل ہونا بہت مشکل ہے - ہلال کی طرح کبھی کبھی بہت ٹکٹکی لگاکر دیکھنے سے اُسکا چاند سا منہ نظر آجاتا ہے تو آجاتا ہے - لوگ انگلیاں اُٹھا اُٹھاکر اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ہے - لیکن ہلال کے ہویدا ہونیکا بھی ایک وقت ہے - لوگ اُسے جان سکتے ہیں - مگر مائی لارڈ کے چاند سے مُنہ کے نظر آنیکا کوئی وقت بھی نہیں ہے - اچھا جسطرح اس مُلک کے لوگ مائی لارڈ کے چاند سے منہ کے دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں یا جیسے شیوشنبو شرما کے جی میں اپنے ملک کے مائی لارڈ سے ہولی کھیلنے کی آئی ہے اُسی طرح کبھی مائی لارڈ کو بھی اس ملک کے لوگوں کا خیال آتا ہے؟ کیا کبھی حضور کے دل میں آتا ہوگا کہ جس رعایا کی جان و مال کے وہ مالک ہوکر تشریف لائے ہیں اُسکے کسی ایک آدمی کے دل کو ٹٹولیں؟ مائی لارڈ کو ڈیوٹی کا خیال دلانا سورج کو چراغ دکھانا ہے وہ خود زبان مبارک سے فرما چکے ہیں کہ ڈیوٹی سے بندھا ہوا میں اس ملک میں پھر آیا - یہ ملک مجھے بہت ہی عزیز ہے - لہٰذا ڈیوٹی اور پیار کی بات حضور کے ارشاد ہی سے طے ہو جاتی ہے - اس میں کسی طرح کی حجت کی ضرورت نہیں ہے - تاہم یہ سوال دل میں خود بخود اُٹھتا ہے کہ اس ملک کی رعایا سے رعایا کے مائی لارڈ کا قریب ہونا اور رعایا کے لوگوں کی بات جاننا بھی اُس ڈیوٹی کی حد تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچتا ہے تو کیا حضور بتا سکتے ہیں کہ اپنے چھ سال کے طویل عہد حکومت میں اس ملک کی رعایا کو کیا سمجھا اور اس سے کیا تعلق پیدا کیا؟ جو پہرے دار سر پر عمامہ لپیٹے ہاتھ میں سنگین دار بندوق لئے کاٹھ کے پتلے کی طرح گورنمنٹ ہوس کے دروازے پر کھڑا رہتا ہے یا پاگل کی طرح کبھی کبھی ادھر اُدھر ہلتا دکھائی دیا کرتا ہے کبھی اُس سے بھول کر بھی پوچھا ہے کہ کیوں کیسی گذرتی ہے؟ کسی کالے چپراسی یا خانساماں سے کبھی حضور نے دریافت فرمایا کہ کیسے رہتے ہو - تمہارے ملک کی چال ڈھال کیسی ہے تمہارے اہل ملک ہماری حکومت کی نسبت کیسا خیال رکھتے ہیں؟ کیا ان ادنیٰ درجے کے نوکر چاکروں کو مائی لارڈ کی زبان

مبارک سے نکلے ہوئے آبحیات کے ان الفاظ کے سننے کا کبھی فخر حاصل ہوا یا خالی درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آواز ہی اُنکے کانوں تک پہونچکر رہ گئی؟ کیا کبھی سیر تماشے میں یا چہل قدمی کے وقت کسی تنہائی کی جگہ میں اس ملک کے کسی باشندے سے دو چار باتیں کرنیکا موقع حضور والا کو ملا؟ یا اس ملک کے کسی معزز بے غرض آدمی کو اپنے گھر بلا کر اس ملک کے لوگوں کے صحیح خیالات دریافت کرنے کی کوشش کی گئی؟ یا کبھی ملک یا ریاستوں کے دورے کے وقت اُن لوگوں کے سوا جو جھک جھک کر لمبی سلامیں کرتے آتے ہیں کسی پیچھے اور بے پروا آدمی سے کچھ پوچھنے یا اُس سے کچھ کہنے کی تکلیف گوارا کی؟ سنا کہ کلکتے میں حضور نے کونا کونا تلاش کر ڈالا۔ ہند میں کیا اندر اور کیا سرحد پر کوئی مقام دیکھے بغیر نہیں چھوڑا۔ بہت لوگ ایسا ہی خیال کرتے تھے مگر کلکتہ یونیورسٹی کی کانووکیشن والی مجلس میں چانسلر کا جامہ پہنکر مائی لارڈ نے جس ہمہ دانی کا اظہار کیا اُس سے صاف عیاں ہو گیا کہ جن آنکھوں سے اُنہوں نے دیکھا اُن میں اُس ملک کے معاملات کے صحیح طور سے دیکھنے کی طاقت نہ تھی۔

کل ہندوستان کی بات الگ رہی ایک کلکتے ہی میں دیکھنے کی اتنی باتیں ہیں کہ صرف اُنکو اچھی طرح دیکھ لینے سے ہند کی بہت سی باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ مائی لارڈ کی حکومت کے چھ سال ہالول کی یادگار میں لاٹھ بنوانے بلیک ہول کا پتہ لگانے اختر لونی کی لاٹھ کو میدان سے اٹھوا کر وہاں وکٹوریہ میموریل ہال بنوانے کا خیال دوڑانے گورنمنٹ ہوس کے آس پاس عمدہ روشنی عمدہ فوٹ پاتھ اور اعلیٰ درجے کی سڑکیں بنوانے میں گذر گئے۔ دوسرا دور بھی ویسے ہی کاموں میں ختم ہو رہا ہے ممکن ہے کہ اُس میں بھی حضور والا کی پسند کے انگریزی محلوں میں سے کچھ اور بڑی بڑی سڑکیں نکل جائیں اور گورنمنٹ ہوس کی طرف کی بہشت کی حد کچھ اور بڑھ جاے مگر شہر جیسی تاریکی میں تھا ویسی ہی میں رہا۔ کیونکہ اُسکی اصلی حالت دیکھنے کے لئے اور ہی طرح کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ آنکھیں نہ ہونگی تب تک یہ تاریکی یونہی رہیگی۔ کسی دن شیو شنبو کے ساتھ مائی لارڈ شہر کی حالت دیکھنے چلتے

تو دیکھئے کہ اس شہر عظیم کے لاکھوں باشندے بیٹوں اور سووروں کی طرح سڑے گندے
جھونپڑوں میں پڑے لوٹتے ہیں۔ اُنکے آس پاس سڑی بدبو اور میلے سڑے پانی کی
نالے بہتے ہیں۔ کیچڑ کوڑے کے انبار لگے رہتے ہیں۔ اُنکے جسم پر میلے کچیلے
پھٹے چھیتڑے لپٹے رہتے ہیں۔ اُن میں سے بہت سوں کو زندگی بھر پیٹ بھر کر کھانا اور
جسم کو چھپانے کے لئے کپڑا میسر نہیں ہوا۔ جاڑوں میں سردی سے اکڑکر رہجاتے ہیں
اور گرمیوں میں سڑکوں پر پھرتے اور جہاں تہاں پڑتے ہوئے گذارہ کرتے ہیں۔ بارش
میں سڑے گیلے گھروں میں بھیگے پڑے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر ایک موسمی سختی کے
وقت سب سے آگے وہی لوگ موت کی راہ کے مسافر بنتے ہیں۔ ایک موت ہی ہے
جو اُنکی حالت پر رحم کرتی ہے۔ اور اُنکو جلد جلد اس زندگی کے لاعلاج مرض سے
رہائی دلاتی ہے!

مگر کیا اس سے بھی بڑھکر کوئی اور نظارہ نہیں ہے؟ ہاں ہے۔ مگر اُسکے دیکھنے
کے لئے اور زیادہ استقلال کی ضرورت ہے۔ بالو میں بکھری ہوئی چینی کو ہاتھی اپنی
سونڈ سے نہیں اُٹھا سکتا۔ اُسکے لئے چیونٹی کی زبان درکار ہے۔ اسی کلکتے میں اسی
عمارتوں کے شہر میں مائی لارڈ کی رعایا میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں جن کو رہنے کو سڑا
جھونپڑا بھی نہیں ہے۔ وہ لوگ گلیوں اور سڑکوں میں پھرتے پھرتے جہاں تھوڑی
بہت جگہ دیکھتے ہیں وہیں پڑ رہتے ہیں۔ پہرے والا آکر ڈونڈا لگاتا ہے تو دوسری
جگہ جا گرتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں تو سڑکوں کے کنارے پڑے ہوئے پاؤں پیٹ
پیٹ کر مر جاتے ہیں کبھی آگ جلاکر کھلے میدان میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی
حلوائیوں کی بھٹیوں سے پٹ کر رات بسر کر دیتے ہیں۔ ہر روز اُنکی دو چار لاشیں
جہاں تہاں پڑی ہوئی پولیس اٹھواتی ہے۔ بھلا مائی لارڈ تک اُنکی بات کون پہنچاوے
دہلی دربار میں بھی جہاں سارے ہندوستان کی دولت جمع تھی صدہا اسی قسم
کے لوگ دہلی کی سڑکوں پر دکھلائی پڑتے تھے۔ مگر اُنکی طرف نظر ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔
اگر مائی لارڈ ایکبار اُن لوگوں کو دیکھ پاتے تو سوال کرنیکا موقع ہو جاتا کہ وہ لوگ بھی

برٹش عملداری کے سٹیزن ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو براہ عنایت پتہ بتلایے کہ اُنکے رہنے کے گھر کہاں ہیں؟ انگریزی راج سے اُنکا کیا تعلق ہے؟ کیا کہکر وہ اپنے شاہ اور اُس کے نائب کو مخاطب کریں؟ کن الفاظ میں انگریزی حکومت کو دعا دیں؟ کیا یوں کہیں کہ جس انگریزی راج میں ہم اپنی زاد بوم میں ایک انگل زمین کے بھی مالک نہیں جس عملداری میں ہمارے جسمونکو پھٹے کپڑے بھی میسر نہ ہوسے اور نہ کبھی اس کمبخت پیٹ کو بھرنے کے لئے پورا کہانا ملا اُس کی ہمیشہ فتح ہو! اُسکا نائب ہاتھیونکا جلوس نکال کر سب سے بڑے ہاتھی پر چنور چھتر لگا کر نکلے اور اپنے ملک میں جا کر ہند کی رعایا کی خوشحالی کا ڈنکا بجاے۔

اس ملک کے کروڑوں آدمی ایسے ہیں کہ صبح شام کسی ایک جگہ جمع ہو کر راجہ بکرماجیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان راجہ بادشاہونکی بڑائی کرتے ہیں جو رعایا کی تکلیف دور کرنے اور اُسکے دُکھ سکھ کا پتہ لگانے کے لئے بھیس بدلکر راتو نکو پھرا کرتے تھے۔ اکبر کی رعایا پروری بیربر کی ہر دلعزیزی کی کہانیاں کہکر جی بہلاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انصاف اور آرام کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب وہ راجہ مہاراجہ پیدا نہیں ہوتے جو رعایا کے دکھ درد کی باتیں اُنکے گھرونپر جا کر معلوم کر آتے تھے۔ مہارانی وکٹوریہ کو وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ اس ملک کی ملکہ معظمہ تھیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اب اُنکے فرزند ارجمند اس ملک کے بادشاہ اور مالک ہوئے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اُنکے بادشاہ کے ایک نائب ہوتے ہیں وہی اس ملک کی حکومت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اس ملک کی تیس کروڑ رعایا پر حکومت کرنیکا فخر بھی کیا کرتے ہیں۔ یا جی میں آوے تو اس ملک کے ساتھ بغیر کسی طرحکا اچھا برتاؤ کیے بھی یہاں کے لوگونکو جھوٹا مکار کہکر اپنی بڑائی کرتے ہیں۔

ان سب خیالات نے اتنی بات تو شیو شمبھو کے دلمیں بھی پکی کر دی کہ اب راجہ اور رعایا کے مل کر ہولی کھیلنے کا وقت گیا۔ جو کچھہ باقی تھا وہ کاشمیر کے مہاراجہ رنبیر سنگھہ کے ساتھہ ختم ہو گیا۔ اس ملک میں اُس زمانہ کے جلد پھر آنیکی اُمید نہیں۔ ساتھہ ہی کسی حاکم کا بھی ایسا اچھا نصیب نہیں ہے کہ اس ملک کی غریب رعایا کی غریبانہ محبت کے حاصل

کرنے کی پروا کرے۔ ہائی لارڈ جو اپنے عہد حکومت کی عمدت سے عمدہ تصویر دار تاریخ خود لکھوا سکتے ہیں وہ رعایا کی محبت کی کیا پروا کر سکتے ہیں" تاہم یہ پیغام بنگرڈ شرا اپنے حلقہ تک پہونچا دینا چاہتا ہے کہ آپ کے دروازے پر ہولی کھیلنے کی امید رکھنے والے ایک برہمن کو اور کچھ نہیں تو پاگل سمجھکر ہی کبھی یاد کر لینا۔ وہ آپ کی اس بے زبان رعایا کا ایک وکیل ہے جسکے تعلیم یافتہ ہوکر منہ کھولنے تک آپ کچھ کرنا نہیں چاہتے!

بلا زمان سلطان کہ رساند این دعا را
کہ بشکر بادشاہی ز نظر مراں گدا را

—————(✤)—————

جی۔ سبرامنیا آیر

—————(✤)—————

مدراس کے اس مشہور اخبار نویس۔ ملکی جاں نثار۔ مقرر۔ اور شیر دل کے نام گرامی اور مضامین عالی سے بہت سے لوگ واقف ہونگے۔ مندرجہ ذیل چند واقعات جو مفید سبق اور نتیجہ خیز خیالات سے بھرے ہیں، انکا مطالعہ خالی از دلچسپی نہو گا۔

(۱) پیدایش جنوری ۱۸۵۵ء - مقام تنرووادی (تنجور) میں ہوئی۔

(۲) وفات پدر بزرگوار ایسے وقت ہوئی کہ آپکی عمر صرف ۱۴ برس کی تھی۔

(۳) ایف۔ اے کی سند ایس۔ پی۔ جی ہائی اسکول تنجور سے حاصل کی۔

(۴) ۱۸۷۵ء میں چرچ اسکاٹ لینڈ مشن کالج کی معلمی چالیس روپیہ ماہواری پر شروع کی۔

(۵) ۱۸۷۷ء میں بی۔ اے۔ (فلسفہ اور منطق کے مضمون میں) کی فضیلت کی سند حاصل کی اور اینگلو ورناکیولر اسکول ٹرپلیکین کی ہیڈ ماسٹری شروع کی۔

قدرت نے اخبار نویسی اور علمی مصروفیت کا مذاق پہلے ہی سے دیا تہا اور وہ آپ میں رنگ پکڑتا جاتا تہا۔ یکم ستمبر (۱۸۷۸ء) کو آپنے (اور پانچ الوالعزموں کے ساتھ ہوکے) مدراس کا مشہور اخبار ہندو (زاد اللہ عمرہ) جاری کیا۔ آج جس اخبار کو جنوبی ہندوستان کی سپالاری حاصل ہے اسکو ایک دن انہیں نوجوانوں کی منچلی طبیعت نے بہت ہی چپوٹی پونجی سے نکالا تہا۔ صاف کیوں نہ بتادیں کہ پہلے پرچے کے ڈاک کے اخراجات کے لئے ایک معمولی سی رقم قرض لی۔ آج جو عروج اور شہرت اسکو حاصل ہے وہ لگاتار محنت اور ایک اڈیٹر کی قابلیت اور دماغ سوزی کی بدولت ہے۔ ایڈیٹری کی صدرنشینی سبرامنیا آیر کو ملی تہی اور منیجر مسٹر رام چندر آیر (موجودہ چیف جسٹس میسور) راو بہادر سی ناگوجی راؤ مسٹر آیل سی۔ ولیمیس پلّائی اور دیگر معززین نے اسکی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کے قلمی خدمت شروع کی۔ اسی زمانے میں سرکار نے موتہو سوامی آیر کو مدراس ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا۔ انگریزی حلقوں میں اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ ہندو نے اس معاملے کو اپنے ہاتہ میں لیا۔ اس دلیری اور لیاقت سے سرکار کی اس عنایت کو ضروری بتایا کہ ہندو کا نام ہوگیا اور لوگوں نے اس کی موجودگی کی ضرورت دل وجان سے تسلیم کرلی۔ پہلا معرکہ مارنا تہا کہ پہر تو نظریں اُٹہنے لگیں۔ سر جن میہر ایڈرڈ نکلسن مدراس کے آزاد خیال اور دیسی جماعت کے ہمدرد ڈنمس سے تہے۔ آپ کی دوستی اور ہمدردی سے اخبار مذکور کو بہت فائدہ ہوا آپکی وسیع معلومات اور تجربے سے ہندو کے مذاق اور ترتیب میں نمایاں ترقی ہوئی۔ اسی عرصے میں چنگل پیٹ (جنوبی ہندوستان) کے تحصیلدار کا مقدمہ اُٹہا۔ مسٹر آیر نے اپنے اخبار میں رعیت اور بیچاری بے زبان مخلوق کی ایسی حمایت کی اور ایسے ایسے مدلل مضمون پے درپے نکالے کہ بالآخر ظالم کو اپنی سزا بہگتنی پڑی۔ اسکی بے جگری اور مردانہ روش نے اور بہی ہر دلعزیزی حاصل کی۔ ہندو کی ترقی نے مالکونکو اور بہی حوصلہ مند بنایا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۴ میں اس اخبار کو ہفتہ میں تین بار کردیا۔

سبرامنیا آیر صاحب کی اتنے روز کی علمی زندگی میں ہندو نے بڑی ترقی کی اور خود

انکا تجربہ بھی بہت وسیع ہوگیا اور ہندوستان کے تمام سیاسی۔ تجارتی۔ اور تعلیمی
حالات سے اچھی طرح واقفیت ہوگئی۔ آپنے اپنے صوبے میں دورہ کرکے "لوکل سلف
گورنمنٹ" اور دیگر ضروری امور پر خوب پُرمغز تقریریں کیں۔ جابجا لکچر دیے لوگوں سے ذاتی
تعارف پیدا کرکے ملک کی حالت کا افسانہ سنایا اسی ۱۸۸۴ میں پی رنگھا نیبدو (انرابل)
کی رفاقت میں ہوکے مہاجنی سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اچھی گھڑی تھی کہ اسکی بنیاد پڑی۔ آجتک
سبھا نے اپنی خدمت سے ملک کو اتنا فائدہ پہنچایا ہے کہ اسکا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔
بمبئی میں کانگریس کی شرکت کی اور ۱۸۸۶ میں" پبلک سروس کمیشن" کے سامنے ایسی معرکے
کی شہادت دی کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔

اس شباب اور اٹھان کے زمانے میں ہندو کا جوبن اور بھی زور و بنیر ہوا۔ یہ روزنامہ
اخبار کی صورت میں آفتاب عالمتاب کی روح پرور شعاعوں کے ساتھ شائع ہونے لگا۔

مسٹر آیر کی زندگی کے اس حصے میں بہت سے چرچے قابل ذکر ہیں۔ اب دوسرے
پہلو کی طرف بھی نگاہ کرنی چاہیے آپ نے دیکھا کہ ملک میں عام طور سے ناہم پرستی
پھیلی ہے۔ مذہب کے پاک نام کو لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ مشرق جسکا وجود اور
ممالک کے حق میں رحمۃ اللعالمیں رہا آج یوں جہالت اور انسانی ذلیل حماقتوں
میں پھنسا ہے۔ ایسی حالت میں تمدنی اصلاح میں بھی آپ نے حصہ لیا۔ محض زبانی نہیں
بلکہ اپنی ایک بیوہ لڑکی کے عقد سے۔ اسکے عقد ثانی کے نام سے تمام برادری میں مخالفت
کی ایسی آگ بھڑکی کہ اچھے اچھے جادو بیانوں کی عملی قوت سرد پڑ گئی۔ ہاں ایک
آپ کی طبیعت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ ۱۸۹۰ میں ۳۱ دسمبر کو (ولیم وڈبرن۔ راناڈے۔
میلباری کی موجودگی میں) یہ عقد ثانی ہوا۔ اسکے بعد بھائی برادری نے ایسی تکلیف دی
اور ایسی نفرت کا اظہار شروع کیا کہ ایک مرتبہ آپکو مجبوری میں دیکھ کے یاروں نے آپکے
عیسائی ہونیکی خبر مشہور کردی۔ مگر آپ اپنے مذہب پر قائم رہے اور اپنے مادری
ملک کا حق اس مخالفت کے بعد اور بھی زوروں سے ادا کیا۔ ۱۸۹۲ میں "ہندو
سوشیل ریفارم ایسوسی ایشن" کا وجود ہوا اور اس انجمن نے اپنے ابتدائی دعد کے

لفظ بہ لفظ حرف بحرف پورے کئے۔

۱۸۹۷ میں سر مہتا آیر مہاجنی سبھا کی طرف سے وکیل ہو گے لندن گئے "ویلبی کمیشن" کے سامنے ہندوستان کے اخراجات - سرحد کی حفاظت - مالگذاری اور دیگر مشکل سے مشکل اور ضروری سے ضروری مسائل پر ایسی پُرتاثیر اور زبردست شہادت دی کہ آجتک وہ یادگار ہے اسوقت سے ملک کے سیاسی مسائل اور تمدن کے ہر اصول کو آپنے اور بھی جانفشانی سے دیکھا پڑھا اور لکھا ہے چنانچہ اب آپکا یہ مرغوب اور خاص مضمون ہوگیا ہے - لندن کی سیر اور خدمت کے بعد جب آپ واپس آئے تو ملک میں ایک عجب تہلکہ مچا ہوا دیکھا بال گنگادہر تلک کے مشہور مقدمے میں جوش اور جذبات کی انتہا ہو چکی تھی - آپ نے سرکار کی بدگمانی کے خلاف بڑے دہواں دہار مضامین لکھنے شروع کئے اور اسکا نام

"عہد پر آشوب"

رکھا - آپ کی طرف بھی عتاب کی بجلی چمکنے والی تھی کہ سر آرتہر ہیولاک نے اسکو وہیں روکدیا -

اس واجب الاحترام ایڈیٹر نے ۱۸۹۸ میں ہندو سے قطع تعلق کیا - آپ کی علیحدگی سے تمام ملک کو صدمہ ہوا - سربرآوردہ اخباروں اور بزرگوں نے اپنے اپنے مضمون اور خط میں بیحد افسوس کیا - "دی اس ٹمیس کے ایڈیٹر نے لکھا "... ہمیں اس کی ایڈیٹری کی صدر نشینی بہت ہوتی ہے - یہ کام ذمہ داری اور محنت کا ہے - سر آمینیا آیر نے بیس برس تک اس دشوار گذار منزل کی سیر کی ... عادتیں انسان کے حق میں فطرت ثانی ہوجاتی ہیں جسکو اس شراب کی لت پڑجاتی ہے وہ مشکل سے چھوٹتی ہے لکھنے پڑھنے کی بھی یہی حالت ہے - ... "

ہندو کی اڈیٹری سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے اپنی زندگی کو اور دوسری آزمایش کے لئے وقف کردیا - آپنے دیکھا کہ دیسی زبان میں اخبار کی سخت ضرورت ہے خصوصًا ایسے اخبار کی ضرورت ہے جو اخبار نویسی کے فرض کو اچھی طرح پورا کرے اور

رعایا کی بہتری کے لئے دل وجان سے محنت کرے۔ آپ نے "سدیسا متران" نامی اخبار اپنی دیسی زبان میں نکالا۔ اسکو بھی خوب ترقی دی۔ دوسری اگست سنہ ۱۹۰۸ء کو روزانہ کر دیا۔ اب یہ پرچہ بڑی آب وتاب سے نکلتا ہے۔ مضامین کی خوبی مسائل کی گرفت اور ملک کی ہمدردی ہزاروں تعریف کے لایق ہے۔ اور دیکھنا چاہئے کہ دیسی زبان میں ایسے کام کے پرچے سے کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔

فروری ۱۹۰۲ء میں مدراس اسٹینڈرڈ کی ایڈیٹری بھی اپنے ہاتھ میں لی۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنا اخبار "یونائٹڈ انڈیا" بھی نکالا۔ جن لایق ہاتھوں سے ہندو کو ہندو بنا دیا وہی انکے ساتھ بھی ہے۔ مختصر یہ کہ اس پرچے نے ایسی عظمت اور ایسی وقعت پیدا کی کہ آج سر رو پر لتھبرج کے سے مشہور مدبر اپنی تقریروں میں اسکا حوالہ دیتے ہیں۔

مسٹر جی سبرامینیا آیر کی مشغول اور معروف زندگی میں سے بڑوں واقعات ہیں۔ یہاں جتنی خوشہ چینی کی گئی ہے وہ بہت ہی ناکافی ہے۔ پھر بھی اس سے آپ کی دن رات کی محنت۔ قوم کی محبت۔ اور ملک کی بے صلہ خدمت کی وقعت ظاہر ہے۔ آپکا مذہب زیادہ تر یہ ہے کہ کام کرو اور محنت کرو۔ دفتر میں یا مکان پر کہیں بھی ہوں آپ اپنے وقت کا تھوڑا سا حصہ بھی بیکار نہیں جانے دیتے۔ آپ اسکی عملی مثال ہیں کہ باکار آدمی کو بہت کافی وقت ہے۔ اس محنت پر خیال فرمائیے کہ آپ فرصت کے اوقات بھی کتب بینی اور تالیف وتصنیف میں گذار دیتے ہیں۔ تامل زبان میں جاپان کی تاریخ لکھی ہے۔ انگریزی میں ہندوستان کے بعض مسائل پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے۔ آپ کی زندگی میں اللہ برکت اور ترقی دے کہ اپنے قلم سے وہ اپنی مہم پوری کریں ملک کو اچھی حالت میں دیکھیں اور اپنی لگائی ہوئی کھیتی کی بہار دیکھیں۔ ایسے پاک نفوس دنیا کے ہیرو اور دین کے حامی ہوتے اور انہیں سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ~

ساتھ سب کچھ لائے لیکن ساتھ لیکر کیا گئے | فیض پہنچا نیکو آئے تھے ہمیں پہنچا گئے
ملک میں علم وہنر وہ اسطرح برسا گئے | جسطرح کھیتی پہ برسے ابر رحمت ٹوٹ کر

شاہ محمد نذیر ہاشمی غازی پوری (علیگڈھ کالج) (٥۔ ریویو)

بیاضِ حسرت

فغفور یزدی

تنت چوں از نظر پنہاں نشیند
ہزاراں دیدہ سرگرداں نشیند

بہارے در دل آزردہ یادِ رویت
کہ بستاں بر سرِ بستاں نشیند

ز بیم دور باشِ غمزۂ تو
نگاہم در پسِ مژگاں نشیند

گر آویزد بفتراکِ تو فغفور را
سرش در حلقۂ رساماں نشیند

میر تقی ہوس (از بیاض مخمور)

رنگِ گلِ شگفتہ ہوں آبِ رخِ چمن ہوں میں
شمعِ حرم چراغِ دیر شیفتۂ برہمن ہوں میں

سرو نشیمن اور ہیں شاخ نشینِ گل ہیں اور
قمریِ آشیاں خراب بلبلِ بے وطن ہوں میں

میں ہوں نسیمِ نوبہار میں ہوں شمیمِ زلفِ یار
گو کہ نظر سے ہوں نہاں داخلِ انجمن ہوں میں

مرزا جلال اسیر

خجلت کشتم بدہ نرگسِ کم نگاہ را
یا مکن آشنائے دل گرمیٔ گاہ گاہ را

زہر شکایتم بدل شکرِ شکر می شود
چوں بلب آشنا کنی خندۂ عذر خواہ را

ہر کہ ز پاکیِ نفس ہمچو اسیر دم زند
آئینۂ اثر شود گریۂ صبحگاہ را

لا اعلم

گرہ میں زر ہے رندوں کے گھٹا اٹھی ہے اُتر سے
خدا چاہے تو ساقی آج میخانے میں ہُن برسے

سلمان ساوجی

آوازۂ جمالت تا در جہاں فتادہ
خلقے بجستجویت سر در جہاں نہادہ

سودائیانِ زلفت گرد تو حلقہ بستند
شوریدگانِ مویت در ہمدگر فتادہ

مائیم بستہ دل را در لعلِ دلکشایت
آں لب بخندہ بکشا تا دل شود گشادہ

(فقط)

حافظ

اردوئے معلیٰ کے پرچہ نمبر ۴ بابتہ اپریل ۱۹۰۵ء میں لسان الغیب خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کے متعلق بعض دلچسپ حالات چھپے ہین اونمین سے بعض امور کی نسبت مجھکو کچھ عرض کرنا ہے۔

(۱) صفحہ ۱۱ مین مصرعہ الایا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا حافظ کے چچا سعدی کی طرف منسوب ہوا ہے حالانکہ یہ امر مشہور ہے کہ یہ مصرعہ یزید کا تہا جس کا شعر ذیل مین درج ہے۔

(۲) صفحہ ۱۳ مین حافظ کا لاہور (۹۷۶) تک پہنچنا لکہا ہے جو کسی تاریخ یا تذکرے سے ثابت نہین ہے۔ حافظ نے کبہی ہندوستان کی زمین پر قدم نہین رکہا بلکہ ایران کی حدود سے باہر نہین گئے۔ اور ایران مین بہی اپنے وطن شیراز ہی مین رہے صرف چند روز کے واسطے شہر یزد کو گئے تہے جس موقع پر وہ مشہور غزل لکہی تہی جسکا مطلع یہ ہے۔

خرم آن روز کزین منزل ویران بروم		راحت جان طلبم وزپئے جانان بروم	

یا بارادۂ دکن بندرگاہ ہرموز تک گئے۔ اور پہر واپس چلے گئے تہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے لار کے جو خلیج فارس کی طرف بندرگاہ ہرموز کے قریب ہے اور ایران کا ایک قدیم مشہور شہر ہے کسی کتاب مین غلطی سے لاہور لکہا گیا ہے اور اس سفر دکن کے قصد سے حافظ صاحب کا لار تک آنا تاریخ فرشتہ وغیرہ سے ثابت ہے۔

(۳)۔ صفحہ ۱۸ مین نادر شاہ کے حملہ فارس کے متعلق جس فال کا ذکر کیا ہے

وہ میری رائے میں حملہ فارس سے متعلق نہین ہے بلکہ اوس موقع پر یہ فال نکلی تہی جبکہ نادر شاہ تبریز اور آذربائیجان کی فتح کا قصد کر رہا تہا جیسا کہ مرزا مہدیخان نے لکہا ہے۔ صوبہ پارس تو پہلے ہی سے نادر کے قبضے مین تہا اور فال کے شعر کا صاف و صریح مطلب بہی تبریز کی فتح سے ہے جس کو بالآخر نادر شاہ نے تسخیر کر لیا۔

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ		بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است	

حافظ کی فال کی خوبی یہی ہے کہ اوسمین نہایت ٹہیک اور سچے پتے کی باتین معلوم ہو جاتی ہین اور اسی وجہ سے اونکو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا خطاب دیا گیا ہے۔

حافظ کی اسی قسم کی بہت سی فالین مشہور ہین جو نہایت ٹہیک اور صحیح ثابت ہوئین ذیل مین چند مثالین بیان کیجاتی ہین۔

جب جہانگیر کا انتقال لاہور مین ہوا تو نور جہان کے رسوخ کی وجہ سے اوسکا (یعنی نور جہان کا) بیٹا شہریار تخت پر بٹہلایا گیا۔ کیونکہ شاہجہان سے جو وارث حقیقی تہا نور جہان نے جہانگیر کو ناراض کر دیا تہا اور شاہجہان دکن مین آوارہ و سرگردان تہا۔ باپ کے مرنے کی خبر سنکر شاہجہان نے دیوان حافظ مین اس خیال سے فال دیکہی کہ مین دکن ہی مین رہون یا ہندوستان جا کر دہلی و آگرہ کے تخت پر قبضہ کرون۔ اس فال مین یہ اشعار پر معنی نکلے جنپر شاہجہان نے اپنی آیندہ قسمت کا فیصلہ کر دیا اور بلا پس و پیش ہندوستان کو روانہ ہو گیا اور تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا شہریار کا اوس کے پہونچنے سے پہلے ہی کام تمام ہو گیا تہا۔ وہ اشعار یہ ہین جسمین لفظ شہریار کا واقع ہو جانا عجیب الاتفاق ہے:۔

	چرانہ خاک کف پائے یار خود باشم		چرا نہ در پے عزم دیار خود باشم	
	بشہر خود روم و شہریار خود باشم		غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم	

اسی طرح عالمگیر اورنگ زیب کے انتقال پر جسکی بخشایش مین لوگون کو اوس سلوک کی وجہہ سے جو اوسنے اپنے باپ اور بہائیون کے ساتہہ کیا تہا تہوڑا اتنک تہا شعر ذیل فال مین نکلا تہا۔

	کہ زیارت گہ رندان جہان خواہد بود		بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ	

ایک مال کی چوری کا قصہ بہی مشہور ہے جس کے متعلق شب مین چراغ کی روشنی سے فال دیکہی گئی تہی اور وہ شعر نکلا تہا جسکا مصرعہ ثانیہ یہ ہے۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ اور تفتیش پر وہ مال اوسی شخص کے پاس نکلا جو چراغ دکہلا رہا تہا۔

ایک میرے معزز دوست نے مجہسے بیان کیا تہا کہ ایک قصیدے کی نسبت جو حافظ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اونہون نے دیوان مین فال دیکہی اور ایک شعر نکلا جس کا مصرعہ ثانیہ یہ ہے۔ من این نگفتہ ام آنکس کہ گفت بہتان گفت

اسی طرح ایک روایت مشہور ہے کہ جناب میر انیس و مونس مرحوم کے کسی شاگرد نے اپنے اوستاد کی نسبت فال دیکہی تہی تو شعر ذیل نکلا تہا جو نہایت حیرت کا ہے۔

	دل رمیدہ ما را انیس و مونس شد		ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد	

اسکے ساتہہ یہ بہی سنا گیا ہے کہ ایک دوسرے مشہور اوستاد کے ایک شاگرد نے اپنے اوستاد کی نسبت بہی فال دیکہی تو یہ شعر نکلا۔

	صنعت گریست اما طبع روان ندارد		آنرا کہ خواندی اوستاد گر بنگری بتحقیق	

اس پر مجکو وہ قصہ یاد آگیا جو فیضی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ اوسنے یہ سنکر کہ شیخ سعدی کا یہ شعر جو معرفت مین ڈوبا ہوا تہا مقبول ہوا تہا۔

برگِ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اوسکے جواب مین یہ شعر کہا۔

ہر گیا ہے کہ از زمین روید		وحدہ لاشریک لہ گوید

اور بامید صلہ آسمان کی طرف موںہہ اوٹہایا کہ کسی پرندنے اوپر سے بیٹ کردی اوس وقت فیضی نے جلکر کہا۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔

ممکن ہے کہ یہ قصے گڑہے ہوئے ہون مگر کسی نے اچہے گڑہے ہین۔ مینے خود دیوان حافظ کی فالون کا تجربہ کیا ہے اور نہایت پرمعنی اشعار نکلے ہین۔

خاکسار

محمد ابوالحسن بدایونی

(ناظم اول عدالت دیوانی)

امیر و داغ

امیر الشعرا امیر مینائی لکہنوی اور فصیح الملک داغ دہلوی کی وفات سے ایشیائی شاعری کو جو ناقابل برداشت صدمہ اوٹہانا پڑا ہے اب بظاہر اوس کی تلافی کے اسباب مفقود ہین گو ملک مین اور بہی بہت سے خوش گو اور خوش بیان شعرا موجود ہین مگر واقعی بات یہ ہے کہ ان ہر دو بزرگون کے کلام مین جو خصوصیت تہی اوس سے ہر شخص خاص طور پر متاثر ہوتا تہا اور سننے والے کی زبان سے بے ساختہ

تحسین و آفرین کی صدائین بلند ہوجاتی تہین - اس نئی روشنی اور تہذیب وشائستگی کے زمانے مین جبکہ فلسفۂ جدید نے تمام پرانی بنیادون کو ہلا کر پہینک دیا ہے ہماری ایشیائی شاعری کے لئے ان دونون اساتذہ کا وجود بسا غنیمت تہا فی الحقیقت منشی امیر احمد امیر کی ذات جامع کمالات ہمارے ملکی شعرا مین خاص امتیازی درجہ رکہتی تہی اور اس قادر الکلام سخنور کو قاسم ازل نے ایسی ہمہ دان وہمہ گیر طبیعت عطا کی تہی جس کی بدولت وہ جملہ اصناف سخن پر بخوبی حاوی تھے اور اُنہون نے ثابت کر دکہایا تہا کہ ایشیائی شاعر کسی شعبۂ علمی مین دوسرون سے دب کر رہنے والے نہین - مراۃ الغیب اور صنم خانہ عشق مشہور دواوین کے علاوہ منشی صاحب مرحوم نے نعت ختم المرسلین مین محامد خاتم النبین کے نام سے ایک دیوان لکہا ہے جس کے ایک ایک شعر بلکہ مصرع مصرع مین یاس وحسرت سوز و گداز اور ذوق وشوق کی نہایت سچی تصویرین کہنچی گئی ہین - اس نعتیہ دیوان کے شروع مین چند قصائد بہی ہین جن مین وہ قصیدہ لاجواب ہے جس کا یہ مطلع ہے ؎

نشاطِ دہر ہی ہو کس طرح نہ دل مایوس	کہ چار دن کی یہ مہمان ہے مثل تہرم عروس

اس کے علاوہ بہسار پہول - اعتبار پہول کے قافیہ ور دیف مین بہی قابل دید قصیدہ لکہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نعتیہ دیوان مین منشی صاحب نے محسن کاکوری کے مشہور و معروف قصیدہ (آمد کا ابجد کا) پر مخمس لکہا ہے انصاف کی بات یہ ہے کہ منشی صاحب تضمین کا حق ادا کر گئے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر منشی صاحب سے پہلے کوئی شاعر اُس قصیدے پر تضمین لکہنا چاہتا تو اُن سے بہتر ہرگز نہ لکہہ سکتا - تضمین کے علاوہ منشی صاحب نے خود بہی ایک قصیدہ مندرجہ بالا زمین مین نہایت قابلیت سے تحریر کیا ہے -

اگر یہ خیال نا واقفیت پر مبنی نہ ہو تو مین دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ اسوقت ہندوستان مین ایسا کوئی شاعر نہین جو عشقیہ غزلیات کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ عام طور پر شاعرون کا یہ قاعدہ ہے کہ جو جس صنف سخن پر قادر ہو گیا ہو گیا! پھر دوسرے رنگ مین اول تو اُس سے کچھ لکھا ہی نہین جاتا اور لکھا بھی جاتا ہے تو اوس مین وہ رنگینی پیدا نہین ہوتی۔ بلکہ یہان تک مشاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر تحریر پر زور دیا جائے تو تقریر کمزور ہو جاتی ہے اور تقریر کی مشق کی جائے تو تحریر مین وہ بات نہین رہتی جناب داغ کے ہر سہ دوادین مین جو دو چار نعتیہ غزلین موجود ہین اُن مین وہ رنگ مطلق نہین پایا جاتا جو اون کی عشقیہ غزلون مین عام طور پر نظر آتا ہے۔ یہ کمال منشی صاحب ہی مین تھا کہ وہ ایک ہی وقت مین نعتیہ اور عشقیہ دونون طرح کا کلام بوجہ احسن موزون کر لیتے تھے۔ نعتیہ دیوان کے علاوہ امیر مغفور نے صبح ازل لیلۃ القدر اور شام ابد کے نام سے تین مسدس اور بھی لکھے ہین جن مین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش۔ معراج اور وفات کا حال بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔

خیر یہ باتین تو نظم سے متعلق ہین مگر منشی صاحب نثر مین بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مولد شریف موسوم بہ خیابان آفرینش آپ نے نثر مین خوب تحریر فرمایا ہے اور بعض بعض مقامات پر تو انشا پردازی کا خاتمہ کر دیا ہے خصوصًا اخیر مین جو مناجات تحریر کی ہے اُس کے اکثر فقرے دل پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہین انتخاب یادگار کے نام سے ایک تذکرۃ الشعرا بھی منشی صاحب نے مرتب کیا ہے جس مین قدیم رنگ کی مقفی عبارت لکھی گئی ہے۔

فن لغت پر بھی منشی صاحب کو پورا عبور تھا۔ اس کے ثبوت کیلئے امیر اللغات کی دو جلدین موجود ہین میرے نزدیک اُردو زبان کی قسمت اس لغت سے وابستہ ہے۔

اگر مجھے منشی صاحب کے شاگردون اور عزیزون سے امید نہین کہ وہ کبھی اسکو شائع کرینگے۔ کیونکہ یہ لوگ کام کرنے کے عادی نہین البتہ ایک دوسرے کی تعریف مین رطب اللسان رہنا خوب جانتے ہین۔ منشی امیر احمد صاحب غریب الوطنی کی حالت مین مرجائین تمام دنیا اُن کی وفات پر ماتم کرے مگر اُن کے شاگردان رشید ایسے بے پروا ہون کہ چار سال کے عرصے مین مرحوم کی سوانح عمری یا غیر مطبوعہ کلام کے شائع کرنے کی زحمت گوارا نہ کرسکین۔

مین اصل مطلب سے بہت دور نکل گیا ہون۔ سلسلہ گفتگو یہ تہا کہ آمیر و داغ کا باہم مقابلہ کیا جائے مندرجہ بالا سطور مین جو کچھ لکھا گیا ہے وہ منشی امیر احمد کی خداداد قابلیت کا زبردست ثبوت ہے جو لوگ منشی امیر احمد اور فصیح الملک داغ مرحوم کا مقابلہ کرتے ہین میرے نزدیک وہ منشی صاحب کے رتبے کو اچھی طرح نہین پہچانتے۔ اور جناب داغ کسی طرح اُن کے ہم پلہ قرار نہین دئیے جاسکتے البتہ یہ بات اِس طریق سے ممکن ہوسکتی ہے کہ عام طور پر داغ و امیر صرف غزل کے رنگ مین ایک دوسرے کے مد مقابل سمجھے جاتے ہین اگر صرف یہی صنف سخن قابل سواز نہ خیال کی جائے اور منشی صاحب کی دیگر اقسام سخن سے قطعاً قطع نظر کر لی جائے تو اِس صورت مین جناب داغ منشی صاحب سے کچھ بڑھے لگا کہا سکتے ہین۔ اِس مین کلام نہین کہ اپنے اپنے رنگ مین دونون سخنور کامل استاد تھے اگر جناب آمیر نازک خیالی و مضمون آفرینی مین یکتا تھے تو جناب داغ زبان کی صفائی اور محاورہ بندی مین اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ یا دوسرے الفاظ مین اِس کا مطلب یون سمجھنا چاہیے کہ داغ و امیر کی شاعری مین زمین آسمان کا فرق ہے اول الذکر صرف میدان غزل گوئی کے مرد تھے اور موخر الذکر جملہ اصناف سخن مین یگانہ و فرد تھے۔ مگر باوجود ان تمام خوبیون کے منشی صاحب کے کلام مین

یہ ناگوار نقص پایا جاتا ہے کہ اون کے بعض اشعار کی بندشین بہت ڈہیلی ہوتی ہین اور عام طور پر دبے گرے۔ الفاظ دکہائی دیتے ہین جو اگرچہ ناجائز تو نہین مگر مخل فصاحت ضرور ہین اور اس وصف خاص مین جناب داؔغ کا درجہ منشی صاحب سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھہ داؔغ مرحوم کی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی طرح خواص مین مقبول نہین ہوئی۔ میرے نزدیک یہ اعتراض کچھہ وزن نہین رکہتا کیونکہ انہون نے جو سہل مگر نرالا رنگ اختیار کیا تہا اس کی تقلید اکثر شاعرون نے کی مگر حق بات یہ ہے کہ کسی کو وہ بات نصیب نہین ہوئی۔ گلزار داغ فصیح الملک کی شاعری کا اعلی نمونہ سمجھا جاتا ہے اور واقعی بہ لحاظ مضمون آفرینی و نازک خیالی اُس کا نمبر جناب داؔغ کی دیگر تصانیف سے اوّل ہے۔ مہتاب داغ مین مضامین کی نسبت زبان کا زیادہ خیال رکہا گیا ہے اور گو اوس کا مذاق کیسا ہی عامیانہ اور بازاری ہو مگر اس امر سے انکار کرنا ایک طرح کی ناانصافی ہے کہ مہتاب داؔغ اُردو زبان کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو صنم خانۂ عشق مین منشی امیر احمد صاحب نے بالکل مہتاب داغ کی تقلید کی ہے۔ اور اکثر اشعار داؔغ کے رنگ مین تحریر کیے ہین۔

فصیح الملک مرحوم پر یہ الزام بہی قایم کیا جاتا ہے کہ وہ علوم عربی و فارسی مین کامل نہ تھے مگر جسطرح ہر عالم کا شاعر ہونا ضروری نہین اسی طرح ہر شاعر کا عالم ہونا بہی لازمی نہین۔ اس وقت ہندوستان مین بہت سے فاضل شعرا موجود ہین لیکن عام طور پر پبلک اون کے نام سے بہی آشنا نہین۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حاؔلی ہی کو دیکھہ لیجیے کہ بہ لحاظ فضل و کمال کیا رتبہ رکہتے ہین مگر اون کی شاعری ایسی نہین ہے جس کی کہلم کہلا تعریف کیجائے۔ خود منشی امیر احمد صاحب بہی باین فضل و کمال داؔغ سے زیادہ تو کیا بلکہ اُن کے

برابر بھی ملک میں شہرت نہ حاصل کر سکے۔ اگرچہ دلعزیزی اور قبولیت عام کوئی بُری چیز ہے تو یہ اور بات ہے۔

فی زمانناً اُردو شاعری کے لئے زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس میں وہ کونسے دقائق ہیں جن کو معمولی شاعر آسانی کے ساتھ حل نہیں کر سکتا۔ وُہی دل وُہی داغ وُہی سودا وُہی دماغ۔ وہی صحرا وہی باغ۔ وہی پروانہ وُہی چراغ۔ وُہی گل وُہی بلبل وہی سنبل وہی کاکل وہی ابرو وہی خنجر وُہی یہ وُہی وہ۔ غرض جو کچھ بھی ہے وُہی ہے جواب سے پہلے ہزاروں مرتبہ لکھا جا چکا ہے اور ابھی خدا جانے ہمارے ملکی شاعر آیندہ کب تک اس لکیر کو پیٹے جائینگے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے واقف ہونیکے لئے زیادہ علم وفضل کی ضرورت نہیں معمولی استعداد کا شاعر بھی چند روز کی توجہ سے ان پر بخوبی عبور حاصل کر سکتا ہے۔ مرزا داغ تو کم وبیش پچاس ساٹھ سال تک دنیائے سخن میں کوس لمن الملکی بجاتے رہے بھلا وہ ان باتوں سے کیونکر بے خبر رہ سکتے تھے میرے نزدیک آجکل اچھا سخنور وہی ہے جو زبان ومحاورہ کے استعمال پر قادر ہے ورنہ متقدمین سب کچھ باندھ گئے ہیں اور مضامین کے لحاظ سے شاعری میں جدت پیدا کرنا اب بظاہر ناممکن ہو گیا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ داغ مرحوم نے زبان کی طرف توجہ نہیں کی؟ ایسا سیدھا سادہ۔ عام فہم۔ صاف وشستہ کلام مشکل ہی ہو سکتا ہے اگر یہی سلامت وصفائی داغ مرحوم کی جہالت کا ثبوت ہے تو ابنائے ملک کی سخن فہمی وقدردانی پر ماتم کرنا چاہئے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے داغ مرحوم نے ملک میں جو نام پیدا کیا اُس کی نظیر دنیائے شاعری میں مشکل سے نظر آئے گی۔ اُن کی وفات پر ملک کے ہر گوشے سے ماتمی صدائیں بلند ہوئی ہیں وہ اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ فی الحقیقت داغ مرحوم اپنے کمال میں یکتا تھے۔ ابھی اُن کی وفات کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر ملک میں اُن کے حالات پر چھ سات جگہہ کتابیں شروع ہو گئیں۔ اور

ان کے موءلف داغ مرحوم کے شاگرد نہین بلکہ نصف سے زیادہ غیر آدمی ہین منشی امیر احمد
صاحب کی آجتک ایک سوانح عمری بہی اچہی طرح نہین لکہی گئی ۔

سب سے زیادہ دلچسپ بحث یہ ہے کہ داغ و امیر ہی ایک دوسرے کے
مدمقابل کیون سمجہے گئے کیا لکہنؤ مین منشی صاحب کے علاوہ کوئی اور استاد
نہ تہا جو داغ کا مدمقابل سمجہا جاتا نہین اور بہی استاد ہین اور ضرور ہین مگر زمانہ نے
انکو یہ موقع نہین دیا ۔ منشی امیر احمد صاحب کے شاگرد فطری طور پر اپنے استاد
اور اپنے استاد بہائیون کا نام اچہالنے مین مشاق ہین بہلا وہ کب چوکنے والے تہے
انہون نے وقت کو غنیمت سمجہا اور منشی امیر احمد صاحب کو داغ کا مدمقابل بنا کر
کہڑا کر دیا ۔ فی الحقیقت اس مقابلے سے منشی امیر احمد صاحب کی شہرت کو خوب
ترقی ہوئی اگر اسکے جواب مین یہ کہا جائے کہ امیر ہی داغ کی شہرت کا باعث تہے
تو اس گتہی کا سلجہانا ذرا مشکل ہے ۔ کیونکہ بقول مخالفین داغ ناقابل تہے کیا
ضرورت تہی کہ ایک جاہل شخص سے عالم کا مقابلہ کیا جاتا ۔ بہرحال جو سچی بات ہوتی ہے
وہ پردہ ڈالنے سے ہرگز نہین چہپ سکتی داغ نرا جاہل اور بے علم تہا مگر حسن قبول
اور شہرت عام اپنے بس کی بات نہین ہے جسکو خدائے پاک یہ دولت عطا کرے ۔

یہ خیال بہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ داغ مرحوم ریاست رامپور مین اساتذۂ لکہنؤ کی ہم بزمی سے
خوش گو شاعر بن گئے ۔ یعنی اگر اُن کو یہ موقع نصیب نہ ہوتا تو وہ فن سخنوری مین ادہورے
رہتے شاید یہ بات صحیح ہو مگر جو لوگ داغ کے موافق ہین وہ اس کو یون بیان کرینگے
کہ جملہ اساتذۂ لکہنؤ کے مجمع مین دہلی کا صرف ایک شاعر نواب مرزا خان داغ تہا
جو کامیابی کے ساتہہ سب کا مقابلہ کرتا رہا ۔ ہمین سخت افسوس ہے کہ ہندوستان کے
بعض متعصب پرچون نے داغ مرحوم کی وفات پر محض ہٹ دہرمی سے خلاف
واقعہ رائین لکہین اور اُن کی شہرت پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ۔ معلوم نہین

ان لوگون نے داغ کی زندگی ہی مین کونسی کسر اُٹھا رکھی تھی جو اونکی وفات کے بعد بھی ناگوار خیالات کا سلسلہ جاری رکھنا مناسب سمجھا۔

اچھے شاگردون کے لحاظ سے منشی صاحب ایک خوش قسمت اُستاد تھے۔ جناب داغ کے* تلامذہ کی تعداد امیر کے شاگردون سے بہت زیادہ ہے مگر جتنی زیادتی ہے اُتنی ہی اچھے شاگردون کی کمی ہے البتہ لکھنؤ مین منشی امیر احمد کا کوئی شاگرد معلوم نہین ہوتا۔ مگر اس کے برخلاف دہلی مین داغ مرحوم کے اکثر شاگرد موجود ہین شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ منشی صاحب کو لکھنؤ مین رہنے کا اتفاق کم ہوا لیکن داغ بھی ہمیشہ دہلی سے باہر رہے۔ اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ لکھنؤ مین منشی امیر احمد بحیثیت اُستاد تسلیم نہین کئے گئے اگر یہ خیال صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر لکھنؤ کی شاعری کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ بہرحال اس سے منشی صاحب کی شاعری مین بٹہ نہین لگ سکتا۔ اور نہ اُن کی اُستادی مین کچھ فرق آسکتا ہے۔ منشی صاحب کا لکھنوی ہونا زیادہ قابل فخر نہین بلکہ اون کی ذات خود لکھنؤ کے لئے باعث ناز ہو سکتی ہے۔

اخیر مین یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح داغ کی شاعری پر اودھ پنچ مین اعتراض ہوئے اسی طرح منشی امیر احمد کی زبان پر مولوی غلام محمد خان تپش دہلوی مرحوم اپنے اخبار مشیر قیصر مین جو اُنہون نے لکھنؤ جاکر جاری کیا تھا بہت کچھ تحریر کر چکے ہین۔ داغ و امیر آدمی تھے فرشتے نہین تھے کہ اُن سے کوئی فروگزاشت نہ ہوتی۔ اعتراض کر دینا بہت آسان ہے مگر کمال کا اعتراف کرنا مشکل ہے۔

مین جانتا ہون کہ اس مضمون سے داغ و امیر کا کوئی شاگرد خوش نہ ہوگا۔ مگر مجھے اس کی کچھ پروا نہین۔ مینے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے۔ اگر امیر بھی

کوئی صاحب ناک بہون سکوڑین تو اُنہیں اختیار ہے۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہین ہین میرے اشعار مین معنی نہ سہی

راقم وجاہت صدیقی جھنجھانوی

افسانۂ حرمان

"یعنی"

(مرگِ محبوب)

جب دنکی روشنی آہستہ آہستہ نظرون سے غائب ہوگئی اور تارے آنکھین پہاڑ پہاڑ کر گھورنے لگے تو اُسوقت مینے دیکہا کہ میری پیاری سو رہی تہی، کمزور سانس اُس کے کہلے ہوئے لبون سے ٹکراتی ہوئی آ اور جا رہی تہی، پلکین اُس کی برف کی سی چتونون پر سائے کی طرح پڑی ہوئی تہین اور نیلی دھاریان اُس کی صاف و شفاف جلد مین نمایان ہو رہی تہین۔ جب مینے اپنی دلربا کو اِس حالت مین دیکہا تو مجکو خوف ——— نہیں، نہین، سخت خطرے کا احساس ہوا، اور ایک فرشتے کی تصویر کا فوراً خیال آگیا جسکی صورت کا نقشہ مینے ایک قبر پر بنا ہوا دیکہا تہا۔ ہاتہ باندہے، پر گرائے، مجسم انتظار کا فوٹو۔

اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ اژدرِ غضب اپنی آتشین زبانین نکالے ہوئے میرے دلِ مضطر پر ہر چہار طرف سے حملے کر رہے ہین، جو مجھے دیوانہ اور پریشان کر دینے کو کافی ہین۔ مین کہان سے قوت پاؤن گا، کہان سے ہمت لاؤن گا، آرام کہان حاصل ہوگا، ارے کمبخت کم امن ہی کیونکر نصیب ہوگا؟ اُف! کیا؟

اس پھیلی ہوئی زمین پر پہاڑ سی زندگی بے یار و غمگسار کاٹنی پڑیگی؟ کیا آرام چین کہین بھی میسر نہ ہوگا؟

"کہین نہین، کہین نہین!" روزنِ دیوار کی بادِ صرصر نے یہی جواب دیا ــــ مُرجھائی ہوئی پنکھڑیون کے زمین پر خوبصورتی کے ساتھ گرنے مین بھی یہی آواز پیدا تھی کہ "کہین نہین، کہین نہین!" ـــ چمکتے ہوئے تارے جو میری جلتی ہوئی آنکھونکے برابر ہوئے تو وہ بھی یہی پکار اُٹھے کہ "کہین نہین، کہین نہین!" کیونکہ یہ کل مصیبتین اُن کے نزدیک ایک پُرانی کہانی اور روز کا قصہ ہے ــــ دنیا دکھے ہوئے دلون اور جگرخراش صدمون سے بھری ہوئی ہے۔ انسانی زندگی ایک دیرپا محنت ہے، ایک آواز ہے جس کا کسی طرف سے جواب نہین آتا، ایک دعا ہے کہ جس کے لئے زمین سخت اور آسمان دور ہے۔

میری پیاری چونک پڑتی ہے، اور ایک سرد آہ بھی اُس کے منہ سے نکلتی ہے گری ہوئی پلکین اُٹھتی ہین اور اُس کی بیمار آنکھین میری نظر سے دوچار ہوجاتی ہین۔

"پیارے، تم یہین ہو! تمہارے پہلو مین بیدار ہونا کیسا فرحت افزا ہے!"

"میری پیاری، میری دلربا، خدا کے لئے اِس فرحت کو ہاتھہ سے نجانے دو، اسکو ترک نہ کرو! تمہارے بغیر مین تنہا کیا کرون گا؟ آہ! مین بھی کاش تمہارے ساتھہ ہی اس دنیا کو خیرباد کہتا!"

"نہین پیارے، نہین! کیا تم بھول گئے کہ تمپر ابھی بہت سے فرائض اور بہت سے حقوق باقی ہین؟ دنیا کہتی ہے کہ تم اعلیٰ جوہر، اعلیٰ قابلیت رکھتے ہو۔ تمکو ہرگز نہین چاہئے کہ اس کو کا ہلانہ غم و الم اور ماتم و شیون مین برباد کردو۔ مین تمپر ہمیشہ ناز کرتی رہی ہون اور غالبًا دوسرے عالم مین بھی مین تمہاری ترقیون کو

دیکہتی اور تمہاری کامیابیون پرخوش ہوتی رہونگی"

"پیاری، ہماری کل بلند پروازیان اور سرورشِ غیب تمہارے ساتہہ ایک ایک کرکے چلدینگے - ہمین اپنی سرد اور سنسان زندگی مین کونسی قوت حاصل کرنا، کونسی طاقت پیدا کرنا اور کونسی کامیابی ہوگی جس پرخوش ہونا باقی رہیگا؟"

"میرے دل کے مالک، شروع شروع مین تونہین، مگر جیسے جیسے وقت کچھہ گذرتا جائیگا، طبیعت سنبہلتی جائیگی، اور پہلی حالت پہرقائم ہونے لگ گی"

"پیاری، یہ ہرگز نہین ہوسکتا جبتک کہ زندگی سے زیادہ موت مہربان نہ ہوجائے"

اُس نے زور سے آہ کہینچی اور دل کو سنبہال کر کہا کہ "بیشک سخت افسوسناک اور جگرخراش حالت ہے، مگر، پیارے، اعلیٰ جوہر اور اعلیٰ قابلیت بہت بڑی تسلی دینے والی اور تشفی بخشنے والی چیز ہے - اُس کی وجہہ سے تم زندہ رہوگے اور محنت کروگے"

میرا دل دُکہنے لگا اور ایک لفظ بہی منہ سے نہ نکل سکا -

اُس وقت مجکو ایسا ہی معلوم ہوا کہ لفظ "تسلی"، میرے کانون کو ایسی ہی ناگوار ہے جیسی کوئی بے سر کی تان - وہ اُس وقت ایک بے معنی، کریہہ اور بے آہنگ لفظ سے بڑہکر کچھہ بہی حقیقت نہ رکہتی تہی - تاریکی نے مجکو چارون طرف سے گہیر لیا - میرا ازدار دل گہرے اور تلخ پانی مین ڈوب گیا، اور مین نے اُس کا ڈوب ہی جانا پسند کیا، اور مدد کے لئے ہاتہہ یا آواز بلند نہ کی -

لاعلاج جدائی کی تاریکی آہستہ آہستہ ہم دونون کو اپنے حلقے مین لارہی تہی - اور رفتہ رفتہ بغیر کسی تکلیف کے میری دلربا کی زندگی موسم بہار کی شفق کی طرح، جو ہماری نظرون مین بہت ہی بہلی معلوم ہوتی ہے مٹتی گئی - لیکن ایک روز وہ ایسی اچہی اور

ایسی بہلی معلوم ہونے لگی کہ مین پہر ایک مرتبہ حیلہ سازا مید کے قریب آئین کر اترانے لگا۔

وہ اپنے چارو نطرف تکیون کا ڈہیر لگا کر اور سفید اونی چادر اوڑہکر اُٹہہ بیٹہی۔ اُس وقت ایک خاص خوبصورتی اوس کے ہر عضو مین پیدا ہوگئی اور مین دل و جان سے قربان ہونے لگا۔ آہ! میری عصمت مآب پیاری۔

ہم نہایت خوشی کے ساتہہ بولتے اور ہنستے رہے۔ ہمارا خوف اور رنج نظرون سے الگ کر لیا گیا اور تہوڑی دیر کے لئے ہم اُن کو بہول گئے؛ مگر بہت ہی تہوڑی دیر کے لئے۔

کمرہ سنہری روشنی مین ڈوبا ہوا تہا۔ دریچہ مغرب کی طرف کہلا ہوا تہا جس سے ہمنے آفتاب کو چکا چوندہ کردینے والے رنگ کی آب وتاب کے ساتہہ ڈوبتے ہوئے دیکہا۔ اُسیوقت میری دلربا نے کہا۔ پیارے، وہ کیا ہے جو لوگ کہتے ہین؟

"جو دیوتاؤن کے پیارے ہوتے ہین وہ کمسن مرتے ہین" یہ میرے لئے ایک نیک فال ہے، ہے نہ؟"

مینے اپنی دلبر کی طرف، جو حقیقت مین کمسن اور ایسی تہی کہ دیوتاؤسکو پیار کرین، حسرت کی نگاہون سے دیکہا اور قوتِ واہمہ نے مجہے سنہرے آسمانونکی سیر کرائی، جہان مین نے اپنی دلربا کو ہوا مین معلق پہول کی اُس پتی کی طرح جسے ہوا نے پہولون کے ہجوم سے اُڑا لیا ہو ٹہیرا ہوا دیکہا۔

وہ اب فرشتے معلوم ہونے لگی اور اُس کے چہرے پر ایسے انوار برسنے لگے جیسے آجتک "دو برو بحر مین" کہین بہی نظر نہین آئے۔

تب خوف نے آکر میرا دامن پکڑا اور اوس نازک صورت کے پاس

جا ٹہا لاا ور مینے اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور گلِ سوسن کی طرح سفید معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھین نیم باز اور سانس کمزور تھی۔

آفتاب کے غروب ہونے کی رونق گندمی اور کہربائی مرغزار پر سے، جہان ہم اکثر ہاتھ مین ہاتھ ڈالکر ٹہلا کرتے تھے —— جہان، افسوس، اب کبھی نہ ٹہلینگے —— مٹتی جاری تھی۔ جب شفق کی وہ تمتماہٹ تاریکی کرارغوانی رنگ —— سے بدل گئی تو مینے اپنی دلربا کے چہرے مین بہی ایک عجیب تغیر دیکھا۔ اُسنے اپنے سفید اور کمزور ہاتہون کو میری گردن مین ڈالنے کی کمزور سی کوشش کی اور مینے اُسکو دہیمی آواز مین کہتے سنا کہ "و پیارے خاوند، میرا بوسہ لیجئے!"

اُف، اُف، سرد اور خشک ہونٹھ، جنکو میرے لب کچھ بہی گرم نکر سکے! اُس آخری بوسے نے، افسوس، حیات کو موت سے ملا دیا! آہ، کیون نہ میرا دل بہی اُسیوقت اُس صدمے سے پاش پاش ہوگیا، اور مین بہی کیون نہ اوسکے ساتھ ہمیشہ کے لئے سوگیا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسا نہ ہونے کی کیا وجہ تھی۔

"و میری پیاری، میری پیاری، ایک مرتبہ تو اور بولو —— دہیمی ہی آواز مین سہی —— صرف ایک ہی لفظ سہی!"

آہ! آہ!! کوئی جواب نہین!!! اب فرشتے کسپر حسد کرینگے؟

وزارت حسین

(داوری)

تنقید

(۱) شیو شنبھو شرما مجموعہ عرصے سے کلکتے کے مشہور ہندی اخبار بھارت متر مین شیو شنبھو شرما کے فرضی نام سے کسی واقفکار کی جانب سے لارڈ کرزن کے نام کہلی خطوط کا ایک نہایت دلچسپ سلسلہ جاری ہے۔ ان خطوط مین گہری واقفیت کے ساتہہ سادگی اور مذاق کی آمیزش نے کچھ ایسا لطف پیدا کر دیا ہے کہ ملک کے اکثر اخبارون اور رسالون نے انکی نقل اردو مین شایع کی۔ چنانچہ اس مرتبہ اردوی معلیٰ مین بہی ایک خط کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ بہارت متر کے قابل اڈیٹر منشی بالمکند جی گپت نے ان خطوط کی مقبولیت اور اہمیت پر نظر کر کے حال مین انکا انگریزی ترجمہ بہی شائع کیا ہے۔ جو لوگ اردو یا ہندی زبان سے ناآشنا ہین وہ اس ترجمے کو دفتر بہارت متر کلکتہ سے منگا کر ضرور دیکھین

(۲) فصیح الملک لاہور اس نام کا ایک نیا ماہوار رسالہ داغ مرحوم کی یادگار مین باہتمام سید علی احسن صاحب احسن مارہروی لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مئی ۱۹۰۵ء کا پہلا پرچہ ہر حیثیت سے قابل اطمینان ہے۔ حصۂ نثر مین صحت زبان کا خصوصیت کے ساتہہ خیال رکہا گیا ہے۔ اور اس باب مین حضرت احسن مبارکباد کے مستحق ہین۔ صحت زبان کے علاوہ صحت املا کی جانب بہی توجہ کیگئی ہے چنانچہ شروع ہی مین "جو بولو وہ لکہو" کا صحیح قاعدہ بطور دستور العمل درج کر دیا گیا ہے اور اسپر عمل بہی کیا گیا ہے مثلاً "زمانے کی رفتار" نہ کہ "زمانہ کی رفتار"، "مجموعے مین" لکہا ہے نہ کہ "مجموعہ مین"۔ اس تجویز سے ہمکو بہی اتفاق ہے بلکہ ہم مدت سے اسپر عمل بہی کرتے ہین لیکن اسکے اس حصے سے ہمکو اتفاق نہین ہے جہان لکہا ہے کہ "جو الفاظ الگ الگ لکہے جاتے ہین اجنبی نہین معلوم ہوتے اور جنکی ترکیب بہی جداگانہ الفاظ سے ہے اکثر جدا جدا لکہے جائینگے جیسے وہ آئین گے ہون سگے" "جس کی" "آپس مین" "بل کہ" "کیون کہ" "علاحدہ"

یہان "آپس مین" اور "جس کی" تک تو خیر غنیمت ہے لیکن "بلکہ" اور "کیونکہ" کو "بل کہ" اور "کیون کہ" لکہنا بالکل نامناسب ہے۔

"گزارش" اور "زرا" کے باب مین فصیح الملک کو مضمون نگار حضرت وصل بلگرامی کا بیان صحیح ہے کہ ان الفاظ مین "ذ" کی جگہہ "ز" لکہنا چاہئے- لیکن رواج عام پر نظر کرکے اس تجویز کا مقبول ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے-

حصہ نظم مین پروفیسر کا اقبال یہ مطلع ہے

مجنون نے شہر چہوڑا تو صحرا بہی چہوڑ دے	نظارے کی ہوس ہو تو لیلےٰ بہی چہوڑ دے

کمزوریون اور غلطیون کا مجموعہ ہے جو ہمارے نزدیک فصیح الملک مین اشاعت پانے کے قابل نتہا-

حصہ نظم کے بعد فصیح اللغات کے چند صفحے بہی فصیح الملک مین شایع ہوا کرینگے- پہلے پرچے مین صرف دیباچہ نکلا ہے- غرضکہ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ اچہا اور قدر کے قابل ہے-

حجم ۲ جزو- قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۲ روپے-

صحیفہ اسی ماہ سے حضور نظام کی چہل سالہ جشن سالگرہ کی یادگار مین حیدرآباد دکن سے صحیفہ نام ایک اور بہی ماہوار رسالہ سید صفی الدین حسن صاحب کیفی حیدرآبادی کے اہتمام سے نکلنا شروع ہوا ہے- یہ رسالہ ہر لحاظ سے اچہا ہے- حجم ۴۲ صفحے قیمت سالانہ ۲؍- پہلے پرچے مین حضرت ظہیر دہلوی کی ایک نہایت عمدہ غزل شایع ہوئی ہے جسکے چند منتخب شعر یہ ہین-

اے راہ روِ ملک عدم خواب کہان تک	دل بستگی عالم اسباب کہان تک
اے دیدۂ تر بارش خوناب کہان تک	دامن مین بہار گل شاداب کہان تک
تاچند جگر کاوی افغان عزا بار	دل سوزی فریاد جگر تاب کہان تک
تاچند شب افروزی مصباح کواکب	تابندگی کرمک شب تاب کہان تک
تاچند ہم آغوشی خوبان گل اندام	آسودگی بستر سنجاب کہان تک
تاچند نظربازی و پابندی تقوی	ہمسائیگی شعلہ و سیماب کہان تک

اے شہرت فغفور وجم صولت بر زو — ہان شوکت اسکندر و دارا یکہان تک
رندی و ہوس ناکی و پندار جوانی — میخواری و لطف شب مہتاب کہان تک
عبرت کا محل ہے یہ فضائے چمن دہر — ایام بہار گل شاداب کہان تک
انجام پہ موقوف ہے ہر چیز کا آغاز — مفتوح رہین عیش کے ابواب کہان تک
یہ غمکدۂ دہر نہین جائے اقامت — دوران بقائے کف سیلاب کہان تک
پہچانتے ہین جانتے ہین خوب نظرباز — آخر یہ کرشمے پس جلباب کہان تک

بیدار رہو بیدار ظہیر قدح آشام
اے بیخبر عزم سفر خواب کہان تک

مراۃ الجہاد جلد اول حجم ۲۱۶ صفحے قیمت ۲ - اس کتاب مین مسئلہ جہاد پر ہر پہلو سے محققانہ بحث کی گئی ہے اور ضمناً رسالہ جہاد مولفہ پنڈت لیکھرام صاحب آریہ مسافر کا جواب بھی دیا گیا ہے - کتاب دلچسپ ہے اور قابل خرید - از تالیف مولوی سید وزارت حسین صاحب احمدی جنکا ایک بہت اچھا مضمون اس مرتبہ مرگ محبوب کے عنوان سے اردوی معلیٰ مین شائع کیا جاتا ہے - کتاب دفتر الحکم قادیان سے ملسکتی ہے -

---

حصہ نظم

غزل جناب مولوی ضمیر الدین احمد صاحب رئیس گیا شاگرد رشید حضرت تسلیم لکھنوی مدظلہٗ

دیکھے دم مجھہ سخت جانکو تونے بیجان کر دیا — واہ کس خوبی سے اس مشکل کو آسان کر دیا
جسم پر میرے جراحت کی بدل دین صورتین — تو نے زخمونکو نمک بھر کر نمکدان کر دیا
داغ دل چمکے ہوئے ہین جل رہا ہون بیتہرے — سوزش غم نے چراغ شام ہجران کر دیا
رات جو تارے چمکتے تھے کہان ہین صبحدم — کیسی کیسی صورتون کو اوسنے پنہان کر دیا

کیا کہون کاہش سے نے اوس غنچہ دہن کی عشق مین
مجکو تار دامن گلہاے خندان کر دیا

دلمین بلبل کے محبت بہی اوسی نے ڈال دی
جسنے باغ دہر مین گل کو نمایان کر دیا

آدمی ہی پر نہین انسان ہونا ختم کچھہ
انس نے حیوان مطلق کو بہی انسان کر دیا

کچھہ میری مشکل نہین یونس کی مشکل سے سوا
کیسی کیسی مشکلون کو تو نے آسان کر دیا

وجد کے لایق سخندانی مگر اوسکی ہے عرش
جسنے اپنے فیض سے تجکو سخندان کر دیا

غزل جناب رضا علیصاحب وحشت متوطن کلکتہ

دل خستہ ذوق الم سے خوش غم یار اپنا اثر سے خوش
کوئی غیر کی ہے ضرر سے خوش کوئی آپ اپنے ضرر سے خوش

یہی رسم منزل عشق ہے کہ ہین سب پرائے ضرر سے خوش
جو مژہ ہے پارۂ دل سے خوش تو ہے چشم لخت جگر سے خوش

نہ خیال ذوق وصال کا نہ دماغ بزم نشاط کا
رہی مجکو عیش دوام سے جو کرے تو ایک نظر سے خوش

ہر اک اپنے رنگ مین محو ہے یہ ہے لطف وادی عشق مین
جو خوشی ہے صید کو زخم کی تو کمانکش اپنے ہنر سے خوش

سے یہ ملوثون اونکی قسمیہ مین مجہے اعتماد ہوا اون پہ کیا
جو عدو سے آنکی بگڑ گئی تو مین کیون ہون ایسی خبر سے خوش

وہی ایک ذوق خیال ہے نہ الم ہے کچھہ نہ ملال ہے
یہ کمال شان جمال ہے دل و جاں ہے جسکے اثر سے خوش

جو ہے ربط چشم کو اشک سے تو لگاو دلکو ہے زخم سے
یہ صدف ہے اپنے گہر سے خوش یہ شجر ہے اپنے ثمر سے خوش

میری طبع نکتہ شناس کی وہ نظر اکتو نکو تو دیکہہ لین
انہین نازکی کا غرور ہے کہ ہوئے ہین اپنی کمر سے خوش

کوئی صبح ایسی نہین ہوئی کہ چمن مین تو میرے ساتہہ ہو
دل ناشگفتہ مرا کبہی نہوا نسیم سحر سے خوش!

الم شکستگی قدم ہے کفیل عشرت جانفزا
ہو دیار یار کا ہو سفر تو ہو کون پہر نہ سفر سے خوش

اثر زمان گزشتہ کچھہ جو ہے دستیاب تو ہے یہی
تری یادگار سے جانکر ہین ہون اپنے داغ جگر سے خوش

دل و جان وحشت بینوا ہے شہید لذت شعر کا
کوئی خوش ہو یا نہوا اسکو کیا وہ ہے آپ اپنے ہنر سے خوش

جناب مولوی عبد الحی صاحب بیخود بدایونی۔

نہان ہو آنکہہ سے دم بہر یہ جلوا ہو نہین سکتا
مری جان دیکہنے والے سے پردا ہو نہین سکتا

وہی ہے زندۂ جاوید جو مر جاے فرقت مین
وہی بیمار اچہا ہے جو اچہا ہو نہین سکتا

مسرّتِ حیرت نے اونکو محو حیرت کر دیا ورنہ
تماشا اسطرح محو تماشا ہو نہیں سکتا

تماشے تھے ہو مشاؤ ہمکو لیکن یہ بھی سُن رکھو
کر ایسا سننے والا مست کے پیدا ہو نہیں سکتا

میرا دل آپکا ٹھہرا اگر تو آپ میرے ہیں
یہی ٹھہری تو پھر اپنا پرایا ہو نہیں سکتا

یہی تم تھے کہ آئینے سے سونہہ اپنا چھپاتے تھے
وہی تم ہو کہ اب غیروں سے پردا ہو نہیں سکتا

وصالِ یار تمہید فراق ہر دو عالم ہے
ملہ کہ اوسکا ہو کے پھر کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

وہ میرا اشتیاق ہمکناری وصل میں بیخود
وہ اوس کا سنکے یہ کہنا کہ ایسا ہو نہیں سکتا

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

جزاک اللہ اڈیٹر"

واہ کیا خوب قدر کی دل کی
نہ سنی تو نے ایک بھی دل کی

آپ پہلو سے میرے اوٹھ کے چلے
لیجئے موت آگئی دل کی

صورتِ شمع زرد رخ ہے مرا
نہیں بجھتی کبھی لگی دل کی

خوش ہوں موت آئی عشق میں جو مجھے
آگئے جو کچھ کرو خوشی دل کی

ضبطِ فریاد میں کٹی شبِ ہجر
شکر ہے بات رہ گئی دل کی

کیوں رولاتا ہے چھیڑ کر ناصح
دیکھ اچھی نہیں ہنسی دل کی

مست ہیں نشۂ جوانی سے
کیا خبر آپ کو کسی دل کی

سخت مشکل ہے اہل دل کے لئے
دوستی ہو کے دشمنی دل کی

بڑھتا جاتا ہے طولِ گیسوئے یار
گھٹتی جاتی ہے زندگی دل کی

یاس دیکھو کہ جسکو کہتے ہیں موت
وہ تمنا بھی مر گئی دل کی

وہ زمانہ اب آیا اے محشر
ہے ہر اک بزم میں ہنسی دلکی

غزل حسرت موہانی

اضطراب عاشقی پھر کارفرما ہو گیا
صبر میرا ناشکیبائی سراپا ہو گیا

سادگیہائے تمنا کے مزے جاتے رہے
ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

واسئے ناکامی نہ سمجھا کون ہے پیش نظر
مین کہ حسن یار کا محو تماشا ہوگیا

بعد مدت کے ملے تو شرم مجھسے کس لیئے
تم نئے کچھ ہوگئے یا مین نرالا ہوگیا

صرف مین دیوانہ اوس کی خوبی پنہان کا تھا
ایک حسن یار کا وہ بھی زمانا ہوگیا

میری ایذا اوس ستم پرور کو تھی مد نظر
شیوہ صبر آزمائی کا بہانا ہوگیا

شورشین جاتی رہین وہ آرزوئے وصل کی
رنج دوری مرہم زخم تمنا ہوگیا

سحر وہ کیا تھا نگاہ آشنائے یار مین
جو دل بیمار کے حق مین مسیحا ہوگیا

عرض ترک جور پر اللہ ری انکی خفگیان
یہ بھی گویا لطف پنہان کا تقاضا ہوگیا

ضبط سے راز محبت کا چھپانا تھا محال
شوق گر پنہان ہوا غم آشکارا ہوگیا

ہے زبان لکھنؤ مین رنگ دہلی کی نمود
تجھسے حسرت نام روشن شاعری کا ہو

کوئل

(ورڈسورتھ کی ہردلعزیز نظم کوکو کا ترجمہ)

اس مختصر مگر دلچسپ نظم مین ورڈسورتھ نے اپنے ان اچھوتے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ایام طفولیت مین کوئل کی کوکو سنکر اسکے دلمین پیدا ہوتے تھے۔ انگلستان کا یہ زندہ دل شاعر بحر تخیل کا اتنا بڑا شناور تھا کہ بچپن ہی کے زمانے سے یہ زمین و آسمان۔ شجر و حجر۔ چرند و پرند۔ یعنی کل کائنات اسکی نگاہ مین سراب کی طرح موہوم نظر آتی تھی اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ اسکول جاتے ہوئے یہ درختون اور دیوارون کو اس غرض سے چھو دیا کرتا تھا کہ دیکھین یہ فی الواقع مجسم چیزین ہین یا میرے خیالات کی محض عکسی تصویرین۔

ناظرین اگر اس تمہید کو پیش نظر رکھکر مندرجہ ذیل نظم کا مطالعہ کرینگے تو امید ہے کہ اسکا مفہوم پوری طرح سمجھ مین آجائیگا۔

محمد شہاب الدین خان

اے پیاری پیاری چڑیا۔ آنا ترا مبارک	(۱)	کوکو تیری مبارک آگانا تیرا مبارک
پہلے بھی مین نے اکثر گانا ترا سنا ہے		سنتا ہون پھر یہ نغمہ ہان تجھکو مرحبا ہے
سچ سچ مجھے بتانا۔ کیا اصلیت تری ہے		کوئی پرندہ ہے تو!۔ یا قاف کی پری ہے
یا اک صدائے شیرین چکر لگا رہی ہے		تانین سنا سنا کر نشتر لگا رہی ہے
جسدم کہ لیٹتا ہون فرش زمردین پر	(۲)	دوہری صدائین تیری سنتا ہون مین مکرر

اگر پہاڑیوں سے - رہ رہ کے - باری باری ۔۔۔ دور اور قریب سے پیہم دیتی ہیں سنائی

(۳) ہمدم ہے تیرا دادی کو یہ جتانا ۔۔۔ پھر موسم گل آیا - پلٹا ہے پھر زمانا

پر میرے حق میں طرفہ پیغام تو ہے لاتی ۔۔۔ بچپن کے بھولے بسرے دن یاد ہے دلاتی

(۴) اے فصل گل کی پیاری! شاباش! خوب آئی! ۔۔۔ تو اب بھی میرے آگے اک چیز ہے ہوائی

چڑیا نہیں ہے ہرگز - آواز ہے تو گویا ۔۔۔ نظروں سے میری پنہاں - اک راز ہے تو گویا

(۵) لاریب تو وہی ہے سنتا تھا جس کا گانا ۔۔۔ جب تھا میں طفل مکتب اور خوب تھا زمانا

بیشک یہی صدا ہے جسکے لئے میں ہر سو ۔۔۔ کیا جھاڑی کیا فلک اور - کیا تکتا ہی دلجو

ہر سمت دیکھتا تھا - ملتا نہ تھا ٹھکانا ۔۔۔ آتی صدا کہاں سے - ہے کسکا طرز نغما

(۶) میں جستجو میں تیری برسوں رہا پریشان ۔۔۔ چھوڑا نہ کوئی جنگل نے سبزہ زار و بستان

اے شوخ تیری صورت لیکن ہوئی نہ ظاہر ۔۔۔ امید ہی رہی تو - یا آرزوئے خاطر

(۷) اے پیاری پیاری چڑیا - پھر تیری جستجو ہے ۔۔۔ پھر تیری کوکو سننے کی دل میں آرزو ہے

اے کاش لوٹ آئیں ایام نوجوانی ۔۔۔ آجائے یاد پھر سے - گذری ہوئی کہانی

(۸) اے طائر خجستہ - یہ دار رنج و حرمان ۔۔۔ تیرے وجود سے ہے - بصورت پرستان

لاریب تیرے قابل پریوں کی یہ سرا ہے ۔۔۔ یہ اسلئے کہ تو بھی ان کی طرح ہوا ہے

محمد شہاب الدین خان - بی - اے (بھاگلپور)

مولانا حالی

معدنِ علم و عمل مخزن صد فضل و ہنر ۔۔۔ موجدِ طرز سخن لطف زبان را مصدر

اے کلام تو پسندیدۂ ارباب نظر ۔۔۔ ایکہ پُر درد بیانِ تو اثر سر تا سر

نیر برج سخن روح معانی ہستی

غالب نکتہ بیان سعدیٔ ثانی ہستی

بندشیں چست تو فقرے ہیں غضب کے نایاب ۔۔۔ جتنے الفاظ ہیں وہ پھول ہیں گویا شاداب

تجھسے وابستہ ہیں شیرین سخنی کے ابواب ۔۔۔ فکر روشن ہے تیری رشک ضیائے مہتاب

دلربا طرز سخن شوخی بھی انداز بھی ہے

سننے والونکے لئے سوز بھی ہے ساز بھی ہے

نازشِ حافظِ شیراز تری طبع روان
سب سے انداز جدا سب سے الگ رنگ بیان

ایک تو سادگی پھر اوسپہ اسلوب زبان
تجھمین جو بات ہے واللہ وہ اورونمین کہان

تیری چہکار بھی ہے پند و نصیحت سے بھری
بلبلِ ہند چہ گوئم کہ عجب عشوہ گری

شاعری کے ہین نئے ڈہنگ ترالی انداز
طائر فکر کی ہے عرش کے اوپر پرواز

شیوۂ سحر بیانی پہ ہے قدرتکو ناز
نغمہ سنجی کی جو پوچھو تو عجب سوز و گداز

تیرے اعجاز کی اک خلق تماشائی ہے
جلوۂ شان کلیمی ہے مسیحائی ہے

گمرہونکے لئے ہے شمع ہدایت تری ذات
دور کرتی ہے کہین نیند کی غفلت تری ذات

پست ہمت کی بڑہا دیتی ہی ہمت تری ذات
آڑے جو قوم کے آئی وہ ہے دولت تری ذات

ہوگئی کایا پلٹ تیری فغان سے سچ ہے
نیند کے ماتے اُٹھے شور اذان سے سچ ہے

وقت ایسا تہا پڑا قوم کے بیڑے پہ کٹھن
موج کا زور تہا چلتی تہین ہوائین سن سن

ناخدا کوئی نہ تہا اسپہ ہزارون دشمن
ڈوبنے کے تہے مگر سارے ہمارے لچھن

ڈوبنے والون کو صد شکر بچایا تو نے
کہنیچکر ورطۂ آفت سے نکالا تو نے

راستبازی کے حقیقت کے چلن تو نے بتائے
جہوٹ اور سچ مین ہین جو فرق زمانیکو دکہائے

نکتہ دانی پہ یہ عاجز تری شیدا ہو جائے
ایسے محسن کے قدم پائے تو آنکہون سے لگائے

اے ہمہ شکل تو مطبوع ہمہ جائے تو خوش
دلم از عشوۂ شیرین شکر خائے تو خوش

محمد فخر الدین خان عاجز بہاگلپور فقط

گلزار نسیم

ابھی پھولوں کی محفل میں سیر وہ رفتار نہیں	وہ پھول ہوں جو کہ کسی کے گلے کا ہار نہیں

گذشتہ مارچ اور اپریل کے دلگداز میں میرے عنایت فرما عبد الکلیم صاحب شرر کے دو مضمون گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئے ہیں جو کہ قدر دانان نسیم کے لیے کسیقدر دلخراش ثابت ہونگے غالباً یہی گلزار نسیم کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے جس کی ترتیب دینے کی خدمت میں نے اپنے ذمہ لی تھی یہ اسی ایڈیشن کی اشاعت ہے جس نے حضرت شرر کی روشنی طبع کو اشتعال دی ہے حضرت ممدوح نے جو کچھ گلزار نسیم کی نسبت تحریر فرمایا ہے اسکا مناسب جواب نہایت مشکل ہے کیونکہ جیسا کہ ذیل کی تحریر سے ثابت ہوگا آپکے مضامین خود زبان حال سے آپکے دلائل کی تردید کرتے ہیں لیکن ان مضامین کو اتقان سخن کی دلیل اکثر غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس خیال نے مجھکو ذیل کی چند سطریں لکھنے پر مجبور کیا

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

حضرت شرر نے اپنے پہلے مضمون کی تمہید میں تحریر فرمایا ہے کہ "اگر اس مثنوی (گلزار نسیم) کے محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اُن نظموں میں ہے جیسی کہ اُردو شاعری کو اپنی اصلی حالت میں بہت کم ہی نصیب ہوئی ہونگی لیکن اسکے ساتھ ہی اُسکے معائب پر نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم میں نہیں ہیں" یا اسی سلسلے میں آپ پھر تحریر فرماتے ہیں کہ "جسوقت اسکے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو اسقدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہو کر تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ اس سے اچھی نظم نہیں ہو سکتی اور جسوقت اسکی غلطیوں کی طرف توجہ کیجئے تو خیال گذرتا ہے کہ شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں اتنی غلطیاں ہوں گی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام میں ہیں

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شرر نے ان الفاظ کے پردے میں کیا معنی پوشیدہ رکھے ہیں
ظاہر الطور پر جو معنی ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں وہ اصولاً قابل اعتراض نظر آتے ہیں یعنی جس
نظم کی نسبت یہ کہا جائے کہ محاسن کے اعتبار سے اسکا شمار ان نظموں میں ہے جیسی کہ اردو
شاعری کو دو ہی چار نصیب ہوئی ہوں گی - اسی نظم کی نسبت یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ
اسمیں اسقدر غلطیاں ہیں جنکا پتا کسی اردو شاعر کے کلام میں نہ ملتا ہو - مگر چونکہ اصل واقعات سے
اس دعوی کی تردید ہوتی ہے - لہذا میں اسکے متعلق اصول کی بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا
حضرت شرر نے اپنے دوسرے مضمون میں گلزار نسیم کے جن اشعار پر اعتراض کیا ہے ان کی
تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہیں ہے - گلزار نسیم میں تقریباً ڈیڑھ ہزار شعر ہیں - اب اگر بفرض محال یہ
مان لیا جائے کہ حضرت شرر کے سب اعتراض بجا ہیں اس حالت میں بھی گلزار نسیم میں تین
یا چار فیصدی اشعار قابل اعتراض ثابت ہونگے چونکہ حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ آپ
کو علاوہ ان اعتراضات کے اس مثنوی میں اور بھی بہت سے شبہات ہیں" اسلئے یہ بھی فرض کر لیا جاتا
ہے کہ جسقدر اعتراضات حضرت شرر نے تحریر فرمائے ہیں وہ صرف "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں
اور اصل میں حضرت شرر ان اعتراضات کے چوگنے اعتراضات پیش کر سکتے ہیں اس حساب سے
بھی گلزار نسیم میں بارہ یا تیرہ فیصدی سے زیادہ اشعار قابل اعتراض نہ نکلینگے - لہذا اسوقت
حضرت شرر یہ فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم سے "زیادہ عیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں" تو کیا حضرت
موصوف کا یہ مطلب ہے کہ کسی اردو شاعر کے کلام میں بارہ فیصدی یا تیرہ فیصدی شعر بھی قابل اعتراض
نہ نکلینگے - میں اسکا انصاف سخن شناسوں کی رائے پر چھوڑتا ہوں - کیونکہ جس شخص کی نظر سے
دس پانچ اردو شعرا کا کلام بھی گذرا ہوگا وہ اس امر کا فیصلہ نہایت آسانی سے کر لیگا کہ حضرت
شرر کے اس دعوی کی تائید واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے - یوں تو کہنے کو جسکا جو جی چاہے
کہہ سکتا ہے میر حسن ہی کی مثنوی کی نسبت ایک بزرگ کا قول ہے "بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا
سانڈے کا تیل بیچتے ہیں - بھلا اسکو شعر کیونکر کہئیے سارے لوگ دلی کی لکھنؤ کی رنڈیوں سے

[illegible]

چلی وانسے دامن اُٹھاتی ہوئی
کرِشمے سے کرشمے کو بچاتی ہوئی

(آبِ حیات مصنفہ محمد حسین صاحب آزاد) ظاہر ہے ان بزرگوں نے کچھ سمجھ ہی کے یہ فرمایا ہوگا جس طرح ان بزرگوار کو میر حسن کی مثنوی کے مقبول عام ہونے پر حیرت ہے۔ اسی طرح حضرت شرر فرماتے ہیں کہ "گلزار نسیم کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے حیرت انگیز ہے" ان دونوں بزرگوں کا جواب فصیح شیراز کئی سو برس پیشتر دے گیا ہے کہ

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

ہاں اس موقع پر میں اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ گلزار نسیم کی شہرت کا ایک بہت بڑا راز یہ بھی ہے کہ اسمیں محاسن کے مقابلے میں معائب بہت ہی کم ہیں یا برابر ہونے کے ہیں اور اردو زبان میں بہت کم نظمیں ہیں جو اس صورت میں اسکا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

حضرت شرر کے مضمون کے اس تمہیدی حصے کے انداز تحریر سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت موصوف پنڈت دیا شنکر نسیم ہی کو گلزار نسیم کا مصنف تسلیم کر لیتے ہیں اور جیسا کہ دکھلایا جائیگا اس مضمون کے آخری حصے میں بھی حضرت شرر نے یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن مضمون کے درمیانی حصے میں آپنے اس پرانے قصے کو کہ گلزار نسیم آتش کی لکھی ہوئی ہے اس پردے میں تازہ کیا ہے کہ گلزار نسیم کا بہترین حصہ آتش کے زور فکر کا نتیجہ ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب و اختصار کا (یہ) آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی اشرف مرحوم۔ جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اسی پہلی دور کے یادگاروں میں تھے اس واقعے کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے۔ بلکہ انکا بیان تھا کہ پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے مسودے [illegible] اوراق بھی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ جو بہت ہی عام دہلی کے [illegible] ہیں کہ سوا ایک مثنوی [illegible] شرر کے کسی کہنہ مشق شاعر کی جانب نہیں منسوب کیا [illegible]

اس بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی ہمارے بعض بزرگوں کے سامنے کی تھی" قبل اسکے کہ حضرت شررؔ کے اس بیان کی نسبت کچھ عرض کروں اتنا ضرور کہونگا کہ منشی اشرف علی مرحوم کی اس زبانی شہادت سے مجھکو عبد الغفور خاں نساخؔ کی شہادت زیادہ پُر زور معلوم ہوتی ہے جنہوں نے صاف الفاظ میں لکھدیا ہے کہ نسیم لکھنوی مشرف بہ اسلام تھے۔ حضرت نساخؔ بھی آخری دور کے یادگاروں میں تھے اور بقول غالبؔ شیخ ناسخؔ تو محض طرز کے ناسخ تھے وہ بصیغہ مبالغہ نساخ تھے لہذا اگر ان کی شہادت پر اعتبار کیا جائے اور انہیں کی تائید میں دلائل پیش کئے جائیں تو گلزار نسیم کا نقاد ان کاوشوں سے نجات پا سکتا ہے جو حضرت اشرف کی زبانی شہادت کی پیروی کرنے میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مخالف کہہ سکتا ہے کہ یہ امر کہاں تک قابل اعتبار ہے کہ حضرت اشرف نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا۔ کیونکہ بتدی شعرا کا یہ عام دستور ہے کہ جب تک اُستاد سے اصلاح نہیں لیتے وہ اپنی ایک معمولی غزل بھی کسیکو نہیں دکھاتے۔ اس حالت میں نسیم مرحوم ایسی مثنوی کا مسودہ کسی شخص کو دکھانے کی جرأت کیونکر کرتے جسمیں کہ باوجود آتش کی زبردست اصلاح کے اسقدر معائب موجود ہیں کہ اسکے دیکھنے سے "یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کے کلام میں اتنی غلطیاں نہ ہونگی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام میں ہیں" علاوہ اسکے یہ بھی سب جانتے ہیں کہ نسیم دہلوی سے اور شعرائے لکھنؤ سے عموماً معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور یہ بھی سنا ہے کہ نسیم لکھنوی اور نسیم دہلوی سے خصوصاً چوٹ چلا کرتی تھی۔ ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھکر عقل سلیم اس امر کو قبول نہیں کرتی کہ نسیم لکھنوی نے اپنی مثنوی کا مسودہ نسیم دہلوی کے ایک شاگرد کو دکھایا ہو۔ یا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا تب بھی یہ امر غور طلب ہے کہ ان کی رائے نسیم لکھنوی کے کلام کی نسبت کسقدر منصفانہ ہو سکتی ہے۔ اردو شاعروں کا یہ عام دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اُستاد کو بیجا فروغ دینا اپنا ایمان سمجھتے ہیں اور اپنے اُستاد کے مقابل کے شعرا کو مٹانا اپنا ایمان نہیں تو اپنا فرض ضرور سمجھتے ہیں۔ آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کے شاگردوں کی معرکہ آرائیاں ضرب المثل ہو گئی ہیں۔ اس صورت میں اگر اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کے مسودے کو عام مذاق کا بتلا کر حق شناسی

ہوگیا ہو وہ مثنوی مذاق زمانے کی روش کے لحاظ سو بہت بجا کیا۔ ان باتوں سو قطع نظر کرکے اشرف مرحوم کی تنقید کی نسبت یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہی کہ خدا جانے حضرت اشرف نے "عام مذاق" سے کیا مراد لی ہو۔ ممکن ہو کہ حضرت اشرف کے "مذاق شاعری" کا معیار غیر معمولی طور سو بلند ہو اور گلزار نسیم کا مسودہ اس خاص معیار کے لحاظ سو "عام مذاق" کا خیال کیا گیا ہو۔ اور کون جانتا ہی کہ اگر گلزار نسیم کی موجودہ حالت کی نسبت حضرت اشرف سو رائے پوچھی جاتی تو وہ اب بھی اسکو "عام مذاق" کا نہ بتلاتے۔ چنانچہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہو حضرت اشرف مرحوم کی زبانی شہادت ایسی مجمل ہے کہ اسمیں سینکڑوں شاخسانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ عبدالغفور خاں نساخ کی تحریری شہادت اس سو زیادہ صاف اور زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مجھکو اس سلسلے میں ایک اور روایت یاد آئی جو کہ ان دونوں روایتوں سو زیادہ دلچسپ ہے۔ لکھنؤ کے ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جو کہ اس آخری دور کے یادگاروں میں تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے میرے عنایت فرما پنڈت بشن نرائن صاحب در سے یہ روایت بیان کرتے تھے کہ گلزار نسیم اصل میں حضرت پروانہ کی تصنیف ہے۔ حضرت پروانہ آتش کے ہمعصر تھے۔ آتش کو پروانہ کی یہ تصنیف کسی طرح ہاتھ لگ گئی۔ انہوں نے اصلاح وغیرہ دیکر نسیم سے ایک مشاعرے میں پڑھوا دی۔

ان بزرگ نے بھی غالباً یہ روایت معتبر ذرائع سے سنی تھی۔ یہ مختلف روایتیں سنکر میرے دل میں یہ خیال گذرتا ہی کہ گلزار نسیم میں باوجود اسقدر عیب کے جتنے "زیادہ عیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں" یہ عجب تماشہ ہی کہ اسکو کوئی آتش کے طرف صاف طور پر منسوب کرتا ہے کوئی یہی روایت دبی زبان سے بیان کرتا ہے۔ کوئی اسکو حضرت پروانہ کے پرواز فکر کا نتیجہ بتاتا ہی کوئی اسی مثنوی کے بدولت نسیم لکھنوی کو اسلام کی دولت سے مالامال کئے دیتا ہی۔ غرضیکہ گلزار نسیم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مگر اسکے مصنف کے زور طبع کا یہ طرفہ اثر ہے کہ ع

بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداخت

پھر سوچتا ہوں کہ ممکن ہی کہ ان روایتوں کے گھڑنے والے محبت کی بنا پر قائم ہوں۔ ان روایتوں کے لکھنے والوں کا یا بیان کرنے والوں کا یہ منشا ہو کہ پنڈت دیاشنکر نسیم کا نام ایسی مثنوی کے ساتھ

نہ وابستہ ہی "جس سے زیادہ عیوب کسی اُردو نظم میں نہیں ہیں" اور جس سے لازمی طور پر نسیم مرحوم کی بدنامی متصور ہی۔ بیشک مجھکو تعجب ہے تو اسقدر کہ مجھکو جو کچھ اس مثنوی کی تصنیف و تالیف کی مطابق معلوم ہوا کہ وہ ان روائتوں کے خلاف معلوم ہوا۔ حکیم رضا حسین صاحب سہا مرحوم میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی تھے اُن کی خدمت میں مجھے برسوں نیاز حاصل رہا۔ اور بہت مرتبہ گلزار نسیم کا ذکر بھی آیا۔ اُنہوں نے مجھسے کبھی یہ نہ کہا کہ گلزار نسیم میں آخری تصرّف و اختصار کا عمل خواجہ آتش کے قلم سے ہوا تھا یا آتش نے تفنن طبع کے طور پر یہ مثنوی لکھکر نسیم کو دیدی تھی۔ بلکہ وہ کہتے تھے کہ میر وزیر علی صبا ہمیشہ ایسی روائتوں کی تردید فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گلزار نسیم خاص پنڈت دیاشنکر نسیم کی تصنیف ہے۔ بیشک حسب دستور اسمیں کہیں کہیں آتش کی اصلاحیں موجود ہیں اور میر وزیر علی صبا پر کیا منحصر ہے۔ تمام سخن شناس اور انصاف پسند اہل اسلام کو اس سے انکار نہیں کہ گلزار نسیم نسیم ہی کی تصنیف ہے۔ بقول اڈیٹر اودھ پنچ کے لکھنؤ کے بنگڑ خاندان کے سوا اب یہ روائت کہیں نہیں سنی جاتی کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف کی ہوئی مثنوی ہے چنانچہ یہ باتیں ملحوظ خاطر رکھکر میں نے اس روایت کی نسبت صرف اسقدر لکھدینا کافی سمجھا تھا کہ "سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے آتش نے اپنی زندگی میں اس رنگ میں ایک شعر نہیں کہا۔" اس دلیل کی تردید میں حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ غزل اور چیز ہے اور مثنوی اور چیز۔ انسان کی طبیعت جو رنگ غزل میں دکھاتی ہی ضرور نہیں کہ وہی رنگ مثنوی میں بھی دکھائے۔۔۔۔۔ دیوان (آتش کے دیوان) کے رنگ کو پیش کر کے مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اس بات کا ثبوت دیتا ہی کہ مسٹر چکبست کو اسکی خبر ہی نہیں کہ شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن میں جداگانہ رنگ دکھایا کرتا ہی۔ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انہیں نوعمر شاگرد سے تھی۔ (اس دلبستگی کی وجہ آپنے نہ بتلائی) اس کی تحریک سے یا اسکی مشق اولین دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو" مجھکو افسوس ہی کہ حضرت شرر نے شاعرانہ مذاق کی رنگا رنگی کی نسبت جو سبق مجھے دیا ہی میں اسکو قبول نہیں کر سکتا اور میں کیا جو شخص اصول شاعری سے کچھ بھی واقفیت

انکا تو وہ میری ہی خیال کی تائید کریگا یہ یاد رہے کہ شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ ایک ہی ہوتا ہی لیکن رنگ مختلف پیرایوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہی۔ پیرایے بدلتے رہتے ہیں۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہی جسمیں اس کی فطری طبیعت کا عکس پڑتا ہی۔ آئینے کی ساخت میں تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں مگر عکس کی ہیئت نہیں بدلتی۔ غزل ہو یا مثنوی یا مسدس ہو ہر پیرایے میں شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ نظر آتا ہی۔ مثلاً جس شاعر کی طبیعت میں روانی اور آمد ہی وہ ہر صنف سخن میں یہی مذاق نباہیگا۔ اگر اسکے مزاج میں آورد کو دخل ہی تو اسکی غزل ہو یا مثنوی یا مسدس سب میں اسی مذاق کا پتا ملیگا۔ میر کی غزلوں میں جو سوز گداز ہی وہی انکے مثنویوں میں موجود ہے داغ کی غزلوں میں جو شوخی اور بیباکی کا رنگ ہے وہی اسکی مثنوی فریاد داغ کا رنگ خاص ہی۔ ممکن ہو سکتا ہی کہ کسی شاعر کی مثنوی اس پائے کی نہو جیسے کہ اسکی غزلیں ہیں۔ لیکن دونوں میں "مذاق سخن" کا رنگ ایک ہی ہوگا مثلاً فریاد داغ کا پایہ داغ کی تصانیف میں ادنیٰ ہی لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فریاد داغ کا مذاق شاعرانہ گلزار داغ سے جداگانہ ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص کیا ہی۔ میں جانتا ہوں کہ حضرت شرر کو بھی اس سے انکار نہوگا کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے۔ اسکی زبان سے شعر اس طرح نکلتا ہی جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اسکے گلزار نسیم میں ہر شعر شروع سے آخر تک آورد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہی۔ جس طرح سنگتراش پتھروں کو تراش کر بُت تیار کرتے ہیں اسی طرح نسیم نے اپنے تیشہ فکر کی مدد سے مضامین کے گل بوٹے تراشے ہیں جنسے گلزار نسیم کی زینت ہے۔ چاہے یہ رنگ بُرا ہو یا اچھا مگر اس سے انکی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ یہی رنگ انکی غزلوں کی گلہائے مضامین سے بھی شبنم کی طرح ٹپکتا ہی مجکو سخت حیرت ہی کہ حضرت شرر کے قلم سے ذیل کے الفاظ کس طرح نکلے کہ "مجھے تعجب ہی کہ مصنف (یعنی نسیم) کے دیوان کا انتخاب جو اس مثنوی (گلزار نسیم) کے آخر میں چھپا ہی اسمیں بھی اس رنگ (یعنی گلزار نسیم کے رنگ) کا کوئی شعر نہیں ہی" اس موقع پر میں چند شعر "انتخاب دیوان نسیم" سے تمثیلاً لکھے دیتا ہوں۔ سخن شناس خود فیصلہ کرلینگے کہ حضرت شرر کا بیان [illegible]

بالا لقد درست ہے۔

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
شوریدگی سے میری بیاباں تک تنگ تھے
روتا جو میں تو غیرت صحرائی کے سفر گیا

بوئے گل غنچے سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی موںہہ سے افسانہ چلا

چمن میں دہر کے آکر میں کیا نہال ہوا
برنگ سبزۂ بیگانہ پائمال ہوا
کہانی کہکے سلاتے تھے یار کو سو آپ
فسانہ سحر ہوئی خواب وہ خیال ہوا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ
بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا
بلبل کے موںہہ پہ اڑنے لگیں ہوائیاں
صیاد کو بتا ہمیں او باغباں ہوا

صبح او ماہ تو گھر سے نکلا
شکر ہے چاند کدھر سے نکلا

معنی روشن جو ہوں تو سو سے بہتر ایک شعر
مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے
بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائیگی
گرمی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی
داغ سودا ایک دن دیگا بہار
فصل اس گل کی شگوفہ لائیگی
کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار
بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی
مہندی رنگوں سے مانا دل ملا
درد سر کی کسکے ماتھے جائے گی
خاکساروں سے جو رکھے گا غبار
او فلک بد کی نری ہو جائے گی

ہم رخصت ہو تو باندھ دیجئے
بیقراری آئے تو ٹھہرا لیجئے
دل میں جب ولولہ ہے تاثیر عشق
ٹھنڈی سانسوں سے آہیں گرمائیے

گل ہوا کوئی چراغ سحری او بلبل
ہاتھ ملتے ہوئے پتوں سے صبا آتی ہے

جسکو دیکھو وہ اس زمانے میں
اپنے نزدیک دور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذروں پر
روز باراں نور ہوتا ہے

اس رنگ کے نوّے فیصدی اشعار نسیم کے دیوان میں ملتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی وہی ترکیب کی چستی وہی تناسب لفظی وہی آورد کا رنگ جو کہا ہے جو کہ مثنوی کا رنگ خاص ہے۔ آتش کا مذاق شاعرانہ اس رنگ سے اعلیٰ تر ہے لیکن اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ اگر وہ تفنن طبع ہی کے طور پر کوئی مثنوی کہتے تو یہ ممکن تھا کہ وہ مثنوی اس پایہ کی ہوتی جیسی کہ انکی غزلیں ہیں لیکن اُس مثنوی میں ان کی طبیعت کے رنگ کا ضرور پتا ملتا۔ علاوہ اسکے یہ کہنا کہ شاعر نے گلزار نسیم کو محض تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا ہے کسقدر بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کوئی شخص کہے کہ جاپان روس سے "تفنن طبع" کے طور پر لڑ رہا ہے۔ قطع نظر ان سب باتوں کے اس مقام پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جو کہ کسیقدر غور طلب ہے۔ یعنی حضرت شرر نے اس مضمون کے ایک حصے میں تو یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ گلزار نسیم میں محض انتخاب و اختصار کا آخری عمل حضرت خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ لیکن آپ ہی صاف الفاظ میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آتش نے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کے اسے بجائے اپنے نسیم کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ یہ دونوں دعوے ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ چونکہ حضرت شرر کے اس مضمون کا رنگ خاص یہی ہے کہ ایک دعوے کی تردید دوسرے دعوے سے کیجائے، لہذا اسکی نسبت زیادہ لکھنا فضول ہے۔ حضرت شرر کا یہ مقولہ صحیح ہو یا نہو کہ "شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن میں جداگانہ رنگ دکھاتا ہے" مگر اسقدر ضرور صحیح ہے کہ حضرت موصوف کا مذاق تنقید ہر صفحے پر نیا رنگ دکھاتا ہے۔

دیباچے میں تناسب لفظی کی بحث کے سلسلے میں میں نے اسبات پر زور دیا تھا کہ صنعت مذکور کا لطافت کے ساتھ نباہنا اک امر دشوار ہے۔ اور یہ دکھانے کے لئے کہ کس صورت پر تناسب لفظی بجائے حسن کے عیب ہو جاتا ہے میں نے مثال کے طور پر امانت، رند، خلیل، قلق وغیرہ کا ایک ایک شعر یا مصرع لکھ دیا تھا۔ اس سلسلے میں گلزار نسیم کے بھی دو ایک شعر لکھ دئے تھے۔ اس بنا پر حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ "مسٹر چکبست نے امانت، رند، اور قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کر کے

سب کی شاعری میں دھبہ لگایا ہے" مجکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں ہرگز اس الزام بیجا کا مستحق نہ تھا صرف و نحو کی کتابوں یا کتب عروض میں اکثر غلطیوں کی تشریح کے لئے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر لکھے ہوئے ملینگے۔ ان اشعار کے پیش کرنے سے لکھنے والے پر یہ الزام نہیں عائد کیا جاسکتا کہ اسکا منشا یہ تھا کہ ان استادوں کی شاعری میں دھبہ لگایا جائے۔ آخر کسی کے کلام سے تو مثال دینا ہی پڑیگی۔ لہذا ایک صنعت خاص کا ذکر کرتے ہوئے اگر میں نے رند و خلیل و قلق وغیرہ کے کلام سے ایک ایک مصرع یا شعر نقل کر دیا تو میری مراد اس سے یہ نہ تھی کہ میں ان کی شاعری کو بحیثیت مجموعی قابل نفرین قرار دوں۔ اگر ان مثالوں کے پیش کرنے سے کوئی معنی پیدا ہو سکتے تو وہ یہ تھے کہ جہاں تک تناسب لفظی کی صنعت کا تعلق ہے رند و خلیل و قلق وغیرہ نسیم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر حضرت شرر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو میرے سر مفت کا الزام نہ دھرتے ؎

جو نشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بیشک، امانت کے لئے میں نے صاف الفاظ میں یہ لکھدیا تھا کہ ان حضرت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہے۔ حضرت شرر کا یہ خیال نہیں ہے۔ آپکے نزدیک گلزار نسیم کی طرح امانت کے کلام میں بھی ایسے معیوب اشعار جنمیں تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن نہ قائم رہی ہو دو فیصدی سے زیادہ نہ نکلینگے۔ اور حضرت موصوف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تناسب لفظی کے نباہنے میں امانت ہی "سب سے زیادہ کامیاب" بھی ہوئے ہیں۔ میں حضرت شرر کی اس تنقید کے نسبت زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ جس شخص نے امانت کا کلام ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت شرر نے امانت کی مدحت سرائی میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک شاعرانہ مبالغے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا چند اشعار امانت کے درج ذیل ہیں۔ سخن شناس "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ امانت نے تناسب لفظی کی صنعت کو کیا معراج دی ہے۔

چھولوں جو کان پور میں وہ زلف حلقہ دار پھانسی کا حکم چھوٹتے ہی کوتوال دے

دُر دُر کرے صدف کو جو وہ گوہر مراد موتی ہر ایک دانت خوشی سے نکالدے

سوراخ در کے بند کرو چھوڑو حیا تکنا　　روزن تمہارے شرم میں رخنہ ڈالدی

کھلاتا ہی بجا اس شعلہ رو کو برف خانے کی　　رقیب روسیہ کو فکر ہے نقشہ جمانے کی

ملادیے شہنا سے جو دُھن اپنی نزاز کی　　ندامت سے بُری نوبت ہوئی نقارخانے کی

یہ گیسو کالے سانپ ہیں کہتی ہے شانے کو　　مری طبع رسا کرتی ہی باتیں مار کھانے کی

خط بہت بڑھ گیا ہے بنواؤ　　گلشن حسن ہے کہ جنگل ہے

لا سر دل کو میرے صدقے کر　　بت کے بیر آج شگل ہے

عاشق زلف کیوں نہ سر ٹکرائے　　مانگ دار اس پری کی تکل ہے

نظم کرتا ہوں خط سبز کا وصف　　مرغ مضمون جو ہے وہ ہریل ہے

اسی کہتے ہیں تکلف اسے نازک طبعی　　گھانس کے تان پر اس شوخ نے گھونگٹ باندھا

بندھ گیا کاکل و بیش جو بایا اس نے　　ہنس خیاط کو چڑیا کا بنایا اس نے

میں قدردانان اماؔنت کا مشکور رہونگا اگر وہ اماؔنت کے دیوان میں دو فیصدی شعر بھی ایسے نکالدیں جنمیں تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن بھی قایم رہی ہو۔ یوں دعولے بے دلیل کرنا تو بہت آسان ہے۔ حضرت شرؔر نے مجکو اسبات کا بھی ملزم ٹھہرایا ہے کہ میں نے جو نسیؔم کے معرکے لکھے ہیں اُن کے پردے میں "لکھنو کے بعض مشہور و معروف و مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش" کی ہی۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن بزرگوں کی شہادت پر لکھا ہے جو نسیؔم کے ساتھ مشاعروں میں شریک تھے اور جنکے سامنے یہ معرکے پیش آئے۔ اگر حضرت شرؔر کو اس میں شک ہو تو یہ انکا حسن ظن ہے اور چونکہ اس بحث سے اور نفس مضمون سے زیادہ تعلق نہیں لہذا میں اسکی نسبت زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتا۔

حضرت شرؔر نے مجھ غریب پر یہ بھی اعتراض کیا ہی کہ بجائے مولوی حاؔلی کے اعتراضات کا جواب دینے کے میرا فرض یہ تہا کہ گلزار نسیؔم کے "ان عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتا جن پر عام اہل سخن معترض ہیں اور جنکا اسوقت تک جواب نہیں دیا گیا ہے" اس اعتراض کی نسبت

میں یہ عرض کروں گا کہ مولانا حالی کے اعتراضات چاہے واجب ہوں یا غیر واجب اُنہوں نے اُن کو نقادان سخن کے سامنے تحریری حیثیت میں پیش کیا ہی۔ لہذا اعتراضات مذکورسے ہر شخص پورے طور سے واقف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اعتراضات میری نظر سے بھی گذرے اور جو کچھ میری سمجھ میں آیا میں نے ان کی نسبت لکھا ہی۔ علاوہ ان اعتراضات کے اور ایسی اعتراضات گلزار نسیم پر میری نظر سے نہیں گذرے جو کسی مستند شخص کی طرف سے پیش کئے گئے ہوں جو اعتراضات حضرت شرر نے اساتذہ لکھنؤ کا وکیل بنکر پیش کئے ہیں اُن کی نسبت میں صرف اسقدر کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ان اعتراضات سے اساتذہ لکھنؤ کا دامن آلودہ کرنا سخت بیرحمی ہی میرے خیال میں کوئی لکھنؤ کا رہنے والا جسکو شعر و سخن کا مذاق ہے اور جس نے گلزار نسیم کے علاوہ اور شعرا ی اُردو کا کلام بھی پڑہا ہے اسکے قلم سے ایسے اعتراضات نکل ہی نہیں سکتے ہیں۔ چنانچہ انہیں اعتراضات کے متعلق ۱۱۔ مئی کے اودھ پنچ میں لکھنؤ کے مستند اور مسلم الثبوت زباں داں منشی سجاد حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ہمارے خیال میں اساتذہ لکھنؤ کی اس سے بڑہکر ذلت نہیں ہوسکتی کہ اُن کے جانب یہ اعتراض (یعنی حضرت شرر کے اعتراض) منسوب کئے جائیں جنسے فارسی محاوروں سے عموماً اور لکھنؤ کی زبان اور شاعری سے خصوصاً عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہی" اگر حضرت شرر خود غور سے کام لیں تو وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اساتذہ لکھنؤ کے جانب یہ اعتراض منسوب کرنا کہ نسیم نے "حیا اٹھاکر" خلاف محاورہ نظم کیا ہی "پردہ حیا اٹھاکر" چاہیئے ایسا فعل ہی کہ جس سے جرات کا تو ضرور اظہار ہوتا ہے مگر دور اندیشی کا نہیں۔ یا یہ کہنا کہ "تجہ پاس" کہاں کی زبان ہے اور پہر کہنا کہ یہ اعتراض اساتذہ لکھنؤ کے جانب سے ہی لکھنؤ کو بدنام کرنا ہی۔ مجھکو خود اکثر اساتذہ لکھنؤ کی خدمت میں باریابی حاصل ہے۔ میں نے ان کی زبان سے کبھی ایسے اعتراضات نہیں سُنے۔ اب رہے اُن حضرات کے اعتراضات جو گلزار نسیم پر اعتراض کرنا ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر میرے گوش گزار ہوتے رہے۔ مگر انکے جواب میں میں کسی فارسی اُستاد کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑہ لیا کرتا ہوں ؎

بسیار زغمہاست کہ خاک است مرہمش
نتواں بہ رشتہ دوخت دہان دریدہ را

ایسے اعتراضات کا کسی سنجیدہ تحریر میں ذکر کرنا حماقت ہے اور ایسی حماقت ہے کہ جسکی کبھی انتہا نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال سے میں نے محض مولانا حالی کے اعتراضات کا ذکر کرنے پر قناعت کی۔ اب چونکہ حضرت شرر نے اپنے رسالے میں چند اعتراضات پیش کئے ہیں ان کی نسبت آگے چلکر میں جو کچھ میری سمجھ میں آئیگا لکھوں گا۔

اس مضمون کے آخری حصے میں حضرت شرر فرماتے ہیں کہ "گلزار نسیم میں ایسے اشعار بہت ہیں جنکی بنا پر صرف یہی نہیں کہا جاتا کہ نسیم کی زبان میں غلطیاں ہیں بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم زبان پر اتنی حکومت نہیں رکھتے کہ ہر ایسے مضمون کو جو خیال میں آئے ادا کر جائیں" اس سلسلے میں حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ انکا مقصد گلزار نسیم پر اعتراضات پیش کرنے سے یہ ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کر دیا جائے کہ گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیاں ہیں اور اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہیں ہے" اس اعلان کی نسبت دو امور دریافت طلب ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ اعلان حضرت شرر کے پہلے مضمون کے اس حصے کی تردید کرتا ہے جسمیں آپنے اس امر کا اقرار کر لیا ہے کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے۔ یعنی میرے دیباچے پر رائے زنی کرتے ہوئے حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ "گلزار نسیم کے اختصار۔ اس کی ترکیبوں کی پختگی۔ کلام کی روانی اور سادگی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھکے ہے (دلگداز بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۸۱) اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکیزگی زبان کے نسبت جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے حضرت شرر کو پورا اتفاق ہے بلکہ آپ لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ "پاکیزگی زبان" کی نسبت میں نے کیا لکھا ہے۔ دیباچے کے بارہویں صفحے پر حاشیئے پر "پاکیزگی زبان" کی سرخی قائم کر کے گلزار نسیم کی زبان کے متعلق صاف الفاظ میں میں نے یہ لکھا ہے کہ نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہئے"

میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شرر نے پیشتر نسیم کی زبان دانی کو کیوں تسلیم کیا اور پھر اپنے ہی بیان کی تردید اس زور شور سے کیوں کی۔ دوسرا سوال اس اعلان کی نسبت یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیشتر حضرت شرر اپنا عقیدہ یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کے اصلی مسودے کے ورق نہایت ہی عام مذاق کے تھے اور جو کچھ محاسن اس مثنوی میں پیدا ہوئے وہ اس سبب سے ہوئے کہ انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ یا یہ کہ حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے مطابق آتش نے یہ مثنوی خود تفنن طبع کے طور پر کہی اور پھر اسکے اشعار میں متعدد دلغزشیں لیکر نسیم کو دیدی گویا نسیم سے اور اسکی تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں عقل سلیم یہ کیونکر قبول کر سکتی ہے کہ گلزار نسیم کی زبان اہل لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے" یہ ظاہر کر چاہے خواجہ آتش نے اس مثنوی کی اصلاح میں آخری انتخاب و تصرف کی زحمت اپنے سر لی یا حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے رو سے آتش نے خود یہ مثنوی "تفنن طبع" کے طور پر کہی اور پھر نسیم کو دیدی ان دونوں صورتوں میں اس مثنوی کی ترتیب دینے میں آتش نے اسقدر غور و فکر سے ضرور کام لیا کہ اسمیں ایسے محاسن پیدا ہو گئے جنکی وجہ سے حضرت شرر بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ باعتبار خوبیوں کے گلزار نسیم کے مقابل کے دو ہی چار نظمیں اردو میں نکلینگی۔ اس حالت میں گلزار نسیم میں ایسے شعر کہاں سے آ گئے جنکی نسبت آج حضرت شرر تک کو یہ کہنے کی جرات ہوتی ہے کہ انکی زبان نہایت ہی مبتذل اور بازاری زبان ہے اور بازار بھی کہیں اور کا لکھنؤ کا نہیں" یہ ممکن تھا کہ آتش کے اور کلام کے مقابلہ میں یہ مثنوی ہلکی ہوتی مگر جہانتک زبان کا تعلق ہے یہ ضرور مستند خیال کیجاتی آتش کی بہت سی غزلیں ہیں جن میں ایک شعر بھی قابل تعریف نہیں ہو یا بہت سے شعر مہمل ہیں۔ ان غزلوں کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے انہیں محض "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہوگا یعنی زیادہ غور و فکر سے کام نہ لیا ہوگا۔ مگر باینہمہ یہ مہمل شعر بھی زبان کی بحث میں اسی وثوق کے ساتھ سند کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں جیسے کہ آتش کے اعلیٰ سے اعلیٰ شعر۔ ان اشعار میں شاعری کے اور جوہر ہوں لیکن ان کی زبان کی نسبت یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ "مبتذل بازاری

زبان ہے اور بازاری زبان بھی کہیں اور کی لکھنؤ کی نہیں" مثلاً اگر یہ بحث درپیش ہو کہ آیا حلال کرنا لکھنؤ کا محاورہ ہے کہ نہیں تو آتش کا ذیل کا ایک شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ؎

آتی جو عید قرباں خنجر کو لال کرتے

دنبے کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے

اس شعر میں چاہے اور صدہا عیوب ہوں مگر اس کی زبان مستند ہے کیونکہ یہ شعر آتش کا ہے افسوس ہے کہ حضرت شرر نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ کوشش تو یہ ثابت کرنے کی کر رہے ہیں کہ گلزار نسیم میں نسیم کا کلام برائے نام ہے یا برابر نہونے کے ہے اور جو کچھ اسکو فروغ حاصل ہے وہ اس سبب سے ہے کہ یا تو اس پر آتش کی زبردست اصلاح ہے یا آتش نے خود اسے "تفنن طبع" کے طور پر تصنیف کیا ہے اور پھر یہ اعلان بھی شائع کرتے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آتش نے نہ اسکی اصلاح میں غور و فکر سے کام لیا ہے نہ وہ اسکے مصنف ہو سکتے ہیں۔ حضرت شرر کی اس تنقید پر "نام پہ می سرائیم و طنبورہ ما چہ می سرائیدؔ" کی مثل صادق آتی ہے۔ کیا حیرت کا مقام ہے کہ حضرت شرر کا طائر خیال ایک شاخ پر بیٹھتا ہی نہیں شروع سے آخر تک کل مضمون متضاد بیانات سے پر ہے جنکی وجہ سے حضرت موصوف کے دلائل کا سلسلہ تار عنکبوت سے زیادہ مضبوط نہیں نظر آتا۔ جس وقت آپکا خیال گلزار نسیم کے محاسن کے طرف جاتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس مثنوی کا بہترین حصہ آتش کے زور فکر کا نتیجہ ہے اور اپنے دعویٰ کی تقویت کے لئے نقادان سخن کے دربار میں اُن بزرگوں کی شہادت پیش کرتے ہیں جو موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں اور جنکو اسبات کی مطلق خبر نہیں کہ آج اُن کے نسبت کیا کہا جا رہا ہے جب حضرت شرر کو گلزار نسیم میں معائب تلاش کرنے کی فکر ہوتی ہے تو اُس وقت آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ نسیم کی تصنیف ہے اور اسلئے اسکی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔ اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ چالیس پچاس شعر جو حضرت شرر کے نزدیک قابل اعتراض ہیں وہ تو نسیم کے ہیں باقی ڈیڑھ ہزار شعر آتش کے ہیں۔

ن یہ ہے کہ اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ چونکہ پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے اسلئے ان کے
ستند نہیں ہے گو کہ حضرت شرر نے کسی مصلحت سے اس خیال کو جلباب خفا میں رکھا ہے مگر آپ کے
ے کے پردے میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے مگر اس خیال کے لوگوں کو اس امر پر غور
ہئے کہ نسیم کے وقت کا لکھنؤ وہ لکھنؤ تھا کہ جسکا ذرہ ذرہ تہذیب و تربیت کے نور سے معمور تھا
میر احمد صاحب بے۔اسے کے اس زمانے میں "لکھنؤ میں شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے
وشس زن تھا اور زباندانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اسکی دلکش سیر
ں اسکے دلچسپ منظروں اور اسکے دلفریب میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا ہی انسان کو تہذیب
نے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا" اور پھر نسیم کی ایک خاص حالت تھی۔ایک تو وہ خود ہی
طور پر غیر معمولی طور سے ذہین اور طباع شخص تھے۔دوسرے انکا تمام وقت آتش و صبا وغیرہ
زبان دانوں کی صحبت میں صرف ہوتا تھا جنکی زبان آج تک محاورۂ اردو کی دستور العمل سمجھی
ہے۔قطع نظر اسکے یہ سب جانتے ہیں کہ گلزار نسیم آتش کی اصلاح کے بعد ان کی زندگی
ائع ہوئی اس صورت میں یہ کہنا کہ چونکہ گلزار نسیم کا مصنف ہندو تھا اسلئے اسکی زبان
ستند زبان نہیں ہے انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہے۔جس شاعری میں یہ مثنوی رات بھر
ئی وہ مشاعرہ آتش ہی کے نام سے کیا گیا تھا لہذا اسمیں شہر کے تمام سر برآوردہ شعرا جمع تھے۔اکثر
اب بھی زندہ ہیں جو اس مشاعرے میں شریک تھے۔کیا ایسا مشاعرہ کرنے سے آتش کی مراد
ہ سخن سنجان لکھنؤ کے سامنے اپنے شاگرد سے ایسی مثنوی پڑھوا کر اپنی ہنسی کرائیں جسمیں
ر غلطیاں ہیں کہ شاید کسی اردو نظم میں نہونگی اور جسمیں اکثر ایسے شعر موجود ہیں "جنکی زبان
ی بازاری زبان بھی نہیں ہے" یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے راسخ الخیال اور منصف مزاج اہل اسلام
سیم کی زبان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھتے ہیں۔حضرت شرر نے جو اعلان شائع کیا ہے
ار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے وہ کسقدر دیر سے شائع ہوا ہے۔کیونکہ
اعلان کی اشاعت کے قبل اساتذہ لکھنؤ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے سب سے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورہ کی بحث میں گلزار نسیم کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں اب اس سے بڑھکر گلزار نسیم کی زبان کے مستند ہونے کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لغت میں اسی شاعر کا کلام سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جسکی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت شرر امیر مرحوم کو اُن تمام اساتذہ "لکھنؤ" کے زمرے سے خارج نہ سمجھتے ہونگے جنکا ذکیل بنکر آپ نے یہ اعلان شائع کیا ہے کہ "گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے"۔ علاوہ امیر مرحوم کے لکھنؤ کے سرمایہ ناز انشاء پرداز اور مسلم الثبوت زباندان منشی سجاد حسین صاحب نے حضرت شرر کے اعلان مذکور کی نسبت جو کچھ ۱۱ مئی کے اودھ پنچ میں لکھا ہے وہ شائقین سخن کی نظر سے گذرا ہی ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ گلزار نسیم کی زبان کو غیر مستند ثابت کرنے کا زمانہ گذر گیا۔ اب تو اس کے سینکڑوں شعر زبان اُردو کا حصہ ہو گئے ہیں اور زباندان اسکی زبان کو مستند تسلیم کر چکے ہیں۔ اب اگر کسی کا دل چاہے تو وہ یہ خیال کر کے اپنا دل خوش کر لے کہ یہ مثنوی نسیم کی کہی ہوئی نہیں ہے اور اگر قلم میں زور ہو تو اس دعوی کی تائید میں دلائل بھی پیش کرے۔ اور میرے خیال میں قدر دانان نسیم کو ایسے مضامین سے ناخوش نہیں ہونا چاہئے۔ میں تو یہ مان لینے کو تیار ہوں کہ نسیم لکھنوی کا اس عالم ایجاد میں وجود ہی نہیں ہوا تھا "پنڈت دیاشنکر نسیم" محض اک اسم فرضی ہے۔ یہ مثنوی کسی بندہ خدا کی تصنیف ہے جس نے اسکو اس فرضی نام سے شائع کر دیا اب یہ بندہ خدا چاہے آتش ہو یا پروانہ یا مصحفی (اگر منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے معتبر نائی کی روایت صحیح ہے) یا کوئی اور شخص ہو جو مشرف بہ اسلام تھا۔ مجکو تو مثنوی گلزار نسیم سے مطلب ہے نہ کہ اسکے مصنف کے مذہب سے ہاں اگر "گلزار نسیم" میں لفظ نسیم کھٹکتا ہو تو اسکو "قصہ گل بکاولی منظوم" کہو مگر خدا کے لئے اسکے جوہروں پر تو خاک نہ ڈالو۔

خاص اعتراضات کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہ لکھدینا مناسب ہے کہ اس مضمون

میر. انیس شعرا[۱] کے کلام سے مثالیں دیگئی ہیں جنکے اشعار امیر اللغات اور بہار ہند[۲] میں بھی بان اور محاورے کی بحث میں سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

حضرت شرر نے گلزار نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنی قرار دیا ہے ایسے اشعار سلسلہ وار لکھے جاتے ہیں

۵۷ صاد آنکھوں کی دیکھکر پھر کی - بینائی کے چہرے پر نظر کی

اعتراض ہے کہ بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے ؟

"چہرے پر نظر کرنا" شاہی دفاتر کی اصطلاح ہے "چہرہ" نام کے معنی میں استعمال ہوتا تھا - اور یہ اسلئے کہ جس شخص کا نام دفتر میں لکھا جاتا تھا اسکے ساتھ اسکا خط و خال بھی لکھ لیا جاتا تھا - "نظر کرنا" دوسری اصطلاح ہے - اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا تو اصطلاحًا یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے چہرے پر نظر کر دی گئی - اب

"۶ - بینائی کے چہرے پر نظر کی"

کے معنی صاف ہیں یعنی "بینائی کا چہرہ کاٹ دیا گیا" - جسکا مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہوا کہ "بینائی کو کھو دیا" نسیم کے علاوہ مختلف شعراے اردو نے اس اصطلاح کو نظم کیا ہے -

خواجہ وزیر ہے نرگس پہ نظر کیجے دوبارا کہ وہ کٹ جائے - ہو جائے نظر ثانی میں اسکی نظری آنکھ

آتش { قلم نے چہرے حسینوں کے لوح پر لکھکر - کچہریوں کو کیا خط و خال سے واقف
{ پھر آئے رنگ فتہ جو رُخ پر عجب نہیں - اکثر ہی چہرہ نظری صاد ہو گیا

صبا ہے برطرف غم کر دیا دکھلا کر اسنے صاد شبنم - چہرہ عشاق کو حکم بحالی ہو گیا

غیاث اللغات صفحہ ۴۶۲ "نظری - انچہ بداں نظر کنند و منظور نبود لفظ نظر براے بطلان باشد ایں اصطلاح اہل دفتر است" مجھکو حیرت ہے کہ حضرت شرر نے ایک عام اصطلاح سے کیوں ایسی بے خبری ظاہر کی اور گلزار نسیم کی ایک لاجواب فرد کو کیوں نظری بنا دیا -

---

[۱] آتش - ناسخ - صبا - رند - واجد علی شاہ (اختر) انیس - غالب - نواب مرزا شوق - محمد حسین آزاد (آب حیات) وغیرہ

[۲] حضرت شرر کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ صاحب امیر اللغات کے علاوہ مولف بہار ہند نے بھی پنڈت دیا شنکر نسیم کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے ہیں -

۵۲ اک بلی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ ۔ نیولے کو بھگا دیا دکھا سانپ

اعتراض ہی کہ سانپ کو نیولا مار ڈالتا ہی۔ مگر یہ دکھا سانپ کیا۔ آخر نیولے نے ماری کا تماشا کیوں دکھایا۔ اگر بفرض محال یہ اعتراض تسلیم ہی کر لیا جائے تب بھی گلزار نسیم کا مصنف اسکا ذمہ دار نہیں ہو سکتا نسیم نے محض گل بکاولی کا وہ قصہ نظم کر دیا ہے جو کہ پیشتر نثر میں موجود تھا۔ اگر یہ اعتراض ہے تو اس غریب پر جسنے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہی۔ نسیم نے تو شروع ہی میں کہدیا ہے ۔

ہر چند سنا گیا ہے اسکو + اُردو کی زبان میں سخنگو +

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں اس می کو دو آتشہ کروں میں

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت شرر کا یہ اعتراض کسی حالت میں جائز نہیں ہی۔ کیونکہ اس شعر کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرع۔ ع ۔ دیکھا تو یہ ہے شگون نرالا

اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنف قصہ نے اس واقعے کو خود "نرالا" یعنی حیرت انگیز مانا ہی یعنی وہ خود تسلیم کرتا ہی کہ "نیولے کا سانپ دکھانا" خلاف واقعات ہے ۔ پس اس حالت میں سیاق کلام کو نظر انداز کر کے درمیاں سی اک شعر چن لینا اور اس پر اعتراض کرنا آئین تنقید کے خلاف ہی اور لفظی شعبدہ پردازی سی زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔

۵۳ سن کے قیدی کے زار نالے زنجیر کے پیچ ۔۔ سے نکالے

اعتراض ہی کہ "مانا کہ زنجیر کے الیسے پیچ نکال ڈالے ۔ مگر اس سی یہ مطلب کیونکر نکلا کہ بکاولی کے پاؤں میں سے زنجیر نکال لی؟ سچ ہی یہ شعر یوں ہی ؎ سنکے قیدی کی زار نالی ۔ زنجیر کے پیچ سے نکالی ۔ "زار نالی" چاہی غلط ہو مگر مصنف نے اس سے رونے دھونے کے معنی لئے ہیں "

یائے معروف کے بدلے یائے مجہول یا اسکے برعکس لکھدینا کاتبوں کی عام غلطی ہی۔ چنانچہ یہ شعر بھی کاتب کی تیغ اصلاح کا زخمی ہے واقعی اصل شعر یوں ہی ؎ سنکے قیدی کی زار نالی۔ زنجیر کے پیچ سے نکالی چونکہ اس حالت میں حضرت شرر دبی زبان سے فرماتے ہیں کہ "زار نالی چاہے غلط ہو" اس لئے حضرت موصوف کے اطمینان کے لئے ذیل کی مثالیں غالبًا کافی ہونگی ؎

درد و الم ہی میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں
میر
دن اشک ریزیاں ہیں شب بھر نالیاں ہیں

فقرہ - میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی - افسردہ دلی .... کے مضامین کو خوب ادا کیا (آب حیات مصنفہ آزاد)

واں پھانس چبھی ہے اسکو غم کی
یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

شعر ۵۴

اعتراض ہے کہ "ایک دم کی سانس نہونا" ایسا محاورہ ہے جسکے کوئی معنی نہیں"

مجھکو اس اعتراض کے معنی سمجھ میں نہیں آتے - اس مصرع (یاں سانس نہیں ہے ایکدم کی) کے معنی چشمہ آفتاب کی طرح روشن ہیں اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئیں تو یہ تسنیم کا گناہ نہیں - غالباً حضرت شرر نے اس مصرع میں "دم" سے بھی "سانس" مراد لی ہے اس صورت میں واقعی "یاں سانس نہیں ہے ایک سانس کی" کے کچھ معنی نہیں ہوئے - لیکن "دم" یہاں "لمحے یا لحظے" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - تسنیم کا مطلب ہے کہ "یاں ایک لمحے کی سانس نہیں باقی ہے" یعنی موت کا وقت قریب ہے - ممکن ہے حضرت شرر کہیں کہ دم سے لمحے کے معنی لینا کہاں کی زبان ہے" اس لئے اشعار ذیل سند اً درج ہیں - آتش ؎

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

ناسخ

ایک دم فرصت نہیں مجکو بتوں کی یاد سے
کہتے ہیں زاہد خدا کی یاد ہر دم چاہیے

چاہا تھا کہ پیس کا احسان لے
پوچھا کہ نگین جو لے کہاں سے

شعر ۵۵

اعتراض ہے کہ "جب تک کسی خاص نگین کو دکھا کے یہ نہ کہا جائے کہ اس نگین کو لے تو کہاں سے اسوقت تک اس عام سوال کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے" اس مقام پر بھی حضرت شرر نے سیاق کلام پر غور نہیں فرمایا ورنہ آپ کو اس اعتراض کی تکلیف گوارا نہ کرنی پڑتی بکاولی نے (فرخ کے بھیس میں) عمداً یہ سوال ایک مبہم طریقے پر پیش کیا تھا اسکا مطلب یہ تھا کہ اگر ان

چاروں شہزادوں میں سے کوئی اسکا گلچیں ہوگا تو وہ اسکی انگوٹھی ہی اپنے پاس رکھتا ہوگا لہذا ممکن ہے کہ اسکی زبان سے نکل جائے کہ اگر نگین لینا ہو تو بکاولی کی انگوٹھی کا نگین لے۔ اگر ایسا نہوا یعنی ان چاروں شہزادوں میں کوئی اسکا گلچیں نہوا تو اس عام سوال کا ایک عام جواب بھی لمجائیگا کہ نگین عزیز ہے تو فلاں شہر میں عزیز ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔۵

بتلانے لگے وہ چاروں ناداں

کوئی یمن اور کوئی بدخشاں

اس جواب سے بکاولی نے یہ نتیجہ نکالا کہ انمیں سے اسکا گلچیں کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ

جاناکہ جو گل یہ لائے ہوتے ۔۔۔ خاتم کے نگین بتاسے ہوتے

رکنا ہوا اس پری کا مشکل

۵۶

یہ دل لگی اب لگائے کی دل

اعتراض ہے کہ "مصنف تو یہ مضمون اداکرنا چاہتا کہ اس پری (روح افزا) کے ٹھہر جانے سی دشواریاں پیش آئیں مگر زبان پر قدرت نہونے سے مطلب یہ ہوگیا کہ اسکا ٹھہرنا مشکل ہوا یعنی ٹھہر نہ سکی" حضرت شہر کا غالباً یہ خیال ہی کہ "مشکل" سے صرف کسی امر کا غیر ممکن ہونا مراد لیا جاتا ہی۔ مگر ایسا نہیں ہے لفظ مشکل سے وہ حالت بھی مراد لی جاتی ہی جس سے بحیثیت مجموعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ خواجہ حافظ کے ذیل کے مصرع سی ثابت ہے۔ ع

مشکل ایں است کہ ہر روز بتر می بینم

ظاہر ہے کہ اس مصرع میں "ہر روز بتر دیدن" جس حالت کا اشارہ کرتا ہے وہ حالت "مشکل" ہی یعنی باعث پیچیدگی ہے۔ اسی طرح نسیم کا مطلب ہے کہ اس پری کا رکنا باعث پیچیدگی ہوا۔ عام گفتگو میں بھی لفظ مشکل اس معنی میں استعمال ہوتا ہی۔ مثلاً کہتے ہیں کہ "اگر وہ چلے جاتے تو سب بات بن گئی تھی مگر مشکل یہ ہے کہ وہ رک گئے" چونکہ زبان کا رنگ بدل گیا ہی لہذا نسیم کے مصرع کی بندش اس زمانے میں کسیقدر الجھی ہوئی نظر آتی ہی۔ لیکن نسیم

کے زمانے میں اس قسم کی ترکیب جائز سمجھی جاتی تھی آتش کا شعر ہے؎

عشق نے حال کیا مردہ بے وارث کا　　　میرے اوپر ہے یقین قبضہ سلطان ہونا

اس شعر میں "یقین،" کا لفظ بالکل اسیطرح استعمال ہوا ہے جیسے کہ نسیم کے شعر میں "مشکل" کا لفظ۔ اب اس ترکیب متروک سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آتش و نسیم کو زبان پر قدرت نہ تھی انصاف کا خون کرنا ہی میر حسن کا شعر ہے؎

جو اسکے طویلے کے ادنیٰ تھے خر

انہیں نعلبندی میں ملتا تھا زر

اس شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ نعلبندوں کو اُجرت میں زر ملتا تھا۔ لیکن زبان کا رنگ بدلجانے سے اب یہ معنی نظر آتے ہیں کہ خروں کو زر ملتا تھا۔ اس بنا پر اگر کوئی کہے کہ میر حسن کو زبان پر قدرت نہیں تھی تو اسکا جواب سوائے خاموشی کے کیا ہے۔

شہزادے نے ایک دن سمجھ کر

شادی کو کہا حیا اٹھا کر ؎

اعتراض ہی کہ "پردہ حیا اٹھاکر" کی جگہ "اٹھاکر" نظم تو کر دیا گیا ہے مگر کوئی معنی نہیں رکھتا یہ اعتراض کسیقدر تشریح طلب ہے۔ لکھنو اور دہلی میں تو اس قسم کے فقرے زبان زد عام ہیں کہ فلاں شخص نے حیا اُٹھادی یا فلاں شخص کی حیا اُٹھ گئی۔ چنانچہ لکھنو کے مستند زباندان مرزا محمد مرتضیٰ عاشق (عرف مرزا مچھو بیگ) شاگرد جناب نسیم دہلوی نے اپنے مشہور لغت بہار ہند میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ "حیا اٹھانا" بے حجابی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہی

(بہار ہند مطبوعہ ۱۸۸۹ء صفحہ ۲۶۷)

"حیا اٹھانا" پر کیا موقوف ہے "حیا اُٹھا دینا"۔ "حیا اُٹھ جانا"۔ "آنکھوں سے "حیا ٹپکنا" وغیرہ بولا بھی جاتا ہے اور نظم بھی ہوتا آیا ہے۔ اس موقع پر مجھے مومن خاں کا ایک شعر یاد آگیا؎

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو　　　ہی بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

حضرت شرر کے خیال کے مطابق "شیرہ حیا ٹپکے" ہونا چاہئے محض "حیا ٹپکنا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۵۹ دختر جو پسند مہ لقا ہے ؎

اعتراض ہے کہ حرف ترکیب کی خرابی نے مطلب خبط کر دیا۔ کنایہ یہ تھا کہ مہ لقا دختر جو پسند ہے" جس شخص کی نظر سے گلزار نسیم کے علاوہ کسی اور شاعر کا کلام بھی گذرا ہے وہ اس اعتراض کی وقعت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ ہر زبان کی شاعری میں ترتیب الفاظ میں اس قسم کا الٹ پھیر جائز سمجھا گیا ہے۔ اردو شعرا کے کلام میں بھی اس طرز کی سیکڑوں بندشیں ملجائینگی چند شعر تمثیلاً لکھے جاتے ہیں۔ آتش

صبح تک دیدہ ترسے نہیں آنسو تھمتے ۔۔۔ پانی کرنے کو شب ہجر لہو آتی ہے

دم اخیر تصور بندھا ترے رخ کا ۔۔۔ طرف کو کعبے کی کروٹ مجھے قضا نے دی

ناسخ

ہماری آنکھ سے دریائے اشک جاری ہے ۔۔۔ خیال ہے ترے بازو کی پار مچھلی کا

ذبح وہ کرتا ہے پر یہ چاہئے ای مرغ دل

دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھکر صیاد کا

ان اعتراضات کے بعد حضرت شرر نے گلزار نسیم کے وہ اشعار لکھے ہیں جنھیں آپ کے نزدیک لفظی غلطیاں ہیں۔

بولا کہ چکھوں گا میں یہ انسان (۱)

۶۰ بیڑے چکھے پان کے مزیدار (۲)

اعتراض ہے کہ ناسخ و آتش کے زمانے سے لیکے اسوقت تک "چکھونگا" اور "چکھے" کی جگہ "چکھونگا" "اور چکھے" غیر فصیح ہی نہیں غلط ہے" میں حضرت شرر سے نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ اس موقع پر آپ نے لفظ "غلط" کس معنی میں استعمال کیا ہے ظاہر ہے

کہ سودا[۱] وغیرہ نے "چکھا" کی جگہ "چکھا" برابر نظم کیا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نسیم کے طبقے کے شعرا نے "چکھا" نہیں نظم کیا ہے۔ اس صورت میں نسیم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسا قدیم محاورہ نظم کیا جو انکے زمانے میں غیر فصیح سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مثلاً شیخ ناسخ نے سودا و میر کی طرح لفظ "زور" بہت کے معنی میں استعمال کیا ہے[۲] آتش نے اس محاورہ قدیم کو متروک قرار دیا ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ نے ایک غیر فصیح محاورہ نظم کیا۔ لیکن یہ کہنا کہ لفظ "زور" کو بہت کے معنوں میں استعمال کرنا غلط ہے کوئی معنے نہیں رکھتا۔

خیر اس اعتراض سے زیادہ مزیدار اعتراض حضرت شررؔ کا "پان کے بیڑے" پر ہے آپ فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع (بیڑے چکنے پان کے مزیدار) میں صرف بیڑے کافی تھا "پان کے بیڑے" محاورے میں اچھا نہیں" اس اعتراض کا انصاف بھی میں سخن شناسوں پر چھوڑتا ہوں دو شعر درج ذیل ہیں ناظرین "تفنن طبع" کے طور پر ملاحظہ فرمائیں۔

جان صاحب

چٹکی مری کھائے گی ہری پان کا بیڑا   منجھلی کا نہ سنجھلی کا نہ ہے بیاہ بڑی کا

امیر مینائی

بسملوں کی دم رخصت ہی مدارات ضرور   یار بیڑا تری تلوار میں ہو پانوں کا

علاوہ بریں شرفائے لکھنؤ میں یہ فقرہ مثل کے طور پر بولا جاتا ہے کہ "ایسی شادی تھی کہ کسی کو پان کا بیڑا بھی نہ ملا"۔ غالباً حضرت شرر کو آتش کی اصلاح دیکھکر یہ اعتراض کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر آپ کو اس امر پر بھی غور کر لینا تھا کہ نسیم نے جو یہ اصلاح نہ مانی تو کچھ سمجھکر نہ مانی ہوگی اور آتش ایسے نازک مزاج شخص نے اپنے شاگرد کا یہ اختلاف گوارا کیا تو کوئی وجہ

---

[۱] سودا { چکھا انہوں نے جوای بارِ دمی کا شہد ۔ وہ تلخ کام کبھی زہر دشمنان نکرے ۔
بجائے سرمہ کروں میل گرم میں پاس ہیں ۔ نمک سے اشک کے جس چشم نے مزا نہ چکھا

[۲] ۔ اب تو ناسخ زور رندلا اوبالی ہو گیا ۔

معقول ضرور ہوگی ع

ع کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا (۱)

ع وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی (۲)

اعتراض ہے کہ "ان مصرعوں میں حَمل کی جگہ حَمل نظم کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے" یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ محض لغت کے تلفظ کی پیروی شاعر کے لئے ضروری نہیں ہوتی یہ مانا کہ لغت کے رو سے حَمل درست ہے لیکن شرفائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے۔

واجد علی شاہ (آخری فرمانروائے اودھ) سے ایک مثنوی موسوم بہ دریائے تعشق یادگار ہے اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ گلزار نسیم کی تصنیف کے زمانے سے بہت قریب ہے۔ "دریائے تعشق" میں بھی حمل ہی نظم ہے ؎

گھر میں ہے کہ بھی ای خوش اطوار

آثار حمل کے ہیں نمودار

اس مثنوی میں چاہے اور شاعرانہ محاسن ہوں لیکن جہانتک زبان اور محاورے کا تعلق ہے اسکا ہر شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس زمانے میں واجد علی شاہ سے بڑھکر کس کی زبان مستند ہو سکتی تھی۔ علاوہ بریں جانصاحب نے بھی "حمل" نظم کیا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

دائی یقین دل کو ہے گر جائے گا حَمل

ننّا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ مل گیا

متقدمین کے یہاں بھی "حَمل" ہی نظم ہوا ہے۔ چنانچہ سودا کہتے ہیں۔

اسقاط حَمل ہو تو کہیں مرثیہ الیا

پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

لفظ "حَمل" پر کچھ موقوف نہیں متعدد الفاظ ایسے ہیں جنکا تلفظ لغت کے رو سے کچھ اور ہے

اور نظم عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصل لفظ کَلِمہ ہے یعنی لام بالکسر ہے لیکن محاورے میں چونکہ بسکون لام بولتے ہیں اسلئے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے[۹]

با دل سا وہ بحر آسماں جوش
[۱۲] بجلی سی لہرے تھا ہم آغوش

اعتراض ہے کہ "لہر کی جگہ "لہَر" یعنی ہائے متحرک کے ساتھ نظم کر دیا گیا ہے جو اُردو میں غلط ہے" اس اعتراض کے لئے بھی ایک حد تک وہی جواب ہے جو اس سے پیشتر کے اعتراض کے بارے میں لکھا گیا ہے اور دو شعر نسیم کی تائید میں سندًا درج ذیل ہیں۔ میر

شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی میں
کھیتے مہتاب سی اٹھتی تھی لہر پانی میں

نواب مرزا شوق

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی
بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

جاگی تو سب اسکے جوڑ کی تھیں
[۱۲] اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں

اعتراض ہے کہ "اسمیں پری کی جگہ "پریاں" چاہئے جو نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی معلوم ہوتی ہے" بیشک اس زمانے میں یہ ترکیب کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن نسیم کے وقت میں اس کا رواج ضرور تھا

آتش

کیا کیا پری اتاری ہیں شیشے میں آہ نے
جن کون ہے جو نالے سے اپنے نہیں جلا[۱]

اسکے چار ابرو کے لکھا ہے نے دم بھر کا پایا
درمیاں پاتا ہوں دلکو چار سو تلوار کو (یعنی تلواروں کو)

ناسخ

شراب کیوں نہ چلے فصل گل میں اے زاہد
کہ نہر جاری ہوئیں موسم بہار آیا

---

[۹] جرأت۔ کلمہ پڑھ ترا تجھی دیکھے جو اک نظر۔ کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ میں
دبیر۔ ارے خدا کا غضب۔ تیری جان پر ٹوٹے
تو کلمہ پڑھکے رسول خدا کا گھر لوٹے
صبا۔ خدا کے واسطے کلمہ بتو نکا پڑھ واعظ
زباں تری ہے ابھی اختیار باقی ہے

خوش لہجہ بہت بکاولی تھی
شعر ۱۵
گائی اور ناچنی بڑی تھی ؎

پہلے مصرعہ پہ یہ اعتراض ہے کہ "خوش گلو یا خوش آواز کی جگہ غلطی سے خوش لہجہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے"

"خوش لہجہ" خوش گلو اور خوش آواز کے معنوں میں برابر استعمال ہوتا ہے ۵

حافظ

دلم از پردہ بشد حافظ خوش لہجہ کجاست — تا بقول و غزلش ساز و نوائے بکنیم

گل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی نوا کے باعث

دوسرے مصرع کی نسبت حضرت شرر کا اعتراض ہے کہ "گائن کی جگہ گائی اور ناچنے والی کی جگہ ناچنی غلط ہے"

اس موقع پر بھی حضرت شرر نے ایک قدیم محاورے کو "غلط" ٹھہرانے میں تکلف نہیں کیا ہے گلزار نسیم کی زبان وہ زبان ہے جو کہ لکھنؤ میں ۷۰ سال پیشتر مروج تھی۔ گائی اور ناچنی کی ترکیب اس زمانے میں ضرور غیر فصیح معلوم ہوتی ہے مگر نسیم کے زمانے کے شعرا کے کلام میں اسکی مثالیں ملسکتی ہیں۔ مثلاً میر انیس فرماتے ہیں۔

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس رباعی کے دوسرے مصرع میں آنے والی کی جگہ "آنی" اور "جانے والی" کی جگہ "جانی" نظم کیا گیا ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ "گانے والی" اور "ناچنے والی" کے بدلے "ناچنی" استعمال کرنا دونوں کی ترکیب میں سرمو فرق نہیں ہے۔

---

۵ یہ مصرعہ گلزار نسیم کے اس نئے اڈیشن میں غلط چھپ گیا ہے یعنی کاتب نے "گائی" کے بدلے "گاتی" اور "ناچنی" کے بدلے "ناچتی" بنا دیا ہے۔ گو کہ ایک نقطے کا بڑھا دینا یا گھٹا دینا کاتبوں کی معمولی سے غلطی ہے۔ مگر حضرت شرر نے اس قرین قیاس بات کو نظر انداز کر کے مجکو تعرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے۔ خیر اسکا جواب اس مضمون کے آخری حصے میں دیا جائیگا۔

حضرت شرر کا ایک اعتراض یہ ہے کہ گلزار نسیم میں چنگل اور چنگال کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے اور تینوں جگہ بےموقع اور غلط۔ اس اعتراض کی تشریح کے لئے ذیل کے تین مصرعے لکھے گئے ہیں

(۱) پونچھا لب حوض سے نہ چنگل
(۲) شہزادے پہ اسنے مار چنگال
(۳) پیاری یہ نہیں حنائی چنگال

پہلے مصرع کے معنی حضرت شرر نے لکھ دئے ہیں یعنی "ہاتھ نہیں پونچھا" اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تحریر فرمایا ہے۔ دوسرے مصرع کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ "یہاں اگر یہ کہا جائے کہ پروں کی طرح پری کے پنجے ہی تھے تو شاید صحیح ہو جائے" تیسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ مہندی لگے ہاتھوں کو حنائی چنگال کہنا لکھنؤ کی زبان نہیں ہے ان اعتراضات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شرر کا یہ خیال ہے کہ چنگل اور چنگال محض پنجہ جانور کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے جس شخص نے فارسی کی درسی کتابیں بھی پڑھی ہیں وہ جانتا ہے کہ فارسی شعراء نے "چنگال" ہاتھ کے معنوں میں برابر استعمال کیا ہے۔ شیخ سعدی بوستان میں کہتے ہیں۔

مرا در صفاہان یکے یار بود
کہ جنگ آور و شوخ و عیار بود

پلنگانش از زور وسر پنجہ زیر — فرو بردہ چنگال در مغز شیر

تیسرے مصرع پر جو اعتراض ہے وہ بالکل خارج از آہنگ ہے "حنائی چنگال" فارسی کا محاورہ ہے اسکی نسبت یہ کہنا کہ یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے کوئی معنی نہیں رکھتا اگر یہ کہا جائے کہ دست حنائی کے بدلے۔ حنائی چنگال کہنا درست نہیں تو اعتراض کے کچھ معنی ہو بھی سکتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض بھی بیجا ہے۔ ملا شہیدی فرماتے ہیں۔

بستہ رنگ حنا بر چنگل خود اے نگار
یا بخون عاشقاں تر کردہ چنگال را

غیاث اللغات صفحہ ۱۲۶ "چنگل و چنگال۔ پنجہ آدمی وغیرہ از مدیہ و بہار عجم و جہانگیری وغیرہ"

شاہ بیجا وہ ہوا کہا کہ جب جا جا
کیسی را نی کہاں کا راجا

اعتراض ہے کہ "برہم ہوا کی جگہہ پر بیجا ہوا کہنا بہت ہی مبتذل بازاری زبان ہے" میں نے دیباچے میں خود تسلیم کر لیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر موقعوں پر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھدئے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی اسی طرز کا ہے۔ اسمیں "جا جا" کے لئے "بیجا" نظم کر دیا ہے۔ حالانکہ برہم نہایت آسانی سے نظم ہو سکتا تھا۔ اب رہا یہ کہ "بیجا" بازاری زبان ہے۔ اسکی نسبت میں صرف اسقدر کہونگا کہ بیشک اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا کہنا بیجا نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا نسیم کے زمانے میں بھی "بیجا" بازاری زبان میں داخل سمجھا جاتا تھا کہ نہیں۔

میر تقی۔ میر کا شعر ہے

جنگ زمانہ میں تو صحبت ہی عشق ہی کا ۔ بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

(کلیات میر صفحہ ۹۴۳ دیوان چہارم)

"بیجا" کے علاوہ اکثر الفاظ ایسے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں ضرور فصیح سمجھے جاتے ہوں گے مگر فی الحال وہ بازاری زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ مثلاً میر انیس نے "جگہہ" کی بالعوض "جاگہ" نظم کیا ہے۔ جس کی مثال ان کے معاصرین کے کلام میں مشکل سے ملے گی اور اس زمانے میں تو "جاگہ" بالکل "مبتذل بازاری" زبان میں داخل ہے۔ جسکا استعمال تعصباتی لوگ بھی معیوب سمجھتے ہیں اس بنا پر یہ کہنا کہ میر انیس نے بازاری اور مبتذل زبان نظم کی ہے بالکل بیجا ہے۔

شاہ جھنجلا کے ڈرا کے غل مچا کے ۔:۔ سمجھا کے بجھا کے دست پا کے

اعتراض ہے کہ "اردو میں دسترس پانا کہہ سکتے ہیں مگر دست پانا" قابو پانا کی جگہہ ہرگز جائز نہیں ہے" حضرت شرر کو غالباً معلوم ہوگا کہ "دست یافتن" فارسی کا محاورہ ہے اور قابو پانے کے معنی میں استعمال

عـــہ ۔وسواس کا مقام ہے جاگہ قلق کی ہے ۔ بیجا نہیں ہول میں یہ صاشیر حق کی ہے (جلد اول صفحہ ۹۸ طبع ۱۹۱۴ء)

عـــہ نظیر فاریابی۔ شبے کہ وسوسہ عقل دست یافت ظہیر ۔ بنوش بادہ کہ ایں رفع آں ملال کند
سعدی۔ چرا قبالش اندوستی سر تافت + ناکام دشمن بہ دست یافت

ہوتا ہے۔ نسیم نے اس محاورے کا ترجمہ کر دیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے نسیم کے زمانے میں اس صورت پر فارسی محاوروں کا ترجمہ کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً "دوش دادن"[۹] فارسی کا محاورہ ہے۔ رند نے اس محاورہ کا ترجمہ بالکل نسیم کی طرح کیا ہے ؎

تیرے کوچے سے نہ اٹھیگا نہ جنازہ میرا
بعد مُردن نہ دیا تو نے اگر دوش مجھے

ظاہر ہے کہ جس طرح آجکل کوئی قابو پانے کے بدلے "دست پانا" نہیں کہتا اسیطرح کاندھا دینے کی جگہ "دوش دینا" نہیں استعمال کرتا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اردو میں "انعام دینا" محاورہ ہے۔ مگر چونکہ "انعام کردن" فارسی کا محاورہ ہے لہذا آتش نے یہ کہنے میں تکلف نہ کیا کہ ؎

باغباں خیر چمن کا بھی کوئی کام کریں
سرو قمری کو عنادل کو گل انعام کریں

علاوہ بریں سودا وغیرہ نے تو "دست" قدرت کے معنی میں اکثر استعمال کیا ہے سودا

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیدا

۹۱ تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی

اس مصرع پر دو اعتراض ہیں اوّل یہ کہ "اردو میں جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بد تمیزی ہی نہیں غلطی ہوگی گلزار نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ نہیں بلکہ روح افزا سے پہلی ہی ملاقات میں کہتا ہے۔ "جی بجانہ جانی" اور وہ جواب دیتی ہے کہ "تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی"

اس نیم اخلاقی اور نیم شاعرانہ اعتراض کے جواب میں میں صرف اسقدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت شرر نے اس کلمہ شفقت (جانی) کے استعمال کے لئے جو حدود قائم کئے ہیں ممکن ہے کہ انکی پیروی آیندہ نسلیں کریں۔ لیکن نسیم کے زمانے میں شرفاء لکھنؤ "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ

۹۔ ناصر علی۔ وضع تمکین خرد مجرم ایں راہ نبود + لغزش پا مردے کہ کرد دوشم دادند

کے دوسروں کی شان میں بھی استعمال کرتے تھے اور محض خلوت میں نہیں۔ بلکہ دوچار کے سامنے۔ اور اب بھی جو بزرگ اس زمانے کے یادگار باقی ہیں ان کا یہی دستور ہے۔ "جانی" کا لفظ بلا کسی رکیک خیال کے محض پیار اور محبت کے اظہار کے لئے بولا جاتا تھا۔ ذیل کی مثالیں سند آ درج ہیں

"دریائے عشق" میں ماں لڑکے سے کہتی ہے۔ ؎

یہ تم سے امید تھی نہ جانی
دے جاؤ گے داغ دل نشانی

طلسم الفت (قلق) میں جب شہزادہ سفر کو جاتا ہے تو ماں کہتی ہے ؎

کیا ہی دل میں ٹھان لی جانی
ماں کی ہوتی ہے خانہ ویرانی

پھر آخری رخصت کے وقت دعا دیتی ہے ؎

جانی اللہ کی پناہ تمہیں
ہو نہ زنہار رنج راہ تمہیں

"زہر عشق" میں بھی ماں لڑکے سے کہتی ہے۔ ؎

پالا کس کس طرح تمہیں جانی
کون منت تھی جو نہیں مانی

علاوہ بریں اگر اس زمانے میں "جانی" کا مفہوم کسی قدر بھی غیر مہذب سمجھا جاتا تو یہ لفظ مرثیوں میں ہرگز استعمال ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ انیس

عباس نے رو کر کہا کیا چاہیے جانی
شرما کے سکینہ نے یہ کی عرض کہ پانی

(جلد اول صفحہ ۲۱۳ بند ۳۹)

دبیر ؎ اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی :: زخمی میں گھرا ہے وہ یداللہ کا جانی

(جلد دوم صفحہ ۱۹۷ بند ۵۵)

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مندرجہ بالا مثالیں ان موقعوں کی ہیں جہاں ہجوم عام تھا

اور خلوت کا ذکر نہ تھا مجکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت شررؔ نے اس محاورے کے استعمال پر" بدتمیزی" کا الزام لگاکر کتنے بزرگوں کی روح کو صدمہ پہونچایا۔[۱]

اس مصرع (تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی) پر دوسرا اعتراض یہ ہی کہ "تجھ پاس" کا لفظ بھی "تیرے پاس کی جگہ کہاں کی زبان ہے "تیرے" کے بدلے "تجھ" اور میرے" کے بدلے "مجھ" استعمال کرنا آج کل ضرور ناجائز سمجھا جاتا ہی لیکن سوداؔ و میرؔ کے زمانے سے لیکر آتشؔ و رندؔ و نسیمؔ و نواب مرزا شوقؔ کے زمانے تک یہ محاورہ عام تھا

میرؔ۔ اب اشک حنائی سے جو تر ہوئے آنکھیں ۔۔۔ وہ تجھ کف رنگین کا مارا ہوا ہوگا

سوداؔ۔ نگر آباد ہیں بستے ہیں گاؤں ۔۔۔ تجھ بن اجڑی پڑی ہے اپنی نلوں

آتشؔ۔ شام سے تا صبح نیند آئے نہ اک دم تجھ بغیر + آگ نالوں نے لگائی اشک نے طوفان کیا

رندؔ

آنکھ تجھ بن جو کسی پر بت عیار پڑے ۔۔۔ عوض سبحہ گلے میں مرے زنار پڑے

عاشق روئے حسینان ہیں بیمار اجل ۔۔۔ بنکے صورت حور کی مجھ پاس آیا چاہئے

پھر یہ مونھ لیکے آئے ہو مجھ پاس ۔۔۔ دور ہو سامنے سے نفرت ہے

نواب مرزا شوقؔ

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن

اب سکے بچھڑے ملینگے حشر کے دن

کیا افسوس کا مقام ہے کہ "تجھ پاس" کی ایسی عام ترکیب پر حرف رکھا جاتا ہے اور ایسے اعتراض سے اساتذہ لکھنؤ کا دامن آلودہ کیا جاتا ہے۔

نکلا جیسے ہے منھ کے باہر

پتھرا گئی چشم حلقہ در

ص ۲۰

اعتراض ہے کہ " فارسی میں" حلقہ در" کنڈی کو کہتے ہیں اور یہاں جب ہی معنی صحیح

---

[۱] یہ تاویل بہت کمزور ہے۔ ماں کا بیٹے سے یا کسی بزرگ کا اپنے چھوٹوں سے جانی کے لفظ سے خطاب کرنا محبت بزرگانہ پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک غیر عورت سے کسی مرد کا بلا تعارف سابقہ "جانی" کہنا ضرور قابل اعتراض ہے۔ (ایڈیٹر)

ہوسکتے ہیں کہ حلقۂ در سے دروازے کا بورا چوکھٹا مراد لیا جائے۔ غالباً حضرت شرر نے ہندوؤں کا وہ قدیم ساخت کا شوالہ نہیں دیکھا ہے۔ "شوالہ" کہتے ہیں ورنہ آپ ایسا اعتراض نہ کرتے "شوالے" کی ساخت گنبد نما ہوتی ہے۔ اس میں دروازے کے چوکھٹے وغیرہ یا کنڈی کو مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اسکے تین جانب ایک گول دیوار ہوتی ہے اور ایک جانب ایک محراب دار در ہوتا ہے۔ نسیم نے حلقۂ در سے محراب در مراد لی ہے۔ فارسی شعراء نے بھی حلقۂ در کو محراب در کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ بدر چاچ نے قلعہ دہلی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اسکا ایک شعر محراب در کی تعریف میں درج ذیل ہے

چو قلعہ ایست کہ قوسے ز حلقۂ در او   محیط نہ ہفت طارم اعلیٰ است

یہ بھی خیال رہے کہ فارسی شعراء نے "کنڈی" کے لئے "حلقۂ بیرون در" زیادہ تر استعمال کیا ہے اور حلقۂ در سے عموماً محراب در مراد لی ہے۔

اک دن پنجرا اُٹھا کے لائی
۵۲۱ حسن آرا کو وہ کل سجھائی

حضرت شرر نے پیشتر اس شعر کی تشریح اسطرح کی ہے کہ "یہ تدبیر بتائی کہ یہ آدمی کیونکر قمری بنایا گیا ہے" مگر باوجود اصلی مطلب سمجھ جانیکے آپنے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اردو میں صرف مادی شیئوں کے نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے۔ طلسم اور جادو اور عمل کی نسبت اسکا استعمال ہرگز جائز نہیں ہے" گو کہ حضرت شرر نے یہ کلیہ قایم کر دیا ہے کہ اردو میں کل کا لفظ صرف مادی شیئوں کی نسبت استعمال ہوسکتا ہے مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ کل کا لفظ اردو میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ "ترکیب" کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے نسیم نے اس شعر میں "کل" سے "ترکیب" مراد لی ہے یعنی حسن آرا کو وہ ترکیب بتائی" اور چونکہ پنجرے میں بھی کل ہوتی ہے لہذا تناسب لفظی کا بھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ حضرت شرر کا یہ دعوی کہ جادو اور عمل کے نسبت "مشین" کے معنی میں

عہ جیسا کہ ذیل کے فقروں سے ثابت ہے "میں کل جاؤنگا" "او بٹ کس کل بیٹھتا ہے" "اسکو کسطرح کل نہیں پڑتی" نمبر ملاحظہ

کل کا استعمال جائز نہیں ہے۔ بالکل بے دلیل ہے۔ میرحسن کی "پہلی اعلیٰ اور مقبول عام اردو مثنوی" میں جب منیر جب بے نظیر کو جادو کا گھوڑا پرستان میں دیتی ہے تو کہتی ہے ؎

یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کا تجھے ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے

یا دوسرے موقع پر کہتی ہے ؎

جو اترے تو کل اسکے یوں جوڑ یو جو برعکس چاہت تو وہ کل موڑ یو

دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی
شب کو اسے آدمی بناتی ؎۲۲

حضرت شرر کا طوطی فکر اس شعر کی نسبت یوں نغمہ زن ہے " تو تا پڑھایا جاتا ہے۔ مینا پڑھائی جاتی ہے۔ فاختہ کا پڑھایا جانا ایک بالکل نئی بات ہے " حضرت شرر کو معلوم ہو گا کہ یہ "طلسمی فاختہ" تھی اور اسکو پڑھانے والی ایک پری تھی جو کہ جادو کے زور سے بہت سی ایسی "نئی باتیں" کر سکتے تھی جو حضرت شرر کے خیال کے مطابق اعتراض کے قابل ہو سکتی ہیں علاوہ بریں فقیر اکثر فاختہ پالتے ہیں اور اُسے پڑھاتے بھی ہیں۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت شرر کا اعتراض صحیح ہے تب بھی اسکا الزام اس شخص کے سر ہے جسنے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نہ کہ نسیم کے سر آخر میں یہ عرض کروں گا کہ کسی "نئی بات" کو قابل اعتراض قرار دینا واجب نہیں ہے۔ عام طور سے کبوتر اڑا کر جاتے ہیں مگر خلیل خاں فاختہ اڑا گئے۔ یہ "بالکل نئی بات ہے"۔ خدا جانے یہ اعتراض "اساتذہ لکھنو" میں سے کن صاحب کی پرواز فکر کا نتیجہ ہے۔ مجھکو تعجب ہے تو اسقدر کہ اس زمرے میں حضرت شرر نے گلزار نسیم کی اس حکایت پر کیوں نہ اعتراض کیا جسمیں یہ ذکر ہے کہ ایک طائر نے اپنے صیاد سے جواب و سوال کئے یہ "بالکل نئی بات ہے"۔

سوجھا تو نہ تھا صلاح الجھنا
دانائی تھی بات کا سمجھنا ؎

اس شعر پر ایک بہت مختصر سا اعتراض ہے کہ " دانائی تھی " کتنا برا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے" چونکہ اس اعتراض کی زیادہ تشریح نہیں کی گئی ہے لہذا چند اشعار "اساتذہ لکھنو" کے کلام سے لکھے جاتے ہیں۔ جنکی بندش اس مصرع (دانائی تھی بات کا سمجھنا) کی بندش کے مطابق ہے۔

طلسم الفت (خلق) شب نہ تھی دود آہ عاشق تھا

جلوہ نور صبح صادق تھا

آتش

مر بہر مضمون ملائی رنگ کے بند تیر ہیں
سرنوشت اپنی بھی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا

مسجد سے میکدے میں مجھے نشہ لیگیا
موج شراب جادہ تھی راہ صواب کا

امیر مینائی ؎
وادی ایمن میں تھی برق تجلے بے حجاب
جرأت موسیٰ تھی پردہ جلوۂ دیدار کا

اب اس عام بندش کو کسطرح بھونڈا کہئیے۔

میں نے گلزار نسیم کے دیباچے میں یہ خود تسلیم کرلیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبہ سکا ہے۔ اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھ دئے ہیں۔ لیکن حضرت شرر نے غالباً اعتراضات کی تعداد بڑہانے کے لئے اس قسم کے شعر بھی اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔ جنہیں آپ کے نزدیک نسیم سے تناسب لفظی اچھی طرح نہیں نبہ سکا ہے۔ مگر جن اشعار پر آپنے اس پہلو سے اعتراضات کئے ہیں وہ ایسے اعتراضات سے بری ہیں اب اس رنگ کے اعتراضات ملاحظہ ہوں۔

؎
واغا تو چلے تفنگ سے وہ
چھوٹے ہتید فرنگ سے وہ

اعتراض ہے کہ "تفنگ کی چال سے انسان کی چال کو کیا علاقہ؟" اول تو میں عرض کروں گا کہ "تفنگ چلنے" سے "گولی کا چلنا" مراد لیا جاتا ہے لہذا انسان کی چال کو تیزی کے لحاظ سے گولی کی چال سے تشبیہ دی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "تفنگ چلنا" گولی کے چلنے کے معنوں میں نہیں استعمال کیا جاتا تب بھی حضرت شرر کے اعتراض کا جادو چلتا نہیں نظر آتا ذو معنی الفاظ کو اسطرح استعمال کرنا جسطرح نسیم نے اس شعر میں "چلے" کو نظم کیا ہے نزاکت شاعرانہ میں داخل ہے۔ اور شعرائے لکھنؤ نے اس قسم کے تکلفات کو بہت رواج دیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ آتش۔

ایسی وحشت نہیں دل کو کہ سنبھل جاؤنگا
صورت پیرہن تنگ نکل جاؤنگا

ظاہر ہے کہ پیرہن سے کے بھاڑنے سے آدمی کی گلی کو منطقی طور پر کوئی علاقہ نہیں ہو مگر شاعری میں ایسا کرنا جائز ہے اس رنگ کی اور مثالیں بھی مدیہ ناظرین ہیں۔ وزیر ؎

ضعف سے مانگی کہ خون کی چھینٹیں اڑکر | آستیں کا ہے ترے کوس انیس عنبر قاتل

ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ کا
مانگو نگا میکشی کو پیالہ تفنگ کا

(حضرت شرر کہینگے کہ میکشی کے پیالے سے اور تفنگ کے پیالے سے کیا علاقہ)

قلق { اسکی تلوار کے سوال کا پیالہ تو نہیں	آب شمشیر کی تاثیر جو تیزاب میں ہے
ایسا کاٹتا ہے خارِ مژگاں کا	وزن کر لیتا ہے نہ رجاں کا (طلسم الفت)
رند۔ دور ہوتا روح طاہر سے کثافت جسم کی	گھاٹ پر اسکی سروہی کے نہانا چاہئے

شعر ۲۵
وہ پور بی کر کے جوگیا بھیس
جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اعتراض ہے کہ سب راستے چھوڑکر تاج الملوک جنگلے کی راہ محض اسلئے بھیجا گیا کہ مصنف گلزار نسیم کو اس لفظ کی ضرورت تھی" حضرت شرر نے اس مقام پر بھی سیاق کلام سے چشم پوشی کی ہے۔ یہ شعر اس موقع کا ہے کہ جبکہ تاج الملوک گل لیکر وطن کی طرف کشتی پر چلا ہے اور جب وطن کے متصل آگیا ہے تو اس مقام پر یہ صورت درپیش آئی ہے۔

سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد	کیا جانئے کیا پڑے گی اُفتاد
لازم ہے گل اپنے ہاتھ رہ کئے	موقع نہیں ہیئت ساتھ رہ کئے
لنگر کا انہیں کیا اشارہ	خود کشتی سے کر گیا کنارا
وہ پور بی کر کے جوگیا بھیس	جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اس سلسلے میں آخری شعر کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ تاج الملوک کو بیٹے ساتھ رکھنا منظور نہ تھی اسلئے وہ دریا کی راہ چھوڑکر فقیروں کے لباس میں جنگل کے راستے سے وطن کی طرف پیدل چونکہ وہ بھیس بدلکر چلا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی پہچانے اسلئے وہ بھی شاہراہ سے کنارہ کشی کر کے جنگلوں میں ہوتا ہوا وطن کی طرف سدھارا۔

۵۱

نقش اسکو ہوا کہ بس وہی ہے
ان سادوں سے کندہ کب ہوئی ہے

اس شعر پر دو اعتراض ہیں اولاً یہ کہ "اسکے دل پر نقش ہوا" کے بدلے "نقش اسکو ہوا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا - اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا اعتراض بہت بجا ہے - لیکن نسیم کے وقت یہ اختصار جائز سمجھا جاتا تھا - شیخ ناسخ فرماتے ہیں ؎

سارے نقشے سامنے آنکھوں کی ہیں — نقش ہیں نقش و نگار لکھنو

(یعنی دل پر نقش ہیں ہمارے)

دوسرا اعتراض حضرت شرر نے "سادوں" پر جڑا ہے آپ فرماتے ہیں "اصل تو سادہ مزاج" "سادہ لوح" ہیں - "سادے آدمی" اور سادے لوگ بھی سہی مگر محض "سادوں کا" لفظ تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس اعتراض کے لئے وہی جواب ہے جو اسکے پیشتر کے اعتراض کے لئے لکھا گیا ہے اور دو شعر سنداً پیش ہیں - ناسخ

ترک کرواتا ہے عشق سادہ رو — زاہد بے دین بھی کتنا سادہ ہے

(یعنی سادہ لوح ہے یا سادہ آدمی ہے)

جانصاحب

کتنی سادہ ہو کہ جٹی مانگتی مینا سے ہو
میں بھبوکا لعل منگوا دوں تمہیں دو چار چرغ

جس زمانے میں "محض سادہ" سادہ لوح کے بدلے بولا جاتا تھا تو اسکی جمع "سادوں" بھی ضرور فصیح سمجھی جاتی ہوگی ؎

۵۲

دیووں نے ادھر محل بنایا
کشتی سے وہ دخت رز کو لایا

اعتراض ہے کہ نسیم نے محمودا کو "بغیر خیال کئے دخت رز کہدیا اور یہ یاد نہیں رہا کہ دخت رز شراب کو کہتے ہیں"

حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ "دخت رز" سے کوئی معشوقہ عورت مراد لینا جائز نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہے - آتش کا شعر ہے ؎

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے　　　میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

یا تعلق کہتے ہیں ؎

وہ میکش ہوں کہ میں نے دخت رز کو گھر میں ڈالا ہے　　　لبالب بادہ گلرنگ سے دل کا پیالا ہے

ظاہر ہے کہ نہ آتش محض "شراب" کو نور جہاں بیگم کہہ سکتے تھے۔ نہ تعلق یہ کہہ سکتے تھے کہ "میں نے شراب کو گھر میں ڈالا ہے لیکن "دخت رز" میں لفظ "دخت" کی وجہ سے شاعر کو "شراب" "عیش و عشرت کی ایک مجسم تصویر" نظر آتی ہے اسلئے وہ اسکو کسی معشوقہ عورت سے تشبیہ دینے میں تکلف نہیں کرتا۔ اس صورت میں اگر "دخت رز" نور جہاں بیگم بن سکتی ہے تو محمودا کیوں نہیں بن سکتی۔ اور چونکہ محمودا کشتی پر تھی اور کشتی دخت رز سے بھی خاص تعلق رکھتی ہے اسلئے تشبیہ اور بھی چسپاں ہو گئی جس شخص کو شعر و سخن کا کچھ بھی مذاق ہے وہ اس قسم کی شاعرانہ نزاکتیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

۵۲۸　وہ گندم جو نما تھی بالی

حضرت شرر اس مصرع کی نسبت فرماتے ہیں کہ "رعایت لفظی نے مضمون کی کیا مٹی خراب کی ہے" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مصرع میں کیا عیب ہے بہتر ہوگا اگر حضرت موصوف کسی آیندہ موقع پر اپنے اس مختصر مگر ناموزوں اعتراض کی تشریح فرمائیں۔

۵۲۹　فوارہ تو گم خزانہ باقی

اس شعر کے نسبت حضرت شرر نہایت حیرت سے فرماتے ہیں کہ "بلا فحش و ابتذال کی کوئی حد ہے"۔ جسطرح حضرت شرر نے گلزار نسیم کی زبان پر بحث کرتے ہوئے تمام قدیم محاوروں کو جو کہ اب متروک ہو گئے غلط کہنے میں تکلف نہیں کیا ہے۔ اسیطرح اس موقع پر بھی تنقید سخن کے اس اصول اولین سے بے خبری ظاہر کی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے اخلاقی پہلو پر اس زمانے کی تہذیب کا معیار پیش نظر رکھکر بحث کرنی چاہیئے جس زمانے میں کہ وہ شاعر پیدا ہوا تھا۔ نسیم کے زمانے میں ان فحش محاوروں کا نظم کرنا ناروا نہیں سمجھا جاتا تھا جنکا زبان پر لانا اب خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ شاعر کا کلام اسکے زمانے کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے اسلئے گلزار نسیم بھی فحش کے کانٹوں سے پاک نہیں ہے۔ نسیم اسحالت میں ضرور قصوروار تھے جبکہ انکے کلام میں فحش محاورے ملتے اور انکے معاصرین کا کلام ایسے محاوروں سے پاک ہوتا۔ مگر ایسا نہیں۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کلام میں فحش محاورے موجود ہیں لہ

۳۰ە
باہم زن و مرد نے کیا میل
دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل

اعتراض ہے کہ "یہاں سیل کے معنے ہی کچھ نہیں باقی رہے" غالباً حضرت شرر "قطرہ زن" کے معنے "قطرہ بار" سمجھے ہیں جبھی آپ فرماتے ہیں کہ "یہاں سیل کے کچھ معنی باقی نہیں رہے" مگر ایسا نہیں ہے۔ "قطرہ زن" فارسی کی ایک خاص اصطلاح ہے جسکے معنی "شتابندہ" کے ہیں یہاں قطرہ زن سیل سے "شتابندہ سیل" مراد ہے جو کسی صورت میں بے معنی نہیں ہے۔ قطرہ زن کے معنوں کے نسبت حضرت شرر کوئی لغت دیکھکر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔

۳۱ە
غربت میں وطن کی دُھن سمائی
اس فیل کو یاد ہند آئی

اعتراض ہے کہ "فیل سے تشبیہ صرف ہند کی ضرورت سے دیگئی ہے۔ مگر کسقدر برا معلوم ہوتا ہے" حضرت شرر کا اس مصرع کی نسبت کچھ ہی خیال کیوں نہو مگر اسکو قبول عام کی سند مدت ہوئی مل چکی ہے۔ یہ مصرع ضرب المثل ہوگیا ہے کہ ع - اس فیل کو یاد ہند آئی۔

۳۲ە
خواہش جو بلائے جان ہوئی وہ
ہلکا ہوا وہ گراں ہوئی وہ

اعتراض ہے کہ "جب بکاولی تو چونکہ آدہی پتہر کی ہوگئی تہی اسلئے گراں ہوئی مگر ایسی حالت میں تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوئے" تعجب ہے کہ حضرت شرر لکھنؤ کے اس معمولی محاورے سے واقفیت نہیں رکھتے کہ "ہلکا ہونا" ذلیل ہونیکے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ نسیم نے "ہلکا ہوا" سے یہ مراد لی ہے کہ وہ بہری محفل میں ذلیل ہوا اور شعرائے اردو نے بہی یہ محاورہ نظم کیا ہے۔ **قلق**

بیتابی الفت نے کیا ہے سبک ایسا　　خاطر پہ گراں یار کی نظروں میں ہوں ہلکا

میاں صاحب کی درگا نا ہوبالی کیا کہوں۔

جان صاحب
کر دیا ہلکا سب مجھے منجھلی نوا کے سامنے

حضرت شرر اس شعر میں "گراں ہوئی" کے معنی ہی غلط سمجھے ہیں۔ "گراں ہوئی" کے معنی اس مقام پر یہ ہیں۔ کہ بکاولی اہل محفل کی طبیعت پر گراں ہوئی۔

حضرت شرر یہ بھی فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم کے بہت سے اشعار میں افعال کا استعمال ایسی بری طرح سے ہوا ہے کہ جو نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک جائز ہے نہ دہلی والوں کے نزدیک" اس اعتراض کی تائید میں حضرت موصوف اس قسم کے مصرع پیش کرتے ہیں۔

۶۔ خاتم کے نگین بتائی ہوتے (خاتم کے نگین انھوں نے بتائی ہوتے" یا خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا)

۶۔ حیلہ کرکے چھپائی گیند (بجائے "اسکو چھپایا")

۶۔ اس شب کو بغل میں آکے جاگا (یعنی" اس رات جب وہ آئی تب جاگا)

۶۔ ہائیں دیکھا کہیں نہ پائی (یعنی کہیں نہ پایا)

۶۔ بیدار کیا وہ ماہ پیکر۔ (یعنی اس ماہ پیکر کو بیدار کیا)

وغیرہ وغیرہ

بیشک آجکل جو زبان کا رنگ ہے اسکے لحاظ سے افعال کا استعمال اس صورت پر غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نسیم کے معاصرین کے کلام میں اس قسم کی ترکیبیں عام نظر آتی ہیں ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ناسخ۔

کیا اتحاد ہے کہ وہ پیٹا جو گاڑ کر ——— مدفن میں ہو گیا ہے ہمارا بدن سفید

(یعنی اُسنے اپنی چھتی پیٹا" کے بدلے" وہ پیٹا" استعمال ہوا ہے)

ناسخ۔ کیوں نہ ہو وہ نوجواں برسات میں رنگین لباس ——— پیر گردوں تک شفق کا لال جوڑا چاہیے

(یعنی پیر گردوں تک کو شفق کا الخ)

ناسخ۔ گھر میں تیرے پاس سے جاتا نہیں ——— اب تو سیکھا ہے مرے ڈھنگ آئینہ

(یعنی اب تو آئینے نے میرے ڈھنگ سیکھے ہیں)

" بوسہ مانگا میں نے وہ کہنے لگے گھر سے نکل ——— جو کہ سائل ہو وہ دروازے کے باہر چاہیے

(یعنی اسکو دروازہ کے باہر ہونا چاہیے)

آتش۔ جوش وحشت میں جو لی زنداں سے میں نے راہ دشت ——— کودکاں مجکو خدا حافظ پکارے شہر سے

(یعنی کودکاں نے مجکو خدا حافظ پکار کر کہا)

" باغ عالم میں یہی میری دعا ہے روز و شب ——— خار خار عشق گلرخسار توڑا چاہیے

(خار خار عشق گلرخسار کو توڑا چاہیے)

آتش - ہوگیا ہی ایک مدت سے دل نالاں خموش
باغ میں جاکر اسے بلبل سنانا چاہئے
(اسے نغمہ بلبل سنوانا چاہئے)

رند - حاضر اگر ہے دن کو تو غائب ہی رات کو
غمزہ یہ کس حسین سی سیکھا ہی آفتاب
(یعنی آفتاب نے یہ غمزہ کس حسین سی سیکھا ہی)

" ہجر بت میں ہی جب جیسے میں تنگ
اسپنے اللہ کو پکارے ہیں
(یعنی ہم نے اپنے اللہ کو پکارا ہے)

دریائے تعشق (واجد علیشاہ)
پایا نہ مگر وہ ماہ طلعت
پوشیدہ رہا برنگ نکہت
(یعنی "اس ماہ طلعت کو نپایا" یہ بعینہ ویسی ہی ہی جیسے کہ "بیمار کیا وہ ماہ پیکر")

قلق - خواہش جستجوی یار مرے سے بھی کچھ ہی ہشیار
بعد فنا مرا غبار ڈھونڈھ پھرا گلی گلی
(یعنی "اسے ڈھونڈھتا پھرا گلی گلی") ۱؎

اس زمانے میں نظم کے علاوہ نثر میں بھی افعال کا استعمال اس صورت پر جائز سمجھا جاتا تھا - فسانہ عجائب سی ذیل کا اقتباس تمثیلاً درج ہی - " دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دلہن گود میں اٹھالی الخ "
(یعنی دلہن کو گود میں اٹھایا)

حضرت شررؔ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہی کہ " شتر گربہ کے عیب سے بھی یہ مثنوی خالی نہیں " - اور اس اعتراض کی تائید میں ایک شعر پیش کیا ہی جو کہ درج ذیل ہی -

ہے یاکہ نہیں خطا تمہاری
فرمائیے کیا سزا تمہاری ۳۴؎

افسوس ہے کہ حضرت شررؔ اس شعر کی نزاکت کو نہیں سمجھے - ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے - یہ شعر

۱؎ - ان مثالوں میں سو اکثر بے تعلق ہیں کیونکہ سمجھنا - پکارنا - اور پڑھنا ایسے فعل ہیں جنکے فاعل کے ساتھ محاورے میں " نے " نہیں بھی آتا مثلاً " ہم سمجھے " - " زید پکارا " وغیرہ - اور پیٹنا بمعنی ماتم کرنا " کے ساتھ تو " نے " کبھی آتا ہی نہیں - غرضکہ ان تمام مثالوں میں سے صرف واجد علیشاہ کی بیت بطور سند پیش کیجاسکتی ہی لیکن اسکو از قبیل شاذ سمجھنا چاہئے ہماری رائے میں نسیم کے زمانے میں بھی انکا اس کثرت کے ساتھ استعمال ضرور قابل اعتراض ہی - " اڈیٹر "

اس موقع کا ہی جبکہ بکاولی تاج الملوک پر اپنے غصّے کا اظہار کر رہی ہے۔ اور یہ سب پر روشن ہی کہ جس وقت کوئی شخص عالم غیظ میں کسیکو خطاب کرتا ہی تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ میری تقریر اس وقت "شتر گربہ" کے عیب سے پاک رہے۔ وہ کبھی "تم" کہتا ہے کبھی طنزاً "آپ" کہتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں نسیم نے بکاولی کے غصّے کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ کبھی "تم" کہتی ہے کبھی طنزاً "فرمائیے" کہتی ہی۔ الفاظ سے اس قسم کی مصوری کرنا کمال شاعری میں داخل ہے۔ اگر اس شاعرانہ نزاکت کے خیال کو بالائے طاق رکھکر اس شعر کو محض ایک مُلّائے مکتبی کی نگاہ سے دیکھیے تب بھی حضرت شرر کا اعتراض بیجا نظر آتا ہے۔ کیونکہ نہ تو فارسی شعرا نے "شتر گربہ" سے پرہیز کیا ہی نہ قدیم اساتذہ اردو نے۔ محض طبقہ حال کے شعرا نے "شتر گربہ" کو ناجائز قرار دیا ہے[ع] نسیم کے معاصرین کے کلام میں "شتر گربہ" کی پچاسوں مثالیں ملسکتی ہیں طوالت مضمون کے خیال سے ہر شاعر کے کلام سے دو دو ایک مثالیں دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حافظ
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
بسرت گر ہمہ عالم بسرم بخروشند — نتواں برد ہوائے تو برون از سر ما

آتش
ہر لباس آپ کو ہی زیبندہ — جامہ زیبی سے کہ بادشاہ ہو تم
تم تو غریب خانے میں آئے نہ ایک روز — فرمائیے تو شب کو کسی وقت آؤں میں

ناسخ۔ میں جاں بلب ہوں گلا کاٹو یا گلے سے ملو — جو اسمیں آپ کو منظور ہو سو جھٹ پٹ ہو

رند
ہاتھ سے رند کو کھوتے ہو عبث — کہیں ایسا نہو پچھتائیے آپ

قلق
تیز دستی کی پائیگا سزا — شامت آ جائیگی تمہاری بجا (طلسم الفت)

قلق
آپ کو کچھ نہیں خیال اپنا — دیکھو آئینے میں تو حال اپنا (طلسم الفت)

نواب مرزا شوق۔ شکل دکھلاؤ کبریا کے لئے — بام پر آ ؤ ذرا اس کے لئے (زہر عشق)

جان صاحب۔ پڑی ہیں سر میں جوئیں اب ایسی کہ بچ ہی جینے سے دل ہمارا ہی بھائی اماں میں سر میں ڈالوں منگا دو تھوڑا سا جھکر پلا

ع گو کہ فصحائے دہلی و لکھنؤ نے "شتر گربہ" کو اب ترک کر دیا ہی۔ مگر اکثر زمانہ حال کے مصنفین کے یہاں بھی اس طرز قدیم کی پیروی کا پتا ملتا ہی۔ نظم تو در کنار نثر میں ایک ناول کے مکالمے میں "شتر گربہ" کی مثال درج ذیل ہی۔
مریم۔ آخر یہاں تو کہو کیا ہوا۔
طلع۔ غلام آج دوپہر کو ذرا سو گیا تھا۔ ناگہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی صورت سامنے ہے۔
(ایام عرب حصہ دوم مصنفہ جناب عبد الحلیم صاحب شرر صفحہ ۱۲۰)

اس اعتراض کے بعد حضرت شررؔ فرماتے ہیں کہ" دو ایک جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے چھپنے میں غلطی ہوگئی اور وہ اب تک چلی آتی ہے ۔ مسٹر چکبست نے ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ نہیں کی" اس دعوے کی تائید میں آپ ذیل کے دو شعر پیش کرتے ہیں۔

صحت (۱) رہرو کو دا بہ لطف و اکرام ــــــ آسے آرام جا سے پیغام

غلط (۲) دیکھا تو تمام دشت گلزار ــــــ دائیں بائیں دو رستہ بازار

پہلے شعر کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ "صاف ظاہر ہے کہ پیغام کی جگہ اصل میں انعام کا لفظ ہوگا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پیغام کی جگہ انعام کا لفظ کیوں ہوگا ۔ سرا میں جو مسافر ٹھہرتے ہیں انکو سرا کا مالک کسی قسم کا پیغام تو دے سکتا ہے مگر وہ انعام کیوں دینے لگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس اعتراض کی تشریح کر دی جاتی۔ دوسرے شعر کے نسبت تحریر ہے کہ" دو رستہ" کی جگہ " دو دستہ" ہوگا ۔ ممکن ہے کہ اہل عرفان اس اصلاح کا اصل منشا سمجھ لیں۔ میرا فہم تو اس تصرف کا مطلب سمجھنے میں قاصر ہے ۔ شاید حضرت شررؔ کا یہ خیال ہو کہ " دو رستہ" لکھنؤ یا دہلی کا محاورہ نہیں ۔ اس شبہہ کے مٹانے کے لئے دو شعر مثلاً درج ذیل ہیں ۔

طلسم الفت (قلق)

سب دوکانیں دو رستہ ہوں رنگیں
حد سے افزوں ہو شہر کی تزئین

گرد نوشہ کے تا مکان عروس ــــــ یوں دو رستہ تھے جھاڑ اور فانوس

مہر حسن

دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے
پتنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے

مضمون کے آخری حصے میں حضرت شررؔ کا اشہب قلم بالکل بے قابو ہوگیا ہے ۔ چنانچہ بلا وجہ آپ نے اکثر ذاتی حملے مجھ پر کئے ہیں ۔ مثلاً متعدد جگہ آپ نے مجھے تصرف بیجا کا ملزم ٹھرایا ہے، اور اس رنگ کے فقرے لکھے ہیں کہ ۔

"ہمارے رستے نے بہت سی اور نئی غلطیاں پیدا کر دیں"

"اہل زبان سے پوچھئے کہ اس اصلاح سے شعر بنایا بگڑا"

"اس اصلاح نے شعر کی مٹی خراب کر دی"

"غرض اس اصلاح میں بھی ناسمجھی سے مثنوی پر ظلم ہوا ہے"

"بے تکلفی کو خاک میں ملانیکے بعد شعر کو کیا غارت کر دیا"

"افسوس ان اصلاحوں سے مثنوی کو کیسے گہرے اور بڑے زخم لگے ہیں"

اور جن بنیاد پر آپ نے ان ہوائی تیروں کا مجھے نشانہ بنانا چاہا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو - آپ فرماتے ہیں کہ "مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے اڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن (یعنی وہ ایڈیشن جو نسیم کی ۔۔ لی میں مطبع حسنی میں ۱۸۴۳ء شائع ہوا تھا) کے مطابق درست کر کے شائع کیا ہے میں نے اسکا اندازہ کرنیکے لئے مطبع نامی کی آخر ۱۹۰۳ء کی چھپی ہوئی گلزار نسیم منگوائی - اور اس سے مقابلہ کر کے دیکھا" واقعی تحقیق و تنقید کے معنے یہی ہیں - میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت شرر منشی نولکشور کے مطبع کی چھپی ہوئی مثنوی سے اس نئے ایڈیشن کا مقابلہ کرتے تو آپ کو سب "ظلم اور وہ اصلاحیں" اور تصرفات ملجاتے - خیر جو کچھ حضرت شرر نے میری نسبت تحریر فرمایا ہے اسکا ترکی بہ ترکی جواب دنیا میں تہذیب مضمون نگاری کے خلاف سمجھتا ہوں میرا جواب صرف اسقدر ہے - ع

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جن اشعار میں حضرت شرر کو تصرف بیجا کا شک پیدا ہے - انمیں سے اکثر میں واقعی کتابت کی غلطیاں[1] موجود ہیں -

صحیح	غلط
بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا	بولی وہ جمیلہ کہہ کروں کیا
پو پھٹتے ہی جگ اُن کا لوٹا	پو پھٹتی ہے جگ انکا لوٹا

[1] جس حالت میں کہ حضرت شرر نے ایک نقطے یا شوشے کے گھٹنے یا بڑھجانے کو تصرف بیجا قرار دیا ہے اسحالت میں آپ سے امید نہیں ہو سکتی کہ آپ کسی لفظی تغیر کو کتابت کی غلطی تسلیم کریں - لیکن کاتبوں کیلئے ایسی غلطی کرنا کوئی "نئی بات نہیں ہے" حضرت شرر کے اسی اعتراضات والے مضمون میں گلزار نسیم کا ایک مصرع اسطرح چھپا ہے - ع دالما تو چلے تو تفنگ زدہ - جہل و تعصب کا اشارہ تو یہی ہے کہ میں بھی کہوں کہ حضرت شرر نے "تو" بڑھا کر "ناسمجھی سے" مصرع کی بے تکلفی اور سادگی کو خاک میں ملا دیا ہے" یا ناموزوں کر دیا لیکن عقل سلیم کہتی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے نہ کہ مضمون نگار کی - مراد اس سے یہ ہے کہ ایسی کتابت کی غلطی ہو جانا "فاختہ کے پر ہنے" کی طرح ناممکن نہیں ہے -

جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو — جنتی تھی ہمیشہ دختر اسکو
قامت نے جو بیغ پری دکھایا — قامت نے بیغ پری دکھایا
قسمت سے مفر ہے اب نہ امن — قسمت سے مفر ہے اب یہ امن
صیاد تھی لائے پالنس کر صید — صیاد تھی لائی پالنس کر صید
چلنے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر — چلنے گا تو ساتھ میں بلا عذر

ان مصرعوں کے علاوہ اور جن اشعار پر حضرت شرر کو "اصلاح" یا "تصرف" کا شک ہوا ہے وہ اسی حالت پر ہیں جس حالت میں کہ وہ اصلی ایڈیشن میں پائے گئے تھے۔ انمیں ایک لفظ کا تغیر یا تبدل نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے اصلی ایڈیشن پر اگر کہیں تصرف کیا ہے تو صرف اسقدر کہ یاے معروف کے بدلے یاے مجہول یا اکثر یائے مجہول کے بدلے یاے معروف بنادی ہے۔ کیونکہ پرانے زمانیکے کاتب یای معروف اور یاے مجہول کا فرق نہیں مانتے تھے۔ نامی پریس کی [illegible] ہی کو جس شخص نے ترتیب دیا ہے اس نے اکثر قدیم محاوروں کے بدلے اس زمانے کے محاورے [illegible] ہیں۔ غالبًا اسی بنا پر حضرت شرر فرماتے ہیں کہ "بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا انہیں بلکہ بنا [illegible] [illegible] میں اس قسم کا تصرف کرنا طالبان فن زبان کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ چاہے عامیانہ مذاق کے لوگ ایسی تصرفات کو پسند کریں۔ کیونکہ انکی نظر وسیع نہیں ہوتی ہے مگر نقادان سخن جانتے ہیں کہ مرتب کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی گنجینہ دار معانی کی چھوڑی ہوئی امانت میں کسیطرح کی خیانت نہ کرے۔

آخر میں حضرت شرر اپنے مضمون کے نسبت فرماتے ہیں کہ "بعض حضرات کو یقینًا یہ تحریر ناگوار گزریگی اور میں [illegible] خدا سے چاہتا ہوں کہ انہیں سخت ناگوار گزرے۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ شاید زیادہ جوش سے جواب لکھینگے" مجکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علمی مباحثوں میں اس جوش بیجا کا اظہار جسکے حضرت شرر طالب ہیں، اصل مطلب کو خبط کر دیتا ہے اور صرف سخن پروری پر آمادہ کر دیتا ہے اگر حضرت شرر کے مضمون کے جواب لکھنے میں کوئی صاحب اس قسم کا جوش صرف کرینگے جس سے کہ مضمون مذکور کا [illegible] مقصود ہے تو سوائے اسکے کہ انصاف کا خون ہو اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ نقاد سخن کا فرض [illegible] بات کے لئے دست بدعا رہے کہ دوسروں کو اسکی تحریر ناگوار گزرے بلکہ اس بات کی [illegible] مخالف اسکے دلائل پوری طرح سے سمجھ جائیں۔

برج نراین چکبست۔ لکھنوی

از بیاض علامی میر عبدالجلیل بلگرامی عطراللہ مضجعہ

صایب

پائے طربم بکوسے راحت نرسد — دستم بگریبانِ فراغت نرسد
بر شہپر جبرئیل اگر تیر دعا — بندم بہ نشانۂ اجابت نرسد

شیخ علی نقی

کام فراست ہوس عشق بلاانگیز است — شاہد ایں دو مثل کوہ کن و پرویز ست

مرزا جلال

اے دانۂ تسبیح خیالات دل دانا — سر حلقۂ مستانِ رخت دیدہ بینا
یک توشہ کش وادیٔ شوق تو توکل — یک گم شدہ راہ خیالِ تو تمنا

ملا نوعی

مشاطہ خون کمن جگرِ مشکناب را — نشتر مزن بشانہ رگِ آفتاب را

مرزا مقیم

می خورد و برنگِ ارغواں شد — گلزار بکام بلبلاں شد
بر کرد تمامیٔ تو گردم — زیبا تر ازیں نمی تواں شد

لایعرف

زلال گوہر از فوارہ یاقوت می جوشد — کند از آستین بیرون چو آں گلگوں قبا دستی

(بندۂ لم یزلی علی عفرلہٗ اورنگ آباد)

حصہ نظم

رباعیات جناب ضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

کیا ذکر کہ تجھ سے بے خبر تک پہونچیں — نالے وہ کہاں کہ جو اثر تک پہونچیں
اک شوق رہا ہے ہرزہ گردی سے ہمیں — مقصود نہیں کہ تیرے در تک پہونچیں

اے دوست چو بیگانہ بمامی آئی
ہستی کہ بدیں لغزشِ پا می آئی

سوگند بجورِ یکے بسختِ دشمن
وانگاہ بگوکہ از کجا می آئی

ولہٗ غزل

نازک مزاجیوں میں کچھ اُنسے میں کم نہ تھا
وہ لطف ہی نہ تھا کہ جو مجھکو ستم نہ تھا

اں حسرتِ ستم کی خلش تھی کوئی تو تھی
تیرے ستمکشیدہ کے سینے میں دم نہ تھا

قاتل کو خونبہا کی عبث پڑگئی ہے فکر
مجھ میں تو قتل ہونیسے پہلے ہی دم نہ تھا

تیرے ہی ذوق جلوہ سے وا ہوگئی چشم
یاں ورنہ امتیازِ وجود وعدم نہ تھا

کیا کیا مجھے تغافلِ ساقی کا تھا گلہ
دیکھا تو میں ہی درخورِ لطف وکرم نہ تھا

اللہ ری دلفریبیٔ انداز ضبطِ عشق
اک موجِ خون تھی دلمیں اور آنکھوں میں نم نہ تھا

اس حسن امتیاز کے قربان جایئے
تھا اک جہاں سے۔ پراُسے وحشت کم نہ تھا

غزلیات حسرت موہانی

(۱) دربیان آغاز محبت

یاد ہیں ساری وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسم جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن والفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر وتمہید شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جسمیں اُٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

شوق عرض آرزو کے وہ نرالے ولولے
فکر مضمونہائے عنوان کتابت کے مزے

وہ زمانا بھی غرض تھا کیا زمانا لطف کا
مجھکو جب حاصل تھے ساری عیش وعشرت کے مزے

لیک حسرت اس تغافل کیش کی بیدادنے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

(۲) دربیان ادّعای ترک محبت

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بیخودی کے مجھکو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قید ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

سکون خاطر ناکام کی تکلیف کیا کہئے
جنون و وحشت و فصاد و نشتر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت تری ترک محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ہیں

غزل جناب مولانا شفق عمادپوری تلمیذ حضرت امیر مینائی مرحوم

کھل گئے ہیں جان پر دیکھکے اُس ادا کو ہم
اُسکی ادا سمجھکے اب ڈھونڈتے ہیں قضا کو ہم

سوز ادھر ہی ساز اُدھر ناز اُدھر نیاز ادھر
پیار کہیں ستم کو ہم لطف کہیں جفا کو ہم

مطرب شوخ نے سے کام کیا سر میں یہ دُھن سمائی ہے
پردے میں ساز کے فقط سن لیں تری صدا کو ہم

صبر و قرار چھین لے غمزۂ فتنہ زا ترا
ایک نظر جو دیکھ لیں نرگس سرمہ سا کو ہم

خوگر جور تھی مگر بھول گئے وہ لذتیں
پا کے تغافل آشنا اُس ستم آشنا کو ہم

نرگس نیم باز اُدھر مائل خواب ناز ہے
تکتے ہیں مُنہ کھڑے ادھر دیر سے التجا کو ہم

لذتِ غم چشیدہ ہی یہ دل درد آشنا
مُنہ نہ لگا ئینگے کبھی چارہ گر و دوا کو ہم

صورت خامہ سر کے بل دوڑ کے آئے نامہ بر
دیکھکے تیرے ہاتھ میں نامۂ دلربا کو ہم

اور قصور کچھ نہیں اتنے قصوروار ہیں
تیری عطائیں دیکھکر بھول گئے خطا کو ہم

لے اُڑے اہل بزم کو نشۂ جوش بیخودی
دیدیں شفق جو یہ غزل مطرب خوش نوا کو ہم

غزل جناب ظفر رسولپوری (ماخوذ از اودھ پنچ بانکے پور)

چلی آرہی ہے دھواں دھار بدلی
مزا دے رہی ہے مزے دار بدلی

تڑپتی ہے رہ رہ کے یہ برق تاباں
کہ چمکاتی پھرتی ہے تلوار بدلی

سر بام کھولے نہوں اُس نے گیسو
جھکی پڑتی ہے سوئے کہسار بدلی

ہوا پر اُڑیں زلفیں بکھرا کے پریاں
کہ منڈلاتی ہے یہ دھواں دھار بدلی

گلابی شلوکا بسنتی دوپٹا
یہ پوشاک تمنے طرحدار بدلی

یہ چالیں ریاکاریوں کی جو آئیں
ظفر تمنے زاہد سے دستار بدلی

فقط

[illegible]

... [illegible] ... کو مقدمہ ... [illegible]

... کے ...

[illegible] جناب سید ... حسن ... صاحب ... [illegible] ... ہے ۔ قیمت ۲۰۰ روپیہ ... علاوہ محصول ... [illegible] ... ملنے کا پتہ ... ہے ۔ ... کے آئینہ ... میں ... [illegible]

سفرنامہ حج یعنی سفرنامہ حجاز مولوی سبحان اللہ صاحب ... گورکھپور ... [illegible] ... سے مل سکتا ہے ۔ اس سفرنامے میں اکثر مقامات ... [illegible] ... انتظام کی خرابیوں کے اسباب ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی ہے ۔ آخر میں ایک ... [illegible] ... اور ایک متعلق ... سفر حج بھی دے دیا گیا ہے ۔

[illegible] نسیم لکھنوی کے ... شاعری کی نسبت حضرت ... کے ... ایک ... [illegible] ... حضرت ... [illegible] ... نسیم لکھنوی کی شاعری ... [illegible] ... گے ۔

... [illegible] ...

[illegible]

لیکن حق یہ ہے کہ مجروح نے بھی اچھے اچھے شعر نکالے ہیں خصوصاً آخری شعر کا طرز بیان بالکل نرالا ہے۔

دیگر

منہ چھپانے لگے حیا کر کے — ہوئے بیگانہ آشنا کر کے
ایسے پھر چھپے ہنو وینگے — مجھکو پچتاؤگے رہا کر کے
رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا — رات کاٹی خدا خدا کر کے
خوب ملنے کو آئے تھے صاحب — مجھکو مجھسے چلے جدا کر کے
دل نے ہی اسکی خو بگاڑی ہے — ہر گھڑی عرض مدعا کر کے
کھو دیا ہاتھ سے انہیں مجروح — یونہی ہر روز التجا کر کے

آخر عمر میں مرحوم آنکھوں سے بالکل معذور ہوگئے تھے لیکن ذوق سخن کا یہ حال تھا کہ ۱۹۰۲ء میں جب راقم حروف کی تجویز سے علی گڈھ میں ایک مشاعرہ[1] قرار پایا تو آپنے بھی شرکت مشاعرہ کی تکلیف گوارا فرمائی اور رات بھر شریک محفل رہے اور ایک غیر طرح غزل بھی ارشاد فرمائی جو مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے۔

اس مشاعرے کے بعد جب منشی امیر اللہ تسلیم آپکے جائے قیام پر ملاقات کے لئے تشریف لیگئے اور کلام کی فرمایش کی تو آپنے اسی غزل کے چند شعر عجب انداز سے پڑھکر سنائے خصوصاً تیسرے اور پانچویں شعر کو بڑے لطف سے ارشاد کیا۔ جو لوگ اس مجمع خاص میں موجود تھے انکو دہلی و لکھنؤ کے ان دو عدیم المثال باکمالوں کی یکجائی کا سماں ہمیشہ یاد رہیگا۔

سلسلہ تحریر کہاں سے کہاں جا پہونچا اصل میں ذکر یہ تھا کہ مجروح کا رنگ سخن چھوٹی بحروں میں میر سے بہت کچھ مشابہ یا عام طور پر کہہ سکتے ہیں کہ متقدمین کے سادہ اور غیر مصنوعی انداز کا نمونہ ہے۔ مثلاً اکثر شعرائے متقدمین کے مانند مجروح نے بھی بعض غزلوں میں صرف قافئے پر قناعت کی ہے بلکہ ہمارے نزدیک تو ان کے بہترین کلام کا نمونہ زیادہ تر انہیں

[1] اس مشاعرے کے کچھ ہی دنوں کے بعد آپکا انتقال ہوگیا۔ غنیمت ہے کہ اس موقع پر آپکا فوٹو لیلیا گیا تھا۔ مشاعرے میں جو غزل آپ نے پڑھی تھی وہ جولائی سنہ کے اردوئے معلی میں درج ہو چکی ہے غالب کی زمین (گماں اور نشاں اور) میں کیا خوب شعر نکالا ہے؎ خوبی نہیں اس بت کی ان آنکھوں میں سماتی + اللہ مجھے دے کوئی چشم نگراں اور۔

غزلوں میں ملتا ہے جو قید ردیف سے آزاد ہیں۔ سُن لیجئے۔

کون پردے میں ہے یہ زمزمہ ساز
سخت دلکش ہے ساز کی آواز

پل میں کردے دلونکو زیروزبر
قہر ہے وہ نگاہِ سحر طراز

دل کرتا منبع فیوض ازل
لگیا غم سے وہ خزینۂ راز

منتخب کسکو چشم شوق کرے
ایک سی ایک ہے نیا انداز

دلکو برباد کرنہ لے بدخو
ہے یہ مجروح کا بڑا دمساز

یونہیں گزرا بہار کا یہ برس
ہم اسطرح ہیں اسیرِ قفس

اسمیں طولِ امل ہزار ہزار
زندگی کا مدار ایک نفس

قید میں بھی ہی اک طرح کی بہار
شاخِ گل میں لٹک رہا ہی قفس

میں اداسکی رکھائیاں دیکھوں
کیا کروں دل نے کردیا بیبس

بیخودی لیگئی وہاں کہ جہاں
خوف قاضی ہی اور نہ بیم عسس

قید نے کھوے ولولے دلکے
پہلے ہمکو بھی تی چمن کی ہوس

ہے یہ مجروح کی دعا غالب
تم سلامت رہو ہزار برس

کسکی بو تھی نسیم سے ہمدوش
ہم بہت دیر تک رہے بیہوش

آرزوئیں تو ہیں بہت لیکن
اپنے گویا نہیں لب خاموش

اس سے بڑھکر کونسی حسرت
مے نہو اور ہو بہار کا جوش

اسکا دیدار برقِ خرمن صبر
اسکا جلوہ وداعِ طاقتِ ہوش

پہلی غزل میں نشان زدہ الفاظ کی دلکشی اور تیسری غزل میں ان الفاظ کی متین خوبی آفریں کی لائق ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ردیف پسند طبائع کو یہ غزلیں کچھ زیادہ قابل تعریف نہ معلوم ہوں لیکن ارباب بنیش پر غالبًا یہ امر روشن ہوگا کہ شاعری اور استادی کا صرف یہی کمال نہیں ہی کہ مضمون بلند ہو اور زبان صحیح یا ردیف کہلتی ہوئی ہو اور قافیہ تازہ بلکہ ان سب باتوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی جو سب سے بڑھکر مشکل لیکن

سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے وہ انتخاب الفاظ سے متعلق ہے۔ مثلاً خوشی۔ انبساط ابتہاج۔ خرمی۔ مسرت اور شادمانی میں سے مذاق سلیم شادمانی کو اور اسکے بعد مسرت یا خرمی کو پسند کریگا لیکن اسکے برخلاف استاد ناسخ کے پیرو اور لکھنؤ کے شاعر گمان غالب یہ ہے کہ خوشی کو سب پر ترجیح دینگے یا کم از کم شادمانی کو خوشی سے کسی بناپر فائق نہ تسلیم کرینگے۔

خدا غریق رحمت کرے۔ مرزا نسیم مرحوم رنگین کلامی شگفتگی ترکیب اور شادابیٔ الفاظ کے بادشاہ تھے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے کہ جو چیز راقم کے نزدیک نسیم کے کلام کی جان ہے وہی صفیر بلگرامی مرحوم کی نظر میں ان کی شاعری کا خاص عیب ہے چنانچہ انہوں نے تذکرہ جلوۂ خضر میں دہلی کے قابل اعتراض محاوروں کے ذکر میں ضمناً مرزائے مرحوم کے بھی بعض الفاظ پر اصلاح دی ہے۔ پہلے نسیم کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم گریۂ گلرنگ سے یاد گل تر میں	صیاد بنا لینگے قفس میں چمن اپنا
نہیں لگتی پلک آمد ہوئی ہیں حسن کے جلوؤں کی	نگاہوں میں چمکتا ہے تصور روئے جاناں کا
لو فراغت ہوگئی کیسا سبکجاں ہوگیا	چاک دامن ہوگیا ٹکڑے گریباں ہوگیا
اوڑے اوراق گل باد خزاں سے	ہوئی برہم کتاب گلستاں آج
سکھائی ہے نئی تدبیر مجھکو میری خاطر نے	پسند آتا ہوں دشمن کو بھی تری گفتگو ہوکر

ان اشعار میں نشان زدہ الفاظ کی نسبت صفیر مرحوم کا قول ہے کہ لکھنؤ میں "گریۂ گلرنگ" کے بجائے "اشک گلرنگ"۔ "حسن کے جلوے" کی جگہ "ہجوم جلوہ"۔ "سبک جاں" کی جگہ "سبکبار"۔ "برہم" کی جگہ "ابتر"۔ اور "خاطر" کی جگہ "طبیعت یا دل" صحیح سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن ہمارا تو یہ اصلاحیں دیکھکر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے خیر یہ قصہ طول طویل ہے اسکو یہیں پر ختم کر کے سلسلۂ مضمون کو درست کرنا چاہیئے کہ الفاظ میں سے شاعرانہ الفاظ کا انتخاب، شاعرانہ ترکیبوں کی دریافت اور شاعرانہ اسلوب بیان کا استعمال ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اور اسی لحاظ سے جس شاعر کے کلام میں

یہ خصوصیات پائے جاتے ہوں ہمارے نزدیک وہی اصلی شاعر کے خطاب کا مستحق ہی۔

اور اسی خیال سے باوجودیکہ مجروح کے کلام میں زبان کی غلطیوں کے علاوہ خامیٔ مشق کا بھی ثبوت ملتا ہے ہم انکو مسلم الثبوت اُستاد نہیں کہتے تو مسلم الثبوت شاعر ضرور کہتے ہیں ملاحظہ ہو کیا خوب مطلع لکھا ہے۔

وہ نالوں کی شورش ہی نہ غل ہی آہ وزاری کا ۔۔۔ وہ اب پہلا سا ہنگامہ نہیں ہی بیقراری کا

یہاں پہلے مصرع میں شورش اور دوسرے میں ہنگامے کا لفظ اس مطلع کی بلندی کا باعث اور مجروح کی گرم کلامی کا ثبوت ہے۔

اور بہی کیا خوب غزل لکھی ہے۔

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھکو برا جانا ۔۔۔ سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا
اک عمر کے دکھ پائے سوتے ہیں زلف سے ۔۔۔ اے غلغلۂ محشر ہمکو نہ جگا جانا
کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تہا ۔۔۔ میں نے تو کہا کیا تہا اور آپنے کیا جانا
چلمن کا الٹ جانا ظاہر کا بہانا ہے ۔۔۔ انکو تو بہر صورت اک جلوہ دکہا جانا
ہی حق بطرف اسکے چاہی سو ستم کرلے ۔۔۔ اُسنے دل عاشق کو مجبور وفا جانا
انجام ہوا اپنا آغاز محبت میں ۔۔۔ اس شغل کو جا نفرسا ایسا تو نہ تہا جانا
مجروح ہوئے مائل کس آفت دوراں پر ۔۔۔ اے حضرت من تمنے دل بھی نہ لگا جانا

غزلوں کے علاوہ مجروح کے دیوان میں قصائد قطعات رباعیات وغیرہ بھی ہیں لیکن انہیں سے کوئی قابل ذکر نہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی غزلیں ہی دیار سخن فہمی میں انکی شہرت دوام کے لئے کافی ہیں۔ فقط

ـــــ

؎ دیوان مجروح تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۲۵۰ صفحے۔ دفتر اردوئے معلی علی گڈہ سے مل سکتا ہی۔
قیمت علاوہ محصول عمہ ر

تقدیر۔ قسمت

(نوشتہ)

مذاہب میں خواہ کیسا ہی اختلاف اور تضاد ہو کچھ نہ کچھ اتحاد یا الحاق بھی ضرور ہوتا ہے۔ یوں اصولاً تو ہر مذہب دوسرے مذہب سے ملتا جلتا ہے اور اغراض بھی سب کے قریباً یکساں ہیں لیکن فروع میں بھی کبھی کبھی اتحاد پایا جاتا ہے اسیطرح مذاہب اور فلسفہ یا سائنس میں گو ایک قسم کا بعد اور اختلاف مانا جاتا ہے اور ایک کی حقیقت دوسرے کی حقیقت سے مغایر سمجھی جاتی ہے مگر ان کے مسایل میں بھی ایک نسبت اور اتصال ہوتا ہے گو طرز استدلال دونوں کا جُدا گانہ ہو اور دلایل کا ذخیرہ بھی الگ الگ لیکن نفس الامر میں یکسانی موجود ہوتی ہے۔

نفس الامور کے اعتبار سے بھی دُنیا کی حقائق اور کیفیات میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس قسم کے اختلافات سے ہم انکار نہیں کر سکتے لیکن اختلافات کا بہت سا حصہ طرز استدلال سے مربوط یا منسوب ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اختلافات کا جزو کثیر اسوجہ سے بھی زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ

"میں یہ بات اسواسطے نہیں مانتا کہ اسکا کہنے والا یا ماننے والا فلاں شخص ہے"

"میں اسواسطے اعتراض کرتا ہوں کہ یہ بات فلاں کتاب میں لکھی ہے۔"

"میں اسواسطے نہیں مانتا کہ فلاں کتاب میں نہیں لکھی یا فلاں شخص کی زبان سے اسکی تصدیق نہیں ہوئی۔"

بہت لوگ ایسے ہیں جو مذہبی صداقتوں کو صرف اسواسطے تسلیم کرنے سے جھجکتے ہیں کہ انہیں مذہب بیان کرتا ہے یا اُن کا مفسر یا بانی مذہب ہے۔

اسیطرح بہت سی باتیں سائنس یا فلسفے کی اسلئے نہیں مانی جاتیں کہ فلسفے یا سائنس نے اونکی تشریح یا تاویل اور تائید کی ہے گو ایک صداقت باعتبار

نفس صداقت کے صداقت ہی مگر اعتباری اختلافات یا نسبتی تضاد کی وجہ سے وہ ایک خانے میں جاکر صداقت ہو جاتی ہے اور دوسرے میں صداقت کے پایے سے گر جاتی۔

اگر یہ اعتباری یا نسبتی استدلال حقیقت پر محمول کئے جاویں تو یقیناً اختلافات کا اکثر حصہ دنیا سے اُٹھ جاوے۔ یا یہ کہ باوجود کثرت اختلافات کے اختلافات کا وہ زہریلا اثر نہ رہے جو اب ایک خوفناک حالت میں پایا جاتا ہے۔

قسمت یا نوشتے کا مسئلہ بھی منجملہ اُن مذہبی مسائل کے ہے جس کی تصدیق اور تائید یا تاویل مذہبی پیرایہ میں کی جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں علمی اعتبار سے اسکی نسبت کچھ اور ہی کہا جاتا ہے۔ مذہب کہتا ہے۔ کہ قسمت یا نوشتہ بھی ایک طاقت یا ایک اثر ہے۔

علمی تحقیقاتیں کہتی ہیں یا علمی تحقیقاتوں کی جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ قسمت یا نوشتہ درا صل کوئی طاقت یا اثر نہیں ہے۔ قسمت اور نوشتے کے مرادفات میں تقدیر کا لفظ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

جو لوگ کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں وہ کسی نہ کسی پیرائے میں اس مسئلے کے قائل یا معترف ہیں۔ جو اشخاص مادیات سے زیادہ تر کام لیتے ہیں اور مذاہب کے بھی معترف ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ اس مسئلے کے مؤید ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جو مذہب ہونے کی حیثیت میں اس تعلیم کا کچھ نہ کچھ مؤید یا حامی نہ ہو۔ یہ کہا جاتا ہے کہ فلاسفر اور سائنس اس تعلیم کے حامی نہیں ہیں۔ لیکن ہیں گروہ حکما ہیں اکثر ایسے حکیم بھی ملتے ہیں جو اس مسئلے کی کسی نہ کسی پہلو میں حمایت کرتے ہیں اُن کے دو نمونے ہیں۔

"ایک وہ جو فلاسفر ہونے کے ساتھ کوئی نہ کوئی مذہب بھی رکھتے ہیں"

"ایک وہ جو لامذہب ہوکر بھی اس مسئلے کے حامی ہیں۔"

پہلے گروہ کو تو ہم مذاہب والوں ہی میں رکھتے ہیں۔ البتہ دوسرے گروہ کی شہادت

قابل غور ہے۔ ادنیٰ اختلافات کو چھوڑ کر مسئلہ قسمت یا نوشتہ و تقدیر کی موٹی موٹی تاویل یا تفسیر یوں کی جاتی ہے۔

"ہم سے جو کچھ افعال سرزد ہوتے ہیں وہ ہماری تقدیر سے ہوتے ہیں"

"جو کچھ ہم سے ہوگیا وہ ہمارے نوشتہ یا قسمت ہی میں تھا۔۔"

"یوں ہی ہونا تھا۔۔"

ہم اس مضمون میں مذہبًا یا حکمتًا یہ بحث نہیں کرینگے کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب کے ساتھ ہم نے حکمت کو اسواسطے کہدیا ہے کہ انسان کی مجبوری اور مختاری کا مسئلہ مذہب اور حکمت دونوں کے زیر بحث چلا آتا ہے۔ جیسے ایک پیرو مذہب اس بحث میں دلچسپی لیتا ہے ویسے ہی ایک فلسفی بھی اسمیں طبع آزمائی کرتا ہے ہم بالفعل اس مضمون میں یہ بحث کرینگے کہ تقدیر یا قسمت سے مطلب کیا ہے اور ان الفاظ کا مفہوم مذہب اور حکمت کے اعتبار سے کیا ہے یا کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اور ایدا اعتبارات کی جہت سے انکی کتنی صورتیں ہیں۔

ہمیں ان خیالات یا دلائل کے متعلق جو اس مسئلے کی نسبت ہر طرف سے پیش کئے جاتے ہیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسکی تقسیم مندرجہ ذیل صور توں میں ہو رہی ہے۔

(الف) باعتبار مفہوم تعلیم مذہب۔

(ب) باعتبار مفہوم عامہ۔

(ج) باعتبار مفہوم خاصہ۔

اور ان تینوں تقسیموں کا خلاصتًا ایک ہی مفہوم ہے البتہ اونکے طرز استدلال یا وسعت میں فرق ہے۔ ایک عام عقل کا آدمی یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ میں جو کچھ برا بھلا کر رہا ہوں یا جو کچھ مجھ سے سرزد ہوتا ہے وہ سب کچھ کسی اور طاقت کے زور یا تحریک سے ہو رہا ہے میرا اسمیں کوئی قصور اور کوئی دخل نہیں۔

ایک خاص عقل کا شخص اسے یوں بیان کرتا ہے کہ میں حتی الامکان اچھا ہی عمل کرتا ہوا کرونگا اگر اوسمیں کوئی نقص نکل آیا یا نکل آتا ہے تو وہ ایک تقدیری امر ہے :

کر سکتا ہوں۔

یا یہ کہ میں اپنی طرف سے تو کوشش کرونگا اور سود مند نتیجے کی امید ہے لیکن اگر آخر میں ناکامیابی ہو تو یہ ایک تقدیری امر اور نوشتہ قسمت ہے اسمیں میرا کیا زور یا کیا چارہ ہے۔

یا یہ کہ انسان کا فرض تدبیر کرنا ہے اگر اُسمیں کامیابی نہ ہو یا تدبیر پٹ پڑی تو یہ ایک مجبوری ہے۔

سب تو اُن لوگوں یا اُس مخلوق کے خیالات ہیں جو کسی مذہب کے معتقد یا پیروکار ہوتے ہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اس بارے میں کیا اور کن الفاظ میں تعلیم دیتا ہے۔

وہ مذہب کہتا ہے کہ جس طاقت کا میں نام لیوا اور پرستار ہوں وہ ایک قادر مطلق سرب شکتمان۔ جبار۔ قہار۔ رحمان۔ عادل۔ منصف۔ رحیم و کریم ہے۔ اُسکی اعلیٰ اور مقدس ہستی کے مقابلہ میں میری اور تمہاری ہستی ناچیز اور محض ہیچ ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ وہ عالم الغیب اور علیم کل ہے اُسکا علم وسیع اور بےانتہا ہے اور ہمارا علم محدود اور محصور ہے۔ ہماری تمام تدبیریں تمام حکمتیں تمام تجویزیں تمام ہمتیں اوسکے ارادے کے مقابلے میں ہیچ اور لاشئے ہیں اوسکے کام حکمت سے خالی نہیں۔ اور اوسکی حکمت سراسر نور اور جامع ہے۔ ہم کون ہیں جو اوسکے کاموں میں دخل دیں اور اوسکے علوم اور قدرت کا مقابلہ کریں وہ سب کچھ جانتا اور سب باتوں سے واقف ہے وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اوسکے حکم اور اذن سے ہو رہا ہے تدبیر کرو لیکن تقدیر اوس پر غالب ہے تدبیر ضروری ہے لیکن چونکہ وہ تقدیر کا مقابلہ نہیں کرسکتی اسواسطے تدبیر کو تقدیر کے سپرد کرو۔

"مرضی مولا از ہمہ اولےٰ" "بہ توکل زانوائے اشتر بہ بند"

کم و بیش ہر ایک مذہب میں اسی قسم کی تعلیم ہے۔ اور کوئی مذہب اس سے خالی نہیں یوں اب کوئی تاویل کر کر اسکے پیچھا چھڑا لے تو یہ ایک جدا بات ہے۔ ورنہ ہر مذہب میں یہی مواد بھرا ہے۔ تدبیر سے تو کوئی انکار کر نہیں سکتا کیونکہ اسکا وجود بدیہی اور موجود ہے

اور ہر فرد باوجود اعتراف مذہب و تقدیر اسکا مشتاق اور عادی یا حامی ہے - جو تقدیر تقدیر کہتے ہیں وہ بھی اس سے نہیں چونکتے - جو بڑے توکلی ہیں وہ بھی اس کوچے سے ضرور گزرتے ہیں اور باوجود متوکل ہونے کے اسکا دامن نہیں چھوڑتے - بلکہ مرتے دم تک اسکے گرویدہ رہتے ہیں - البتہ تقدیر سے بعض لوگ منکر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک اعتباری جز ہے اسکا وجود اور اثر نہ کچھ ہے اور نہ ہونا چاہئے -

تقدیر کے واسطے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ آتے ہیں اگر لفظی نہیں تو مرادی مفہوم سبکا ایک ہی ہوتا ہے -

تدبیر کا مفہوم ایک تیسرا نتیجہ یا تیسرا اثر پیدا کرنے کی خاطر چند اسباب کا آپس میں ترکیب دینا ہے ہم پانی کے نیچے آگ جلا کر پانی گرم کرتے ہیں یہ ایک تدبیر ہے جلتی آگ پر پانی پھینک دیتے اور آگ سرد کر دیتے ہیں یہ بھی ایک تدبیر ہے ہم جو کچھ کرتے ہیں یا جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے خواہ ارادی ہو یا اضطراری وہ چند اسباب معلومہ کا محتاج ہے یا چند اسباب معلومہ اوسکے مدار علیہ ہیں - ایک چوکی اوسوقت تک نہیں بنتی جب تک اسی لوہے لکڑی کیل کانٹے سے نہ ترکیب دیں جو کام لوگے اُسمیں ایک ترکیب پائی جائیگی اور جو ترکیب ہوگی اُسکا ایک ترکیب دہندہ بھی ہوگا خواہ اوسکا وجود مرئی ہو خواہ غیر مرئی -

مذہب اور حکمت یا سائنس اور فلسفے کی جستجونکو الگ رکھکر ہم اسبات کی شہادت وجدانیات و ذاتیات قایل ہیں کہ ہمارا علم اور ہمارا قیاس یا استدلال محدود اور محصور ہے گو ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور ہماری معاملات میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے مگر پھر بھی بہت کم جانتے ہیں گو ہمارا علم کامل ہی ہو مگر پھر بھی ہنوز تکمیل طلب ہے - ہم ایک دیوار یا ایک پردے کے پیچھے کچھ نہیں کہسکتے کہ کیا ہے خواہ دیوار یا پردہ کاغذ ہی کا ہو - ہم نہیں جانتے کہ ایک منٹ کے بعد کیا واقعہ ہونیوالا ہے - اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پیچھے کیا کچھ ہو رہا ہے ہم صدہا تجربوں اور علموں کے مالک یا موجد ہیں اور صدہا ترکیبوں کے بانی صدہا رموز پر ہمنے فتح پائی ہے اور صدہا مخفی امور ہم نے نکالی ہیں لیکن ہنوز

سوز اول کا معاملہ ہے۔

ہم دنیا میں جب امر کا دعوی کرتے ہیں وہ تین حال سے خالی نہیں۔

(الف) تجربی۔

(ب) قیاسی۔

(ج) استقرائی۔

ہم نے صدہا تجربے کئے ہیں اسواسطے ایک مجموعہ ہمارے ہاتھ آگیا ہی جسکے زور سے ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ یوں ہوگا یا یوں ہوگا۔ سینکڑوں قیاسات کے بعد ہمنے چند قیاسات کی صحت معلوم کرکے اُن پر بھروسہ کیا ہے۔ ہم تفحص اور تلاش کرتے کرتے دور دراز فاصلوں تک جا پہنچے ہیں اور پھر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایسی ترکیب یا ایسی تالیف سے یہ صورت پیدا ہوا کرتی ہے۔ ہمارا علم اور ہمارا قیاس انہیں تین اجزا سے مرتب ہی جامع علمی طاقت یا علمی ادراک ہم میں موجود نہیں ہی۔ بیشک ہم مدرک اور علیم ہیں مگر ہمارا ادراک اور علم چند اسباب سے مشروط ہے جب وہ اسباب رفع ہوجاتے ہیں تو وہ ادراک یا وہ علم ہی باقی نہیں رہتا۔ ہم آنکھوں یا بصارت سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں اگر دنیا میں روشنی نہ رہے تو کیا ہم بہت حصہ ادراکات کا کھو نہ دینگے جب ہم اندھیرے میں جاتے ہیں تو آنکھوں میں نور بدستور ہوتا ہے مگر بوجہ ظلمت کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ اگر ہوا نہ رہے تو ہم کوئی آواز نہ سن سکیں۔ اگر خود اجسام میں سردی اور گرمی کی طاقت نہ ہو تو ہم گرمی اور سردی کی تمیز ہی نکر سکیں۔ یہ سب مراتب اور حالات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارا علم کافی یا مکمل نہیں ہے اور ہماری ادراک میں ایک تحدید پائی جاتی ہے۔

یہی حال ہمارے خیالات اور استقرا و یا استدلال کا ہے کبھی تو ہم ایسے بڑے بڑے مسائل پر کامیاب ہوجاتے اور ایسے جز ورس ہوتے ہیں کہ گویا ہم عقل کل ہیں اور کبھی ہمارا ادراک اور ہماری قوتِ فیصلہ ایک معمولی بات کے سمجھنے اور پرکھنے سے ہی قاصر ہوتی ہے ہم سینکڑوں یا بیسیوں عقل کے کام کرتے کرتے ایک ایسی بیوقوفی

کر بیٹھتے ہیں کہ ہمیں خود بھی اُس پر ہنسی آتی ہے کبھی زمین کی تہہ اور آسمان کی چوٹی پر ہماری رسائی ہوتی ہے اور کبھی کاغذ کی صرف ایک تہہ ہزاروں پردوں کی قایمقام اور سدِ سکندری بن جاتی ہے۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

ہم اس بات کے معترف ہیں کہ ہماری اکثر تدبیریں پٹ نہیں پڑتی ہیں۔ یا تو یہ کہ اُن میں کوئی نہ کوئی نقص یا خامی رہ جاتی ہے اور یا یہ کہ اُن کا کوئی مزاحم اور مانع ہوتا ہے۔ اِن مزاحمات اور موانعات میں سے ہم اکثر سے آشنا اور باخبر بھی ہوتے ہیں اور اکثر سے لاعلم رہتے ہیں ہماری یہ لاعلمی صرف اُس وجہ سے ہے کہ ہمارا علم اور ادراک مکمل یا جامع نہیں ہے۔

ہم اسبات کے بھی قایل ہیں کہ اگر ہمارا کوئی ارادہ پورا ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی ترکیب یا قانون کے تابع ہوتا ہے اور اُسمیں ایک تدبیر بھی پائی جاتی ہے۔ یہ طرزِ عمل اور یہ نظریہ ہمیں اسبات کی جانب لیجاتی ہے کہ جب کوئی تدبیر مخالف پڑتی ہے تو اُسکا بھی کوئی نہ کوئی باعث یا موجب ہوتا ہے۔ اگر دو ہاتھوں کو ملا کر بجانے سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے تو ضروری ہے کہ اُن کا آپس میں نہ ملنا کوئی صدا نہ پیدا کر سکے۔ اگر قلم لکھنے سے لکھتا ہے تو اسکا دوسرا پہلو یہ بھی ہوگا کہ جب اوسے روکینگا تو نہ لکھیگا

ہماری بہت سی ایسی تدبیریں بھی کہ ہماری نگاہوں میں وہ بالکل مکمل اور پختہ ہیں لیکن وہ پوری نہیں اوترتی ہیں اور ہم حیران ہیں کہ اُن میں کیا خامی رہ گئی تھی جو ابتک ہمارے ذہن میں نہیں آئی ہے حالانکہ ہم یہ مان چکے ہیں کہ اسکا بھی کوئی نہ کوئی موجب ضرور ہوگا اور ہونا چاہیے۔

ان اولیات کے بعد ہم تقدیر کے رُخ کو یوں پھیرتے ہیں کہ جن واقعات مزاحم اور جن اسباب مانع سے ہم بیخبر یا لاعلم ہیں اور نہیں جانتے کہ ہماری تدبیروں کی ہزیمت کا کون موجب ہوا ہے اور جو ہمارے اسباب مانع ادراک اور علم سے باہر ہیں وہی

امر تقدیری ہے اور وہی نوشتہ اور قسمت۔

ہم ارادہ اور پورا پورا سامان کر کے گھر سے نکلتے ہیں اور تدبیر ہمہ وجوہ مکمل ہوتی ہے لیکن باوجود اسکے ہم ناکامیاب واپس آتے ہیں۔ ایسے چند اسباب نکل آتے ہیں جو ہماری عقل و فکر میں بھی نہ تھے جنہیں دیکھکر ہم حیران سے رہ جاتے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا مقدر یا نوشتہ تھا۔

ہم ایک کام کے واسطے کوٹھے سے نیچے اُترتے ہیں ہمیں کوئی علم نہیں کہ ہماری راہ میں کیا کچھ حائل ہے جب ہم پہلے ہی زینے پر قدم رکھتے ہیں تو زینہ یکایک ٹوٹ جاتا ہے اور ہم دھم سے نیچے گر جاتے ہیں۔ ہم خود اور ہمارے دوست بھی کہتے ہیں کہ "تقدیر"۔

ہم ایک جانور کو نشانہ بناتے ہیں لیکن نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا یا زد سے قبل جانور اوڑ جاتا ہے یا کوئی دوسرا شخص آجاتا ہے اور اُس سے ڈر کر پرواز کر جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اوسکی قسمت میں نشانہ ہونا نہیں لکھا تھا۔

ہم ایک گڑھے میں رات کے وقت گر جاتے ہیں بجائے چوٹ کھانیکے ہم ایک خزانے پر جا پڑتے ہیں ہم خوشی خوشی روپیہ اُچھالتے چلے آتے ہیں اور کہتے ہیں ہماری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا۔

ہم ایک امتحان کے واسطے کچھ تیاری نہیں کرتے لیکن شامل ہو جاتے ہیں ہمسے وہی سوال کیا جاتا ہے جو امتحان کے کمرے کے باہر ہمنے ابھی ابھی ایک دوسرے شخص سے پوچھا تھا ہم پاس ہو جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں ہمارے نوشتے میں یوں ہی تھا۔

ہم ایک محکمے کے افسر کے پاس نوکری کے واسطے جاتے ہیں وہاں اور امیدوار بھی موجود ہیں وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ہم معمولی حالت میں۔ افسر نے اپنے مذاق کے مطابق ہمیں چن لیا اب لوگ یہی کہیں گے اسکی قسمت اچھی تھی اور یہ حسب نصیبا تھا۔ ہم بیمار تھے سب ڈاکٹروں سے علاج کرایا کوئی فائدہ نہ ہوا اور سبنے جواب دیدیا ہم بد پرہیزی کرنے لگے اس سے ہم اچھے ہو گئے ہمنے اپنی تندرستی کا شکریہ یوں ادا کیا کہ ہمارے

نصیب میں یوں ہی لکھا تھا۔

ایک شخص ایک ایسے ملک یا ایسے خطے میں چلا گیا جہاں ایک خصوصیت آب شخص کی ضرورت تھی اون لوگوں نے اُس شخص کا انتخاب بلا اوسکی درخواست کی خودبخود کر لیا اب یہ ایک نوشتہ یا تقدیر اور قسمت ہے۔

اسی قسم کی اور صدہا باتیں اور واقعات گنوائے جا سکتے ہیں اور سب کی نسبت یہ کہا جاوے گا کہ وہ تقدیر اور نوشتہ یا قسمت کے زور سے عمل میں آتے ہیں۔ تدبیر کا اُن میں کوئی دخل نہیں یا یہ کہ جس شخص کے مقابلے میں اُن کا وقوع ہوا ہے اُس نے اُنکے متعلق کوئی تدبیر نہیں کی۔ اب دوسرے الفاظ میں۔ نوشتہ۔ قسمت نصیب۔ تقدیر کا مفہوم یہ ہوا کہ ــــ جو صورت یا جو عمل اور جو ظہور بلا کسی خاص تدبیر کے وقوع پذیر ہو وہ ایک نوشتہ۔ قسمت۔ نصیب یا تقدیر ہے اور اگر ہم غور کو وسعت دینگے تو ماننا پڑے گا کہ ہم ہمیشہ اُنہیں امور اور واقعات سے تقدیر کو متعلق کرتے ہیں جو ہماری کوشش اور سعی کے احاطے سے باہر ہوتے ہیں یا جو یکایک وقوع میں آجاتے ہیں اور پہلے سے اُن کا ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ جو واقعات اس قبیل سے نہیں ہوتے اُنہیں ہم کبھی قسمت یا تقدیر سے منسوب نہیں کرتے بلکہ تدبیر کے خامی یا اپنی ناداقی پر محمول کرتے ہیں ہم بارہا کہتے ہیں کہ تدبیر سے چوک گئے ورنہ کام بن جاتا تدبیر وقت پر نہ ہوا یہ بات رہ گئی یہ جزو زائد تھا یوں نہیں کرنا تھا یوں کرنا تھا۔ اب یہ سوال ہوگا کہ کیوں اس حالت کا نام ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسکی ضرورت کیا ہے۔ ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارا علم کامل یا جامع نہیں ہے اور ہم بہت سے وقوعات یا اونکے اسباب حائلہ اور لازمیہ سے لاعلم اور بے خبر ہیں اور ایسے واقعات کا ظہور ہمیشہ ہوتا رہتا۔ چونکہ بالقوۃ اُن کا وجود موجود تھا گو ہم اُن سے ناواقف یا لاعلم تھے اسواسطے ہم اونہیں مقدر سے تعبیر کیا۔ مقدر وہی ہے جو ہماری نگاہوں اور حد علم سے بالا ہوا دوسرے الفاظ میں مقدر قسمت نوشتہ نصیب سے مراد ایک امر یا امور مخفی و مستتر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسے امور مخفی یا مستتر نہیں ہوتے ہیں اور باوجود اس

کے اُن کا ظہور اور وقوع بھی ہوتا رہتا ہے اور وقوع کے وقت ہی ہمیں معلوم ہوتا ہو کہ ان کا وقوع بھی شدنی[۵۱] تھا۔

واقعات کا مخفی رہنا یا مخفی ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے ہماری زندگی میں صدہا ایسے امور ہیں جو ہم سے مخفی ہیں اور صدہا ایسے جن کا ظہور یا افشار بعد میں ہوا ہے قانون قدرت میں بھی صدہا امور مخفی حامل ہیں اور خاص ہی اوقات میں اُن کا ظہور ہوتا ہے صدہا علمی نتیجے مخفی ہیں جن کا ایک خاص عمل سے وقوع ہوتا ہے ایسے امور ایسی صدہا مخفی باتیں یا مخفی ترکیبیں سینکڑوں سالوں اور سینکڑوں تجربوں کے بعد ظہور میں آئی ہیں اور صدہا بار وہ قدرتی امور اور حوادث ظہور میں آئے ہیں جن سے دنیا حیران اور دنگ رہ گئی ہے حالانکہ قبل از وقوع اُن کا کسی فرد بشر کو علم تک نہ تھا۔ قانون قدرت کے اس طرزِ عمل سے ثابت ہو کہ اظہار کے ساتھ اخفار بھی ہے افشار میں استتار بھی موجود ہو پس جو امر مخفی اور جو طاقت مستتر ہے اور جو ہماری تدبیر یا سلسلہ تدابیر سے ذرا فاصلے پر ہے

---

[۵۱] فارسی میں شدنی اور ہندی میں ہونی تقدیر کے مفہوم میں مستعمل ہے لفظ شدنی اور ہونی کے مفہوم سے صاف طور پر مترشح ہے کہ جو واقعات لاعلمی کی حالت میں باوجود ظاہری تدابیر اور تدارکات کے ظہور یا وقوع میں آتے ہیں وہ انسانی اختیارات اور قدرت سے نسبتاً باہر ہوتے ہیں اور اُن کے اسباب کا سلسلہ شروع سے لیکر اخیر تک تا وقوع انسان سے مخفی رہتا ہو اور ہیں یا بدی یا لازمی تھا کہ اُن کا وقوع ایک خاص حالت یا خاص وقت میں ہو کے رہے کیونکہ اگر اون کا وقوع شدنی نہ ہوتا تو وہ وقوع میں ہی نہ آسکتے۔ یا کوئی تدبیر اُن کے وقوع کی مانع بھی نکل آتی اور اُن کا اثر بھی دور ہو جاتا باوجود منع اور مزاحمت کے بھی اُن کا واقع اور حادث ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ شدنی امور تھے آفتیں۔ حادثات۔ مہلکات پوچھے پوچھے کے نہیں آیا کرتے اسی طرح خوشی اور کامیابی بھی بعض اوقات بلا تردد و استفسار آجاتی ہے اور انسان کوئی وجہ نہیں بیان کر سکتا گو وجوہ وقوعہ موجود ہوتے ہیں لیکن بالفعل انسان اُن سے محض لاعلم ہوتا ہے ایسی حالت میں سوا اسکے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حادثات۔ وقوعات۔ آفتیں۔ مصیبتیں۔ خوشیاں۔ فتوحات۔ شدنی تھیں جب وہ بلا ہمارے علم اور ادراک کے واقع یا حادث ہو چکیں تو اب ہم اُن کے وجود یا وقوع سے کسطرح اور کس دلیل سے انکار کر سکتے ہیں۔ ۱۲

وہی مقدر ہے اور وہی قسمت و نوشتہ علہ۔

یہ ایک مذہبی پیرایہ تھا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اسکے مقابلے میں وہ پیرایہ بھی ہے جو حکماء اور فلاسفروں کا معمول ہے صرف طرز استدلال یا الفاظ میں فرق ہے ورنہ نتیجہ قطعاً ایک ہی ہے جہاں ایک مذہبی شخص قضا قسمت۔ نوشتہ۔ تقدیر استعمال کرتا ہے وہاں ایک حکیم منش یا فلاسفر مزاج شخص قضا۔ اتفاق۔ وقت استعمال کرتا ہے ایک فلاسفر یا ایک حکیم ہمیشہ ایسے مواقع پر یہی کہیگا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہی یہ کام وقت پر ہوگا یا یہ ایک اتفاقی واقعہ ہے۔"

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے تو اس کا مفہوم سوائے اسکے اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو واقعہ ہونا ہے یا جسکے وقوع کی خواہش کی جاتی ہے اُس کا علم نہیں ہے۔ بیشک کبھی کبھی قرین اور قیاس سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا ایسا عنقریب ہوگا لیکن باوجود ان قراین اور قیاسات کے ایسے واقعات کے وقوع کا ٹھیک وقت متعین نہیں ہوسکتا۔

جب یہ کہا جاتا ہی کہ ایسا اتفاق ہوگیا ہے یا اتفاقی بات ہے تو اس کا مفہوم یہی یہی ہوتا ہے کہ وہ امر یا واقعہ ظہور اور وقوع میں آیا ہے جسکا ہمیں پہلے علم نہ تھا اور جو ہمارے حیطہ تدبیر اور حیطہ قیاس سے باہر اور دور تر تھا۔ ایسے واقعات روز پیش آتے

علہ جسقدر الفاظ تقدیر کے مرادف مستعمل ہیں ان سب کی تاویل ہو سکتی ہے۔ مثلاً

تقدیر سے مراد وہ امور ہیں جو ہمیں معلوم نہیں ہیں یا ہمارے حیطہ علم اور حیطہ ادراک سے ہنوز باہر ہیں۔

قسمت سے وہ امور یا وہ حالت مراد ہے جو ہماری نگاہوں سے غائب ہو لیکن اونکا تعلق ہماری ذات سے وابستہ ہے۔

نصیب سے واقعات کا وہ حصہ مراد ہے جو بالفعل موجود یا حاصل نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی آیندہ وقت میں ہو سکے۔

نوشتہ سے بھی وہ واقعات یا وہ امور مراد ہیں جو ہنوز معرض اظہار میں نہیں آئے ہیں لیکن حیطہ قوت میں موجود ہیں اور اونکا اظہار یا وقوع کسی وقت میں ہو سکتا ہے وقوع کے وقت جس شخص سے ایسے امور متعلق ہونگے گویا وہ اونکے لئے ایک نوشتہ تھی۔

ہیں جنکا ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا اور جنکی نسبت کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ خواہ ایسے واقعات ہماری کامیابی میں اضافہ کرتے ہوں خواہ مایوسی اور ناکامیابی کا باعث ہوں ہماری حیطۂ علم اور حیطۂ تدبیر سے باہر ہوتے ہیں اور ہم ان دونوں صورتوں میں اُن کی نسبت یہی کہتے ہیں کہ۔

"یوں ہی ہونا تھا۔"

"یوں ہی ہونا چاہیئے تھا۔"

ہم یہ ان واقعات کی نسبت نہیں کہتے جو ہماری کسی مقدم تدبیر کا نتیجہ ہوں (ا)۔ اُن واقعات کی نسبت جو ہماری تدبیر اور ہمارے قیاس سے دور تر ہوں۔

اتفاقی واقعات سے بھی وہی واقعات مراد ہیں اور اس مفہوم میں ہی وہی حادثات داخل ہیں جنہیں اہل مذہب تقدیری امور سے تعبیر کرتے ہیں صرف طرز استدلال یا انضباطی قانون کا فرق ہے۔

اہل مذہب جو ایسے واقعات کا سلسلہ خدا یا علت العلل تک جا پہنچاتے ہیں وہ اس دلیل سے ہے کہ اُن کے نزدیک وہ ذات اقدس بلحاظ اپنے جامع علم کے ایسے تمام واقعات اتفاقی یا تقدیری سے علیم اور خبیر ہے اور چونکہ وہ قادر مطلق بھی ہے اسواسطے ایسے تمام واقعات کا صدور اور وقوع بھی اوس کے ضابطے یا قانون قدرت کے تابع ہوتا ہے اور اُسی سے اونہیں نسبت دیجاتی ہے اہل مذہب کی یہ کوئی بیجا ساعت نہیں ہے بلکہ ایک لازمی اور واقعی نسبت کا اظہار اور عبودیت کا لازمہ ہے۔

فلاسفر اگر اپنے اتفاقی واقعات کے صدور اور وقوع کی اُس ذات اقدس ہی نسبت نہیں دیتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ایسے اتفاقی واقعات کسی ضابطے یا قانون کے ماتحت یا تابع نہیں ہیں فلاسفر اور حکیم مانتے ہیں کہ ایسے اتفاقی واقعات کا وقوع بھی کسی نہ کسی قانون ہی کے ماتحت اور تابع ہوتا ہے اور وہ قانون تدبیری مواد سے خالی نہیں ہوتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ ایسے تدابیر سے ہم واقف نہیں ہوتے۔ یا یہ کہ ایسی تدبیریں ہمارے حیطۂ قدرت سے باہر ہوتی

ہیں۔ سو اس طرز استدلال کا مفہوم بھی اہل مذہب کے استدلال سے قریب قریب ہے دونوں فریق اس امر کے معترف ہیں کہ تقدیری یا اتفاقی واقعات کا وقوع کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کے ماتحت ہوتا ہے اور اُن میں بھی سلسلہ علت اور معلول موجود ہے صرف کمی یہ ہے کہ ہم اُس قانون یا ضابطے کے وجوہ یا اسباب سے واقف نہیں ہوتے۔ یا وہ سلسلہ علت اور معلول ہماری سمجھ اور علم سے باہر ہوتا ہے اور اسبات سے ہم انکار کر ہی نہیں سکتے کہ ہمارا علم اور ادراک تمام واقعات اور حادثات کا حادی یا جامع نہیں ہے بلکہ ایک محدود حالت میں ہے ہمارے علوم اور ادراکات میں جو تدریجی ترقی ہوتی رہتی ہے یہ بھی بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ہم کلی ادراک نہیں رکھتے۔ مذہب یہ نہیں کہتا کہ کوئی تقدیری امر یا تقدیری وقوعہ بلا کسی ضابطے یا قانون کے وقوع پذیر ہوا یا ہوتا ہے یا اوس کا کوئی فاعل یا علت نہیں ہے مذہب یہ کہتا ہے کہ ہماری قوت تدبیر سے باہر اور ہمارے حیطہ اختیار سے بیرون بھی واقعات اور حادثات کا وقوع یا حدوث ہوتا رہتا ہے اور باوجود اس حدوث اور وقوع کے ہم اونکے ضابطے یا قانون سے لاعلم رہتے ہیں اور ہمیں مطلقاً معلوم نہیں ہوتا کہ اس گھڑی کے بعد اور اس ساعت کے پیچھے کیا کچھ اور کیونکر وقوعات ہونگے اور شخصی جہت سے انکا اثر کس کس پر پڑیگا۔

بیرونی واقعات یا بیرونی علائق کو چھوڑ کر ہم خود اپنے شخصی واقعات یا ذاتی حادثات کی نسبت بھی نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے منٹ یا دوسری گھڑی میں اُنمیں کیا کچھ تغیر و تبدل منودار ہوگا۔

اور ہماری شخصیت یا ذات کس گرداب یا کس انقلاب میں مبتلا ہوگی ان واقعات کے اثبات کی دلیلوں سے ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ تقدیر کا قایل ہو یا منکر کہہ سکتا ہے کہ کیا اوسکی ذات پر ایسے حالات کا عبور نہیں ہوتا ہے کیا وہ ایسے تغیرات اور تبدلات سے ماثر نہیں ہے کیا اوسکا علم اور ادراک جامعیت رکھتا ہے یا اوسمیں جامعیت پیدا کی جاسکتی ہے اگر یہ باتیں یا یہ حالتیں پیدا نہیں ہوسکتی ہیں اور اب تک ان پر انسان کامیاب نہیں ہوا

تو ماننا پڑے گا کہ بہت سے واقعات اور حادثات ہمارے حیطۂ علم یا حیطۂ قدرت سے باہر ہیں اور خود بخود بلا ہمارے تدبر کے اُن کا وقوع ہوتا رہتا ہے۔

پس یہ وہی مجبوری اور وہی حالت ہے جسے مذہب تقدیر اور قسمت کے نام سے نامزد کرتا ہے اور جسکو حکمت یا فلسفے میں اتفاقات سے تعبیر کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ کیوں کہا جاتا ہے کہ

"خدا کے حکم سے ایسا ہوتا یا ہوا ہے"؟

یہ بحث بجائے خود ایک طویل بحث ہے اس بحث میں دو جزو قابل غور ہیں۔

(الف) علم الٰہی۔

(ب) حکم یا ارادۂ الٰہی۔

خدا ایک نور اور ایک طاقت ہے اُسے خدا مان کر ہم اُس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے حالات اور کوائف یا موجودہ اور آئندہ واقعات اور حادثات سے واقف ہے جب وہ خبیر اور علیم ہے تو اُس کا ارادہ کرنا یا کسی امر کا چاہنا اور عمل میں لانا اوسکے صفات مقدسہ کے منافی نہیں ہے۔ بڑے بڑے واقعات اور حادثات کا وقوع اور حدوث یاد دلاتا ہے کہ وہ محض اوسی کے ارادے کے تابع واقع یا حادث[۵۹] ہوئے ہیں بڑے بڑے واقعات اور عظیم حادثات کا دستور العمل جزوی واقعات اور چھوٹے

---

[۵۹] ۴ر اپریل ۱۹۰۵ء کا جانکاہ اور لرزا دینے والا زلزلہ اسپر روشنی ڈالتا ہے کہ انسانی معلومات یا علوم کی حد کہاں تک اور کیسی جامع ہے۔ رات کو کیا کیا آرزوئیں اور کیا کیا خواہشیں اور اُمنگیں لیکر لوگ سوئے تھے اور اُن کے دلوں میں صبح کے واسطے کیا کچھ بھرا تھا کوئی کسی خیال میں سویا تھا اور کوئی کسی میں۔ لیکن ارادۂ الٰہی میں کچھ اور ہی مرتسم تھا۔ تقدیر ہنس رہی تھی اور قہر الٰہی سب اُمنگوں اور سب آرزوؤں پر قہقہا لگا رہا تھا۔ اُٹھنے سے پہلے ۳ منٹ کے اندر ہی اندر ہزاروں مخلوق کا فیصلہ کر دیا گیا۔ نہ منطق کام کرے اور نہ ہندسہ نہ فلسفہ اور نہ سائنس ہم مانتے ہیں کہ زلزلہ بلا اسباب کے نہیں آتا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے

باقی نوٹ صفحہ ۲۲ پر

حادثات کے لئے بھی کسی نہ کسی دستور العمل ہونے کی ضرورت ظاہر کرتا ہے جب تدبیر کے اجزائے عامہ بھی کسی نہ کسی دستور اور طاقت کے ماتحت ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تقدیری واقعات کو کسی نہ کسی دستور اور طاقت سے نسبت نہ ہو۔ فقط

راقم۔ سلطان احمد میاں والی پنجاب

پارٹی پالٹیکس

جسوقت سے بمبئی کانگرس نے یہ طے کیا ہے کہ جنرل الکشن کے وقت چند وکلاء ہند انگلستان بھیجے جائیں تاکہ وہ یہاں کی صورت حال انگریزی پبلک کے روبرو پیش کریں اور اُنسے انصاف اور امداد کے خواستگار ہوں، اُسیوقت سے مختلف صور توں میں یہ امر زیر بحث رہا ہے کہ اس طریق سے کچھ کامیابی کی امید ہے یا محض وقت اور روپیہ کا برباد کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ ہر بہی خواہ ملک کے دل میں بیچینی پیدا کرتا ہے اور اسے پیچ و تاب میں ڈالتا ہے۔ اکیس برس سے کانگرس اپنا کام کر رہی ہے، عوام میں اس سے ایک تحریک پیدا ہو چکی ہے جسے کامیابی کا زینہ کہنا چاہئے، نہ صرف یہی بلکہ کانگرس اپنے اغراض و مقاصد میں عملاً بھی بہت کچھ کامیاب ہو چکی ہے۔ لیکن گزشتہ چند برسوں سے گورنمنٹ ہند کے برتاؤ نے عجیب مایوسی اور اضمحلال دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔ اس مایوسانہ حالت میں صرف ایک خیال ہے جو دل کو تقویت دیتا اور آیندہ کو امید بندھاتا ہے وہ خیال انگلش قوم کے معدلت پسندی و نصفت شعاری کا یقین ہے۔ اوّل روز سے

لیکن پوچھا جاتا ہے کہ ایسے اسباب کا جامع اور محرک کون ہے اگر خدا ان کا محرک اور جامع ہے۔ (ضرور وہی ہے) تو کہا جاوے گا کہ یہ سب کچھ اوسیکے ارادے کی شان اور اوسیکی جباری کا نمونہ تھا جس سے انسان اخیر تک لاعلم رہا بس یہی تقدیری واقعہ یا ازلی حادثہ ہے۔ فتدبّر۔ ۱۲

کانگرس اسی اعتماد پر کام کر رہی ہے، اگر خدانخواستہ یہ امید بھی منقطع ہو جائے تو
کانگرس اور اسکے ساتھ ہندوستان پر فاتحہ پڑھکر بیٹھ رہنا چاہئے۔ اسی لئے اس
پر غور کرنا اور اسکا سلجھانا تمام بہی خواہان ملک کا اولین فرض ہے۔ اس اعتماد او
یقین کو کسیطرح ٹوٹنے نہ دینا چاہئے اور اس سے ہر طبقے کو آگاہ کرنیکی کوشش
کرنا چاہئے۔ لہذا ایک مختصر کیفیت ان تمام کارروائیونکے درج کیجاتی ہے جو اب تک
اس بارے میں ہوئی ہیں اور اکثر مدبرین ملک کے آراء کا خلاصہ بھی لکھا جاتا ہے تا
مایوس دلونمیں امید با امید دلونمیں کام کی خواہش اور خواہشمند دلونمیں تازہ جوش
پیدا ہو۔ مدبرین ملک کی رائونکے دیکھنے سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جائیگا کہ ولایت
میں کام بلا تعلق پارٹی کے ممکن نہیں اور دونوں پارٹیونمیں سے صرف لبرل پار
ہماری اغراض سے متفق اور ہماری درد کی دوا ہو سکتی ہے اور اسیکا دامن مضبو
پکڑنا اور یکدر گیر و محکم گیر پر عمل کرنا چاہئے۔ بعض لوگونکا یہ خیال ہے کہ ولایت
میں جلسے کرنا اور لکچر دینا ایسا ہی بیہودہ ہے جیسے یہاں ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کو
معاملے میں عام رائے کی پروا نہیں کرتی خواہ ملک ایک سرے سے دوسرے سر
تک اسکے خلاف کیوں نہو جیسا کہ قانون رازداری میں ظاہر ہو چکا ہے لیک
انگلستان میں ایسا نہیں ہے وہاں عام رائے کی بہت وقعت اور عزت ہے۔ گز
کانگرس میں سر ولیم ڈوربرن نے فرمایا تھا کہ یہ سچ ہے کہ "ولایت میں پبلک
(عام رائے) بنفسہ کوئی قانون نہیں بناتی اور نہ عہدہ داران سلطنت کا تقرر کرتی۔
مگر بالواسطہ یہی عام رائے ہر قانون بناتی اور عہدہ دار مقرر کرتی ہے، انگلستا
عام رائے کا اثر ووٹ دینے والوں پر پڑتا ہے اور ہاؤس آف کامنس گورنمنٹ کی
کرتا ہے اور گورنمنٹ ہندوستان کے لئے وزیر اور ویسرائے مقرر کرتی ہے ج
حکومت کرتے ہیں۔ اسلئے اگر تم عام رائے پر اثر ڈالوگے تو تمہیں وہ قوانین
جنکے تم متمنی ہو اور تم پر ایسے عہدہ دار مقرر کئے جائینگے جنکی تم آرزو کرتے ہو" پبل
کی عام رائے کو اپنا ممد و معاون بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا چاہئے۔

ذیل کے بیان سے ظاہر ہوگا کہ کانگرس نے اپنے قیام کے زمانے سے لگاتار
کوششیں کی ہیں کہ ولایت کی پبلک اونہیں معاملات ہند کیطرف رجوع ہو (یہاں
صرف ڈیپوٹیشن کا ذکر ہوگا ورنہ "انڈیا" اخبار کے جاری کرنے "برٹش انڈین کمیٹی کے
قائم کرنے پمفلٹ وغیرہ کے شایع کرنے اور معاملات ہند پر مسلسل تقریرونکے انتظام
کرنیمیں اسنے جو خدمتیں ملک کی انجام دی انکا شمار نہیں ہوسکتا۔)

کانگرس سے پہلے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں علیحدہ علیحدہ پولیٹکل انجمنیں
قائم تہیں اور وہ اپنے اپنے حدود کے اندر بہت کچہ کام ہی کرتی تہیں مگر عوام اور گورنمنٹ
پر ان کا وہ اثر نہ تہا جو مجموعہ اور متفقہ قومی کانگرس کا اب پڑرہا ہے۔ اس زمانے میں
انڈین ایسوایشن کیطرف سے مسٹر لال موہن گھوش ۱۸۷۹ع میں وکالت ہند کے لئے
انگلستان بہیجے گئے۔ مسٹر برائٹ اسوقت زندہ تہے اور انہوں نے مسٹر لال موہن گھوش
کو ہر طرح مدد دی۔ اور خود مسٹر گہوش ولایت میں کافی شہرت حاصل کرچکے تہے۔ اُنہوں
نے بہت سے جلسے کئے اور جہانتک انکے امکان میں تہا ملک کے عام خیال کو معاملات
ہند کیطرف رجوع کرایا۔ اُن کی سعی بارآور ہوئی اور بہت سے خیرخواہ ہندوستان
کے پیدا ہوگئے۔ ولیس ہال میں جب مسٹر برائٹ اور لال موہن گھوش نے اپیچیں دیں
تو اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر اسٹیوٹری سول سروس کا مراسلہ شایع کیا گیا مسٹر
موصوف نے انگلستان میں زیادہ قیام نہیں کیا اور ۱۸۸۰ع کے اوائل میں واپس چلے
آئے۔ دوسرا ڈیپوٹیشن ۱۸۸۵ع میں جنرل الکشن کے وقت روانہ کیا گیا۔ اسمیں مسٹر
من موہن گھوش متوفی۔ مسٹر رام سوامی مدیر متوفی اور مسٹر چندروا کرشامل تہے۔ ان
حضرات نے ہی بہت دلچسپی ہندوستان کے معاملات سے پیدا کی اور یہ ڈیپوٹیشن
بہی اپنے مقاصد میں کامیاب واپس آیا۔ تیسرا ڈیپوٹیشن ۱۸۹۰ع میں کانگرس کیطرف
سے بہیجا گیا اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسی ڈیپوٹیشن کی جانفشانیونکا نتیجہ تہا کہ مسٹر بریڈلا
۱۸۹۲ع میں انڈیا کونسل ایکٹ کے پاس کرانے میں کامیاب ہوئے۔ اس ایکٹ پر
اگرچہ گورنمنٹ نے پورا عملدرآمد نہیں کیا مگر یہ اسیکا طفیل ہے کہ چند منتخب ممبر

ولیسرائے کی کونسل میں نظر آتے ہیں اگرچہ وہ بے لبس اور بے اختیار ہی کیوں نہوں۔

ان تمام نتائج کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا کہ اسوقت تک جتنے ڈیپوٹیشن ولایت میں بھیجے گئے وہ کامیاب ہوئے اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے برٹش پبلک میں معاملات ہند سے دلچسپی پیدا کیجا سکتی ہے۔ اور اہل انگلستان ہی کیا موقوف ہر قاعدہ کلیہ ہے کہ جب تک ہم خود اپنے تکالیف اور ضروریات کو نہ بیان کرینگے دوسرں کو کیا غرض پڑی ہے کہ اپنے عیش و آرام کو چھوڑ کر ہمارے لئے زحمت گوارا کریں۔ اگرچہ ایسے بھی نیک بندے خدا کے موجود ہیں، مگر عام اختیار سے یہی بہت ہی کہ ہماری آواز اہالیان انگلستان تک پہنچ جائے اور ہماری حالت کیطرف اُنکو توجہ ہو جائے خواہ وہ کیسی ہی قلیل کیوں نہو۔

جب ہمنے یہ ٹھان لی ہے کہ اپنی آواز نیکدل انگلش قوم تک کے پہچا دینگے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کام کسی ایک پارٹی کے سرگروگی میں ہونا چاہئے یا پارٹیوں سے آزاد اور دونوں سے متعلق ہو۔ عرصے تک ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ خیال جما رہا اور اُنھوں نے اسکے مطابق کوشش بھی کی کہ ہندوستان کے مسائل انگلستانی پارٹی پالٹیکس میں داخل نہوں مگر تجربے نے بتا دیا کہ ؎

ترسم نرسی بکعبہ ای اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

اینگلو انڈین حضرات بڑی زور کے ساتھ ابھی تک یہی صلاح دے رہے ہیں مگر ان مہمان مشفق کی رائے شنیدن "روا است و لے پذیرفتن خطا است" ان کی رائیں شکریے کے ساتھ مسترد کر دی جائیں اور اپنے کام میں مشغول رہنا چاہئے۔ مسٹر ایبرٹ ناٹ مرحوم نے ۱۸۸۳ء میں لندن کے اسٹیٹسمین میں ایک مضمون شائع کرایا تھا اگر اسپر عمل کیا گیا ہوتا تو ہملوگ اسوقت "مذبذبین بین ذالک" میں نہ رہتے اور یکسوئی حاصل ہو گئی ہوتی مگر ابھی بہت وقت نہیں گیا ہے۔ مسٹر موصوف لکھتے ہیں کہ یہ کہنا کہ ہندوستان کو پارٹی پالیٹکس سے علحدہ رہنا چاہئے بالفاظ دیگر یہ کہنا ہے کہ پارلیمنٹ

خیال ہندوستان کیطرف رجوع ہونا چاہئے یعنی ہندوستان کے معاملات
کامل تحقیقات ہونی چاہئے .... اور پچیس کروڑ نفوس کو بلا خوف
ابد ہی غیر قوم کے حکام کے رحم پر چھوڑ دینا چاہئے،، درحقیقت انگلستان کی حالت
کہ کیسا ہی اہم ترین مسئلہ کیوں نہو اگر وہ کسی پارٹی کے پروگرام میں شامل نہو تو اسپر
مطلقاً توجہ نہیں کیجاتی اور کیسا ہی اخف ترین مسئلہ ہو اور وہ پارٹی کے پروگرام میں داخل
ہو تو پھر بیش از بیش توجہ کیجاتی ہے - ہندوستان کا معاملہ خود اسکا شاہد ہے کہ جس وقت
ہندوستان کا بجٹ پیش ہوتا ہے تو اونگنے چند ممبر بخوشی پیرا اونگھا کرتے ہیں
اور باقی ہاؤس خالی رہتا ہے یہ کیوں ؟ صرف اسلئے کہ ہندوستان کے مسائل کسی
پارٹی سے متعلق نہیں -

اب مدبرین ملک کی رائیں ترتیب وار درج کیجاتی ہیں - انسے صاف طور پر عیاں
ہو جائیگا کہ اسوقت تک ان بزرگوں نے اس بارے میں کیا کچھ سوچا اور کیا ہے اور
ان سے یہ سوال بھی حل ہو جائیگا کہ کس پارٹی سے ہندوستانیوں کو اپنے معاملات
متعلق کرنا چاہئیں -

(۱) مسٹر لال موہن گھوش جب ولایت سے واپس آئے تو اپنے مشن کے متعلق
۴ مارچ ۱۸۸۰ء کو کلکتہ ٹاؤن ہال میں لکچر دیا - اسمیں کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کا اعتراض
ہے کہ میں نے ایک گروہ سے تعلق پیدا کیا اور دوسرے سے کچھ سروکار نہ رکھا..... لیکن
..... میں مجبور تھا - میرا کام ہی ایسا تھا کہ ایک گروہ اس سے زیادہ ہمدردی ظاہر کرتا تھا -
اور دوسرا بالکل کشیدہ تھا - پس یہ قصور میرا نہیں - بلکہ اس کام کا ہے جو میرے
سپرد کیا گیا تھا کہ کیوں میں نے گروہ لبرل کو مخصوص کیا اور کنسرویٹو سے اجتناب کیا -
آپ جنگ افغانستان کو ناپسند کرتے ہیں، ہندوستانی پریس ایکٹ کے خلاف ہیں
اور ان قوانین کے مخالف ہیں جو رعایا کی ترقی کو روکتے ہیں - کیا آپ امید رکھتے ہیں
گروہ کنسرویٹو سے !!! آپ کی تمنا ہے کہ پبلک سروس میں ہندوستانی اور انگریز بلا
لحاظ قومیت کے داخل ہوں، آپ کی عین خواہش ہے کہ ملک میں طریق الکشن کو رائج

کریں اور پھر اسکے پورے ہونیکی توقع رکھتے ہیں۔ ان منصف مزاجوں سے جنکے نزدیک سیاسی معاملات میں اخلاق کوئی چیز نہیں ہے! ع

این خیال است و محال ست و جنوں

برخلاف اسکے لبرل گروہ کا حال یہ ہے کہ وہ ہر امر کے سُننے اور انصاف کرنیکے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جس گروہ نے غلامی کو مسدود کیا، چرچ آئرلینڈ کو آزاد کیا، ہمیشہ خود غرضی کے خلاف کوشش کی، وہی گروہ اگر اپنا دست انصاف ہماری طرف بھی بڑھا دے تو کچھ بعید از قیاس نہیں"

(۲) دوبارہ۔ ۲۰ فروری ۱۸۹۶ء کو مسٹر موصوف نے نیشنل لبرل کلب ڈنر کے موقع پر لندن میں بھی یہی خیالات ظاہر کئے اور فرمایا کہ ۱۸۸۵ء کے قبل کنزرویٹو گروہ کو ہندوستان کے معاملات سے دلچسپی تھی اسکے بعد وہ دلچسپی کم ہوتی گئی اور لبرل فریق ہندوستانی مسائل پر زیادہ متوجہ ہوتا گیا " آخر ہمیں مجبور ہوکر یہ کرنا پڑا کہ ہم گروہ کنزرویٹو سے جدا ہوکر لبرل سے تعلق پیدا کریں۔"

(۳) ۱۸۸۵ء میں مسٹر دادا بھائی نوروجی نے لکھا کہ ہمیں اپنے بہت سے عظیم مجادلات پارلیمنٹ میں کرنے ہیں۔ ممبران پارلیمنٹ کے انتخاب پر ہمیں خاص نظر ڈالنی چاہئے اور بالخصوص ان ممبروں کے انتخاب پر جو معاملات ہند پر رائے زنی کرنا چاہتے ہیں" اور ہمیں چاہئے کہ انتخاب کرنیوالوں کو بتادیں کہ ان موخرالذکر ممبروں میں سے کن پر ہمیں اعتماد ہے"

(۴) اس سال انتخاب ڈیلیگیٹ کے موقع پر سر فیروزشاہ مہتا نے فرمایا تھا کہ "یہی وقت ہے کہ ہندوستان کے مسائل پارٹی کی حمایت میں دقیق اور غائر تنقید کیلئے پیش کئے جائیں، جب تک یہ نہ ہوگا مسائل ہند پر ولایت میں کچھ توجہ نہ کیجائیگی اور جو ہماری خواہش ہے نہ کبھی لوگ اسے سمجھیں گے اور نہ وہ حاصل ہوگی.... اسمیں شک نہیں کہ پارٹی کی جنگ و جدل میں بعض وقت ہندوستان کے اغراض کو قربان کرنا پڑے گا مگر کبھی نہ کبھی برٹش قوم کا دل پگھلیگا اور ضرور پگھلیگا جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے

بسا اوقات اس شمولِ گروہِ خاص سے کچھ نقصان بھی پہنچیگا مگر آخر کار ضرور بالضرور فائدہ ہوگا۔"

(۵) مسٹر من موہن گھوش نے ولایت سے واپس آکر بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن میں ۱۳ جنوری ۱۸۸۶ء کو ایک لکچر دیا اور اسمیں کہا کہ

"مجھسے زیادہ کسیکو اس امر کی خوشی نہوتی اگر ہم لوگ پارٹی پالٹیکس سے بچ نکلتے مگر واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ ممکن نہیں اور اسکے مشکلات پر غالب آنا محال ہے، جب تک ہم لوگ مسائل ہند کو پارٹی پالٹیکس میں داخل نکرینگے کچھ فائدہ نہیں پہنچیگا .... باوجودیکہ ہمنے پارٹی پالٹیکس سے علیحدہ رہنے کا اعلان کر دیا تھا لیکن اوسپر بھی گروہ کنسرویٹو کیطرف سے ہم صرف ایک جلسے کی شرکت کے لیے بلائے گئے حالانکہ لبرل انجمنوں نے ملک کے مختلف حصص سے اسقدر دعوتیں ہمارے پاس بھیجیں کہ ہم اُن سب کو مجبورًا منظور نہ کر سکے۔"

(۶) پونا کانگرس میں بابو سُرندرو ناتھ بنرجی نے فرمایا "کہ قبل اسکے کہ ہم انگریزی قوم سے انصاف کی امید کریں یہ ضروری ہے کہ انہیں معاملاتِ ہند سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں کہ ہندوستانی مسائل پارٹی پالٹیکس کے حلقے کے باہر رہیں۔"

(۷) اسی ڈپوٹیشن کی نسبت سر ولیم وڈربرن لکھتے ہیں کہ بہت سے جلسے ہوئے مگر انتظام خاطر خواہ نہیں ہوا اور کانگرس کو بہت زیادہ زیر بار ہونا پڑا لیکن "یہ نتیجہ تھا اس امر کا کہ ہم پارٹی سے بے تعلق ہوکر اپنا کام کرنا چاہتے تھے، یعنی لبرل اور کنسرویٹو دونوں سے اپیل کی اور اسیلئے ان دونوں پارٹیوں میں سے کسی سے بھی پوری مدد ہم نہ حاصل کر سکے .... لبرل پریس برابر ہماری تائید کر رہا ہے۔ برخلاف اسکے کنسرویٹو پریس کا لہجہ مخالفانہ ہے۔" (سر ولیم کی رائے تھی کہ اگر ڈیلیگیٹ لبرل کے شریک ہو جاتے تو انکو اپنے جلسوں کے لئے علیحدہ خرچ برداشت نہ کرنا پڑتا اور نتیجہ بھی زیادہ مفید ہوتا)

(۹) مسٹر ارڈلی نارٹن (مدراس کے مشہور بیرسٹر) بھی اس ڈیپوٹیشن کے ممبر تھے ولایت سے واپس آکر جو چند اسپیچیں اُنہوں نے دیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کنسرویٹو گروہ کو کانگرس پارٹی سے کس درجہ بغض و عناد ہے اور اُنہوں نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ کسیطرح کی مدد اس گروہ کو نہ دینگے۔ برمنگھم میں لبرل یونینسٹ کیطرف سے کانگرس کی تائید میں ایک جلسہ ہونیوالا تھا لیکن مسٹر چیمبرلین نے عین وقت پر اسکو درہم و برہم کر دیا اور آخر کار لبرل ایسوسیشن کی کوشش سے ایک مختصر جلسہ لبرل فریق کا ہوا۔ بیرسٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ لارڈ ہیرچل نے صاف طور پر کہدیا تھا کہ ہندوستان کو پارٹی پالٹیکس میں شامل کر لینا چاہیئے اور اس سے انکا مطلب یہ تھا کہ کنسرویٹو اسے اپنی پارٹی میں شامل کر لیں مگر کنسرویٹو ریفارم کی مخالف ہیں اور اُنہوں نے صاف انکار کر دیا۔

پس کیا اب ہمکو بے تعلقی کے فضول خیال کا پابند ہو کر اپنا روپیہ اور وقت برباد کرنا چاہیئے اور ایسے لوگوں سے اپیل کرنی چاہیئے جو ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ کے تحت میں داخل ہیں۔ اگر کنسرویٹو لوگ ہماری مدد کریں تو ہم تیار ہیں۔ لیکن جب وہ انکار کرتے ہیں تو ہمیں یہ پڑھکر کہ ؎

دل ابتو عشق کی دریا میں ڈالا   تو کلتُ علی اللہ تعالےٰ

اپنی قسمت کا پانسہ لبرل گروہ کے ساتھ ڈالنا چاہیئے۔ جو ہونا ہوگا ہو رہیگا۔"

مسٹر موصوف نے کنسرویٹو گروہ کا اچھا خاکہ کھینچا ہے فرماتے ہیں کہ ہمکو سارے زمانہ قیام انگلستان میں کبھی کنسرویٹو جلسے میں اسپیچ کہنے کا موقع نہیں ملا اور نہ کسی کنسرویٹو نے ہماری کچھ تواضع کی برخلاف اسکے بیشمار لبرل جلسوں میں ہمنے اسپیچیں کہیں اور صدہا لبرل اشخاص نے ہماری مہمانداری اور خاطر و مدارات کی۔ مینے بمشکل تمام مسٹر گارنتھ کو راضی کیا کہ وہ ایک کنسرویٹو جلسہ کریں۔ مینے یہ بھی وعدہ کیا کہ میں اس جلسے میں کوئی رزولیوشن کانگرس کی تائید میں نہ پیش کرونگا اور جسکا جی چاہے میرے خلاف تقریر کرے بشرطیکہ مجھے اپنے خیالات کے آزادانہ

اظہار کا موقع دیا جائے۔ ایک ہفتے کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ کنسرویٹو آپکی تقریر سننے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی راے میں آپکی تقریر غیر وفادارانہ اور باغیانہ" ہوگی۔ مینے پوچھا کہ کیا انہیں معلوم ہے کہ میں کیا کہونگا؟ جواب ملا نہیں، مینے پوچھا کہ مسائل ہندوستان کو آپ ضروری سمجھے ہیں؟ جواب ملا کہ "ہاں"۔ کیسے غضب کی بات ہے کہ جو چیز ضروری اور نامعلوم ہے اسی غیر وفادارانہ اور باغیانہ، سمجھ لیا البغض للہی اسکو کہتے ہیں۔

(۱۰) کلکتہ کانگرس کے موقع پر ۱۹۰۶ء میں مسٹر کین نے فرمایا کہ " انڈیا کمیٹی کے ۱۲۰ ممبروں میں سے ایک بھی کنسرویٹو نہیں ہے .... کانگرس کی تحریک کو صرف لبرل پارٹی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اسپر وہ بھروسہ کر سکتی ہے۔ صاحبو! ٹوری پارٹی سے جو کچھ بھی امیدیں آپ لوگوں کو ابتک رہی ہیں اُنکو الوداع کہئے۔ وہ پارٹی فوج کا بڑہانا اور خاص فرقوں کی طرفداری کرنا جانتی ہے۔ ہر مسئلے میں وہ ایسا طریق اختیار کرتی ہے جس سے ترقی رُک جائے اور عوام کی راہ میں روک پیدا ہوجائے۔"

(۱۱) مسٹر لال موہن گھوش نے اسی موقع پر فرمایا کہ "مجھے مسٹر کین کی راے سے اتفاق ہے .... آپ لوگوں نے تین بار مجھ ولایت بھیجا اور میرا یہ تجربہ ہے کہ ہمیں گروہ کنسرویٹو سے مدد نہیں ملسکتی ہمنے بارہا کوشش کی کہ کچھ کنسرویٹو ممبروں کو اپنا ہم آہنگ بنائیں مگر افسوس ہے کہ ہر بار ناکامی ہوں۔"

(۱۲) مسٹر ڈگبی مرحوم (جنہوں نے افلاس ہند پر ایک ضخیم کتاب لکھکر ہندوستان پر احسان کیا ہے) ایک طویل آرٹکل میں اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرنیکے بعد فرماتے ہیں کہ "صرف پارٹی کی مدد سے ہم اپنی دلی مراد پا سکتے ہیں اور جو پارٹی ہمیں مدد دیگی وہ لبرل پارٹی ہے کانگرس کو لبرل پارٹی سے متعلق کرنا صحیح راہ پر چلنا ہے اور جب صحیح راستہ معلوم ہے تو ہم غلط راستے پر کیوں چلیں۔"

ان تمام رایوں کے دیکھنے سے ہر شخص جسے اپنے ملک کی بہبود کا کچھ بھی

خیال ہے یہ یقین کریگا کہ لبرل پارٹی اور صرف لبرل پارٹی کی مدد ہمیں حاصل کرنی چاہئے مگر اب سوال یہ ہے کہ آیا لبرل پارٹی کو بھی ہمارے ساتھ کچھ ہمدردی ہوا ور آیا وہ یہ منظور کریگی کہ ہندوستانی مسائل کو اپنے پروپیگنڈا میں (وہ رسالہ جو قبل الکشن کے ہر فریق کیطرف سے جاری کیا جاتا ہے کہ اگر وہ برسر حکومت ہوا تو کیا کیا کرے گا) داخل کرے۔

جب ہم لبرل گروہ کے طرز عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف امید بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ اگر ہماری طرف سے کافی کوشش ہوئی تو وہ ہمیں اپنے ساتھ شریک کرینگے۔ لبرل گروہ پارلیمنٹ میں ہندوستان۔ کے مسائل میں زیادہ دلچسپی اور حصہ لیتا ہے۔ ہندوستان کے مسائل پر کانگریس کی نظر سے لبرل اخبارات زیادہ آزادی اور فراخ دلی سے بحث کرتے ہیں۔ گذشتہ کانگریس کی رپورٹ اکثر لبرل اخبارات میں بذریعہ تار گئی۔ کلکتے کی پروٹسٹ میٹنگ کی کارروائی لبرل اخبار کے کئی نامہ نگاروں نے تار پر روانہ کی اور قریب قریب اکثر اخبارات نے ان خیالات کی تائید کی۔ یہی نہیں کہ لبرل گروہ اخبار کے ذریعے سے ہمسے ہمدردی ظاہر کرتا ہے بلکہ عملاً بھی وہ اسکا ثبوت دے رہا ہے۔ دادا بھائی نوروجی ڈبلیوسی بانرجی کو کس نے پارلیمنٹ کا ممبر بنایا؟ لبرل گروہ نے۔ اور آیندہ الکشن کے لئے کئی ہندوستانی گروہ لبرل کیطرف سے تجویز ہوئے ہیں۔ مسٹر ڈبلو۔ ٹی اسٹیڈ نے اپنے رسالہ ریویو آف ریویوز میں بھی گذشتہ کانگریس کا حال لکھتے وقت لکھا ہے کہ کانگریس کو پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہئے اور ممبران آئرلینڈ کو انہوں نے صلاح دی ہے کہ مسائل ہند کو اپنی حمایت میں لے لیں۔ امید ہے کہ اس بار جو ڈیلیگیٹ جائینگے وہ اس امر کا قطعی فیصلہ کر آئینگے کہ ہمارے اور گروہ لبرل کے اغراض متحد او متفق ہوگئے ہیں خدا ایسا ہی کرے۔

فقط راقم "مسلمان"

گلزار نسیم

اس مثنوی پر مجھے ایک مدت سے متعدد شبہات تھے۔ اور یہ ارادہ کرتا تھا کہ اُن شبہات کو کسی موقع پر پبلک کے سامنے پیش کروں۔ کہ پنڈت برج نراین صاحب چکبست نے اسکا نیا اڈیشن چھپوایا اور اُس کی ایک جلد ریویو کے لئے میرے پاس بھیجی۔ یہ امر اس ارادے کا محرک ہو گیا اور مارچ و اپریل ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں میں نے اپنے خیالات و اعتراضات کا ایک معتد بہ حصہ شائع کر دیا۔ جسکا جواب پہلے تو مجھے یہ ملا کہ بازاری الفاظ میں گالیاں دیجانے لگیں۔ مگر ساتھ ہی بعض عقلا اور صاحب نظر لوگوں نے اُن اعتراضات کی تصدیق کی اور دوسری طرف اُن ناجائز حملوں نے مجھے یقین دلا دیا کہ لوگوں کے پاس اگر کچھ جواب ہے تو یہی ہے۔

لیکن جولائی کے اردوئے معلےٰ میں خود مسٹر چکبست کا ایک لمبا چوڑا مضمون نظر سے گذرا جو اگرچہ اعتراضات پر بہت ہی خفیف اثر ڈال سکا مگر بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اور اس قابل ہے کہ اُسکی طرف توجہ کیجائے۔ مسٹر چکبست نے ابتدائی ۱۷ صفحے تمہیدی اور عام مطالب کی نذر کئے ہیں۔ اُنکے متعلق میں سوا چند خاص باتوں کے زیادہ نہیں لکھنا چاہتا۔ اسلئے کہ اصلی بحث اعتراضوں سے ہے۔ اور اُنہیں کے صحیح یا غلط ہونے پر جملہ امور کا دارمدار ہے۔

میں نے گلزار نسیم کی تعریف بھی کی تھی اور اُسکی نسبت یہ بھی لکھا تھا کہ جتنی غلطیاں اُسمیں ہیں کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ ان دونوں باتوں کو مسٹر چکبست باہم متضاد بتاتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک ہی کلام میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ بہت سے عیوب کا بھی جمع ہونا خلاف عقل کیوں ہے۔ اور اسمیں کونسا عقلی استحالہ لازم آتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کے قلم سے ایسی بے بنیاد بات کا نکلنا نا قابل حیرت ہے۔ اس استدلال نے ان کو اس بات پر لا ڈالا کہ میں نے اس مثنوی کو ابتدا میں تسنیم کی تصنیف اور فحوائے سخن اور [illegible] اساتذہ کی روایتوں کی بنا پر بعد کو وہ خیال ظاہر [illegible] کیا تھا صاحب [illegible] زیادہ تر آتش کا ہے" ان دونوں با[illegible]

صاحب عقل متضاد نہیں کہہ سکتا مگر مسٹر چکبست کے فلسفے میں ایسا ہی ہے۔ اُنہوں نے بہت زیادہ بحث اس امر میں کی ہے کہ مثنوی نسیم ہی کی ہے۔ اور سوا معمولی اصلاح کے آتش نے کوئی تصرف یا تغیر و تبدل نہیں کیا۔ اس میں زیادہ بحث کرنا میں نہیں پسند کرتا ورنہ مجھے اس پر اصرار ہے کہ مثنوی کا کل حصہ یا کوئی جز آتش کا ہے۔ یہ ایک اخبار و روایت کی بحث ہے۔ اور عام قاعدہ ہے کہ جو جس کو زیادہ معتبر و مستند خیال کرتا ہے اُسکی روایت کو مان لیا کرتا ہے۔ لیکن چکبست اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ لکھنؤ کے تمام پرانے شعرا کا (عام اس سے کہ وہ زندہ ہوں یا رہ نوردِ آخرت ہو چکے ہوں) یہی خیال ہے کہ یہ مثنوی آتش نے کہہ کے نسیم کو دیدی تھی۔ میں نے اُن سب لوگوں کے خلاف اگر یہ رائے قائم کی کہ مثنوی کہی خود نسیم نے اور اُسے ایک قابل قدر مثنوی آتش نے بنایا تو نسیم کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ لیکن اگر یہ رائے بھی مسٹر چکبست کے خلاف ہے تو میں اُسکے واپس لینے کو تیار ہوں۔ کیونکہ ایسے اختلاف و نزاع سے نہ کوئی نتیجہ وہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ میں پیدا کر سکتا ہوں۔ ایک گذرے ہوئے واقعے کی تصدیق و تکذیب صرف روایتوں سے ہو سکتی۔ اور روایتوں کو ماننا اور نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے۔ اگرچہ عام شعرائے لکھنؤ کے دل سے مسٹر چکبست اس یقین کو نہ محو کر سکینگے کہ مثنوی گلزار نسیم صرف نام کے لئے نسیم کی ہے اور یہ یقین اگر دور بھی ہو گا تو ان اعتراضوں ہی سے۔ کیونکہ سب کو ماننا پڑے گا کہ اگر آتش کی ہوتی تو اس میں اتنی غلطیاں نہ ہوتیں۔

مسٹر چکبست کا یہ خیال بھی عجب مزے کا ہے کہ گلزار نسیم میں بارہ یا تیرہ فیصدی سے زیادہ اشعار قابل اعتراض نہ نکلیں پھر پوچھتے ہیں "تو کیا کسی اُردو شاعر کے کلام میں بارہ فیصدی یا تیرہ فیصدی شعر بھی قابل اعتراض نہ نکلیں گے؟" اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے مہربان کے نزدیک اشعار میں بارہ فیصدی غلطیاں نکلنا اتنی عام بات ہے کہ کسی اُستاد کے کلام میں بھی اس سے کم غلطیاں نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سا اُردو کا شاعر ہے جسکے کلام میں اتنی غلطیاں نکل سکتی ہیں۔ بہتر ہو کہ ہمارے دوست کسی اوستاد کے دیوان کی تنقید شروع کر دیں۔ جن لوگوں کے ایک ایک لفظ سے سند لی جاتی ہے

اُن کی نسبت یہ خیال کرنا کہ اُن کے بارہ یا تیرہ فیصدی اشعار غلط ہیں شعرا ور کنار اُردو شاعری پر بھی بہت بڑا احسان ہے - اور اسکے ثبوت میں اس واقعے کو پیش کرنا کہ "میر حسن کی مثنوی کی نسبت ایک بزرگ کا قول ہے کہ مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں - بھلا اسے شعر کیونکر کہئے" اصل دعوے سے زیادہ حیرت انگیز ہے - جن بزرگ نے یہ اعتراض کیا انہوں نے اعتراض نہیں کیا بلکہ میر حسن کو اتنی بڑی داد دی جس سے بڑی داد ہو ہی نہیں سکتی - تو کیا وہ ایسی ہی غلطیاں ہیں جن کا آپ ہر شاعر کے کلام میں فیصدی بارہ یا تیرہ کے حساب سے اندازہ کرتے ہیں ؟ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ نسیم کی غلطیاں ایسی نہیں - وہ تو بہت ہی فاش اور بدنما بلکہ کلام کو مٹا دینے والی غلطیاں ہیں -
کمال یہ ہے کہ غلطیوں کے اس ایورج کو یقینی خیال کرکے ہمارے دوست فرماتے ہیں "گلزار نسیم کی شہرت کا بہت بڑا راز یہ بھی ہے کہ اسمیں محاسن کے مقابلے میں معائب بہت ہی کم ہیں یا برابر نہ ہونے کے ہیں - اور اُردو زبان میں بہت کم نظمیں ہیں جو اس صورت میں اسکا مقابلہ کرسکتی ہیں" جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو شعرا کا سارا کلام گلزار نسیم پر قربان کر دیا گیا -

اپنے تمہیدی مطالب کے خاتمے پر مسٹر چکبست نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "چونکہ پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے اسلئے اُن کی زبان بعض لوگوں کے نزدیک مستند نہیں ہے گو کہ شرر نے کسی مصلحت سے اس خیال کو جلباب خفا میں رکھا ہے مگر آپکے اعلان کے پردے میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے" - مجھے اپنے دوست کی اس بدگمانی سے جسقدر تکلیف ہوئی اور کسی چیز سے نہیں ہوئی - میرا خیال نہ کبھی تھا اور نہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان مستند نہیں ہو سکتی - لکھنؤ میں اُردو ہندی کے جوش کے زمانے میں جب مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا تو اُسمیں میں نے ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ "اُردو زبان کو جو نسبت مسلمانوں سے ہے وہی ہندوؤں سے ہے - اُس موقع پر اپنی تقریر میں میں نے یہ خیال بھی ظاہر کر دیا تھا کہ جیسے حقوق اُردو زبان پر مسلمان مصنفین نے پیدا کئے ہیں قریب قریب ویسے ہی ہندو مصنفین نے بھی پیدا کر لئے ہیں" - اور

بھی کبھی میرے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جس سے یہ خیال قائم کیا جائے کہ ہندوؤں کو زبان کے لحاظ سے مسلمانوں کے ہم پلہ ہونیکے قابل نہیں خیال کرتا۔ مگر باوجود اسکے محض بدگمانی سے مجھپر ایسا الزام لگانا اتنی بڑی تنگ خیالی ہے کہ میں اُسے نہایت ہی ذلیل سمجھتا ہوں۔ ہمارے ملک میں سب سی بڑی شامت یہی ہے کہ لوگ ہر معاملے کو کھینچ تان کر قومی مسئلہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے غرض تو صرف اتنی ہوتی ہے کہ اپنی حمایت کے لئے پوری قوم میں جوش پیدا کردیں مگر ملک اور قوم کو ایسی بیجا کارروائیوں سے جو نقصان پہونچ جاتا ہے اُس کا اندازہ یہ لوگ اپنی کوتاہ نظری سے کر نہیں سکتے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کسی لٹریچر کی یا نظم کی کتاب پر ریویو کرنے کو ہندو مسلمانوں کے قومی تعلقات سے کیا علاقہ؟ کیا یہ کوئی نئی بات ہے؟ اودھ پنچ نے مدت ہائے دراز تک پنڈت رتن ناتھ در پر بُری طرح سے نکتہ چینی کی تو وہ کوئی قومی تعصب تھا؟ اور کیا ہمارے دوست مولوی حالی کی نسبت جو سخت سُست الفاظ کہے گئے ہیں تو اسپر کوئی مسلمان شخص دعوے کر سکتا ہے کہ چکبست نے مذہبی تعصب کیا ہے؟ کیا کبھی کسی ہندو ریویو نگار نے ہندو مصنف کی اور مسلمان ریویو لکھنے والے نے مسلمان مصنف کی مخالفت نہیں کی؟ پھر ایسی صورت میں یہ کس قدر تنگ حوصلگی کی بات ہے کہ ایک لٹریری جھگڑے کو قومی اور مذہبی جھگڑا بنا کے ملک میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کیجائے۔

خیر اب میں ان امور کو چھوڑ کے اعتراضات کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

(۱) صاد آنکھوں کی دیکھکر پر کی بینائی کے چہرے پر نظر کی

اعتراض تھا کہ "بینائی کے چہرے پر نظر کرنے" سے کیا مراد ہے؟ مسٹر چکبست جواب دیتے ہیں کہ "اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا۔ تو اصطلاحاً یہ کہا جاتا تھا۔ کہ اُسکے چہرے پر نظر کر دی گئی"۔ مگر یہ غلط ہے۔ کاٹ دینے کے محل پر سوا نظری کر نیکے "نظر کرنا" اُردو زبان میں نہ کبھی بولا جاتا تھا نہ بولا جاتا ہے اور نہ اسکا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکا۔ کمال یہ ہے کہ جتنے اشعار ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں اُن سب میں بھی کاٹ دینے اور منسوخ کر دینے کے محل پر "نظری" ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے

واقعی یہ قابل داد ہے کہ "نظر کرنے" کے ثبوت میں خواجہ وزیر کا مصرع

"ہو جائے نظر ثانی میں اُسکی نظری آنکھ"

اور آتش کا مصرع "اکثر ہے چہرۂ نظری صاد ہوگیا" پیش کئے گئے ہیں۔ مگر ہاں ایک ثبوت ہے جو ناظرین اُردوی معلے کو غالباً بہت باوقعت معلوم ہوا ہوگا۔ وہ یہ کہ غیاث اللغات میں لکھا ہے۔ "نظری۔ انچہ بداں نظر کنند و منظور نظر بود۔ لفظ نظر برائے بطلان باشد۔ ایں اصطلاح اہل وفراست"۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ امر قابل لحاظ ہے کہ غیاث اللغات کا سب سے پرانا ایڈیشن علی بخش کے مطبع کا چھپا ہوا ہمارے پاس موجود ہے جو ۱۲۷۱ھ میں یعنی آج سے ۵۲ سال پیشتر اور تصنیف سے صرف ۳۰ سال بعد چھپا تھا اُسمیں "نظری" کے تحت میں ان الفاظ میں سے ایک لفظ بھی نہیں موجود ہے۔ اُسمیں جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اُسقدر ہے کہ "بفتحتین وآں قسم اول است از ہر دو قسم حکمت۔ و حکمت نظری را حکمت علمی نیز گویند وآں تصور حقائق موجودات باشد و قسم دوم حکمت عملی است۔ و اقسام نظری بسیار است چنانچہ علم ہیأت و علم مناظر و مرایا و تشریح۔ علم معاون و نباتات وغیرہ" بس اسکے سوا ایک حرف بھی نظری کے معنوں میں نہیں لکھا ہے۔ مزید احتیاط کے لئے ہمنے فخر المطابع کا چھپا ہوا ایک جدید نسخہ بھی منگایا مگر اسمیں بھی یہی الفاظ ملے جو اوپر نقل کئے گئے۔ اور ہمارے دوست کا بنایا ہوا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ لہذا میں قطعی رائے قائم کر سکتا ہوں کہ اب اگر کسی اور نسخے میں یہ الفاظ نکل بھی آئیں تو قابل استناد نہیں ہیں مگر میرے نزدیک اسکی ضرورت بھی نہیں ہے کہ مسٹر چکبست نے جن مصنوعی الفاظ کو غیاث سے نقل کیا ہو وہ غلط کہے جائیں۔ کیونکہ وہ چاہے کسی اور نے لکھدیے ہوں مگر اُن سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہی کہ نظری کا لفظ بطلان کے معنے دیتا ہے۔ ورنہ ضرور تھا کہ خود لفظ "نظر" کے تحت میں یہ معنے بتائے جاتے نہ "نظری" کے تحت میں۔

(۲) سپیرے سے بھگا دیا دکھا سانپ

اعتراض تھا کہ "یہ دکھا سانپ" کیا؟ جواب یہ ملا ہے کہ یہ الفاظ اصل نثر قصے

میں موجود تھے نسیم نے جو لکھا دیکھا بے سوچے سمجھے نظم کر دیا - اعتراض ہی تو اوس غریب پر جسنے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا" جن ہاتھوں سے گلزار نسیم کے اس ایڈیشن کے غریب کاتب پر مظالم ہوئے تھے - اُنہیں ہاتھوں سے اب قصے کے اصلی مصنف پر بھی ظلم شروع ہو گیا - مگر ایسی بے بنیاد باتوں سے کہیں کام چل سکتا ہے نسیم کی حمایت میں چند روز کے لئے پبلک کو دھوکا دیدیا گیا - اور اس کا خیال نہ کیا کہ کوئی اصل قصہ دیکھے گا تو کیا کہے گا! میں نے اسی ضرورت سے اصل قصہ "مذہب عشق معروف بہ گل بکاولی" کو منگوا کے دیکھا - اُس میں اس مہمل وبے معنے "ڈکھا سانپ" کا کہیں پتہ بھی نہیں - ناظرین کے اطمینان کے لئے میں اس کی اصل عبارت نقل کئے دیتا ہوں -

"بڑھیا بولی کہ اُس نے (بیسوا نے) ایک بلی اور چوہے کو پرورش کرکے یہ سکھایا ہے کہ بلی کے سر پر چراغ رکھے تو وہ لئے رہے اور چوہا چراغ کے لئے بیٹھا رہے جب اُس کے خاطر خواہ پانسا نہ پڑے تب بلی چراغ کو ہلا ہلا کر نرد ون پر سایہ کرے اور چوہا پانسے حسب دلخواہ الٹ دے - پس جو کوئی اُس سے کھیلنے کو آتا ہے وہ بچارا بازی ہار جاتا ہے اور یہ بلی چوہے کی مدد سے بازی جیت لیتی ہے - لیکن کسی کھلاڑی پر یہ بھید آج تک نہیں کھلا - اور جو کوئی اس ارادے پر آیا اُس نے داغ ندامت کا اپنی پیشانی پر کھایا - تاج الملوک جب یہ دریافت کر چکا بازار میں گیا اور نیولے کا بچہ مول لیکر اُسے آستین میں رکھکر یہ سکھانے لگا کہ جو ہیں وہ چٹکی کی آواز پائے - بس بچہ پلنگ کی طرح آستین سے کود کر باہر آئے" بھلا اسمیں کہیں بھی سانپ کا نام آیا ہے؟ اب میں پوچھتا ہوں - بے دیکھے بھالے محض اُس حسن عقیدت کی بنیاد پر جو نسیم سے ہے غریب نثر قصہ نویس کو تہمت لگانا اور مجھے بے نتیجہ زحمت دینا کونسی خوبی کی بات تھی؟ کیا جواب اسی کا نام ہے؟

(۳) سُنکے قیدی کے زار نالے زنجیر کے پیچ سے نکالے

اسمیں اصلی اعتراض "زار نالے" پر تھا - جسکی نسبت ہمارے ہی خیال کے

مطابق جواب میں تسلیم کیا گیا کہ "زارنالے" غلط چھپ گیا۔ اصل میں "زارنالی" ہے میں نے ذیلی طور پر "زارنالی" کو بھی غلط کہا تھا۔ اب جواب میں دو مثالیں پیش کی گئیں تو میں مانے لیتا ہوں کہ "زارنالی" جائز ہے گو غیر فصیح اب بھی خیال کرتا ہوں۔

(۴) یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

اعتراض تھا کہ "ایک دم کی سانس نہ ہونا کیا؟" جواب دیا گیا کہ "دم" کے معنے لمحے یا لحظے کے ہیں۔ اور مطلب یہ کہ "ایک لمحے کی سانس نہیں باقی ہے"۔ خیر تو اب میں پوچھتا ہوں کہ "ایک لمحے کی سانس نہ باقی ہونیکے کیا معنے؟" اس جواب میں یہ خاص صنعت رکھی گئی ہے کہ جیسا مہمل اصل شعر تھا ویسے ہی مہمل معنے بھی بتائے گئے۔ اصل یہ ہے کہ نسیم نے یہاں "سانس" کا لفظ "فرصت" کے محل پر استعمال کیا ہے یعنی "یہاں ایک دم کی فرصت نہیں ہے" ثبوت چاہیے تھا واسبات کا کہ "سانس" کا لفظ فرصت کے معنوں میں بھی کبھی مستعمل ہوا ہے یا نہیں؟ اسکا ثبوت تو ہاتھ نہ آیا بیکار اپنی اور پرائی تضیع اوقات کے لئے کہنے لگے کہ "دم" کے معنے لمحے کے بھی آسکتے ہیں۔ ہاں صاحب آتے ہیں مگر اس سے نسیم کا مصرع کیونکر درست ہوگیا؟

(۵) پوچھا کہ نگین جو لے کہاں سے

اعتراض تھا کہ جب تک یہ کا لفظ نہ بڑھایا جائے اور یوں نہ کہا جائے کہ "یہ نگین لے تو کہاں سے"؟ مطلب نہیں نکل سکتا۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے بکاولی فرخ کے بھیس میں تھی اور اسلئے یہ سوال جان بوجھ کے مبہم طریقے پر پیش کیا تھا کہ اُن میں سے کوئی میرا گلچین ہوگا تو جواب میں بول اُٹھے گا "بکاولی کا نگین لے" مگر میرا ذہن اسبات کی سمجھنے میں قاصر ہے کہ مطلق اتنا پوچھنے سے کہ "نگین کہاں ملسکتا ہے"، بکاولی کی انگوٹھی لانے والا کیوں خواہ مخواہ بول اُٹھتا کہ "نگین لینا ہو تو بکاولی کی انگوٹھی کا نگین لے"۔

(۶) ڑکنا ہوا اُس پری کا مشکل یہ دل لگی اب لگائے کی دل

اعتراض تو یہ ہے کہ "وہ اُس پری کا رُکنا مشکل ہوا" سے جو سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ ہی

کہ " وہ نہ رُک سکی یا نہ رُکی۔ بلکہ چلی گئی " مگر نسیم نے اس فقرے سے یہ معنے مراد لئے ہیں کہ " وہ رُکی اور اُس کے رُکنے سے دشواریاں پیش آئیں " جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ مشکل کے معنی غیر ممکن ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہیں کہ " بہ حیثیت مجموعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے " ہاں ہیں۔ مگر اُس محل پر یوں نہ کہیں گے کہ " رُکنا مشکل ہوا " بلکہ یوں کہیں گے کہ " رُکنے سے مشکلیں پیش آئیں " ان لغوی معنوں کے تانے سے کیا مطلب نکلا؟ یہاں تو کسی مستند شخص کے کلام سے اسباب کا ثبوت ملنا چاہئے کہ رُکنا مشکل ہوا " کے معنے بجائے " وہ نہ رک سکے " کے یہ لئے گئے ہوں کہ " رُکنے سے مشکلات پیدا ہوئے " اس کو تعقید کہنا اس شعر کی عزت بڑھا دینا ہے۔ نہیں یہ محاورے کا غلط استعمال اور زبان پر قابو نہ رکھنے کا ثبوت ہے۔

(۷) شادی کو کہا حیا اُٹھا کر

اعتراض ہے کہ " حیا اُٹھانا " محاورہ نہیں " پردۂ حیا " چاہئے۔ جواب میں دعوے کیا جاتا ہے کہ " نہیں محاورہ ہے " مگر خوب سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی متنازع فیہ محاورہ جب تک کسی مستند شخص کے کلام سے ثبوت نہ دیا جائے جائز نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ حیا اُٹھا دینا۔ حیا اُٹھ جانا۔ حیا ٹپکنا۔ حیا اُڑا دینا یہ سب محاورے ہیں اور اہل زبان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں مگر محض " حیا اُٹھانا " بمعنے بے حجاب ہونا نہ لکھنؤ کی زبان ہے نہ دہلی کی۔ اُٹھا دینا اور اُٹھانا میں فرق ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ جہاں اُٹھا دینا بولا جاتا ہو۔ وہاں اُٹھانا بھی بولا جائے۔ مسٹر چکبست نے بہار ہند کا حوالہ دیا ہے کہ اس میں لکھا ہے " حیا اُٹھانا بے حجابی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر اُس میں مرزا مچھو بیگ مرحوم نے بھی کوئی سند نہیں پیش کی۔ اور مرزا صاحب مرحوم اگرچہ لائق لوگوں میں تھے اور بہت اچھی زبان لکھتے تھے مگر بالذات کوئی سند نہیں ہیں۔ اور بغیر سند کے اُن کا دعویٰ قابل تسلیم نہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ نسیم کے اس مصرع ہی کے دھوکے میں اُنہوں نے حیا اُٹھانا بمعنی بے حجابی لکھ دیا ہو ورنہ یہ محاورہ نہ کسی کے کلام میں ہے اور نہ کسی کی زبان پر۔ ہمارے مہربان کو یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ

محاورہ محض سماعی چیز ہے اُس میں قیاس کو کچھ دخل نہیں "حیا ٹپکنا" پورا محاورہ ہے اُسپر "حیا اُٹھانے" کا قیاس نہیں چل سکتا۔

(۹) دختر جو لپند مہ لقا ہے

اعتراض تھا کہ ترکیب کی خرابی نے مطلب خبط کر دیا۔ کہنا یوں چاہیے تھا کہ "مہ لقا دختر جو لپند ہے" جواب کا ماحصل یہ ہے کہ یہ ایسی لغزش ہے جس سے کوئی شاعر نہیں بچا۔ لہذا نسیم بھی قابل معافی ہیں۔ یہ اسقدر کمزور جواب تھا کہ اردوے معلے کے ایڈیٹر صاحب سے بھی نہ رہا گیا۔ حاشیہ پر لکھ ہی دیا کہ "تعقید لفظی بہرصورت عیوب شاعری میں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ معنے میں شبہ پیدا ہوتا ہو جیسا کہ اس شعر میں ہے" ایڈیٹر صاحب نے اس کی حد بھی بتا دی کہ کہاں تک تعقید جائز رکھی گئی ہے اور کہاں سے ناجائز ہے۔ افسوس کہ اس تحدید ذوہ ساری نظریں بیکار کردیں جو بڑی محنت سے ڈھونڈھ کے نکالی گئی تھیں۔

(۱۰) بولی کہ چکھوں گا ہیں یہ انسان (۱)

(۱۱) بیڑے چکھے پان کے مزیدار (۲)

اعتراض تھا کہ "چکھّوں گا" کی جگہہ "چکھوں گا" غیر فصیح ہی نہیں غلط ہے۔ جواب دیا گیا ہے کہ "متروک محاورے کو غلط نہیں کہتے" مگر شاید مجیب صاحب کو خبر نہیں کہ متروکات کے مدارج ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ کوئی لفظ یا محاورہ عام طور پر چھوڑ دیا گیا مگر بعض لوگ کسی موقع پر مجبور ہو کے لکھ جاتے ہیں۔ اور ایک درجہ یہ ہے کہ وہ لفظ یا محاورہ مطلقاً چھوٹ گیا۔ اور کیسی ہی شاعرانہ مجبوری ہو کوئی نہیں استعمال کرتا۔ اول الذکر متروکات کا استعمال خلاف فصاحت ہوتا ہے اور آخر الذکر کا استعمال غلطی۔ کبھی "اس کا سا" "کے جگہ پر اوگ "دسری کا" بولا کرتے تھے مگر فی الحال یہ لفظ اُن متروکات میں ہے جن کی نسبت غلط کا لفظ استعمال کیا جائیگا۔ بہ خلاف اسکے "زور" کے لفظ کو بہت کے معنوں میں کبھی بولتے تھے۔ مگر ناسخ و آتش کے دور میں یہ متروک تو تھا لیکن متروک غلط نہیں بلکہ متروک غیر فصیح تھا۔ "چکھوں گا" بغیر تشدید کے

متاخرین میں کلیۃً متروک ہوگیا۔ نہ کسی کی زبان پر رہا اور نہ کسی کے کلام میں لہذا اس کا شمار متروکات غلط میں ہے۔

"پان کے بیڑے" کے متعلق میرا حضرت اسقدر اعتراض ہے کہ "محاورے میں اچھا نہیں" اور بے شک اچھا نہیں۔ ان یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ "ایسی شادی تھی کہ کسی کو پان کا بیڑا بھی نہ ملا" مگر باوجود اسکے یہ کہنا کہ "پان کے بیڑے رکھے" بُرا ہی۔ اسکو خواص لکھنؤ محلات۔ شاہزادوں۔ اور نیشاپوری خاندان والوں سے دریافت کیجئے۔ خود ہی معلوم معلوم ہوجائے گا۔ زبان نہایت ہی نازک چیز ہے۔ ایک لفظ ایک محل پر فصیح ہوتا ہی اور وہی دوسرے محل پر بھونڈا۔ اور یہی اعتراض نسیم پر ہے کہ اُن میں اس بات کی حس نہ تھی۔ جانؔ صاحب اور امیرؔ کے شعروں میں "پان کا بیڑا" بدنما نہیں۔ مگر نسیم کے مصرع میں بدنما ہی۔

(۲۱) "کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا" اور "وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی"
اور ایک تیسرا مصرع اب بڑھائے دیتا ہوں۔

"خورشید حمل ہوا نمودار"

اعتراض تھا کہ "حَمل" چاہئے۔ "حمَل" غلط ہے۔ جواب یہ ہے کہ شاعر الفاظ اُسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔" ثبوت میں تین شعر بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ایک واجد علی شاہ مرحوم کا مصرع "آثار حمل کے ہیں نمودار" دوسرا جان صاحب کا مصرع "دائی یقین دل کو ہے گر جائے گا حمل" تیسرا مرزا رفیع سودا کا مصرع "اسقاط حمل ہو تو کیں مرثیہ الیا" سودا کا ثبوت تو اس لئے قابل لحاظ نہیں کہ اُن کے زمانے میں یہ اور ایسے ہی صدہا تصرفات جائز تھے جواب قطعاً ناجائز خیال کئے جاتے ہیں۔ باقی رہے۔ جانِ عالم اور جان صاحب کے مصرعے۔ اُن کے متعلق مجھے ضرورت معلوم ہوتی ہی کہ ایک خاص اصول مسٹر چکبست کے ذہن نشین کر دیا جائے۔ شاعری اور چیز ہے اور اہل زبان ہونا اور چیز۔ اہل زبان ہونا اسبات کے لئے کافی ہے کہ انسان لفظ کو اُسی لب و

لہجہ سے ادا کرے گا اور انھیں محاوروں کو استعمال میں لائے گا جو اُس زبان میں فصیح ہیں۔ مگر شاعری اسبات کی تعلیم دیتی ہے کہ اُن مستعملہ الفاظ و محاورات پر کون سا تصرف جائز ہے اور کون نہیں جائز ہے۔ لغت پر اہل زبان کا کون تصرف مان لیا گیا ہے اور کون نہیں مانا گیا۔ محاورہ جن الفاظ میں لغت کے مخالف ہو گیا ہے اُنہیں سے کس میں پابندی محاورہ کی جائے گی اور کس میں پابندی لغت لازمی ہے۔ محض اہل زبان نہ شاعر ہوتا ہے اور نہ شاعری میں حجت ہوتا ہے اسکی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ موزوں کرنے کے لئے اکثر اوقات الفاظ و محاورات میں تقلیب و تصرف کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے کسی مسلم الثبوت شاعر کی شاگردی کرنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسے موقعوں پر کس قسم کا تصرف صحیح ہے اور کس قسم کا غلط۔ عام اہل زبان تخت کو تخَت اور فتح کو فتَح کہتے ہیں۔ وہ اگر کسی کے شاگرد نہیں ہوتے ہیں تو یقیناً تخت اور فتح موزوں کر جائیں گے۔ اور اس کو سارا زمانہ غلط کہے گا۔

اس اصول کے مطابق واجد علی شاہ کی زبان کوثر کی دھوئی ہوئی سہی مگر شاعری میں حجت نہیں۔ وہ اپنا کلام نہ کسیکو دکھاتے تھے۔ اور نہ کبھی کسی کو اُن کے کلام میں ایک لفظ کے بدلنے کی بھی جرأت ہوئی۔ اُن کا کلام ظفر کا کلام نہیں ہے کہ ذوق کی جانب منسوب کر کے معتبر سمجھا جاے۔ اسی وجہ سے واجد علی شاہ کا کلام صدہا قسم کی شاعرانہ غلطیوں سے مملو ہی۔ رہی جان صاحب اوّل تو بعض لوگوں نے یہی شبہ پیدا کر دیا ہے کہ اُن کا یہ مصرع یونہیں ہی جیسا کہ مجیب صاحب فرماتے ہیں یا یوں ہے کہ "در دائی یقین دل کو ہی گر جائے گا یہ محل" قافیئے میں ہے نہیں کہ حجت قطعی ہو سکے اور اگر مان بھی لیا جائے تو جان صاحب کی نظیر سوا ریختی کہنے والوں کے اور لوگوں کے لئے حجت نہیں ہو سکتی۔ وہ عام لوگوں سے قطع نظر کر کے عورتوں کی زبان کو انہیں کی وضع اور انہیں کے لہجے میں ادا کرنیکی کوشش کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے اوپر یہ قید لازمی کر لی تھی کہ فارسی اضافت کلام میں نہ آنے پائے۔ کیونکہ عورتوں کی بول چال میں کم ہے۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے کسی غلط لفظ کو اپنے لئے جائز کر لیا تو اور کے لئے حجت نہیں ہی علی الخصوص

نسیم کے مصرع "خورشید حل ہوا نمودار" کی سند میں۔ کیونکہ جان صاحب کی زبان میں حمل جائز بھی ہے تو وہ فارسی نہیں محض اُردو ہے۔ جس کی طرف فارسی اضافت کرنا اس غلط لفظ کے استعمال سے بھی زیادہ فاش غلطی ہے۔ بیشک سوداکے مصرع میں اضافت کے ساتھ حمل کا لفظ ہے۔ مگر اُن کے وقت میں اس قسم کے تصرفات جائز تھے کہ متحرک لفظ ساکن اور ساکن متحرک کردیا جائے۔ اور نیز اس قسم کی اضافتیں معیوب نہیں خیال کیجاتی تھیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایسے تصرفات کے جواز کے ثبوت میں سے چکبست کلمے کے لفظ کو پیش لیتے ہیں کہ کلمہ ہے مگر اُردو میں کلمہ بسکون لام موزوں کرنا جائز کر لیا گیا۔ ہمارے دوست کو خبر نہیں کہ کلمہ عربی میں بھی بسکون جائز ہے۔ صراح میں ملاحظہ ہو لکھا ہے "کلمہ بالفتح والکسر سکون ۲ کذلک۔ ثلث لغات مثال کبد وکبد وکبد" یہ آپ کی غلطی ہے جو اسکو اُردو شاعروں کا تصرف بتاتے ہیں۔ خود عربی میں کلمہ بہ سکون لام جائز ہے۔

(۴۴) بادل سا وہ بحر آسماں جوش ۔۔۔ بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش

اعتراض تھا کہ لہر بہ ہائے متحرک نہیں بلکہ بہ ہائے ساکن ہے۔ اسکا جواب بھی یہی ملا ہے کہ چونکہ اکثر لوگ لہر حرکت کے ساتھ بولا کرتے ہیں لہذا نسیم نے اُسی طرح موزوں بھی کردیا۔ ثبوت میں ایک شعر تو میر کا پیش کیا گیا ہے جن کے وقت کی زبان بھی ناسخ و آتش کے عہد میں بدل چکی تھی اور اصول شاعری بھی متغیر ہو گئے تھے۔ لہذا اُن کے کسی تصرف کو نسیم کی شاعری کے لئے حجت قرار دینا بالکل بے سود ہے۔ ہاں دوسرا شعر اگر صحیح ہوتا تو البتہ قابل استناد تھا یعنی نواب مرزا شوق لکھنوی کا شعر

میر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی ۔۔۔ بو سونگھا دو تم اپنے بالوں کی

مگر مجھے یہ کہتی شرم آتی ہے کہ زہر عشق کے تقریبًا تمام صحیح اڈیشنوں میں یہ مصرع یوں چھپا ہوا ہے ع "لہر پر چڑھ رہی ہے کالوں کی" بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ زہر عشق کے غلط سے غلط اڈیشن میں بھی مجھے یہ مصرع یونہیں نظر آیا۔ خدا جانے ہمارے دوست کو کوئی ایسا نسخہ ملا بھی ہے جس میں "لہر پھر" کے بدلے "پھر لہر" چھپا ہوا

ہو یا محض نسیم کی غلطی درست کرنیکے لئے یہ اصلاح دے لی گئی ہے - مگر ایسا انوکھا طریقہ استدلال اس سے پیشتر شاید کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ کسی اُستاد کے کلام میں اپنی ضرورت کے موافق تصرف کر کے اُسے غلط بنایا اور پھر اُسے سند کی طور پر پیش کر دیا - اور لطف یہ کہ نواب مرزا شوق نے ایک اور جگہ بھی لہر کا لفظ بہ سکون ہا نظم کیا ہے کہتے ہیں ع - "رُخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی" - کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ نسیم کی غلطیاں درست کرنیکے لئے دیگر مستند اساتذہ کے اشعار غارت کئے جاتے ہیں - حالانکہ اگر یہ کارروائی چل بھی جائے تو سوا اس کے کہ دیگر اُستادوں کے اشعار غلط ہو جائیں نسیم کو کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا -

(۴۱) جاگی تو سب اُسکے جوڑ کی تھیں — اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں

اعتراض یہ تھا کہ "پری تھیں" غلط ہے "پریاں تھیں" چاہئے - جواب یہ دیا گیا ہے کہ کہ نسیم کے وقت میں یہ جائز تھا اور ثبوت میں تین شعر پیش کئے گئے ہیں دو آتش کے -

(۱) کیا کیا پری اُتار رہی ہیں شیشے میں آہ نے + جن کون ہے جو نالے سے اپنی نہیں جلا

(۲) کس کس پہ چار ابرو کے نظارے نے دم پھڑکا دیا + درمیان پاتا ہوں دلکو چار سو تلوار کے

اور ایک شعر ناسخ کا -

۵ شراب کیوں نہ چلے فصل گل میں اے زاہد + کہ نہر جاری ہوئیں موسم بہار آیا

اسکے متعلق پہلے تو میں مسٹر چکبست کی تلاش کی داد دیتا ہوں کہ نسیم کی سی غلطیاں ناسخ و آتش کے کلام میں بھی دکھلا دیں - مگر بقول ایڈیٹر صاحب ریاض الاخبار غلطی غلطی ہی - کسی کے غلط کہہ دینے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ غلط لفظ صحیح ہو جائے - اور اسوجہ سے ایڈیٹر صاحب اُردوے معلی نے بھی اس جواب کو کمزور خیال کر کے حاشیے پر لکھدیا کہ "سند صحیح نہیں ہے کیونکہ آتش کے پہلے شعر میں پری مذکر ہے - اور اسلئے اُتارے بیائے مجہول لکھا گیا ہے لفظ پری محبوب حسین کے معنوں میں مذکر بھی آتا ہے - باقی دو شعروں کی سند بھی کمزور ہے" اصل میں یہ اعتراض محاورے اور لغت کا نہیں بلکہ قواعد زبان یا نحو و صرف کا ہے - اور نحو میں غلطیاں چاہے کتنے بڑے سے بڑے شخص سے ہو جائیں غلطیاں ہی رہتی ہیں - میرا خیال یہ ہے

کہ آتش و ناسخ درکنار میرؔ و سوداؔ کے زمانے میں بھی جب کہ اکثر الفاظ غلط استعمال ہوجاتے
اور صحیح سمجھ لئے جاتے تھے ایسی غلطیاں معیوب اور لغزش ہی تصور کی جاتی تھیں۔ ناسخ
و آتش کے کلام میں ایسی نحوی غلطیوں کا ہونا بالکل بعید از قیاس ہے۔ ہمارے مطابع
میں اکثر غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اور اسی اندیشے سے سند وہی قاطع و مسکت سمجھی جاتی
ہے جو ردیف و قافیہ میں ہو کیونکہ اسمیں مطبع کی غلطی کا احتمال بہت کم ہوتا ہے۔ مجھے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش کا پہلا شعر اگر اڈیٹر صاحب اُردوئے معلٰی کا جواب صحیح نہ مانا جائے
تو مطبع کی خرابیوں سے غلط ہو گیا ہے اُس میں مصرع اول بجائے "کیا کیا پری اُتاری
ہیں شیشے میں آہ نے" کے "کیا کیا پری اُتاری ہے شیشے میں آہ نے" ہے۔
چھاپنے والوں نے "ہے" کو "ہیں" بنا دیا۔ لفظ "پری" اُس میں اسم جنس ہے۔ جو
کثرت پر دلالت کرتا ہے بغیر اسکے کہ جمع بنائی جائے، بولتے ہیں "ہزارہا آدمی تھا"
اور "گیہوں پٹا پڑا تھا"۔ آتش کا دوسرا شعر بالکل صحیح ہے۔ اسمیں تلوار کا لفظ اسم جنس کی حیثیت
سے مستعمل ہوا ہے۔ مسٹر چکبست نے اُسے زبردستی پیش کر دیا۔ "درمیاں پاتا ہوں دل کو چار
سو تلوار کو" اسکا یہ مطلب نہیں جو ہمارے کرم فرمانے بیان کیا کہ "چاروں طرف تلواروں کو
پاتا ہوں" بلکہ یہ مطلب ہے کہ "چاروں طرف تلوار ہی تلوار نظر آتی ہے"۔ ناسخ کے شعر کو بھی
میرے نزدیک مطبع نے غارت کیا ہے اُس کے دوسرے مصرع کو بجائے "کہ نہر
جاری ہوئیں موسم بہار آیا" "کہ نہریں جاری ہوئیں موسم بہار آیا" پڑھنا چاہیے۔ اس جواب
کو گلزار نسیم کے حامی شاید نہ مانیں۔ مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آتش و ناسخ کے کلام
میں اگر اتنی ہی غلطیاں نکلتیں جتنی کہ نسیم کے کلام میں نکلی ہیں تو میں صاف کہہ دیتا کہ جہاں
اُن سے اور بہت سی غلطیاں ہوگئیں وہاں ایک یہ بھی سہی لیکن جبکہ اُن کے ضخیم دیوانوں
میں صرف یہی دو یا ایسی اور دو ایک غلطیاں نظر آتی ہیں تو عقل نہیں قبول کرتی کہ ایسی
نحوی غلطیاں جو بچوں سے بھی نہ ہوتیں اُن سے ہو گئیں۔ حقیقت میں یہ مطبع ہی کی
غلطیاں ہیں اور ہو سکتی ہیں تو صرف نسیم کے ایسے شاعر سے۔

(۱۵) خوش لہجہ بہت بکاولی تھی — گانی اور ناچتی بڑی تھی

پہلے مصرع پر اعتراض تہا کہ "خوش گلو کی جگہ غلطی سے خوش لہجہ استعمال کیا گیا" جواب دیا گیا ہی کہ "خوش لہجہ خوش گلو اور خوش آواز کے معنوں میں برابر استعمال ہوتا ہی۔ اور اسکا ثبوت کتنا معقول پیش کیا گیا ہے! حافظ شیرازی کہتے ہیں۔

دلم از پردہ بشد حافظ خوش لہجہ کجا است   تا بقول و غزلش ساز و نوائی بکنیم

اور دوسرا اردو شعر جو خدا جانے کس کا ہی۔

گل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر   تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کی باعث

یہ دونو نظیریں بیکار ہیں۔ حافظ کا شعر قطع نظر اسکے کہ فارسی ہی اور اردو میں حجت نہیں ہوسکتا اسبات کو ثابت ہی نہیں کرتا کہ اسمیں "خوش لہجہ" کے معنے "خوش گلو" کے لئے گئے ہیں "لہجہ" عربی لفظ ہے۔ جس کے معنے زبان کے ہیں۔ صراح میں لکھا ہی لہجہ بالتحریک والتسکین (یعنی لہَجہ بہی اور لہْجہ بہی) زبان۔ یقال فلاں فصیح اللہجۃ" لہذا خوش گو۔ خوش بیان یا الفاظ کو اچہی طرح ادا کرنے والے شخص کو خوش لہجہ کہیں گے۔ انہیں معنوں میں حافظ شیراز کے اس شعر میں بہی یہ لفظ مستعمل ہوا ہے۔ شعر کا مطلب صرف اتنا ہی کہ وہ حافظ خوش گو بلاؤ کہ تاکہ میں اُس کی غزلوں کو گاؤں" خوش گلوئی کی ضرورت اُس شخص کے لئے ہ جو گائے گا۔ حافظ تو صرف غزلیں کہہ دیتے تہے۔ لہذا اُنہیں خوش زبان فصیح البیان یا خوش گو ہونا چاہیے۔ اور انہیں اوصاف کے ظاہر کرنیکے لئے خوش لہجہ کا لفظ اس ش میں استعمال کیا گیا۔ اس سے یہ کیونکر نکل آیا کہ حافظ شعر گوئی کے ساتہہ خوش گلو بہی ت زیادہ سے زیادہ یہ ہی کہ کسی کی آواز باتیں کرنے میں اچہی اور شیریں ہو تو اُسے بہی "خو کہہ دینگے۔ مگر خوش گلو کے محل پر خوش لہجہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

رہا اُردو کا دوسرا شعر وہ اگرچہ قابل اعتنا ہی نہیں کیونکہ نہیں معلوم کس کا شعر ہی مگر ا بہی کچہہ ضرور نہیں کہ خوش لہجہ کے معنے خوش گلوئی ہی کے لئے جائیں۔ بلبل خوش آواز بہی اور خوش گلو بہی۔ یعنی بولنے میں اُسکا لہجہ بہی شیریں ہے۔ اور اُس کی باتیں بہی دلکش لہذا بلبل کو اس شعر میں خوش لہجہ بلحاظ اسکی خوش آوازی کے کہا ہے نہ بہ لحاظ اُسکی خوش گلوئی کے۔

نسیم کے اسی شعر کے دوسرے مصرع "گانی اور ناچنی بڑی تھی"
پر اعتراض کیا گیا تھا کہ "گائن کی جگہ گانی اور ناچنے والی کی جگہ ناچنی غلط ہے" اس کے جواب میں بھی یہی دعواے بلا دلیل ہے کہ نسیم کے زمانے میں یہ الفاظ ان معنوں میں مستعمل تھے۔ اور ثبوت میں میر انیس مرحوم کا یہ مصرع پیش کیا گیا ہے کہ "ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی" میر انیس کے کلام سے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں، وہ اسی طرح آج بھی جائز و فصیح ہیں۔ اور اہل زبان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں مگر اسی شرط کیساتھ کہ دونوں لفظ "آنی جانی" ایک ساتھ آئیں۔ اس وزن کے اسم فاعل محض سماعی اور خلاف قیاس ہیں۔ انکو دیکھ کے قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا کہ جتنے افعال اس وزن کے ملیں انکا "آنی" اور "جانی" تک کے اسم فاعل بنا لیا جائے۔ "پانا" "کھانا" "لانا" "نہانا" "سنانا" "ستانا" اسی قسم کے فعل ہیں لیکن اگر کوئی شخص نسیم کیطرح ان مذکورہ افعال کے اسم فاعل "پانی" "کھانی" "نہانی" "سنانی" "ستانی" بنا دے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ جاہل ہی نہیں سمجھا جائیگا بلکہ اس قابل خیال کیا جائیگا کہ لکھنؤ سے نکال دیا جائے۔

(۱۶) نسیم کے تین مصرعوں "یونہی لب حوض سے نہ چنگل" "شہزادے پہ اُس نے مارِ چنگال"۔ "پیاری یہ ہیں حنائی چنگال" پر اعتراض کیا گیا تھا کہ "چنگل" اور "چنگال" کے الفاظ ہاتھ کے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں جو اُردو میں غلط ہے" باوجودیکہ اعتراض میں اُردو کی قید موجود ہے مگر جواب دیا جاتا ہے کہ "فارسی شعرا نے چنگال ہاتھ کے معنوں میں برابر استعمال کیا ہے" یہ کون کہتا ہے کہ فارسی میں چنگل و چنگال کے معنے ہاتھ کے نہیں ہیں۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ اُردو میں بھی ان الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کرنا صحیح ہے۔ مسٹر حکمت کا شاید یہ خیال ہے کہ جس لفظ کے جتنے معنے فارسی میں ہوں سب اُردو میں بھی لئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ ناواقفیت اور بہت بڑی غلطی ہے۔ اول تو کسی زبان کی کسی لفظ کے سب لغوی معنے ہی دوسری زبان میں مستعمل نہیں ہو سکتے۔ اور اگر بعض لغوی معنے مستعمل بھی ہو جائیں تو محاورہ اُسوقت تک ہرگز ترجمہ نہیں ہو سکتا جبتک کہ اُس دوسری زبان کے محاوروں میں داخل نہو جائے۔ ملا شہیدی نے فارسی میں "یا بجویں شفقت ترکردہ چنگال را" کہہ دیا تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ "حنائی چنگال" کہنا اُردو میں بھی جائز ہے۔ اگر نسیم کے کلام کو غلطیوں سے پاک کرنا مقصود ہے تو کسی اُردو شاعر کے کلام میں دکھایئے۔

(باقی مضمون اکتوبر کے رسالے میں درج کیا جائیگا)

عبدالحلیم شرر

بیاض حسرت

مصحفی

لاکھ راہیں بتائیے دل کو — صبر کیونکر سکھائیے دل کو

خواجہ احسن اللہ بیان دہلوی شاگرد مرزا مظہرؒ

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی — جس طرح کٹا روز گزر جائیگی شب بھی

غزل ملتمس شاگرد مصحفی کوڑا جہان آبادی

باوصف عقل تہمت دیوانگی رہی — اک عمر آشنائی سے بیگانگی رہی

نے گھر سے ہمکو کام رہا نے دیار سے — ابتک جنوں سے نسبت بیخانگی رہی

کیا حال ہے ترا دل نا آزمودہ کار — اب وہ نہ ہوش ہیں نہ وہ فرزانگی رہی

بھی ملتمس نے مفت دیا تمپہ واہ واہ — اتنی نہ تمکو غیرت جانانگی رہی

جرأت

مرنا ہی نظر آیا انجام گرفتاری — پیغام اجل لایا پیغام گرفتاری

کیوں دام میں گھبراتے صیاد کو گر پاتے — کیا چین سے کٹ جاتے ایام گرفتاری

واں شام لطافت ہے اور صبح صبا ہے — یاں صبح ندامت ہے اور شام گرفتاری

امیدی

کاش گردوں از سرم بیروں برد سودائی تو — یا مرا صبرے دہد چند انکہ استغنائی تو

قاضی احمد افکاری اشعرائی

تو بر فریب مرا ہیں چہ سادہ آمدہ ایم — کہ دل بوعدہ وصلت نہادہ آمدہ ایم

جدائی ساوجی

گیرم کہ تو بیازی گلگوں کند کسے — با آں دو لعل تو بہ شکن چوں کند کسے

سلطان ابراہیم مرزا جاہی

نہ پنداری کہ چشمش رسم عیاری نمیداند — نماید آنچناں خود را کہ پنداری نمیداند

فقط

شرر اور سرشار

گڑے مردے اکھاڑنا اچھا نہیں ہوتا - اور قومی فخر و ناز وہیں تک اچھا ہوتا ہی کہ انسان اپنی حد سے نہ گزر جائے - کوئی ایک سال ہوا ہوگا کہ "کشمیر درپن" اور "زمانہ" میں چکبست نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے حالات زندگی لکھ کے شائع کرائے تھی - جسمیں قومی جوش کا اسٹیم اسقدر زیادہ ہوا کہ انہیں سرور - حالی - اور شرر کے ایسے کاملانِ فن کے برابر لا کھڑا کیا - بلکہ اور اُن سے بڑھا دیا - خوش نصیب تھے مولوی محمد حسین صاحب آزاد جن کی عزت اس کشمیری قوم پرستی کے سیلاب میں بچ گئی - ورنہ اُس پیمبرِ نثر اُردو کے فقط ہم پلہ بنا کے چھوڑ دئے گئے جس کی شان میں غالباً غالب مرحوم فرما گئے - ؎

خامہ ہندوے پارسی دانش　　　ہندیاں سر بخطِ فرمانش

یہ مضمون مجھے اور میرے بعض لائق کرم فرماؤں کو ناگوار گزرا تھا - اور تعجب معلوم ہوا تھا کہ یہ لوگ کس قدر نافہمی میں مبتلا ہیں - ارادہ کیا کہ کچھ لکھوں مگر یہ خیال کر کے خاموشی اختیار کر لی کہ کشمیری پنڈتوں کو فخر و ناز کا ایک موقع ہاتھ آگیا ہی - اُسمیں خلل انداز نہ ہونا چاہئے - ہمارا کچھ نہ بگڑیگا اور وہ اپنے مقام پر خوش ہو جائیں گے - مگر برس بھر کے تجربے سی معلوم ہوا کہ ہماری خاموشی سے وہ برادری کو خوش کرنیوالا دعویٰ لاجواب سمجھ لیا گیا تھا - چنانچہ سی ۱۹۰۵ء کے کشمیر درپن میں ابوالاعجاز بیدل کے خلاف اُسی پہلی غلطی کی تائید از سرِ نو کی گئی ہی - لہذا اب میں مجبور ہوں اور ضرورت معلوم ہوتی ہی کہ تھوڑی توجہ کر کے بتا دوں کہ شرر اور سرشار میں اصلی فرق کیا ہی - اور اُردو انشا پردازی کے دربار میں دونوں کس جگہ پر ہیں

سے مجھے سرشار سے کوئی مخالفت نہیں - اُن کے ناولوں کو میں نے شوق سے پڑھا ہے اور بعض حیثیتوں سے اُن کی داد بھی دینے کو جی چاہتا ہے - مگر شرر کے مقابل میں اُنکا نام لینا ایسا ہی ہے جیسے کسی عالم اجل اور فاضل بے ہمتا کے مقابل میں کسی بے علم ذکی الطبع شخص کا نام لیا جائے - یہ سچ ہے کہ فسانہ آزاد سرشار نے پہلے لکھا - مگر گفتگو اسمیں ہے کہ فسانہ آزاد یا سرشار کے اور ناول جن میں نہ پلاٹ ہے نہ کوئی نتیجہ ہے - نہ جن کا کوئی مبحث ہے نہ اُن میں کوئی غرض رکھی گئی ہے، ناول کے لفظ سے یاد کئے جانے کے بھی قابل ہیں یا نہیں - اور اگر فضول و بے نتیجہ پریشان خیالی ہی کا نام ناول ہے تو پھر ایجاد و اختراع کا نام لینا ہی بے محل ہے - کیونکہ اُردو و فارسی میں جتنی کہانیاں اور داستانیں موجود ہیں اور جو سرشار سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھیں سب ناول ہیں - اسی بنا پر شیخ عبدالقادر صاحب اڈیٹر پنجاب آبزور نے اس امر میں تردد ظاہر کیا تھا کہ ناول کا موجد کسے بتائیں - مگر چکبست اصل بحث تو سمجھے نہیں مولنا شرر کا مصرع "تم نے نئی نکالی فسانے کی راہ واہ" اس ثبوت میں پیش کر دیا کہ شرر خود سرشار کو موجد تسلیم کرتے ہیں - اور اسکا بھی لحاظ نہ کیا کہ مولنا نے اس موقع پر "ناول کا موجد" نہیں کہا بلکہ سرشار کو "فسانے کی نئی راہ نکالنے والا" یعنی نیا فسانہ لکھنے والا بتایا - مولنا کا جو خط اس تاریخ کے ساتھ تھا اور جسے چکبست نے نقل کیا ہے اُسکا یہ فقرہ بھی قابل لحاظ تھا کہ "خیر خدا خدا کر کے ہماری بیچاری پُرانی عمدہ زبان کے ایک آپ تو معین نکلے" اس سے بھی روشن ہے کہ شرر نے سرشار کے کلام میں کسی جدت کو نہیں تسلیم کیا تھا - مگر چکبست انہیں اقراری مجرم بنانے کو تیار ہو گئے -

اب میں انشا پردازی کی حیثیت سے دونوں کا موازنہ کرتا ہوں - اردو نثر کے پرانے نمونے دو وضع کے تھے - ایک تو میر امّن دہلوی کا سادہ رنگ - اور دوسرا مرزا رجب علی بیگ سرور کا رنگ - پہلی سادی بول چال کی زبان تھی اور دوسری میں فارسی مذاق کی رنگینی تھی اور مسجع و مقفیٰ فقرے ہوا کرتے تھے - اس آخری دور میں نثر اردو کے جو مجدد پیدا ہوئے

وہ سر سید احمد خان - مولوی محمد حسین آزاد - مولانا نذیر احمد - اور مولانا محمد عبدالحلیم شرر ہیں - سر سید نے سادگی اور سہل پسندی کو جوہر سخن قرار دے کے وہ شان دکھا دی جو کبھی ایک محدود حیثیت سے مولانا شاہ اسمٰعیل کے قلم سے نظر آئی تھی - اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہر مضمون ایسے آسان و عام فہم الفاظ میں ادا کیا جائے کہ عامی سے عامی شخص اُسے سمجھ جائے آزاد کا رنگ یہ تھا کہ زبان میں بے تکلفی و روانی ہو - اور روانی کے ساتھ بے تکلف قافیے بھی ہوں - شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی ہوں مگر نہایت ہی سموئے ہوئے اور اعتدال کی حد کے اندر - مولوی نذیر احمد صاحب صرف روانی چاہتے ہیں - اور بے تکلفی میں اسقدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ زبان کو جب ٹھیٹ بنانا چاہتے ہیں تو بندش الفاظ پر کچھ اثر نہیں پڑتا بلکہ انگریزی اور عربی الفاظ اور اکثر اوقات جملے لا کے متانت و وزن پیدا کرتے ہیں - وہ سادگی کے شوق میں تشبیہ و استعارہ اور شاعرانہ رنگینی سے بالکل محترز رہتے ہیں - مولانا شرر نے ان سب بزرگوں سے علیحدہ ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پردازی کی خوبصورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا - اور پرانے ایشیائی تشبیہات و استعارات کے ساتھ نئی نازک تشبیہیں بھی بڑھائیں - اُنہوں نے واقعات و اشخاص کی تصویریں کھینچنے کے لئے انگریزی پنسل اور مُوقلم سے مدد لی - اور مشرق کے کاغذ پر مغربی جادو نگاری کا کمال دکھا دیا - اُنہوں نے خیالی مضامین کو لیا - اور انگریزی جادو نگاروں کی خیال آفرینیاں اُردو لٹریچر میں اس اعلیٰ لیاقت کے ساتھ داخل کیں کہ کسی کے مذاق میں غیر مانوس نہ تھیں اُردو میں یہ بالکل نیا رنگ تھا - انگریزی دانوں کو تو اپنے ملکی لٹریچر میں وہ چیز مل گئی جسے وہ بڑے ذوق و شوق سے ڈھونڈھ رہے تھے - رہے صرف اُردو داں انہیں ابتدا میں کسیقدر وحشت ہوئی مگر جب اس نئے رنگ عبارت کا مزہ ملنا شروع ہوا تو پھر وہ سب سے زیادہ اسی کے قدردان تھے اور اُن کے ذوق میں اس سے زیادہ بامزہ کوئی رنگ نہ تھا -

اب اس کے مقابل دیکھنا چاہئے کہ شرر نے اُردو میں کیا لیاقت دکھائی - انکی عبارت

کو غور سے دیکھئے تو صاف نظر آجاتا ہو کہ اُنھیں نئے اسکول سے کسی قسم کا مس نہ تہا۔ وہ صرف ایک پُرانے رنگ کے لکھنے والے تہے۔ اپنی کتاب کو اُنھوں نے فسانے کا ٹہیک لقب دیا تہا۔ اس لئے کہ وہ بجاے ناول ہونیکے ایک کہانی اور فسانہ عجائب کے رنگ کی کتاب تہی۔ اور اس قابل نہ تہی کہ اُردو میں کوئی نئی قسم کی چیز کہی جائے۔ سرشار کے تمام تصانیف میں دو طرح کی عبارت ہی۔ ایک تو وہ جہاں اُنھوں نے کسی دوسرے شخص کی زبان سے اُسکے الفاظ ادا کئے ہیں۔ اور دوسری وہ جہاں اُنھوں نے کسی حالت کیفیت یا واقعے کو اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں بتایا ہے۔ اول الذکر عبارت کو اُن کے ذاتی لٹریچر سے کوئی علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس میں اُنھوں نے صرف دوسروں کی نقالی کی ہی۔ اسمیں کمی یہ ہے کہ صرف تین کیرکٹر ہیں۔ ایک عورت کا۔ ایک مرد کا۔ ایک مسخرے کا۔ اُن کی عورت چاہے کسی قوم اور کسی ملک کی عورت ہو لکھنؤ کی مسلمان عورت ہی۔ علی ہذا القیاس اُن کا مرد چاہے کوئی اور کہیں کا ہو لکھنؤ کا ایک آوارہ مشرب اور بازاری بیفکرا ہے۔ اور مسخرا چاہے کوئی ہو لکھنؤ کا ایک افیونی ہے۔ عورت کی زبان میں ناز آفرینی اور لگاوٹ بازیاں دکہانے کی اُنھوں نے عام طور پر کوشش کی ہی۔ اور یہی چیز ہے جسمیں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر غلطیاں بہی ایسی کی ہیں کہ اُن کی تفصیل بتانیکے لئے دفتر چاہئے اودہ پنچ کی جلدیں اُن سے بہری پڑی ہیں۔ چنانچہ خود چکبست کو بہی ان سے انکار کرنے کی جُرأت نہ ہوسکی۔ مگر پہر بہی سرشار کو اگر کچہ نمبر مل سکتے ہیں تو اسی نقالی زبان میں جسمیں وہ اسقدر منہمک ہوئے کہ جتنی لیاقت تہی اسکے پیچہے وہ بہی مٹادی۔ آخر عمر میں وہ مضمون لکہنے سے بالکل عاجز تہے۔ اودہ اخبار کے ایڈیٹوریل میں بہی اگر کوئی مضمون لکہتے تہے تو صرف چند آدمیوں کی باہمی گفتگو ہوتی تہی۔

رہی دوسری وضع کی عبارت جسے خود اُن کا لٹریچر کہنا چاہئے۔ اُس میں اور فسانۂ عجائب کی عبارت میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔ سرشار کی اس قسم کی عبارتوں

کو غور کر کے دیکھئے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اُن میں کسی قسم کا ایجادی مادہ سرے سے ہی نہیں - وہی سرور کی سی قافیہ پیمائی ہے - وہی مبالغے ہیں - وہی پرانی تشبیہیں اور استعارے ہیں - وہی اگلی بندشیں ہیں - وہی جا بجا چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو اشعار کا بھرتی کرنا ہے - بلکہ سچ یہ ہے کہ الفاظ بھی وہی ہیں جو اگلی نثروں میں ہوا کرتے تھے اسوقت میرے سامنے صرف اُن کی کتاب "جام سرشار" ہے - اسمیں دیکھئے کہ پرانی ترکیبیں اور فارسیت کا غلبہ کس طرح زبان کو خراب اور بھدا بنا رہا ہے - صفحہ ۱۷ میں ملاحظہ ہو لکھتے ہیں :-

"رئیس زادہ نامدار کو اب تک اپنی منکوحہ بیوی سے کہ صاحب عصمت ہونے کے علاوہ صاحب جمال بھی تھیں بڑی محبت دلی تھی - اور اُن کو بھی اپنے شوہر سے کہ جوان صالح و خوبرو تھا عشق کا درجہ تھا - نکاح کے روز سعید و تقریب فرخ سے آج تک اُن کے گلستان عشرت و محبت پر نااتفاقی یا رنج کی گھٹا نہیں چھائی تھی - گو نواب صاحب کے یہاں جوان جوان اور حسین حسین خادمہ تھیں مگر یہ کبھی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے"

قافیہ پیمائی اور سرور کا پُرانا رنگ دیکھنے کے لئے جام سرشار کا صفحہ ۱۴ ملاحظہ ہو جہاں لکھتے ہیں :- "ادہر گھڑیالی نے ٹھنا ٹھن چار کا گجر بجایا اُدہر رفیقوں اور مصاحبوں نے آسمان سر پر اُٹھایا - حضور پانچ بج گئے اب تیاری کیجئے - فٹن نکالنے کا حکم دیجئے - حمام خانے جائیے - اور بن ٹھن کے باہر آئیے - مگر پیر و مرشد اتنا یاد رہے کہ عمدہ سی عمدہ نکھار ہو جو دیکھے عش عش کرے - وہ مردانہ سنگار ہو بانکے جھک جھک کر آداب بجا لائیں - مہوشں چھپ چھپ کر گھورنے آئیں - محبوب مطلوب سے وصال ہو - جیب و دامن گوہر مراد سے مالامال ہو - خدام باادب بخوابہ نازنین کے لیے کمرہ سجائیں - خوشی کے شادیانے بجائیں - مبارک بادی کی صدا بلند ہو - پل پل مسرت دوچند ہو - ادہر جام ہو - اُدہر گلفام ہو - لطف زندگی اُٹھائیے - ہمچشموں میں آبرو پائیے"

ان جملوں میں محض قافیے کی ہوس نے عبارت کو کیسا غارت کیا ہے؟ دو حسین عورتوں کی تعریف کرتے ہیں: — "دونوں چلبلی شوخ و شنگ۔ دونوں معدن حسن روکش پری چہرگان فرنگ۔ دونوں ہبوکا۔ دونوں مہ پارۂ عالم فریب۔ عدوئے صبر و شکیب۔ طاؤس زیب۔ دونوں ناز فروش۔ ستم کوش۔ دونوں سرو قامت۔ دونوں قیامت۔ دونوں محشر خرام۔ دونوں زیبا اندام۔ دونوں سرو جویبار رعنائی۔ دونوں تدرو کوہسار زیبائی۔ دونوں طرۂ رخسار خوبی۔ دونوں خال عارض محبوبی۔ دونوں روکش خوبان فرخار۔ دونوں طرار و طرحدار دونوں ناز آفریں۔ دونوں گلعذار مہ جبیں۔"

ان عبارتوں کو دیکھ کے کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں کسی قسم کی جدت ہے یا ایسی عبارت لکھنے والا عبارت میں کبھی جدت دکھا بھی سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرشار میں ایجاد کا مادہ ہی نہ تھا وہ محض نقال تھے گفتگو میں بازاری لوگوں کی زبان کی نقل کرتے تھے اور عبارت آرائی میں سرور کے طرز تحریر کی۔

چکبست نے سرور کی تقلید کا الزام سرشار کے سر سے مٹانے کے لئے لکھ دیا ہے کہ "سرور کی نثر تصنع کے بوجھ سے گرانبار ہے۔ سرشار کا طرز شوخی اور بے تکلفی سے معمور ہے۔ قدرتی جوش اور صفائی بیان ملک عجیب عالم دکھاتے ہیں"۔ اس دعوے میں صرف الفاظ ہیں جو کبھی مطابق کر کے نہ دکھائے جا سکیں گے۔ سرشار کی جو عبارت ہم نے نقل کی اور ایسی ہی عبارت سے اُن کے تمام تصانیف بھرے پڑے ہیں۔ کیا اسکو پڑھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ سرشار کی گرانباری سرور سے ذرہ برابر بھی کم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "شوخی و بے تکلفی سے معمور ہے" لیکن اگر گفتگو کا حصہ نکال ڈالا جائے تو یہ دونوں صفتیں اُن کی عبارت کے پاس بھی نہیں پھٹکیں "قدرتی جوش اور صفائی بیان" خاص سرور کا حصہ ہے جنھیں سرشار کی طرف منسوب کرتے دیکھ کے ہنسی آتی ہے۔

گو سرور کے مقابل میں سرشار کا نام لینا کسی شخص پر نہیں خود اردو لٹریچر پر ظلم ہے مگر

اب اس جُرم کا ارتکاب ایک شخص کے ہاتھوں ہوگیا تو ہمیں یہ بھی دکھا دینا چاہیے کہ سرشار نے مقابل میں شرر کا رنگ کیا اور کیسا ہے۔

شرر کی عبارت چار طرح کی ہے (۱) ناولوں کے اندر خود اپنی زبان میں کسی چیز یا کسی شخص یا کسی کیفیت کی تصویر دکھانا۔ (۲) دوسروں کی زبان سے اُن کے خیالات وجذبات کو ظاہر کرنا (۳) شاعرانہ مضامین جن کے ذریعے سے شرر نے خیال آرائی کے عجیب و غریب کمالات دکھائے ہیں (۴) تاریخی اور محققانہ مضامین جن میں فلسفیانہ متانت اور منطقیانہ ترتیب الفاظ کے ساتھ قوت استدلال اور زور بیان کی کامل شان نظر آتی ہے۔

ان میں سے پہلے رنگ کی عبارت میں انھوں نے نئی بندشوں اور بالکل عجیب قسم کے بانکپن سے صدہا سین دکھائے ہیں۔ صدہا قسم کے خیالات وجذبات کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اور چونکہ اُن کے ناولوں کے میدان بدلتے رہے ہیں لہذا اُن مناظر وجذبات کی تصویر کھینچنے میں سب سے بڑا کمال یہ دکھایا ہے کہ جو تصویر کھینچی ہے اُسی ملک کی ہے جہاں کا تذکرہ ہے جغرافیوں اور سفرناموں سے مدد لے کے بعینہ اور ہُو بہُو اُسی ملک کا خاکہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے اور اُسمیں تشبیہات واستعارات بھی ہیں تو اُسی ملک وقوم کے مذاق کے موافق۔

ایام عرب کے شروع ہی میں میدان عکاظ کی تصویر دکھاتے ہیں: "وہ جس ریگستانی میدان میں یہ بے شمار مخلوق خدا اپنے کملوں اور دُھسوں کے خیمے تان تان کے فروکش ہوئی ہے اُس کی گرداگرد سیاہ و بے گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جنکی چوٹیاں اوقت دوپہر کی دھوپ میں جو بقول رسول مقبول صلعم فیح جہنم کا نمونہ دکھا رہی ہے، دوزخ کے فرشتوں کی طرح ایک کے پیچھے سے ایک سر اُٹھائے ہوئے درشت مزاج ابنائے بادیہ کو گھور رہی ہیں۔ اور اُنہیں کے پہلوؤں یعنی چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں سے اُس پار

کالق دوق ریگزار اپنی پُرشکن پیشانی نکالے جھانک رہا ہے۔ باد سموم کے جھونکے گرد کو اُڑا اُڑا کے جہاں آسمان کی نیلگونی کو میلا کرتے ہیں وہاں قریب کی برہنہ چٹانوں کو بھی خاکساری کا ملگجا خلعت پنہا رہے ہیں۔ قریب ہی چند کھجوروں کے جھنڈ ہیں جنکے نیچے کئی کنوئیں ان صحرائی پیاسوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ دور دور پر پہاڑوں کی بھول بھلیوں اور صحرا کے نشیب و فراز میں جابجا ببول کے بے برگ ٹھونٹھ کھڑے ہیں جن کے کانٹوں سے دریائے ریگ کے شناور اونٹ اپنی قناعت کے روزے افطار کر رہے ہیں۔"

اس عبارت میں غور سے دیکھیئے تو بندش و ترتیب الفاظ نئی ہے کتنی تشبیہیں نئی اور اچھوتی ہیں کتنے خیالات نئے اور پاکیزہ ہیں۔ اور کیسا خوب صورت نقشہ خاص عرب کی سرزمین کا کھینچا ہے۔ اگر لٹریچر میں کسی چیز کو ایجاد کہہ سکتے ہیں تو وہ یہی ہے۔

اب اسکے مقابل دیکھیئے فتح اندلس میں افریقہ کے سواحل بحیرۂ روم کا نقشہ کھینچتے ہیں:۔ "بحیرۂ روم کا نیلا خوش رنگ پانی افریقہ کے شمالی سواحل کو تھپیڑے دے رہا ہے۔ دشت ناپیدا کنار پر قدرت نے ریگ کا اُجلا فرش بچھا رکھا ہے۔ اور اُس پر پہونچنے کے شوق میں متلاطم و بے قرار موجیں سر ٹپک ٹپک کے رہ جاتی ہیں۔ اور اپنے پُرجوش و وحشیانہ حملوں کے بعد جس طرح کوئی غضب ناک دشمن تھک کے پسپا ہو جاتا ہے منہ میں کف بھر لاکے پلٹتی ہیں۔ صبح ہوئی ہے۔ آفتاب مشرقی اُفق سے اور عین اُس مقام سے جہاں سمندر اور ریگستان باہم مل کے دست و گریبان ہوئے ہیں طلوع ہو رہا ہے۔ دھوپ نیلگوں و مضطرب سطح آب پر افشاں چھڑک رہی ہے۔ ریگ کے ذرّوں میں کندن کے ریزوں نے شعاع دی ہے۔ سامنے کوہستان عربونہ ہے جس کی غاروں اور کھوہوں میں وحشی درندوں نے پناہ لی۔ اور گڑریوں کی سادہ مزاج لڑکیاں اپنے گلوں کو لیے کے نکلی ہیں کہ روئیدگی سے بے زبان مخلوق کا پیٹ بھریں۔"

اپنی ایک مغربی ہیروئن کے حسن کی تصویر دکھاتے ہیں :- "اُس کی سیاہ اور چمکدار زلفیں ایک سادی نیلی اور نیلوفر کے پھول کی سی ٹوپی کے نیچے سے نکل کے پیٹھ اور شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ گوری اور چاند کی ایسی چمک دار پیشانی کے نیچے پتلی اور قوس نما بھویں عاشق کشی کے لئے ہر وقت کھنچی رہتی تھیں۔ اور اُن بڑی بڑی نیلی ارغوانی آنکھوں پر سایہ کئے رہتی تھیں۔ جنھوں نے صبح کے اور شبنم سے دھوے ہوئے آسمان کی رنگت اُڑائی تھی۔ لمبی نوکدار پلکیں یوں تو ریشم سے بھی زیادہ نرم ونازک تھیں مگر ابرو کی کمانوں کا تیر بنتے اور دل میں چبھتے وقت ہیرے کی کنی سے بھی زیادہ سخت اور تیز بنجاتی تھیں۔ اُن آنکھوں سے شرم وندامت کے جذبات بار بار ظاہر ہوتے اور فوراً پاک دامنی و دوشیزگی کا ثبوت دے کے غائب ہوجاتے۔ گورے گلابی گال اپنی خوش رنگی ونزاکت کی وجہ سے گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے۔ اور اُن سے قریب بلند اور سانچے میں ڈھلی ہوئی ناک گویا گل یاسمن کی ایک ناشگفتہ کلی تھی۔ یوں تو پھول کڑاکی دھوپ میں کمھلانے لگتے ہیں مگر یہ پھول اس قدر نازک تھے کہ نظر شوق کی بھی تاب نہ لاسکتے تھے۔ اور کسی سے چار آنکھیں ہوتے ہی ایک عجیب لطف کے ساتھ کمھلا جاتے اور بخصوص اُن کی وہ نرم ونازک پنکھڑیاں جو دُنیا میں ہونٹوں کے لفظ سے یاد کیجاتی ہیں اور جو دانتوں کے موتیوں کو شبنم کے قطروں کی طرح اپنے دامن میں چھپائے رہتی تھیں"

میں نے صحیح اندازہ ہونے کے لئے بغیر کسی انتخاب کے عام طور پر دو ایک جگہہ سے عبارتیں نقل کردیں۔ زیادہ عبارتیں نقل کرنے سے اندیشہ ہے کہ مضموں بہت بڑھ جائیگا۔ لیکن ناظرین نے شرر کے ناولوں میں خود اسباب کا اندازہ کیا ہوگا کہ جن جن مقامات کے نقشے دکھائے ہیں جغرافیہ اور تاریخ سے مطابق کرکے دکھلائے ہیں جن اشخاص کی تصویریں کھینچی ہیں انکے ملکی اور قومی حلیئے کو پیش نظر کرکے کھینچی ہیں۔ اور

جتنی وضعیں بتائی ہیں اُس عہد اور اُس ملک کی حالت کا پورا اندازہ کرکے بتائی ہیں۔ اُن کے ناولوں کی قدر انسان اُسوقت کرسکتا ہے جب اُس ملک کی تاریخ پڑھ لے۔ اُسکے جغرافیے سے واقف ہولے اور وہاں کی اُس عہد کی اخلاقی حالت کا خوب مطالعہ کرلے۔ بغیر اس کے انسان سمجھ ہی نہیں سکتا کہ شرر نے مورخانہ ناول نگاری میں کیا کمال دکھایا ہے۔ میں اسبات کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ شرر کے ناولوں میں کسی کو نہ کوئی جغرافیے کی غلطی ملسکتی ہے اور نہ کسی شخص کے ملنے، وضع اور لباس کے متعلق جس شخص نے اسقدر محنت کرکے تاریخوں پر عبور حاصل کرکے اور ایسی لیاقت سے ناول لکھے ہوں اور ایسا کمال انشا پردازی دکھایا ہو اُسکے برابر ایک عام مذاق کے آدمی کو بٹھا دینا کسقدر افسوس کے قابل ہے۔

دوسرے طرز عبارت یعنی گفتگو میں شرر کو کسقدر دشواری پیش آئی ہے اسلئے کہ وہ کسی انگریزن۔ کسی عربیہ۔ یا عجمیہ عورت۔ یا اندلس کی شاہزادی کو لکھنؤ کی زبان نہیں بلوا سکتے تھے۔ اسی نازک بات خیال کرکے انھوں نے اُن کی زبان سے زنانے جذبات تو ظاہر کرادئے ہیں مگر زبان عام رکھی تاکہ لکھنؤ کی عورتوں کے کیرکٹر کی جھلک نہ آجائے۔ مگر جہاں انھیں ہندوستانی کیرکٹر ملے ہیں وہاں انھوں نے لکھنؤ کی اعلیٰ زبان کا بھی کمال دکھا دیا ہے۔ جسکا اندازہ دلکش۔ بدرالنسا کی مصیبت آغا صادق کی شادی اور خاصکر میوۂ تلخ کے پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔ انصاف سے پوچھئے تو ہندوستان کی شریف خاتونوں کی زبان یا مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں ملتی ہے یا شرر کے مذکورہ ناولوں میں۔ سرشار نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ جان صاحب کی طرح بازاری فاحشہ عورتوں کی زبان شریف خاتونوں کی زبان سے ادا کرادی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اکثر مسلمان خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے فسانۂ آزاد کے ذریعے سے بدنیتی کے ساتھ مسلمان خاتونوں کا کیرکٹر بگاڑا ہے۔ مگر مجھے یقین

سبب ہے کہ یہ اُن کی بدنیتی نہیں بلکہ ناول نویسی کی خامی ہے۔

شرر کا تیسرا رنگ عبارت جو شاعرانہ مضامین میں ہے وہ سب سے جُدا ہے۔ اور اسمیں وہ تمام اُردو انشاپردازوں سے بڑھے ہوئے موجود ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کو ہم شرر کا خاص لٹریچر کہہ سکتے ہیں۔ ان میں اُنھوں نے وہ جوہر پورے کمال کے ساتھ دکھایا ہے جو اسوقت سے پیشتر شاید نثر میں کبھی نہ دکھایا گیا ہوگا۔ انہیں مضامین کی برکت سے وہ جدید اُردو شروع ہوئی جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے اور جو جو یہ رنگ چمکتا اور اُبھرتا جائے گا اُسیقدر زیادہ نمایاں طریقے سے شرر کا سکّہ اُردو لٹریچر پر نظر آتا جائے گا۔ اس رنگ میں وہ جس چیز کی تصویر کھینچتے ہیں اسے اپنے ناظرین کے سامنے لاکے کھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اسطرح اور اتنا اُتصرف کرتے ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں پڑھنے والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ زورِ طبع دکھانے کے لئے اُنھوں نے ایسے ایسے سبجکٹ لئے جن پر اُن سے پیشتر کسی نے قلم نہ اُٹھایا تھا۔ مثلاً "جھلملاتا ہوا تارہ" "غریب کا جھونپڑا" "ذات کی زندگی" "نہیں" "ہاں" "لالۂ خودرو" "دیا ورفتگان" "شمع خاموش" "صحبت برہم" یہ وہ سبجکٹ ہیں جو اُردو کی دُنیا میں بالکل اچھوتے تھے۔ اور جن پر قلم اُٹھانا کسی معمولی آدمی کا کام نہ تھا۔ شرر کی اس لٹریچر کا نایاب و بے مثل خزانہ کو دیکھئے اور اسکے بعد خیال کیجئے کہ سرشار کا سوا ناول کی گفتگو کے ایک مضمون بھی ایسا نہیں ملسکتا جو پڑھنے کے قابل ہو۔ اِن مضامین کی بُنیاد شرر نے ۱۸۸۳ء میں "محشر" نام ایک ہفتہ وار رسالے کے ذریعے سے ڈالی تھی۔ محشر مولوی عبدالباسط کے نام سے نکالا گیا تھا۔ مگر لکھنے والے شرر تھے۔ محشر میں مسلسل صبح کے اٹھارہ انیس سین اس کمال نازک خیالی کے ساتھ لکھے گئے کہ اُردو کے تمام انشاپرداز چونک اُٹھے۔ اور زمانہ عش عش کرنے لگا۔

شرر کا چوتھا رنگ عبارت اُن کے کثیر التعداد تاریخی یا اخلاقی مضامین میں نظر آتا ہو یہ مضامین دلگداز میں اور پردۂ عصمت و اتحاد وغیرہ میں اور ان دنوں ایک نئی وضع سے العرفان میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں شرر کا زورِ قلم۔ عالی دماغی اور فلسفیانہ روشن ضمیری کی شان دکہاتا ہی۔ جن کو پڑھ کے انسان کو یقین آجاتا ہی کہ شرر محض ایک نثار اور انشا پردازی کے بادشاہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑے محقق بھی ہیں۔ مدت ہوئی جریدہ روزگار مدراس کے صفحوں پر میں نے اُن کا ایک مضمون دیکہا تہا جسمیں اُنہوں نے ثابت کیا تہا کہ "کعبے کی طرف سجدہ کرنے سے مسلمان کیوں کعبہ پرست نہیں کہے جا سکتے" یا دلگداز میں "تھیئٹر اور اسلام" "خاندان نبوت" اور "نقطہ یا آتش یونان" کی سرخیوں سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ تحقیق و تنقید کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ اُنہوں نے بہتوں کے خیالات پلٹ دئے ہیں اور ہندوستانی پبلک پر غیر معمولی درجے کا اثر کیا ہے۔

ایسے جامع کمالات کے سامنے اور اتنے بڑے معجز نگار کے مقابل میں سرشار کا نام لینا کتنی بڑی لغویت ہے۔ شرر ابھی زندہ بیٹھے ہیں اور اُن کی زندگی میں اُن کی لائف لکہنا یا اُن کے عام لٹریچر کو تجزیہ کرکے دکہانا شاید منحوس خیال کیا جائے۔ ورنہ وہ حقیقتہً یہ درجہ حاصل کر چکے ہیں کہ پوری محنت کرکے اُن کے حالات اور اُنکے لٹریچر پر ایک ضخیم کتاب لکہی جائے۔

شرر اور سرشار دونوں نے ابتدائی مشق اودہ اخبار کے صفحوں پر کی۔ مگر سرشار کے لئے اودہ اخبار ہی ذریعۂ شہرت و کامیابی ہوا۔ اور شرر کی شہرت اودہ اخبار میں لکہنے کے زمانے تک بہت محدود تھی۔ اُن کے لٹریچر نے اودہ اخبار سے قطع تعلق کرنیکے بعد اپنے لئے شہرت کا راستہ آپ نکالا۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی کامیابی و ناموری محض اپنے ذاتی کمال کے سہارے پر تھی اور اسی سے جھوٹی اور سچی شہرت کا صحیح اندازہ کرلیا

جا سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ امر بھی غور کرنیکے قابل ہے کہ سرشار اپنی ابتدائی شہرت سے آخر زمانے تک تنزل ہی کرتے رہے۔ اُن کا رنگ جو متروکی نقل قافیہ پیمائی۔ اشعار کی بھرتی اور فارسی بندشوں پر محدود ہونے کی وجہ سے ایک مٹنے والا رنگ تھا۔ خود بھی مٹتا گیا اور اُن کو بھی مٹاتا رہا۔ اسکے مقابل میں شرر کو دیکھیئے کہ اُن کے رنگ نے روز بروز ترقی کی۔ اُن کے ابتدائی تصانیف میں نیا اور اچھوتا رنگ ہونے کے باعث خامی بھی ہے۔ اور اُلجھن اور پیچیدگی کے عیوب بھی ہیں۔ مگر روز بروز یہ عیوب نکلتے گئے اور آخر وہ پختہ اور ہمیشہ قائم رہنے والا رنگ قائم ہو گیا۔ جو امید ہے کہ زمانے کے ساتھ روز بروز بڑھتا ہی رہے گا۔

شرر اور سرشار کا ایک اور نازک امتیاز بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ سرشار نے صرف لکھنؤ کی گفتگو لکھی جسکو انشا پردازی شاعرانہ محاسن اور خیال آفرینی سے کوئی علاقہ نہ تھا بخلاف اسکے شرر نے زبان اُردو میں انشا پردازی کا جوہر دکھایا۔ شاعرانہ خیال آفرینیاں کیں۔ اور ایک خاص لٹریچر قائم کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سرشار کو سوا لکھنؤ کے یا چند باہر کے لوگوں کے جو لکھنؤ کی زبان سے اُنس رکھتے تھے اور کسی گروہ میں یا دوسرے شہروں میں شہرت نہیں حاصل ہوئی۔ اسلیئے کہ خالص محاورہ بندی کی قدر یہی لوگ کر سکتے تھے۔ بمقابل اسکے شرر کے لٹریچر سے ہر جگہ کے اُردو والوں نے یکساں لطف اُٹھایا اور اُن کی شہرت ممالک متوسط سے زیادہ پنجاب۔ بنگال۔ بمبئی۔ مدراس اور حیدرآباد میں ہوئی چکبست کو ہم ہدایت کرتے ہیں کہ اگر اُنھیں اسباب کا اندازہ کرنا ہی کہ سچی اور عام شہرت شرر کو حاصل ہے یا سرشار کو تو وہ ہندوستان کے دور دراز مقامات کا سفر کریں۔

لیکن بعض۔ انھیں اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ کیونکہ مجھے نظر آتا ہے کہ قوم

قوم پرستی کے جوش نے اُن میں صحیح حس ہی نہیں باقی رکھی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کہ وہ شرر کے دو نقصانات بیان کرتے ہیں۔ اور دونوں بے اصل و بے بنیاد۔ ایک یہ کہ وہ تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے اور دوسرے یہ کہ شاعری کا دماغ اپنے ساتھ نہیں لائے۔ حالانکہ یہی دو کمال ہیں جن کے اعتبار سے شرر کو سارا ہندوستان ممتاز مان رہا ہے۔ تاریخ میں اُن کی بصیرت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ گزشتہ اقوام و ملل کے حالات گویا خاص اُنکے خاص سبجکٹ ہیں۔ اور اسلامی تاریخ کے تو وہ پورے پورے حافظ ہیں۔ اُن کا پرائیوٹ کتب خانہ صرف تاریخی کتابوں سے بھرا ہوا ہے اور تاریخ ہی گویا اُنکا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُن کا ہر مضمون اُن کی ہر تحریر اور اُنکا ہر ناول اُن کے کمال تاریخ دانی کی شہادت دے رہا ہے۔ ساری دنیا قائل ہے کہ شرر صرف ناولسٹ نہیں ایک گراں پایہ مورخ ہیں۔ وزیر دکن نے مورخ ہی کی حیثیت سے اُن کی قدر کی اُنکی دو ضخیم تاریخیں مکمل موجود ہیں۔ مگر چکبست کو ابھی تک شرر کی تاریخ دانی کا علم نہیں ہوا۔ یہی حالت شرر کے شاعرانہ دماغ کی ہے کہ اُن کا ہر ناول اور تمام اُن کے خیالی و شاعرانہ مضامین پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ جسکے قلم سے نکلے ہیں وہ ایسا غیر معمولی درجے کا شاعرانہ دماغ لے کے دنیا میں آیا ہے کہ اُس نے نثر کو نظم سے زیادہ دلچسپ بنا دیا لیکن یہ آواز جو سارے ہندوستان میں گونج رہی ہے ابھی تک چکبست کے کانوں میں نہیں پہونچی۔

اسی سلسلے میں وہ شرر کا یہ نقصان بھی بیان کرتے ہیں کہ "وہ یورپ کی کسی زبان میں کامل دستگاہ نہیں رکھتے صرف ترجموں سے اپنا مطلب نکالتے ہیں" یہ بھی یا تو محض ناواقفیت ہے اور یا تجاہل عارفانہ۔ بے شک شرر نے انگریزی کسی اسکول میں نہیں پڑھی اور نہ کوئی ڈگری حاصل کی ہے مگر محض ذاتی کوشش سے انگریزی میں اتنی لیاقت حاصل کرلی ہے کہ انگریزی کتابوں کے سمجھنے اور انگریزی سے ترجمہ کر لینے میں تو شاید

بعض ڈگری یافتہ لوگوں سے بڑھے ہوئے ثابت ہونگے۔ ہاں انگریزی لکھنے میں البتہ ناقص ہیں ''ترجموں سے کام چلالے'' کی لغویت اس سے زیادہ کیا بتائی جائیگی کہ اُن کے کتب خانے میں صرف انگریزی تاریخیں ہیں یا عربی تاریخیں جن میں وہ شب روز مشغول رہا کرتے ہیں۔ ترجمہ کسی کتاب کا بھی اُن کے پاس نہیں موجود ہے پھر اُس سے نفع اُٹھاتے ہیں تو کیونکر؟ زیادہ تر مدد وہ ''انسائکلوپیڈیا برٹانکا'' گبن کی تاریخ یا اور ایسی ہی انگریزی تاریخوں سے لیا کرتے ہیں جن کا ترجمہ بھی اُردو میں نہیں ہوا ہے۔ مگر چکبست کو خوش عقیدگی کے جوش میں خبر پہونچ گئی کہ وہ ترجموں سے کام چلایا کرتے ہیں بلکہ یورپین زبانوں میں بصیرت رکھنے کی حیثیت سے شرر کو ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جو شاید نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو بہت کم حاصل ہوگی۔ وہ یہ کہ سفر انگلستان میں انھوں نے ایک فرانسیسی پروفیسر سے فرنچ زبان بھی حاصل کی اور اُس میں اتنی لیاقت رکھتے ہیں کہ ڈکشنری سے مدد لے کے فرنچ کتابوں کا بخوبی ترجمہ کر سکتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ چکبست کا مضمون اول سے آخر تک قابل مضحکہ ہے۔ وہ سرشار و شرر کو برابر رکھ کے ایک ایسے شخص کا مقابلہ جو کچھ نہ تھا اُس شخص سے کرتے ہیں جو سب کچھ ہے۔ پنڈت رتن ناتھ صرف معمولی درجے کی انگریزی جانتے تھے اور فارسی تک ناقص تھی جس شخص میں اُردو لکھنا درکنار اُس کے سمجھنے کی بھی لیاقت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اُنکے مقابل شرر فارسی میں منشی بے بدل ہیں۔ عربی میں ایک فاضل علامہ۔ اور انگریزی اور فرنچ زبانوں سے بھی بغیر کسی کی مدد کے بالذات فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اگر میرے دعووں کے خلاف کوئی لائق اور مستند آدمی کچھ لکھے تو مجھے جواب دینے یا اپنی غلطیوں کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی کشمیری صاحب اسیطرح لکھیں جسطرح کہ چکبست نے سرشار کی لائف لکھی ہے تو میں اپنے قلم کو فضول زحمت نہ دونگا

اس مضمون کے لکھنے سے میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی ناواقف چکبست
کی تحریر سے غلطی میں پڑگیا ہو تو اُس کی غلط فہمی دور کردیجاے -

راقم - حکیم برہم از گورکھپور

اجلاس نیشنل کانگرس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۴ء بمقام بمبئی کے

فیصل شدہ رزولیوشن اور مسلمانان ہند کا نفع نقصان

۱۔ قبل اسکے کہ ہم مسئلہ زیر بحث پر غور کریں اس سوال کو مختصراً حل کرنا چاہتے
کہ "کیوں ملکی حقوق کے مطالبہ میں ہندو اور مسلمانوں کا جُدا جُدا لحاظ رکھا جائے" اور
دیگر اقوام باشندگان ہندوستان کا بھی اسی طریقہ سے خیال نہ کیا جاے جس طریقہ سے
چاہتے ہیں" یہ سوالات اور اسکا مفہوم ایک پیش پاافتادہ مضمون ہوگیا ہے جسپر بہت
قلم فرسائی ہوچکی ہے اور ابھی بہت کچھ باقی ہے یہاں ہم صرف بطور تمہید کے اسکا
تذکرہ مناسب سمجھتے ہیں تاکہ مضمون زیر بحث بلا رکاوٹ آگے کو رواں ہوسکے -
آسانی سے حل ہوجائیگا جبکہ ہم تاریخ ہند پر نظر ڈالکر اس نتیجہ پر پہونچینگے کہ صرف ہندو
مسلمان ہی ہندوستان کی وہ قومیں ہیں جنکے قبضہ میں کبھی اس ملک کی سلطنت
جنہوں نے صدیوں اس ملک پر حکمرانی کی ہے، مسلمانوں کی تعداد ہندوستان
باشندوں میں ۲۰ فیصدی ہے جو نسبتاً ایک بڑی تعداد ہے مردم شماری کی گزشتہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی یہ فیصدی اور نسبتی تعداد ہر دس برس بعد بڑھجاتی ہے
کی قوم اس ملک میں بارہ سو برس سے آباد ہے یہ ہند کی خو بو سے اور ہند ان کی خو
پورے طور پر واقف ہوگیا ہے، یہ حالات ضرور اس قابل ہیں کہ فیاض برٹش سلطنت
مطالبہ حقوق کرتے وقت بلحاظ تعداد ایسی روز افزوں قوم کے حقوق کا لحاظ رکھا
رہگئیں دوسری قومیں شلاً پارسی - یہودی - عیسائی وغیرہ بلحاظ تعداد ہندوستان

توڑتے ہیں جن کو کسی رزولیوشن کانگرس کی تعمیل یا عدم تعمیل سے بلحاظ قوم کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہونچ سکتا ہے کیونکہ اُن کے حقوق ہندوؤں سے متحد ہو سکتے نیز ہم یہ نہیں کہتے کہ بلا استحقاق رعایتاً مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیئے بلکہ یہ حق اوسوقت اُن کو ملے جبکہ وہ مجتمعاً یا منفرداً اپنے میں اسکی قابلیت ثابت کر سکیں ورنہ نہیں۔ گو درمیانی حالات اونکی کیسی ہی تاریک ہوں لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ بلحاظ قابلیت علمی مسلمان اپنے کو ضرور ایک لائق قوم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جیساکہ وہ ہمیشہ سے تھی۔

۲۔ اب ہم دسمبر ۱۹۰۴ء کے اجلاس نیشنل کانگرس منعقدہ بمبئی کی تجاویز پاس شدہ پر مسلمانان ہند کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کی تفتیش کرتے ہیں کہ اگر یہ رزولیوشن عملی صورت میں آجائیں تو اُن کا اچھا یا بُرا کیا اثر مسلمانوں پر پڑے گا اسکے واسطے ہم ہر تجویز پر جدا جدا بحث کرینگے۔

۳۔ نیشنل کانگرس بمبئی کا پہلا پاس شدہ رزولیوشن یہ ہے "(الف) اس کانگرس کی راے میں گورنمنٹ ہند کا اصول اور اُس کی پالسی ہندوستانیوں کے اعلے عہدہاے گورنمنٹ پر مقرر ہونے کی نسبت (جسکا اظہار ۲۴ مئی ۱۹۰۴ء کے رزولیوشن میں ہوا ہے) پارلیمنٹ کے قانون ۱۸۳۳ء اور ملکہ معظمہ آں جہانی کے اعلان شاہی ۱۸۵۸ء کے خلاف ہے۔ یہ کانگرس مودبانہ مگر پُرزور طور پر اُن تمام کوششوں پر اعتراض کرتی ہے جو اون باوثوق وعدوں کے معطل کر دینے کے لئے کیجاتی ہیں جو بادشاہ وقت اور پارلیمنٹ نے اس ملک کے ساتھ کئے ہیں اور پھر اون کوششوں پر اعتراض کرتی ہے جو اُن انتظاموں سے تعریض کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ جن کو گورنمنٹ نے پبلک سروس کمیشن کے غور و فکر کے بعد قرار دیا تھا۔

(ب) اس کانگرس کی راے ہے کہ موجودہ مالی اور انتظامی بد انتظمیوں کا واقعی تدارک اسیطرح ہو سکتا ہے کہ ملک کے اعلیٰ شعبہاے ملازمت میں ہندوستانی بکثرت مقرر کئے جائیں یہ کانگرس اس امر میں گزشتہ کانگرسوں سے اتفاق کرتی ہے کہ پارلیمنٹ

کے رزولیوشن ۴ر جون ۱۸۹۳ء پر (اس بارہ میں کہ ایک ہی سا امتحان سول سروس کے لئے انگلستان اور ہندوستان میں ہوا کرے) فوراً عمل درآمد شروع کیا جائے اس اتفاق رائے کے اظہار کے ساتھ یہ کانگرس اتنا زیادہ کرتی ہے کہ اس مسئلے کا قابل اطمینان حل اسیوقت ہوسکتا ہے کہ ہندوستانی سول سروس کی تجدید مقامی حالات کے اعتبار سے ازسرنو کیجائے اور اسی اثنا میں جوڈیشل خدمات بتدریج ان لوگوں کی سپرد کئے جائیں جنھوں نے قانونی تعلیم حاصل کی ہو۔

(ج) یہ کانگرس اس امر پر افسوس ظاہر کرتی ہے کہ اکثر صوبہ جات ہند میں امتحان مقابلہ بند کر دیا گیا۔ گزشتہ تجربے سے ثابت ہوچکا ہے کہ نامزدگی کے قاعدے سے اس ملک میں یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف حکام رسی سے ملازمت حاصل ہوسکتی ہے اور اسطرح نالائق لوگ بھرتی ہوتے ہیں جس سے انتظام میں نقائص پیدا ہوتے ہیں اور بعد کو یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی اعلے عہدوں کے قابل نہیں۔ مذکورہ رزولیوشن کی ضمن (ب) میں ان الفاظ کے پہلے "ہندوستانی بکثرت مقرر کی جائیں" یہ الفاظ بڑا دئے جاتے "(و بلحاظ نسبت آبادی کے ہندو اور مسلمانوں کی تعداد کا خیال کرتے ہوئے" تو یہ تجویز ضرور مسلمانوں کی مفید مطلب ہو جاتی مگر تجویز کی موجودہ صورت اگر مسلمانوں کے مضر نہیں ہے تو مفید بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ عملاً اب برٹش انڈیا کی گورننگ بوڈی میں مسلمان نسبتاً بہت کم حصہ دار ہیں بلکہ بعض عہدے جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے وہ اُن سے نکل جانے پر کسی نے کبھی کسی مسلمان کا نام بھی پیش نہیں کیا مثلاً ہائی کورٹ کے ججوں کو لیجئے سید محمود مرحوم اور مولوی سید امیر علی کی جو جگہیں خالی ہوئیں وہ پھر مسلمانوں کو نہ ملسکیں حالانکہ قوم میں ان جگہوں کے قابل بہت سے امیدوار ملسکتے تھے اور مل سکتے ہیں کانگرس جو اپنے کو تمام ہندوستان کے باشندوں کا (بلا استثنائے قومی) محافظ حقوق کہتی ہے اُس نے اسکا کبھی نوٹس نہیں لیا۔

سنہ نیشنل کانگرس کے دوسرے رزولیوشن کا مضمون تعلیم کے متعلق ہے۔ یہ رزولیوشن فی الحقیقت ہندو اور مسلمانوں کے لئے یکساں مفید ہے اس سے

من حیث القوم مسلمانوں کو ہرگز اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ بمبئی کانگرس کی تیسری تجویز یہ ہے کہ " اس کانگرس کی رائے میں ملک کی افسوسناک مفلسی کے اسباب یہ ہیں کہ سالہا سال سے ملک کی دولت نکلتی چلی جاتی ہے۔ ملک کی صنعت و حرفت روبہ تنزل ہے۔ مالگذاری سخت ہے اور سلطنت کا انتظام اسطرح پر واقع ہوا ہے کہ بیحد بے انتہا خرچ پڑتا ہے۔ یہ کانگرس ان نقائص کی اصلاح کے لئے اور تدابیر کے علاوہ حسب ذیل تدابیر پیش کرتی ہے:۔ (الف) جیسا کہ سابق سنے۔ زولیوشن میں ظاہر کیا گیا ہے گورنمنٹ تعلیم کی طرف زیادہ ترغیب دلائے۔ (ب) ان حصص ملک میں جو سطابق شرائط مقرر کردہ مراسلات سکرٹری ہند ہیں استمراری بندوبست جاری ہو (ج) پبلک سروس کی اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانی زیادہ مقرر کئے جائیں۔ اس تجویز کی ضمن (ج) ہی ترمیم متذکرہ رزولیوشن اول کی محتاج ہے تاکہ مسلمانوں کا حق محفوظ ہو جائے۔

۶۔ بمبئی کانگرس کی پاس شدہ رزولیوشن نمبر ۴ (جو آگے بیان کیا جاتا ہے) میں اگر کاشتکاروں کے ساتھ زمینداروں کی حالات کی تحقیقات بھی چاہی جاتی تو یہ تجویز مسلمانوں کے واسطے خاص طور پر مفید ہوتی۔ چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے تازہ تازہ سلطنت نکلی ہے اسلئے ہندوستان کی زمینداریاں زیادہ تر اسی قوم کے قبضے میں ہیں۔ اور فرقہ زمیندار کی مقروضی کی حالت کاشتکاروں سے بھی زیادہ ردی ہے۔ شاید ہندوستان میں دو فیصدی ایسے زمیندار ہوں جو مقروض نہ ہوں کانگرس جبکہ اپنے آپ کو تمام ہندوستان کا ہمدرد کہتی ہے اور کل فرقوں کی بھلائی میں کوشش کرنے کی مدعی ہے پھر کیوں زمینداروں کی حالت کی جانب سے وہ غافل ہے اور اُن کی حالت درست کرنے کی جانب کوشش نہیں کرتی۔ زمیندار ہندوستان کا متوسط الحال فرقہ ہے۔ درمیانی ہی فرقہ وہ شے ہے جس میں سے اعلیٰ ہمدرد ملک پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے ملک کا یہ فرقہ کثرت اخراجات عدالت بشیں قرار مالگذاری، حصول خوشنودی و رضامندی کے اخراجات، اپنے حیثیت کے موافق اشیاء آسائش و آرام

کے مہیا رکھنے کا خرچ، حفظ آبرو و مراتب و تحفظ حقوق کے واسطے ناجائز معمولات
ناقابل برداشت بار اور پھر اپنے خانگی ضروریات کا مہیا کرنا اسکی تنگ دپو میں اور اسکے
سے جو قرض اوسکے اوپر ہو جاتا ہے اوسکے سود اور اصل کی ادا کی فکر میں اس
سنک ہے جس سے اس واجب الرحم فرقے کو اتنی مہلت ہی نہیں کہ سر اُٹھا کے ملک
ہی خواہی اور ضروریات کی جانب توجہ کرسکے، درحقیقت جتنے بھاری بوجھ کے نیچے زمیندار
فرقہ دبا ہوا ہے ہندوستان کے بہت تھوڑے فرقے ایسے مجبور ہونگے پس اس
تجویز میں کاشتکاروں کے ساتھ زمینداروں کا نام اور بڑھا دینا چاہئے تھا جو بہت
ایسے اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہیں جنکے برداشت کی کاشتکار کو ضرورت
نہیں ہے۔

۷۔ کانگرس کی پانچویں تجویز جنوبی افریقہ میں ہندوستانی تارکان وطن سے متعلق
یہ تجویز نہایت ضروری اور مفید ہے اسمیں ہندو اور مسلمانوں کا فائدہ یکساں ہے مسلم
بلا چون وچرا اسکی تائید کرنی چاہئے۔

۸۔ کانگرس بمبئی نے چھٹا رزولیوشن یہ منظور کیا ہے کہ "یہ کانگرس اس ناانصافی پر معترض
ہے کہ انڈیا آفس کا بار ہندوستان کے خزانے پر ڈالا جائے حالانکہ کالونیل آفس کا
آبادیوں پر نہیں ڈالا جاتا۔ لہذا اس کانگرس کی رائے ہے کہ سکرٹری اف اسٹیٹ
پوری تنخواہ خزانہ انگلستان سے دیجائے" اسپر مسلمانوں کو کسی اعتراض کی کوئی وجہ نہیں
بلکہ تائید کرنی چاہئے۔

۹۔ کانگرس کی ساتویں تجویز حرف بحرف تائید کے قابل ہے میں بحیثیت مسلمان اسپر کسی
کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ تجویز یہ ہے "(الف) جو بچت گذشتہ چھ برسوں میں قریب
ملین پونڈ کے ہوئی ہے اس سے ملک کی خوشحالی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا
کہ ٹیکس ضرورت سے زائد ہے اور یہ بچت خاصکر روپیہ کی عارضی قیمت مقرر کر دینے
ہوئی ہے اور اس طرح اُن اخراجات میں جو ہندوستان سے انگلستان کو دئے
تین یا چار ملین سالانہ کی بچت ہوئی ہے (ب) جن گردہونکو گورنمنٹ کے سکے

پالسی سے نقصان پہونچا ہے اُسکی تلافی کے لئے اور اس خیال سے کہ گورنمنٹ کو خرچ بڑہانے کا موقع نہ ملے اس کانگرس کی رائے ہے کہ (۱) محصول نمک میں اور تخفیف کیجائے (۲) اُن صوبہ جات میں جہاں متواتر قحط سے نقصان پہونچا ہے مالیہ اراضی کم لیا جائے (۳) روئی کا محصول برطرف کیا جائے (ج) جب تک کہ اس تخفیف محصول پر عمل نہ کیا جائے اس بجٹ کا ایک حصہ اسطرح صرف ہونا چاہئے جس سے بلا واسطہ رعایا کو فائدہ پہونچے مثلاً سائنٹفک زراعتی اور صنعتی تعلیم کی ترقی طبی امداد میں آسانی اور باقی لوکل اور میونسپل بورڈ کی مد میں صرف کیا جائے جن کو پبلک کے سالانہ اخراجات کے سبب سے بہت زیادہ زیر باری ہوئی ہے تاکہ یہ بورڈ حفظان صحت کے وسائل میں ترقی کرسکیں اور ذرائع آمد و رفت وسیع کئے جائیں۔

۱۰۔ آٹھویں تجویز متعلق اظہار رنج بابت وفات مسٹر ٹاٹا مرحوم سے ہم بہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ مسلمان متفق ہیں۔

۱۱۔ بمبئی کانگرس کا نواں پاس شدہ رزولیوشن ذرا زیادہ اہم اور غور طلب ہے ہاؤس اوف کامنس کے واسطے ممبروں کا انتخاب سپریم اور امپیریل لیجسلیٹیو کونسلوں کے ممبروں کی زیادتی تعداد ممبران غیر سرکاری اور اونکے اختیارات کی وسعت انڈیا آفس کی کونسل اور ایگزکٹو کونسلوں میں ہندوستانی قائم مقاموں کا انتخاب ضرور ملک کے اور مسلمانوں کے واسطے مفید ہوگا بشرطیکہ جیسا ہمنے تجویز اول میں ترمیم چاہی ہے اس تجویز میں بھی ایسی ترمیم کردیجائے جس سے ان جگہوں میں مسلمانوں کی موجودگی اور اُن کی تعداد کا لحاظ رہے یعنی بہ تناسب مردم شماری اور مسلمانوں کی آبادی کے اُن کو حق دیا جائے کہ وہ اپنا ممبر منتخب کریں اور ہندو اپنے ممبر منتخب کرنیکے مجاز ہوں۔ بلا اس تفریق کے جیساکہ ہم ابتک دیکھ چکے ہیں جسکا تجربہ شاہد ہے انتخابی اصول سے خواہ وہ میونسپلٹی میں ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ میں اور خواہ وہ پراونشل کانسلوں میں ہو یا سپریم کونسل میں مسلمانوں کی تعداد کبھی اوس نسبت پر نہیں پہونچی اور نہ پہونچیگی جس نسبت پر بلحاظ اُن کی وقوع آبادی کے پہونچنی چاہئے تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں میں اسکا

قابلیت نہیں ہے تو یہ قول بھی غلط ہوجاتا ہے جبکہ ہم فضلِ الٰہی سے اس قوم کی حیرت انگیز بڑھتی ہوئی تعلیمی حالت پر خیال کرتے ہیں اور خاصکر ممالک متحدہ میں جہاں مسلمان تعلیم یافتوں کی تعداد نسبتًا ہندوؤں سے زیادہ ہے اور جہاں کی لجسلیٹو کونسل میں منتخب شدہ مسلمانوں کے (جہانتک ہماری یاد کام کرتی ہے) واسطے ابتک صفر رہا ہے۔ رہگئے دوسرے صوبے۔ ہم ہر صوبے میں درجنوں ایسے لائق مسلمان شمار کراسکتے ہیں جنکی قابلیت، اصابت رائے اور تدبر کو نہ صرف گورنمنٹ بلکہ پبلک بھی تسلیم کرتی ہے۔ اس افسوسناک نتیجہ کو دیکھکر ہر منصف آدمی ہماری تائید کریگا کہ انتخابی اصول مسلمانوں کے واسطے جب ہی مفید ہوسکتا ہے جبکہ اُنکو جداگانہ اپنے انتخاب کا حق دیا جائے۔ ایک اعتراض اور بھی مسلمانوں پر کیا جاتا ہے کہ اونکی یہ حالت کانگرس کی جانب سے بے پروائی اور بے توجہی کے باعث سے ہے جبکہ مسلمان کانگرس سے نفرت کرتے ہیں تو کانگرس بھی اونکے حقوق کی کچھ پروا نہیں کرتی لیکن یہ اقوال نہایت تنگ خیالی اور کم حوصلہ آدمیوں کے ہونگے کانگرس کے لئے عالی وقار مجمع کے یہ خیالات ہرگز نہیں ہوسکتے جسنے تمام باشندگان ہند کی بھلائی کا دعوی کر رکھا ہے اُسکو کسی قوم کے طعن و تشنیع کی جانب مطلق توجہ نہیں کرنی چاہیے اور جیساکہ اوسکا دعوی ہے تمام اقوام ہند کی بہتری میں برابر کوشش جاری رکھنی چاہئی ورنہ اوسکے متانت اور وقار پر بڑا حرف آئیگا اور ایسے رکیک خیالات سے اُسکے وقعت کم ہوجائیگی عندالضرورت اگر کانگرس کسی قوم کے حقوق کو پامال ہوتے دیکھے تو ضرور اُسکو کمزور فرقے کی حمایت لازم ہے تاکہ وہ اپنے حق سے محروم نہ ہوجائے پس بمبئی کانگرس کی تجویز ہم جیساکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں بر بنائے تجربہ تھوڑی ایسی ترمیم کی محتاج ہے جسکے بعد وہ مسلمانوں کے واسطے بھی مفید ہوسکتی ہے۔

۱۲ نیشنل کانگرس کے اجلاس منعقدہ بمبئی کا دسواں رزولیوشن حملۂ تبت اور اسکے جملہ اخراجات بیجا کے متعلق ہے۔

اس تجویز سے مسلمانوں کو اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔
۱۳ کانگرس بمبئی میں گیارہویں تجویز میں پولیس کمیشن کی رپورٹ کی شیوع کی خواہش کی گئی تھی جو شائع ہو گئی۔
۱۴ بارہویں تجویز سے گو جداگانہ مسلمانوں کا کچھ نقصان نہ ہو لیکن ہم اس سے ضرور اختلاف کرینگے جبکہ تمام دنیا کی سلطنتیں اپنی قومی ترقی میں ایسے کوشاں ہیں اور اسمیں کروڑہا پونڈ صرف کرتی ہیں، اور جبکہ روسی افسر آئے دن دھمکاتے رہتے ہیں ایسی حالت میں ہندوستان کو فوجی طیاری سے روکنا "نادان کی دوستی" ہے ہاں یہ کہنا کہ بوجہ افلاس کے انگلستان ہندوستان کے فوجی اخراجات میں مدد کرے بیشک ایک حد تک ٹھیک ہے کیونکہ ہندوستان تاج برطانیہ کا درخشندہ گوہر ہے جسکو محفوظ رکھنے میں نہ صرف ہندوستان ہی کی امن کے واسطے بلکہ انگلستان کی پوزیشن کے واسطے بھی فوائد کثیر حاصل رہنے کی امید ہے۔
۱۵ انیشنل کانگرس نے بمبئی میں تیرہویں تجویز یہ پاس کی ہے کہ " یہ کانگرس گزشتہ کانگرسونکی رائے سے اتفاق ظاہر کرتی ہے اور گورنمنٹ اور سکرٹری اوف اسٹیٹ سے درخواست کرتی ہے کہ فوجداری معاملات میں اگزیکٹو اور جوڈیشل انتظاموں کی علیحدگی میں اب اور زیادہ توقف روا نہ رکھا جائے۔ جبکہ اس علیحدگی انتظامات کے مناسب ہونے کو گورنمنٹ بارہا خود بھی تسلیم کرچکی ہے اور جبکہ یہ بات بکرات ومرات ثابت کردی گئی ہے کہ صرف براسے نام زیادتی اخراجات کے ساتھ اس تجویز کا عمل میں لانا ممکن ہے" اس تجویز سے بھی مسلمانوں کو اتفاق کرنا چاہئے۔
۱۶ چودھویں تجویز متعلق بہ تقسیم بنگال ہے۔ چونکہ یہ ایک لوکل تجویز ہے اس کے متعلق مسلمانان بنگال کی رائے جو کچھ بھی ہو اسلئے ہم اسے درگزر کرتے ہیں۔
۱۷ پندرہواں۔ سولہواں۔ سترہواں اور اٹھارہواں رزولیوشن قابل تائید ہیں مسلمانوں کو کانگرس کا ہم زبان ہونا چاہئے۔ تجاویز یہ ہیں۔ (۱) نیشنل کانگرس کی طرف سے عام انتخاب کے موقع پر ایک ڈیپوٹیشن انگلستان بھیجا جائے۔

اس تنہا ماندے شخص کے لئے آسان کام نہ تھا مگر اسنے ہمت نہ ہاری اور کسیقدر نیچے اُتر کر وہ رات اُسی پہاڑی پر بسر کی اور دوسرے دن علی الصباح نہایت استقلال کے ساتھ اُسی چوٹی پر چڑھ گیا اور ناشتہ وہیں کیا۔ اگر وہ اُس تکلیف کا خیال کرکے جو اُسے وہاں پہنچنے میں ہوئی ہوگی اپنے اس ارادے کو چھوڑ بیٹھتا تو علاوہ اتنی محنت رائگاں جانیکے اُسے ایک ایسی ناکامی کا خیال رہتا جو ہمیشہ اُسکے دل کو توڑنیوالی ثابت ہوتی۔ اُس نے اپنے دوستوں کے دریافت کرنے پر بیان کیا کہ ایسا کرنے سے میری صرف یہ غرض تھی کہ اس عالیشان و دلفریب منظر کے خیال کے ساتھ کہیں میرے دل میں اپنی مایوسی اور ناکامی کا خیال بھی جاگزیں نہ ہوجائے۔ یقین کرلو کہ اس قسم کا آدمی جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اُسے نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیگا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اُسی بلا پورا کئے ہوئے چھوڑ دے۔

کسی مشکل سے جھجکنا نہ چاہئے خصوصاً اُسوقت جبکہ کسی کام کی ابتدا ہو۔ ایک جرمن ضرب المثل ہے کہ ہر ایک کام کے آغاز میں مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے اور کام جتنا زیادہ اچھا ہوتا ہے اُتنی ہی زیادہ دقتیں اُسکی تکمیل میں اُٹھانی ہوتی ہیں۔ درحقیقت مشکل کاموں ہی کے انجام دہی میں کچھ لطف حاصل ہوتا ہے ورنہ آسان کام تو ہر ایک شخص کرسکتا ہے اور اُنکا کرنا ہی کیا۔ مشکل سے مشکل کام کے انجام دینے کا سب سے اچھا آسان اور یقینی طریقہ یہی ہے کہ استقلال سے کام لیا جائے۔ استقلال کامیابی کا دروازہ ہے۔ اسکے سمجھنے کے لئے بابو فریڈرک اعظم سرسید اور راجہ رام موہن رائے کے سے شخصوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یاد رکھو کہ متلون المزاج آدمی کبھی خوش قسمت نہیں ہوتے نہ دنیا میں کبھی انہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

صابر علی خان شروانی (دلبولوی)

خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث صاحب بیخبر مرحوم

خواجہ صاحب مرحوم سلطان زین العابدین کی اولاد میں سے تھے جو ۸۲۶ھ میں کشمیر
حکومت پر سرفراز تھے۔ جب سلطنت اُس خاندان سے جاتی رہی تو خواجہ صاحب کے بزرگوا
نے گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن سلاطین مغلیہ کے زمانے میں پھر ستارہ چمکا اور آپ
اراکین خاندان عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے اور یہ دور آخر دور سلاطین درانیہ تک ر
آپ کی جدہ مادری حضرت خواجہ بابا داؤد خاک رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں جن ک
شمار صوفیائے عظام میں ہے۔ مدت تک آپ کے بزرگوار اپنے خاندانی طریقے کے موافق
تارک دنیا رہے۔ سلاطین تیموریہ نے بسبب زہد و اتقا حضرت کی مورث اعلیٰ کو یاد
کشمیر کے عہدہ قضا پر منصوب کیا۔ یہ عہدہ اُس خاندان میں سکھوں کی عملداری تک
لیکن جب گورنمنٹ انگریزی نے کشمیر راجہ گلاب سنگھ کو عطا کیا تو یہ منصب بھی جاتا رہا
آپ کے جد بزرگوار اور نانا کے والد ماجد کی انتقال کے بعد خواجہ حضور اللہ مغفور آپ
والد اور خواجہ خیر الدین مرحوم آپ کے نانا بسبب حرج و مرج حکومت ترک وطن کر کے لا س
(تبت) میں چلے آئے۔ شاہ چین کے سرکار سے دونوں صاحبوں کا بڑا اعزاز ہوا ا
لاسہ کی مسلمانوں کی مقدمات کا انفصال سے آپ ہی صاحبوں کی سپرد کیا گیا۔ ایک م
دراز کے بعد دونوں اصحاب لاسہ سے نیپال چلے آئے اور وہیں اقامت اختیار کر
مہاراجہ نیپال کی سرکار میں بھی اُن حضرات کا بہت وقار رہا اور وہیں ۱۲۴۰ھ میں خواجہ
پیدا ہوئے۔ آپکا سن چار برس کا تھا۔ آپکے والد اور نانا نے نیپال کی بود و باش چھ
کر بنارس میں توطن اختیار کیا اور وہیں خواجہ صاحب سن شعور کو پہونچے اور علم حاصل
کیا۔ ۱۲۵۵ ہجری میں آپکے والد نے انتقال فرمایا اور اُسی سنہ کی آخر یعنی ۱۲۵
میں اپنے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خان مغفور میر منشی لفٹنٹ گورنر ممالک
و شمالی کی نیابت میں مقرر ہوئی۔ جب سرکار نے مفسدان گوالیار کے تنبیہ کی غرض

فوج کشی کی اور خود گورنر جنرل اُس مہم میں شریک ہوئے اور اُن کا دار الانشا ساتھ نہ پہونچ سکا تو خواجہ صاحب ممدوح ہی اُس مہم میں ساتھ گئے اور نہایت خوبی سے کار تحریر انجام دیا۔ رخصت کے وقت خلعت دیا گیا اور ترقی کی امید دلائی گئی۔ جب مولوی سید محمد خاں بہادر گورنر جنرل کے میر منشی مستعفی ہوئے تو آپ اُن کے عہدے پر ترقی یاب ہوئے اُس زمانے سے ۱۸۸۵ء تک اتنے بڑے اور نازک عہدے کو آپنے اس خوبی سے انجام دیا کہ آپکو حکام غائت درجہ قابل اعتماد سمجھتے تھے اور ہندوستانی رؤسا و غربا سب آپکے ممنون و مشکور تھے۔

غدر ۱۸۵۷ء میں نمک حلالی اور وفاداری کے صلے میں سات پارچے کا خلعت اور تین رقم جواہر جیغہ اور سرپیچ مرصع مع مالائی مروارید و سند خیر خواہی عطا ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے تمغہ قیصری مع سند عطا کیا۔ ۱۸۸۵ء میں باصرار تمام آپنے پنشن لیلی حالانکہ گورنمنٹ آپ کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بعد ازاں خطاب خان بہادر ذوالقدر عنایت ہوا اور پوری تنخواہ پنشن میں دیگئی۔ حاضری خزانہ بھی معاف ہوئی۔ نواب کلب علیخان صاحب بہادر والئے رامپور مدار المہامی کے واسطے بہتیرا طلب کرتی رہی مگر آپنے ہمیشہ شکریے ساتھ انکار کر دیا۔ معاملات دنیاوی سے قطع تعلق کر کے الہ آباد میں اللہ اللہ کرتے تھے۔ افسوس ۱۹۰۵ء میں آپ کا انتقال ہوگیا راقم کی والدہ ماجدہ اور خواجہ صاحب مرحوم سے بہت گہرے مراسم تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضرت مرحوم دُنیا کے ساتھ دین بھی رکھتے تھے۔ رامپور میں ایک بزرگ صاحب کمال کی بہت دنوں تک خدمت کر کے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ شاعری و انشا پردازی میں کمال تھا۔ فارسی میں آپ کی خوش بیانی اور نازک خیالی کا یہ مرتبہ ہے کہ اہل ایران کبھی ہندیوں کی فارسی کو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر آپ کے وقت میں جتنے شعرائے ایران نے آپکا کلام نظم و نثر سنا۔ سبنے آپ کی توصیف کی۔ چنانچہ عارف علی شاہ خراسانی جو بڑے دریدہ دہن تھے اور ہر شخص کے عیب و صواب کو مُنہ پر کہدینا اُن کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ہمیشہ قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ جب سے میں ہندوستان میں آیا ہوں

ایسی شستہ ورفتہ فارسی کسی کی نہیں سُنی سید عبداللہ شیرازی نے جتنے قصائد آپ کے شان میں لکھے سب میں آپ کی اس کمال کی تعریف کی چنانچہ یہ اشعار متفرق اُن کے قصائد کے ہیں ؎

جز کلک در بنان تو اندر گہ رقم — یا للعجب کہ دیدنے خشک دُرنثار

بوالفرح از حیرت شیریں کلامش منفعل — الوری از خجلت شیدا بیانش شرمسار

گہے کہ خامہ گوہر فشاں بکف گیری — ہمی بنان تو بوسد ز شوق روح کمال

کلک او لعل بریزد ہمہ در گاہِ رقم — نطق او دُر بفشاند ہمہ ہنگام کلام

سید محمد حاذق بغدادی نے اپنے قصیدے میں لکھا ہے

در بستنِ شعر ہم سنگ بیدل — و ندر قصائد ہمدوش سلمان

زمانہ حیات میں خواجہ صاحب کی دو کتابیں طبع ہوئیں تھیں ایک خونابہ جگر جس میں فارسی خطوط اور کلام ہے۔ دوسرے فغانِ بیخبر اس میں اُردو خطوط ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۷۰ء میں چھپی تھیں جو عام طور سے شائع نہیں ہوئیں احباب ہی میں تقسیم ہو گئیں اب میر مرحوم کی نظم و نثر فارسی و اُردو کے چند منتخبات لکھکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اُردو کیسی پاک و شستہ ہے۔ فارسی کا کلام کیسا زبردست اور شوخ ہے۔ افسوس تو یوں ہے کہ ارباب کمال مرتے جاتے ہیں اور اُن کا کوئی جانشین نہیں پیدا ہوتا۔

مرزا اسد اللہ خان غالب کے خط کا جواب

حضرت خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپ کے خطوں کے لئے اپنا جی ترستا پایا اگر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلۂ تحریر قطع نہ کیجئے اس محبت کو تا دم آخر پناہ دیجئے لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے یہ سنا کہ اب آپ نے اپنے خدام سے فرما دیا ہے کہ کوئی کاغذ ہو مجھے دکھایا ہی نہ کرو۔ اس سبب سے تحریر پر جرأت نہ کر سکا دل پر جبر کرکے بیٹھ رہا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی دولت ملتی سلطنت ہاتھ آتی تو بھی شاید اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اُن چند سطروں کو بار بار پڑھا کیا۔ دیر تک ایک کیفیت قلب

پر طاری رہی جو بیان میں نہیں آسکتی قسموں کی کیا حاجت ہے اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے دس خطوں کا ایک جواب آئیگا تو حضرت کی دیوان خانہ کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائے گا۔ باقی خیریت۔ بیخبر

ایضاً

کرم شیوہ مخدوما۔ زبان برنگ برگ گل برنگین بیانی نیایش حضرت کبریا صد چمن بہار میفروشد و ناطقہ بسان لسان بلبل از زمزمہ سنجی ستائش بخت رسا با ہنگ ہزار موسیقار میخروشد کہ چنانکہ چشم عنایت مخدوم در منت نہی ارشاد خدمت صادانتخاب بنام خادم ہنوز در رسیدن کشد سعی بذروہ حسن مرام مخدوم سربلندی خادم افزود قصیدہ را از مدن گاہ ممدوح طغراے قبول طراز عنوان لبست و عریضہ را از پزیرائی ما ہو المعروض حرف مراد برکرسی نشست ہوا خواہان را آسائش سبکدوشی گزاردن خدمت مفت وقت گردید۔ منتظران را آئینہ جلوہ نمائی شاہد مدعا پیش نظر رسید۔ جواب بآں آئین کہ دل بحصول آن کمیں داشت انیوقت رنگ روانی میگیرد۔ انشاء اللہ از دست ہماں قاصد کہ ایں سجدہ زار نیاز را بران آستان میرساند تحفہ محفل میگردد بعد ازیں اگر ہمت آسمان سیر قاعدہ شناسان آن بزم فلاطون ادبگاہ چناں خواہد کہ رسیدن منشور فرماں فراہم بتوسط فرمانروا باید از اں طرف تیز اغماض نظر از رعایت ایں طریق نشاید ایں مرتبہ کہ فقیر باظہار وساطت خود سرمایہ آبرو اندوخت فرستادن پاسخ معرفت دیگرے بکدام پیرایہ میخواست کہ مورد الزام خارج آہنگی سے گشت قصور رنگ گرچہ نظر مصلحت بود بوجہ غفلت المصلحہ حسن خدمت معاف باد۔ بیخبر

غزلیں

فقیروں کی بول چال میں

فقیروں سے کرتے ہو جو بولی ٹھولی	بہت پیاری باتیں ہیں یہ بھولی بھولی

بھکاری بتو ہم تو دیدار کے ہیں — بھلا ہوگا ہر دو ہماری بھی جھولی
نہیں بند رہتا کوئی کام اپنا — گرہ دل کی ہے جب سے مرشد نے کھولی
پڑی آج شیشے سی دانا نکالو — یہ کالی بلا کیسی انہوں نے کھولی
کہاں ہم فقیر اور دنیا کے جھگڑے — یہ کیچڑ تو دامن سی پہلے ہی دھولی

دیگر

دل در غم کونین نہ بستیم و گذشتیم — سدی کہ برہ بود شکستیم و گذشتیم
مانند سپندی کہ نشیند سر آتش — یک لحظہ دریں بزم نشستیم و گذشتیم
عالم ہمہ از سخت دلان بود پر از سنگ — ما شیشۂ دل را شکستیم و گذشتیم
یک خندہ بہ زمت صفت شیشہ نکردیم — چوں شمع رسیدیم و گرستیم و گذشتیم
ہر درد کہ در راہ دوا بود نگاہش — ما سینہ ازاں درونہ خستیم و گذشتیم
مارا بجرم شیخ ہمے خواند بصد عجز — گفتیم کہ ما دیر پرستیم و گذشتیم
صد رہ دل ما از ستم و جور شکستی — با عشق تو پیماں شکستیم و گذشتیم
شب تیجر افسانہ از سوز دروں خواند — چوں برق زجا گرم بجستیم و گذشتیم

مخمس بر غزل حضرت خواجہ حافظ

غافل ز حال تلخی ہجران چشیدہ — دور از تو آنچہ دیدہ ام آن را ندیدہ
اکنوں کہ در برم پس از عمری رسیدہ — از من جدا مشو کہ توام نور دیدہ
آرام جان و مونس قلب رسیدہ

امروز پیش چشم تو خوار ند عاشقاں — بے عز و اعتبار و وقار ند عاشقاں
فردا کہ سر ز خاک بر آرند عاشقاں — از دامن تو دست ندارند عاشقاں
پیراہن صبوری ایشاں دریدہ

اے چرخ حسن را رخ تابندہ تو ماہ — برہم زن خرد شکن گیسوی سیاہ
داری بر آئینہ بہ تماشائی خود نگاہ — از چشم زخم خویش مباوت گزند آہ

در دلبری بغایت خوبی رسیدہ

الغار مہر را چہ کنم پیش تو عیاں
باشد بچشم شپرہ چشم تو تو اماں
چوں بنگر ہی دگر نرسد حرف بر زباں
منعم کنی ز عشق و مرا نے نہفتی ماں
معذور دار مستکہ تو او را نہ دیدہ

یارے کہ دل ترا گرو اوست حافظا
از ہجر بہ پرس کہ خوش خوست حافظا
بیوجہ طرز شکوہ نہ نیکوست حافظا
ایں سر زنش کہ کرد ترا دوست حافظا
بیش از گلیم خویش مگر پا کشیدہ

محمد شفیع الدین خان مرادآبادی

تنقید

دیوان ظہیر دہلوی کا کچھ ذکر جولائی کے پرچے میں ہو چکا ہے اس دیوان میں ہر قسم اور ہر مذاق کا کلام موجود ہے چنانچہ جس رنگ کو ہم خاص طور پر پسند کرتے ہیں اس میں حضرت ظہیر کی یہ غزل ستائش طلب ہے۔

گل افشانی کا دم بھرتی ہی چشم خونفشاں کیا کیا
کشود مطلب عاشق کے ہیں لب پر گماں کیا کیا
فقط اک سادگی پر شوخیوں کی ہیں گماں کیا کیا
ادھر کچھ پاؤں بڑھتے ہیں ادھر کچھ ہاتھ اٹھتے ہیں
مروت کا بھروسہ ہی تو کچھ دھوکا ہے تمکین کا
دل خوں گشتہ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں
جنوں سے کم نہیں ہے کچھ ہجوم شادمانی بھی
تصور میں وصال یار کے ساماں ہوتے ہیں
چلی آتی ہے اتراتی ہوئی کچھ کوئے جاناں سی
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمین پر بے نیازی سے
ظہیر خستہ جاں سچ ہے محبت کچھ بری شے ہے

ہمارے زیب دامن ہی بہار گلستاں کیا کیا
ادائے خامشی میں بھر دیا رنگ بیاں کیا کیا
نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
جنوں انگیزیوں پر ہے ہوائے گلستاں کیا کیا
نگاہ شرمگیں پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
بہار آگیں ہے امکی برس فصل خزاں کیا کیا
ہوائے گل میں ہی ہجام رستے ہیں باغباں کیا کیا
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
بسی ہی رشک کی بو میں نسیم بوستاں کیا کیا
بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجود آستاں کیا کیا
مجازی میں حقیقی کی بڑھے ہیں امتحاں کیا کیا

(۲) گلزارِ نسیم

جسوقت سی پنڈت برج نراین صاحب چکبست لکھنوی نے اس مثنوی کا نیا اڈیشن نکالا ہی اور حضرت شرر لکھنوی نے اسکے دیباچے اور بعض اشعار پر گلداز میں کچھ اعتراض شائع کئے ہیں اردو کے اکثر رسالوں اور اخباروں میں دونوں کے موافق یا مخالف تحریریں شائع ہو رہی ہیں[۵۱]- اس بحث کے متعلق مندرجہ ذیل تین عنوان قائم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) گلزارِ نسیم کا مصنف۔

(۲) گلزارِ نسیم کی زبان۔

(۳) گلزارِ نسیم کا اسلوب بیان یعنی اسٹائل۔

عنوان اوّل سے متعلق گلزارِ نسیم کی تصنیف کو خواجہ آتش کے ساتھ منسوب کرنا خطا ہی بلکہ ہماری نزدیک اس قسم کی بے بنیاد روایتوں کو درحقیقت صحیح سمجھنا اپنے تئیں مذاق صحیح سے بیگانہ ثابت کرنا ہی۔

شعرائے لکھنؤ میں سے صرف خواجہ آتش ایک ایسے شاعر تھے جنکے کلام کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اسمیں آورد سے آمد زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں انکو گلزارِ نسیم کا مصنف ٹھہرانا جسکا ہر ہر شعر آورد و تصنع کی گویا ایک مجسم صورت ہی بہرکیف ناواجب ہی۔

ہماری خیال میں حضرت شرر بھی اس غلط روایت کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں اگرچہ بظاہر انکے مضمون کے بعض مقامات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اسکا صحیح ہونا بھی ممکن ہی۔ اصل یہ ہی کہ حضرت شرر نے غالباً اپنا مضمون زیادہ احتیاط کے ساتھ نہیں لکھا تھا کیونکہ انہیں اسبات کا گمان نہ تھا کہ کسیوقت میں مجبیراً اسکے ایک ایک لفظ کی جوابدہی لازم آئیگی۔ گلزارِ نسیم کی زبان بیشک لکھنؤ کی زبان ہے اگرچہ اسمیں بعض غلطیاں بھی موجود ہیں۔ اس بحث کے متعلق

[۵۱] چنانچہ اردوی معلے کے بھی پرچہ جولائی میں مسٹر چکبست کا مضمون نکلا تھا اور اس پرچے میں حضرت شرر کا جواب الجواب شائع کیا جاتا ہے۔ حضرت شرر کا مضمون بجنسہ درج رسالہ کرکے اسموقع پر ہم اپنی ذاتی رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ اڈیٹر

یہ معلوم کرنا ضروری ہی کہ ناسخ کے زمانے سے پہلے لکھنؤ کی زبان کا کوئی مسلم ضابطہ موجود تھا بعض لوگ کبھی کبھی دہلی کی زبان بول جاتے تھے اور بعض لوگ کہیں کہیں پورب کے محاورے لکھ جاتے تھے۔ چنانچہ مصحفی کے بعض شاگردوں مثلاً عیشی اور ہوس کی زبان میں "آئے ہی جائے ہے" کبھو۔ کسو۔ اور بہت سے پرانے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔

مصحفی کے آخر عہد میں شیخ ناسخ نے خاص زبان لکھنؤ کی بنیاد ڈالی جسکی جانب مصحفی نے بھی اپنے دیوان چہارم میں "ن" بسر شخص" کے نام سے اشارہ کیا ہے۔ عام طور پر شیخ ناسخ نے جن الفاظ کو قابل ترک قرار دیا ان کو تقریباً کل معاصرین ناسخ نے تسلیم کر لیا چنانچہ فرد کشمیری۔ اسیر اور آتش وغیرہم اگرچہ ناسخ کے معاصر اور ہمپایہ تھے لیکن اصلاح زبان کے باب میں سب نے انکا مقلد ہونا پسند کیا۔ پھر بھی بعض شاگردان مصحفی نے جو ناسخ کے اجتہاد کو مسلم نہ سمجھتے ہونگے یا خود کو ناسخ سے افضل خیال کرتے ہونگے، اپنی قدیم زبان کو نہ چھوڑا۔ علاوہ بریں بہت سی یک رنگ اور مستقل طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اصلاح کے اثر سے بدیر متاثر ہوتی ہیں یا مطلق ہوتی ہی نہیں اور ہمارے نزدیک یہی وجہ ہی کہ شیخ ناسخ کے بعض ہمعصروں اور ان ہمعصروں کے بعض شاگردوں سے کہیں کہیں ناسخ کے مقررہ قواعد کی نادانستہ طور پر خلاف ورزی بھی ہو گئی ہے [1]

ہمارے نزدیک پنڈت دیا شنکر نسیم بھی ان شاعروں میں ہیں جنپر اجتہاد ناسخ کا اثر ہوا لیکن کم ہوا اور انہوں نے اسپر عمل کیا لیکن جا بجا اسکی پابندی نہیں بھی کر سکے۔ مثلاً تبحر کا ئی جملہ "اور اسکی" بجائے "اسکی ماں جملہ کو بڑکایا" کے لکھ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی غلطیوں کی صحت پر مسٹر چکبست کا اصرار بیجا ہی۔ لیکن باوجود ان غلطیوں کے گلزار نسیم کی زبان بلاشبہ لکھنؤ کی زبان ہے اگرچہ بعض موقعوں پر اسے لکھنؤ کی قدیم زبان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اب رہے عام اعتراضات اُن سے کسی بڑے سے بڑے اُستاد کا کلام بھی نہیں بچا ہے۔ پھر اگر نسیم کے کلام پر بھی بعض صحیح اعتراض وارد ہو سکتے ہیں تو مسٹر

---

[1] ہمنے جتنی باتیں اس مضمون میں لکھی ہیں ان سب کا ثبوت بھی سندوں اور مثالوں سے ہم پہونچا سکتے ہیں لیکن بخیال اختصار مضمون اس سے قطع نظر کرتے ہیں "اڈیٹر"۔

چکبست کو انکے تسلیم کر لینے میں کیا عذر اور بلاضرورت تاویل کی کیا حاجت ہی۔

حضرت شرر کے اعتراضوں میں سے اکثر اعتراض موجودہ زبان کے لحاظ سے صحیح ہیں اور غالباً مسٹر چکبست کا مضمون دیکھنے سے پہلے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ انکا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مسٹر چکبست نے جس محنت اور قابل تعریف تلاش کے ساتھ اساتذہ کے اشعار سے مثالیں اور سندیں ہم پہونچائی ہیں اسکی داد انکے حریفوں کو بھی دینا پڑیگی اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اکثر غلطیوں کے الزام سے نسیم کو مجبوراً بری کرنا پڑیگا لیکن اتنا ہم پھر بھی کہینگے کہ نسیم پر سے الزام ضرور رفع ہوگیا لیکن ان سندوں کے زور سے ہم معائب شاعری کو کسیطرح محاسن نہیں تسلیم کر سکتے مثلاً لفظی و معنوی تعقید سستی بندش۔ غرابت الفاظ یا تصرف ناجائز کی مثالیں ایک نہیں سو استادوں کی کلام سے پیش کیجائیں تب بھی مذکورہ بالا معائب کے قابل اعتراض ہونے میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آسکتا۔ چنانچہ اسی خیال سے ہمنے مسٹر چکبست کے مضمون میں جا بجا نوٹ دیکر ان کی رائے سے اختلاف ظاہر کر دیا تھا۔ اور اس موقع پر ان دو چار نقطوں کی نسبت کچھ لکھنا چاہتے ہیں جنپر حضرت شرر نے جولائی کے دلگداز میں اعتراض کیا ہے اور مسٹر چکبست نے، اگست کے اودھ پنچ میں انکو رفع کرنیکی کوشش کی ہے۔

(۱) جس گل کی ہوا لگی تھی لائے

اسپر حضرت شرر کا اعتراض ہی کہ "شوق تھا" یا "ہوس تھی" کے محل پر "ہوا لگی تھی" غلط محاورہ ہے۔ اسکا یہ جواب کہ "ہوا لگنا اس شعر میں طبیعت پر اثر پڑنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے" کسی طرح صحیح نہیں ہی۔ بیشک کسی مقام کی نسبت یہ کہنا کہ آپ کو "لندن کی ہوا لگ گئی ہی" یا پنجاب کی ہوا لگ گئی ہی" بالکل صحیح ہے اور انہیں اثر ہی پڑنے کے معنی لئے جاتے ہیں۔ لیکن ان مثالوں کو اس مصرعے پر منطبق کرنا بڑی بے انصافی ہی۔

(۲) قاصد سے کلام لطف بولا۔

اسپر اعتراض یہ ہے کہ "کلام بولا" صحیح نہیں ہے جواب میں مسٹر چکبست لکھتے ہیں کہ "کلام بولا" "کلام گفتن" کا ترجمہ ہے۔ اور فارسی محاوروں کے ترجمے نسیم کے زمانے

میں اکثر استعمال ہوئے ہیں مثلاً قلق ؎

تمکنت کو نہ کام فرماؤ   اک نظر مڑ کے دیکھتے جاؤ

اب کوئی اہل زباں کام فرماؤ نہ کہیگا - یا ایک مقام پر طلسم الفت میں ذیل کا شعر ملیگا ؎

بولی گھبراؤ نا سمجھ لیں گے   ہم صفائی تمہاری کر دینگے

اب گھبراؤ نا کوئی نہیں بولتا - لیکن قلق پر آجکل کی زبان لحاظ سے اعتراض کرنا حماقت ہے"

اس جواب میں دو باتیں قابل گرفت ہیں اول تو مسٹر چکبست کا یہ اصول کہ دوسرے اُستادوں کے کلام میں کمزوریاں دکھا کر یہ چاہنا کہ نسیم کی غلطیاں بھی معاف کر دیجائیں حالانکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے -

دوسرے یہ کہ جو الفاظ بطور سند پیش کئے گئے ہیں اُنکا غلط یا متروک ہونا مسلم نہیں ہے - کیا معنی کہ "تمکنت کو کام نہ فرمائیے" "تمکنت کو کام میں نہ لائیے" کے معنوں میں اب بھی مستعمل ہے اگرچہ عام نہیں ہے - اور گھبراؤ نا جس موقع پر استعمال کیا گیا ہے ایسے موقعوں پر "گھبراؤ نہیں" کی جگہہ "گھبراؤ نا" اب بھی گفتگوئے عام میں جاری ہے - اور مسٹر چکبست کا یہ قول کہ اسکے بدلے اہل زبان "نہ گھبراؤ" کہیں گے صحت سے عاری ہے -

اصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص گھبرا رہا ہو اور کسی دوسرے شخص کو اُسے تسلی دینا منظور ہو تو ایسے موقع پر "گھبراؤ" کے ساتھ ممانعت کا دوسرا لفظ ایسا لایا جاتا ہے جسکی آواز میں کسیقدر درازی پیدا ہوسکتی ہو - مثلاً "نہیں اور نا" کہ انکے آخری حصوں کو کسیقدر بڑھا کر "نہیں" اور "نا" بھی کہہ سکتے ہیں - برخلاف انکے "نہ" کی "ہ" کسی صورت سے لہجۂ تشفی کے لئے بڑھ نہیں سکتی - فتامل -

(۴) دیکھ آج تجھے دہل نہ ہوئے

اعتراض یہ ہے کہ "ڈر نہ ہوئے" کی جگہہ "دہل نہ ہوئے" لکھنو کی زبان نہیں ہے

اسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بقول منشی امیر احمد صاحب مینائی متعدد لغات ایسے ہیں جو صرف شاعرانہ خیال ادا کرنے میں مستعمل ہیں اور روزمرہ کی بول چال سے ان کو چنداں تعلق نہیں ہے -

امیر مرحوم کے اس قول کی صحت میں کیا شک ہو سکتا ہے لیکن یہاں امر دریافت طلب یہ ہے کہ آیا دہل کا لفظ شاعرانہ الفاظ میں شامل ہونیکی قابلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں ہمارے نزدیک شاعرانہ تو درکنار عام استعمال میں بھی صرف لفظ دہل خوف کے معنوں میں مروج نہیں ہے۔

(۴) مشہور ہے ضد انس و جانی

اعتراض یہ ہے کہ "ضد انس وجاں" کی جگہہ "ضد انس و جانی" صحیح نہیں ہے۔ اسکے جواب میں بھی مسٹر چلکبت نے وہی وطیرہ اختیار کیا ہے اور آتش کے "المضاف" اور "حلوۂ بے دود" نیز نواب مرزا شوق کے "نام و گھر" کو پیش کرکے نسیم کی غلطی کو بھی جائز قرار دینا چاہتے ہیں ہیں۔

ہمارے نزدیک رفع اعتراض کا یہ طریقہ بغایت کمزور ہے۔ اگر آتش و شوق نے تین لفظ غلط استعمال کئے تو اس سے نسیم کو کیا حق ہو کہ وہ ایک چوتھا لفظ بھی غلط لکھہ جائیں اور کوئی اسپر اعتراض نکرے۔

علاوہ بریں اگر کوئی شخص مثلاً کوئی دہلی کا باشندہ یہ کہدے کہ آتش کا "المضاف" غلط ہے اور شوق کا "نام و گھر" بھی صحیح نہیں ہے اسوقت مسٹر چلکبت کا جواب کس کام آئیگا۔

(۵) جام اُسنے بھرا کہا پیا لے

اعتراض یہ ہے کہ رعایت لفظی کی غرض سے بکاؤلی نے گنواروں کی زبان کیوں استعمال کی۔

اسکے جواب میں مسٹر چلکبت لکھتے ہیں کہ "رنگیلے پیا جا نعالم" لکھنؤ میں اور "شاہ عالم پیا" دہلی میں بھی بولتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اختلاط کی گفتگو میں زیادہ فصاحت و بلاغت سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ اصل جذبات دلی کا اظہار پُرجوش الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ بے تکلفی کے اور موقعوں پر بھی اساتذہ نے اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً قلق ؎

مسکرا کر وہ حور غمزے سے	انگلی چمکا کے بولی ٹھنگے سے
مسافر سے کرتا ہی کوئی بھی پیت
میر حسن	مثل ہے کہ جوگی ہوئے کسکے میت	واجد علیشاہ ۵

ہم تینوں تمہاری چیریاں ہیں	بن داموں خریدی لونڈیاں ہیں"

یہاں پر کئی باتیں ملاحظہ طلب ہیں اول تو یہ کہ جس بے تکلفی اور لطف کے ساتھ ان اشعار میں ہندی الفاظ مستعمل ہوئے ہیں اور جس بری طرح پر نسیم نے محض لفظی رعایت کے لحاظ سے "پیا" کا لفظ لکھا ہے، ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان مثالوں کو بامحل اور مناسب سمجھکر بھی "پیا" کا استعمال گفتگو سے باہم میں کسی صورت سے جائز نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ پیا کا لفظ (۱) ہندی اشعار (۲) یا محبوب کی غیبت کے سوا دوبدو خطاب کی صورت میں ہرگز مستعمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہہ سکتے کہ "پیا ہمارے رہے وہ بن ماں" یا یہ کہ "پیا کے آون کی بھئی بریا"۔ یا "قدر پیا تورے پیاں لاگوں" لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "پیا یہاں آ" یا "پیا یہ کر" یا "پیا یہ جام لے"۔ اس قسم کے فقرے نہ اہل زبان بولتے ہیں نہ گنوار۔

ہمنے جو بات بیان کی ہے اسکی جانب نہ حضرت شرر کا خیال گیا ہے نہ مسٹر چکبست کا اسلئے اعتراض و جواب دونوں غلط ہیں۔ خیر مضمون طویل ہوا جاتا ہے اسلئے اب ہمکو صرف یہ کہنا ہے کہ افراط و تفریط دونوں جانب سے ہی۔ حضرت شرر کو یہاں تک کاوش ہے کہ حق اور لہر کو غلط العام فصیح کے اصول سے بھی صحیح نہیں سمجھتے اور مسٹر چکبست نسیم کی واقعی غلطیوں کی بھی تاویل جا و بیجا جسطرح سے ممکن ہو کرنا چاہتے ہیں۔

ہمکو مسٹر چکبست کی انصاف پسند طبیعت سے امید ہے کہ جسطرح سے اُنہوں نے سرشار کے محاسن تحریر کے مقابلے میں اُن چند غلطیوں کو بھی تسلیم کیا تھا اسی طرح سے انکو ہماری اس رائے کے ماننے میں بھی کچھ عذر نہو گا کہ نسیم کا کلام غلطیوں سے پاک نہیں ہی۔ اور کیونکر ہو سکتا تھا جبکہ بیوقت موت نے انکو کہنہ مشق اُستاد کے درجے تک

پہونچنے ہی نہیں دیا۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ان چند غلطیوں کی بنا پر یہ کہنا بھی غایت درجے کی کوتاہ نظری ہے کہ نسیم کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں ہی یا یہ کہ ان غلطیوں نے گلزار نسیم کو مٹا دیا۔"

(۳) عنوان سوم کے متعلق ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ گلزار نسیم اپنے رنگ کی لاجواب مثنوی ہے۔ لبعض لوگوں نے گلزار نسیم اور مثنوی میر حسن کا مقابلہ کیا ہے۔ مثلاً رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی نے گلزار نسیم کو افضل ثابت کرنا چاہا ہے لیکن جب ایک مثنوی کا اسلوب بیان دوسری سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے یعنی ایک بالکل آورد ہے تو ایک سرتاسر آمد تو مقابلہ باہم کو عبث سمجھکر صرف اسقدر کہنا درست ہی کہ دونوں مثنویاں اپنے اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔

رہی یہ بات کہ دونوں اسلوبوں میں سے مثنوی کے لئے کونسا اسلوب بہتر ہے اسکی نسبت ہماری رائے یہ ہے کہ مثنوی اور خصوصاً بیانیہ مثنوی کے لئے سادگی بہرحال قابل ترجیح ہے۔

جسطرح قصیدے کے لئے بلاغت و شکوہ الفاظ۔ قطعات کے لئے تسلسل و توئی مضمون۔ رباعیات خصوصاً انکے آخری مصرع کے لئے برجستگی مضمون والفاظ لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح ذوق سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ بیانیہ مثنوی کے اسلوب نظم میں سادگی اور روانی کے بجائے تصنع اور محذوفات کو دخل نہو۔ کیونکہ اس سے مثنوی کی اصل غرض یعنی ادائے مطلب یا بیانِ حکایت کی غرض فوت ہو جاتی ہی اور سامع یا ناظر کی طبیعت اصل قصے سے ہٹ کر رعایات لفظی کے پھیر میں پڑ جاتی ہی۔

غالباً مولانا حالی نے اسی خیال کو پیش نظر رکھکر گلزار نسیم پر چند بجا اعتراض کئے تھے اور ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر چکبست سے مولانائے موصوف کے اُن اعتراضوں کا قابل اطمینان جواب نہیں ہو سکا ہے۔

لیکن ہم اس معاملے میں نسیم کو بالکل بری الذمہ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے زمانے کا مقبول رنگ سخن اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ اور قیاس غالب یہ ہے کہ اگر وہ میر حسن

کی پیروی کرتے تو نہ آتش و ناسخ کے زمانے میں انکی مثنوی مقبول ہوتی اور نہ آجکل کی نکتہ چین نگاہوں میں انکو موجدِ رنگِ خاص کا رتبہ حاصل ہوسکتا۔ فقط

(۳) شرر و سرشار | اس عنوان کے تحت میں حکیم برہم صاحب کا مضمون بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے ہم اسکے متعلق اپنی ذاتی راے ظاہر کرنا نہیں چاہتے البتہ اتنا ضرور کہتے ہیں کہ حکیم صاحب کے بعض فقرونکی ہم ہرگز داد نہیں دیسکتے۔ مثلاً آپ نے ایک جگہہ لکھا ہے کہ "اول الذکر عبارت کو (یعنی اس عبارت کو جہاں سرشار نے کسی دوسرے شخص کی زبان سے اُس کے الفاظ ادا کئے ہیں) اُنکے ذاتی لٹریچر سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ اُسمیں اُنہوں نے صرف دوسروں کی نقالی کی ہے" ہمارے نزدیک فسانہ نگار کے لئے دوسرونکے خیالات انہیں کی زبان میں ادا کرنا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے کہ وہ ان خیالات کو اپنی زبان میں ادا کردے۔ پھر ہماری سمجھہ میں نہیں آتا کہ حکیم صاحب اسکو "دوسرونکی نقالی" قرار دیکر ناقابل لحاظ کیوں خیال کرتے ہیں۔

(۴) کانگریس اور مسلمان | حاجی موسیٰ خانصاحب کے مضمون پر بھی اس مرتبہ ہم کچھہ راے نہیں دیسکتے صرف اسقدر لکھنا چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب نے یہ ایک جائز خواہش ظاہر کی ہے کہ ممبران کونسل کے انتخاب کیوقت بلحاظ آبادی ہندو مسلمانوں کی نسبتی تعداد کا لحاظ رکھا جائے لیکن اسکے ضمن میں اپنی دوسری تجویز کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کی کہ ہندو مسلمان علیحدہ علیحدہ اپنے ممبر کیوں منتخب کریں۔ ہمارے خیال میں نسبتی تعداد کے مقرر ہونے میں کوئی ہرج نہیں ہر البتہ علیحدہ علیحدہ انتخاب مناسب نہوگا۔

(۵) المصباح۔ جیپور | حجم ۶۴ صفحے ماہوار۔ قیمت سالانہ للعہ۔ یہ ایک نیا اور قابل قدر رسالہ جیپور سے ماہوار نکلنا شروع ہوا ہے۔ اسکے اڈیٹر علیگڈہ کالج کے ایک لائق طالب علم سید عبدالسلام صاحب ہیں جنکی طبیعت کچھہ دنوں سے روحانیت کی جانب مائل ہوگئی ہی چنانچہ منجملہ دیگر مقاصد مثلاً حفظ صحت۔ صنعت و حرفت زندہ جاوید یعنی تذکرۂ مشاہیر۔ ورزش جسمانی وغیرہ روحانیت بھی اسکا ایک مقصد ہے اور پہلے پرچے میں اسی بحث پر اڈیٹر صاحب کا ایک عمدہ مضمون ہے رسالہ تمامی پیرایوں میں بہمہ وجوہ عمدہ چھپتا ہے۔ ہمکو اس رسالے کی آیندہ ترقی اور کامیابی کی بہت کچھہ امید ہے۔

غزل جناب ظہیر دہلوی شاگرد ذوق

ساقی شراب لا کہ دم ناؤ نوش ہے
فصل بہار مین کسے توبہ کا ہوش ہے

رخصت شب فراق وہ آتے ہین میرے گہر
وقت وداع دین و دل و عقل و ہوش ہے

مژگان خونچکان نے دکہائی عجب بہار
دامن مرا نہین سبد گل فروش ہے

قطعہ

اک روز کا ہے ذکر سنین یہ مجہسے ہمنشین
یہ ماجرا بہی قابل تسلیم گوش ہے

اک قصر دلفریب کی جانب ہوا گذر
دیکہا کہ ایک انجمن رفتہ ہوش ہے

مصروف ذوق شوق ہین اور محو حال قال
خود رفتگی ہے بیخودیٔ ناؤ نوش ہے

بے بادہ چند مست شراب الست ہین
بے نغمہ ہاؤ ہو کا ہر اک سو خروش ہے

یہ رنگ دیکہکر نہ رہا ان کو پہر قرار
پہونچی ندائے شوق کہ تودیع ہوش ہے

آئی صدائے صبر و دل و دین کہ الفراق
ہوتے یہ ولولے کہ مقام خروش ہے

چاہا یہ دل نے ہوجئے چلکر شریک بزم
ہون بہرہ مند آرزوئے چشم و گوش ہے

ناگاہ ایک غرفے سے پیدا ہوئی صدا
رکہنا قدم نہ آگے اگر عقل و ہوش ہے

مینے کہا کہ پہر مجہے بتلاؤ تو سہی
یہ کیا مکان ہے کیا یہ مسرت کا جوش ہے

آئی ندا خموش نہ بیہودہ کر سخن
یہ جائے دم زدن نہ مقام خروش ہے

کعبہ نہین کہ بار ملے تجہکو بے طلب
مسجد نہین کہ جس مین اذان کا خروش ہے

ہشیار رہے ادب کہ مقام ادب ہے یہ
دیر مغان ہے میکدہ مے فروش ہے

ترک رسوم و قطع تعلق کا ہے مقام
جائے وداع حرمت و ناموس ہوش ہے

بانگ صلوۃ قلقل مینا کی ہے صدا
تسبیح و ذکر زمزمۂ نوشا نوش ہے

کیفیت طلب مئے عرفان کے ہین سرور
حیرت کی بزم ہے مئے وحدت کا جوش ہے

یکجا ہوئے ہین چند حریفان مے پرست
خرقہ بدوش ہے کوئی خانہ بدوش ہے

سرشار جام بادۂ عہد الست ہیں
کچہہ دین کی خبر ہے نہ دنیا کا ہوش ہے

یہ مجذوبن واقف اسرار ماسوا
ونیا سے ہم بے خبر ہین حقیقت کا ہوش ہے

تسلیم کا محل ہے رضا کا مقام ہے
دوزخ سے کچہہ ہراس نہ جنت کا ہوش ہے

ہان آکے دیکہہ چشم حقایق نگر ہے گر
ہان آکے من جوگوش حقیقت نیوش ہے

تقوے اوٹہا کے آج سے بالائے طاق رکہہ
توبہ ست باز آجو سزاوار نوش ہے

ہونا ہی بعد جام من تجہکو تو ہوشیار یک
مینی سے ہی تو پی لے اگر اہل ہوش ہے

انکہون کو بند کرکے اوڑا جام بیخودی
سنتا نہین کہ رحمت حق پردہ پوش ہے

کیا خوب کی ہے قطعۂ عصمت کی پیروی
لاریب اے ظہیر تدلے سر دوش ہے

غزل جناب مولوی فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی

بجلیان گرتی ہین دل پر ساز کی
اور ہین پہر شرکت تیری آواز کی

جس کو دیکہا اوس کو بسمل کر دیا
پہیر دین چہریان نگاہِ ناز کی

فرمن گل کی ہو تیرا اے عندلیب
کوندتی ہین بجلیان آواز کی

جا چکی گلشن سے جب فصل بہار
آہ کب رخصت ملی پرواز کی

پہول پر بار گران ہے رنگ و بو
نازکی ہے اوس سراپا ناز کی

زلف سے دونی ہے عارض کی بہار
شب کو کہلتی ہے گرہ آواز کی

اوس کی انکہون کے کرشمے دیکہئے
سحر کی کہئے نہ کچہہ اعجاز کی

پہر چمن مین سبزۂ نورستہ سے
سرگزشت گلستاں آغاز کی

اس کے دندان ہی سی مالیدہ ہین
کالے بادل مین قطارین قاز کی

جام می سرشار ساقی مہربان
لب تک آجاتی ہین نہ باتین راز کی

جہانکتی ہے پردۂ فانوس سے
شمع بہی لینے لگی پرواز کی

ہر صریر خامۂ رنگین بیان
ہان ہے مرغ نوا پرداز کی

رنگ مین آزاد یہ اردو غزل
ہے بہری بوتل می شیراز کی

غزل جناب قاضی محمد خلیل صاحب حیران بریلوی

جہان دیکہا انہی انداز سے وہ شوخ پنہان تہا
نگہ مین نور تہا۔ پہلو مین دل تہا۔ دلمین ارمان تہا

ہمارے قتل کا سامان عجب لذت کا سامان تہا
گلے پر تیغ تہی۔ سینہ مین خنجر۔ دلمین پیکان تہا

اڑا دین دہجیان ایسی جنون نے دست وحشت سے
گمان تک بہی نہین ہوتا گریبان تہا کہ دامان تہا

ترا بیمار تجہسے شکوہ سنج جور کیا ہوتا
اگر کچہہ تہا تو ہان محو سپاس درد ہجران تہا

تماشا کا محو تہا آئینہ۔ کوئی محو آئینہ
نہین اس کی خبر دونون کو کسکا کون حیران تہا

ہمارے زخم دل سے کون واقف تہا زمانے مین
اگر کچہہ تہا تو نشتر تہا۔ اگر کچہہ تہا تو پیکان تہا

بجز خار تمنا کچہہ نپایا باغ عالم مین
گلون کا ذکر کیا۔ کانٹون سے بہی محروم دامان تہا

تمہاری قید مین کچہہ لطف آزادی ملا ورنہ
تمہارے وحشیون کو خانۂ عالم بہی زندان تہا

کسیکی چشم مست ناز سے وہ بیخودی پائی
کہ جام بادۂ رنگین بہی زیب طاق نسیان تہا

ہوا ترک تعلق اب کہان وہ لطف بے لطفی
مزہ عالم کا اے ظالم تیری کاوش مین پنہان تہا

کہان کا روٹہنا۔ کیسا بگڑنا جب نہو الفت
کسیکے رنج بیجا کا بہی میرے سر پہ احسان تہا

کیا راز حقیقت نے مجہے حیران اے حیران
جو ہر ذرے مین ظاہر تہا وہی آنکہون سے پنہان تہا

غزل جناب حکیم عبد الہادی خان صاحب وفا رامپوری

مین ہون مضمون مفصل صورت مجمل مین ہون
دفتر غم ہون مگر محصور اک جدول مین ہون

بیکسی نے گرچہ محشر سے پرے پہینکا مجہے
کہتی ہے ٹہر کر ندامت مین صف اول مین ہون

شوق عالم کیجیے مین دل ترپاتا جاؤن گا
آپ کیون گہبرا رہے ہین مین ابہی مقتل مین ہون

مین وہی اک بادہ ہون جس سے ہے رنگ شباب
کیا ہوا ساغر مین ہون شیشے مین بوتل مین ہون

آرزوے مرگ ہان اک تیز سا ناخن سہی
بستگی کہتی ہے مین بہی عقدۂ لاحل مین ہون

میری ہستی نیستی کے ساتہہ ملکر رہ گئی
دیکہنا مین خواب مخمل کیطرح مخمل مین ہون

عیب ہون لیکن ہنر والون سے نسبت ہے مجہے
مین بہی بنکر نگاہ دیدۂ احول مین ہون

جیتے جی کیا تھی فقط جانکاہی طول امل
مرتے مرتے بھی مقید آج مین ہون کل یہی ہون
اے وفا احباب کی یہ قدردانی ہائے ہائے
روح معنی ہون مگر اک قالب مہمل مین ہون

غزل از جناب رضا علی وحشت متوطن (کلکتہ)

حسن ہو صرف ہوس یہ امتیاز ناز ہے
غیر کو دکھلاتے ہین انداز۔ کیا انداز ہے!
کب نظر ہوتی ہے ہم حیرت زدون کے حال پر
سُرمہ تیرا دست آئینہ تیرا ہمراز ہے
میری صبح وصل شام ہجر کی تمہید ہے
اور شام ہجر صبح حشر کا آغاز ہے!
صید ہے عاجز تو ہے صیاد بھی عاجز نواز
بے پروبالی مجھے بال و پر پرواز ہے
نکتہ پردازی مین وحشت پیرو غالب ہون مین
سُرمے کو کہتا ہون دود شعلۂ آواز ہے

ولہ

یہ بھی انتہائے غم عشق کی میرے دلکو بیخبری رہی
نہ وہ آہ نیم شبی رہی نہ وہ زاری سحری رہی
دل خستہ کی طرف ایک دن ہوئے ملتفت نہ وہ ملے
میری نذر امید قبول مین جو دھری تھی یونہین دھری رہی
وہ عجب تبسم ناز تھا کہ صبا کو بھی عرق آگیا
نہ تو گل مین رنگ ادا رہا نہ چمن کی جلوہ گری رہی
وہ جو شیشہ تھا سو پگھل گیا تھی شراب جتنی ہوگئی
ستم کشاکش آرزو کہ نہ دل رہا نہ پری رہی
وہ یونہین کب آتی تھی میرے گھر جو وہ آئی بستر مرگ پے
میری آہ تا دم واپسین گلہ مند بے اثری رہی
کہون کیا صعوبت آرزو نہ ملی کہین بھی فنا کی بو
میری خاک وادی عشق مین وہی محو دربدری رہی
ہے یہ حال وحشت خستہ کا ستم جہالت عام سے
نہ خیال شعر و سخن رہا نہ ہوائے نکتہ وری رہی

غزل رضی الدین حسن صاحب کیفی حیدرآبادی۔

خم ہو ساغر صراحی جام پیمانہ مرا
میرے ساقی جب مرا تو ہے تو میخانہ مرا
ہر طرف مشق تصور سے ہے نقشہ یار کا
میرے حق مین جنت الماوی ہے کاشانہ مرا
تم یہان کیا آئے گویا اک خدائی آگئی
آج تو اک محشرستان ہے جلوخانہ مرا
لَیسَ فِی ذَاتِی ہو اللہ کی ہے مجکو سلطنت
بھیس تو یون دیکھنے کو ہے فقیرانہ مرا

ساز و سامان میں میری یہ بیسروسامانیاں
باغ جنت سے بھی اچھا ہے یہ ویرانہ مرا

بصد ستمکے ہوئی ہر قصاب کہتے ہیں وہ
آج تک مرا ہی دیوانہ ہو دیوانہ مرا

دشمن اپنا آپ ہوں میں دوست اپنا آپ ہوں
کوئی دنیا میں یگانہ ہے نہ بیگانہ مرا

میں یہ کہتا ہوں پہلی آگ میں گرتا ہو کون
شمع کہتی ہو مگر ایسا ہے پروانہ مرا

شعر کیا نعرہ بہی سنکر کہتے ہیں کیفی ہے یہ
چھپ نہیں سکتا کہیں انداز مستانہ مرا

غزل حسرت موہانی

گزر گئی حد ستم کی ادائی عتاب ترک کلام کب تک
رہیگی مسدود ای ستمگر رہ پیام و سلام کب تک

اسیر پیر جنوں ہوں آخر مجھے خطر کیا ملامتوں کا
خیال ناموس و ننگ چھوڑوں رہیگی پروائے عام کب تک

وہ جو کہ سنتے تہے لطف رندی سو ہمنے پایا نہ لیکن ابہی
ہے آج سے ترک میگساری بغم صراحی و جام کب تک

قفس میں صیاد بند کردی نہیں تمہ سیر حرم چھوڑ ہی دی
میان امید و بیم آخر رہینگے ہم زیر دام کب تک

اگرچہ ہم خود دلفگار ہی ہیں مگر تغافل شعار ہی ہیں
وہ کرچکے تجربہ لطف حسرت یہ آزمائے ستم کب تک

غزل جناب مسعود احمد ضمیر صاحب مینائی خلف امیر مینائی مرحوم

وہ اور روئیں سنکر فسانا کسی کا
بناوٹ ہے آنسو بہانا کسی کا

ہم اس چاٹ پر بیٹھے ہیں زخم کہولے
چھڑک دے نمک مسکرانا کسی کا

نہ سرمہ نہ مسی فقط سادگی تھی
مجھے یاد ہے وہ زمانا کسی کا

اجل کیون دکہاتی ہے عاشق کو آنکہین
یہ کیون تاکتی ہے نشانا کسی کا

حیا کیسی اک چال ہے شوخیون کی
شب وصل شرما کے آنا کسی کا

تصور کہان ڈہونڈہنے جائے آخر
کہین ہو بہی اے دل ٹہکانا کسی کا

سنا ذکر لیلےٰ تو بولے بگڑ کر
اجی ہان کبہی تہا زمانا کسی کا

کہین چوٹ کہائی ہوئی دلسے آہین
ہوا ناوک افگن نشانا کسی کا

ہزارون کی جانونکو رونا پڑے گا
ہنسی سمجھے ہو تم رلانا کسی کا

جو زلف آئی شانے پہ بولی نزاکت
اُترجائے ظالم نہ شانا کسی کا

ہزارون ہین باتین گر میرے دلکو
رہا یاد اک بہول جانا کسی کا

زرا حالت شمع و پروانہ دیکھو
جلاتا بہی ہے دل جلانا کسی کا

کہا شوق نے سنکے عذر نزاکت
چلے گا نہ مجھسے بہانا کسی کا

تڑپتے ہین بسمل تو کہتا ہے قاتل
کوئی کہیل ہے آزمانا کسی کا

یہ کہتی ہوئی جان ہونٹھون پہ آئی
غضب ہے کسی پر بہ آنا کسی کا

ضمیر آپ انسان اپنا ہے دشمن
مخالف نہین ہے زمانا کسی کا

غزل جناب منشی حبیب النبی خان صاحب صولت متوطن کلکتہ

عشقبازی کا حوصلا نہ رہا
ہم رہے وہ نہ وہ زمانہ رہا

شکوہ غیر کا دماغ کسے
یار سے بہی مجہے گلا نہ رہا

تیرے ملنے کی آس توٹ گئی
زندگانی کا اب مزا نہ رہا

آرزو تیری کیا گئی دل سے
دل مین اب کوئی مدعا نہ رہا

بزم مین شاد کام غیر تو ہین
میرا رہنا ہی کیا رہا نہ رہا

مدعی ہین تو مدعا ہی ہے
یہ نہ کہئے کہ مدعا نہ رہا

بے نیازی بتون کی کیا کہئے
ناز اُٹہانے کا حوصلا نہ رہا

غیر ہر وقت ساتھ رہتا ہے
تجہ سے ملنے مین اب مزا نہ رہا

نقش صولت پہ اُسنے رو کے کہا
مشق بیداد مین مزا نہ رہا

غزل جناب اکمل علی صاحب اکمل متوطن کلکتہ

یہ زبانی غمگساری چہوڑ دے
ہمکو حالت پر ہماری چہوڑ دے

اے جنون دیوانگی ایسی بہی کیا
دامن باد بہاری چہوڑ دے

چہوٹتا ہے اس کا دامان خیال
اے نظر اختر شماری چہوڑ دے

رحم کر ظالم تو اپنی جان پہ
بیکسون کی غمگساری چہوڑ دے

مدتون مین جس کے ہاتھ آئی ہو وہ
آستین کیونکر تمہاری چھوڑ دے

تو بالکل اپنی گردن پر نہ لے
یہ نہ کہہ امیدواری چھوڑ دے

ایک دنیا دار کی نصیحت

اپنے بیٹون سے

(ترجمہ از شیکسپیر)

بعد صد غور و تفکر کام کی ہو ابتدا
سامنے آنکھون کے ہو انجام کا نقشا کھنچا

ست لو زید اور عمرو صورت شیر و شکر
اسقدر ملنے کا بد تر ہے تنفر سے اثر

جس سے ہو منظور یاری کر لو پہلے امتحان
دیکھ لو کھوٹا کھرا پہچان لو ارزان گران

دوستون کے دل بندھے ہون آہنی زنجیر سے
بیشتر ان کی وفا ہو عاشق دلگیر سے

بے ہمالی باعث افلاس ہے جان پدر
پاؤن دھرتے ہون تو اس میدان مین رکھنا پھونک کے

جنگجوئی مین نہ کرنا پیش قدمی زینہار
پر جو یہ آتش بھڑک اٹھے تو رہنا برقرار

ق

تاکہ دشمن کی حماقت اس پہ ہو جائے عیان
اور نہ ہو پھر ہو لکر بھی تم سے وہ جنگ آزما

ہر کسی کی بات سن لو جب کہے جیسا کہے
اپنی باتون کو مگر اغیار سے رکھنا پرے

کوئی گر توہین کرے کرنے دو کچھ پروا نہین
خون اسے پینا پڑے گا زہر جاسے انگبین

عیب جوئی اک بری عادت ہے بے روی و ریا
کون ہو تم کہنے والے یہ بھلا ہے وہ برا

پہنو حسب مقدرت اچھے سے اچھا تو لباس
جان مادر پر طرحداری نہ آنے پائے پاس

ملک پیرس کے رئیسون کی یہی دیکھی ہے چال
جاہ و ثروت میں ملیگی جن کی شکل سے مثال

محمد شہاب الدین خان۔

(از بھاگلپور)

قطعہ تاریخ وفات حضرت حسان ہند مولانا شاہ محمد محسن کاکوروی از جناب مولانا شفیق عماد پوری ضلع گیا

چاک ہے یہ کسکے ماتم مین گریبان سحر؟ | کسکے غم مین سرنگون ہے بام گردون پر ہلال؟
سبزۂ کاہیدہ پامال فنا کیون ہوگیا؟ | سوکہکر کانٹا ہوئی کیون صحن گلشن کے نہال؟
نالہاے آتشین منقار بلبل پر ہین کیون؟ | طوق قمری ہوگیا کیون حلقۂ دود ملال؟
کون ایسا تہا ترنم ریز بستان سخن؟ | بنگئی جسکا نشیمن شجرۂ طوبی کی ڈال؟
کون تہا وہ رشک سحبان شاعر شیوا زبان | ہوگیا کس ناظم معجز بیان کا انتقال؟
بلبل خامہ پکار اُٹہا شفیق از روئے یاس | محسن حسان دوران طوطی شیرین مقال؟ ۱۳۲۲

قطعہ تاریخ وفات مرزا داغ مرحوم از مولوی عبد الجلیل صاحب طوفان ڈپٹی کلکٹر

چون میشود ز دیدۂ مردم روان سرشک | چون دردِ دل زمانہ الم کرد خانۂ
چون روی آفتاب ز سیلی شدہ کبود | چون مہ بدل ز داغ نہادہ نشانۂ
فریاد خلق تا بہ سرِ آسمان رسید | خالی چو شد زمانہ ز داغ یگانۂ
در زیر تیرہ خاک رخ ہمچو مہ نہفت | یکتاے روزگار فرید زمانۂ
افتادہ است زیر زمین ہمچو بیکسان | اے آنکہ داشت روئے فلک آستانۂ
یابی چو گنج از ستم و جورِ آسمان | از رنج در خرابۂ ولہا خزانۂ
بینی سہیم خستہ دلان محنتش | ہر سہم حادثہ کہ خورد بر نشانۂ
ہرکس بوقت خود ز جہان میرود مگر | قالب برائے رفتن او شد بہانۂ
داند بفکر شعر چہ خون جگر خورد | گوید چو او کسی غزل عاشقانۂ
باید کشید در غمِ آن عندلیب ہند | درد آشنا چو بلبلِ شیدا ترانۂ
تا کی کنم ز غصہ نمک سود زخم دل | تا کے کشم ز آتش ہجرش زبانۂ
تا آفتاب ہست بہ نظمش بود نشان | تا مہ بود ز داغ بماید فسانۂ
طوفان نوشت مصرع تاریخ فوت او | قطعہ | دارد بخاک بلبل ہند آشیانۂ ۱۳۲۲

مرزا کی شاعری

(ماخوذ از مقدمہ شرح غالب)

میر تقی میر نے جو مرزا کے ہموطن تھے انکے لڑکپن کے اشعار سنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی اُستاد کامل ملگیا اور اُسنے اسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا ورنہ مہمل بکنے لگیگا۔"

اس قول سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کی نظر تنقید سخن کے باب میں کتنی کھری اور سچی تھی۔ حقیقت میں مرزا نے کچھ تو اپنی فطرتی ذکاوت اور دشوار پسندی کے بنا پر اور کچھ فارسی سے طبعی مناسبت اور مُلا عبدالصمد کی تعلیم کے اثر سے، ابتدا میں وہ جو بیدل کا سا رنگ اختیار کیا تھا، اگر اسی پر قائم رہتے اور سلامت طبع یا بعض صحیح المذاق احباب کی نکتہ چینی تبدیلی رنگ سخن کا باعث نہو جاتی تو اسمیں کچھ شبہ نہیں ہی کہ اُن کا کلام مہمل سمجھا جاتا اور عوام کی طرح خواص میں بھی کبھی مقبول نہوتا۔

لیکن مرزا کی قسمت میں چونکہ ایک عدیم المثال اور کامل شاعر ہونا لکھا تھا اسلئے بہ اعانت ذہن سلیم و طبع اثر پذیر ان کے کلام سی اشکال اور پیچیدگی کا عیب بتدریج کم ہو کر ہنر کے درجے کو پہونچگیا۔

ابتدائی رنگ سخن ملاحظہ ہو ؎

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدای بیسر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

یکقدم وحشت سے درسِ دفتر امکان کھلا
جادہ اجزای دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہے ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا	یاں جادہ بھی فتیلہ ہی لالے کے داغ کا
بادۂ رہ خور کو وقت شام ہی تار شعاع	چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع
از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ	طوطی کو شش جہت سے مقابل ہی آئینہ
حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہی	آئینہ زانوی فکر اختراع جلوہ ہے

ان اشعار میں اشکال مضمون کے علاوہ الفاظ بھی اسقدر غریب اور ثقیل آئے ہیں جن کی کوئی شخص تعریف نہیں کر سکتا۔

لیکن جیسا کہ ہمنے پہلے بیان کیا مرزا کی شاعری سی ثقل و پیچیدہ کلامی کا یہ عیب رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا چنانچہ ان کے اشعار کا درمیانی رنگ فی الجملہ قابل اعتراض نہیں ہی بلکہ بعض بعض موقعوں پر تو فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو اُردو کے ساتھ اس بندوبست اور حُسن کے ساتھ ملایا ہی کہ اسکی داد نہ دینا ظلم ہی۔ ملاحظہ ہو

تپش سی میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے	مرا سر رنج بالیں ہی مرا تن بار بستر ہے
سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے	دل بیدست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئی ہو	فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے
ہی آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے	صبح وطن ہی خندۂ دنداں نما مجھے
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست	ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

یہاں "نقش درست کیا" فارسی محاورے کا ترجمہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہی کہ مرزا نے اس کے ترجمے کو اُردو شعر میں کس ترکیب سی گوارا بنا دیا ہے۔ اس قسم کے ترجموں کی متعدد مثالیں مرزا کے کلام سی مل سکتی ہیں جو قابل اعتراض نہیں ہیں لیکن مستحق ستایش بھی نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً

ع "شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا" یہاں مرغوب آیا محاورہ فارسی کا تتبع ہی۔

ع "آگاہی گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر" تماشا کر" بھی تماشا کردن" سی لیا گیا ہے۔

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا	۵	بمہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
زکات حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا		چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے		مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے		کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا

مطلع میں "رسوا بیوفائی کا" ترجمہ ہے "رسوائی بیوفائی کا"۔

دوسرے شعر میں جلوۂ بینش کی روشن ترکیب اور باقی دو شعروں میں اردو اور فارسی الفاظ کی خوبی آمیزش کو مرزا کے درمیانی رنگ سخن کا پسندیدہ نمونہ سمجھنا چاہیئے۔

اہل نظر پر مخفی نہ ہوگا کہ یہ انداز اگرچہ اُسی ابتدائی اور اُب لکھے ہوئے فارسی انداز سے مشتق اور مماثل ہے لیکن مشق اور احتیاط نے دونوں میں کسقدر فرق نمودار کر دیا ہے۔ وہ ثقیل اور ناگوار تھا۔ یہ لطیف اور گوارا بلکہ منظور اور مرغوب ہے۔ اُسمیں نقص اور خامی کی علامتیں پائی جاتی تھیں تو اسمیں کمال اور پختگی کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ ارباب مذاق دیکھینگے کہ مرزا کے کلام کا یہ حسن روز افزوں یہیں پر نہیں ٹھرا بلکہ مشق جاری کے ساتھ خوبی اور دل پذیری کے تمام درجے طے کر کے اس مرتبے پر فائز ہوا کہ عدیم المثالی کی شان میں یکتا قرار پایا ملاحظہ ہو۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں	خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں	تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہوگئیں
واں گیا بھی میں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب	یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج	مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہوگئیں

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو	نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہمسے سرگراں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

کہا تمنے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

اس آخری شعر کے مصرعہ ثانی میں مرزا نے تکرار الفاظ اور شوخیِ بیان کا عجیب و غریب نمونہ پیش کیا ہی۔ اور یہ وہ انداز کلام ہے جو مرزا کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس رنگ کا اور بھی ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

اس مطلع میں بھی مصرعہ اول کی نئی بندش میں "نہیں" کا لفظ شروع میں اس سلیقے اور اہتمام کے ساتھ رکھا گیا ہی کہ پورے شعر میں جان پڑگئی ہی۔

مرزا کے اس آخری انداز کلام میں فصاحت اور بلاغت کی شانیں اس خوبی کے ساتھ فراہم ہوئی ہیں کہ کمال سخن سنجی کی اس سے بہتر مثال ذہن میں نہیں آتی۔ کیا خوب لکھا ہے۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہی
چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمائش ہی

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہی

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

دیکھو تو دلفریبیٔ انداز نقش پا
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فرداودی کا تفرقہ یکبار مٹگیا
تم کیا گئے کہ ہمپر قیامت گزر گئی

مرزا کے خصوصیات کلام میں سے یہ بات عجیب ہی کہ جب کبھی وہ فارسی ترکیبوں سے گزر سہل ممتنع پر آجاتے ہیں تو سادگی اور روانی کا دریا ہی بہا دیتے ہیں مثلاً

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

جان تمپر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ہمکو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئینگے
مگر آشفتہ بیانی میری

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید
ناامیدی اُسکی دیکھا چاہیئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالینگے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ان اشعار کی خوبی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انمیں سے اکثر مقبول انام ہوکر ضرب المثل کے درجے تک پہونچ چکے ہیں۔

یہاں تک مرزا کے الفاظ ۔ ترکیب اور بندش کی خوبیوں پر بحث کرکے جب ہم اُن کے کلام پر بحیثیت مضمون و معنی پر نظر ڈالتے تو اس شان میں بھی اسے یکتا تسلیم کرنا پڑتا ہے یعنی اسلئے کہ جذباتِ انسانی کی جیسی سچی تصویر مرزا نے بصورت اشعار پیش کی ہے اُسکا جواب میر کے بعد کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے دستیاب ہوسکیگا۔

لاریب مرزا نے بعض بعض اشعار کے اجمال میں سلسلۂ خیالات و جذبات کی ایسی تفصیل پنہاں کی ہے جس کی تشریح کے لئے دفتر بھی ناکافی ثابت ہوں تو عجب نہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

کس منھ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص	پرسش ہی اور پائے سخن درمیاں نہیں
رہی اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے	تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں	یعنی سبق شوق مکرر نہوا تھا
گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب	دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو	یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے	کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا	میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی	وہ جو اک لذت ہماری سعیِ بیحاصل میں ہے
جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو	یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

ارباب شوق غور کریں کہ ان اشعار میں سے ہر ایک شعر وسعت و حقیقت

مضمون کے لحاظ سے فرد ہے۔

کسی ایسے مضمون کا تلاش کرنا جو کسی کے ذہن میں نگزرا ہو بڑا ہنر ہے لیکن ہماری نزدیک اس سے بھی بڑھکر کمال ان مضامین کا ادا کرنا ہی جو اہل دل لوگوں کے ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں اور جنسے ہر صاحب درد واقف ہوتا ہے لیکن جنکا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہوسکتا۔

اس قسم کے خیالات کا قید بیان میں لانا ہر شخص کا کام نہیں ہے لاریب مرزا سنے مندرجہ بالا اشعار میں جذبہ نگاری کا وہ کمال صرف کیا ہے جسکی مثال ایشیای شاعری تو کیا مغربی شاعری میں بھی بدقت دستیاب ہوگی۔

کلام غالب کے صفات معنوی میں دوسرے درجے پر وہ خصوصیت ہی جسکو نزاکت معنی سے تعلق ہے۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس سے مرزا کے اشعار کی دلچسپی توجہ اور غور کے ساتھ افزوں ہوتی جاتی ہے۔ جب بڑھئیگا نیا سرور حاصل ہوگا اور جے بار دیکھئے گا وسعت مضمون اور نزاکت معنی کی کیفیتوں کو نئی اور پہلے سے بہتر صورت میں جلوہ گر پائیگا۔ مثلاً

(۱) کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا ۔۔۔ دل کہاں کہ گم کیجے ہمنے مدعا پایا

سرسری طور پر ملاحظہ کیجئے تو اس شعر کا مفہوم معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن نگاہ غور سے دیکھئے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ہمنے مدعا پایا یعنی ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے کہ آپنے ہمارا دل پالیا ہے اور یہ باتیں کہ اگر ہم تیرا دل پائینگے تو نہ دینگے دل پا لینے کے بعد کی ہیں یعنی جیسے لوگ گم شدہ چیز پاکر چھیڑنے کے لئے مالک شی سے کہا کرتے ہیں۔

(۲) تو دوست کسیکا بھی ستمگر نہوا تھا ۔۔۔ اوروں پہ ہی وہ ظلم کہ مجھپر نہوا تھا

اسکا ظاہر مطلب یہ ہے کہ تو کسیکا بھی دوست نہیں ہے اور تیرا جور مجھی پر نہیں ہی

بلکہ اوروں پر بھی ہے اور مجھسے زیادہ ہے۔ لیکن غور کرنے سے یہ بھی مطلب ممکن ہے کہ شاعر کہتا ہو کہ "جو ظلم مجھپر نہیں ہوا وہ تو اوروں پر کر رہا ہے۔ اور مجھے چونکہ شرکت اغیار کسی صورت سے گوارا نہیں ہے اسلیئے تیرا ظلم نکرنا بھی گویا مجھپر ایک ظلم عظیم ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترکِ جور بربنائے دوستی نہیں ہے۔

(۳) کون ہوتا ہے حریفِ مۓ مردافگن عشق ۔ ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

"اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مۓ مردافگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد کوئی شراب عشق کا خریدار نہیں رہا؟ اسلئے اسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے۔

مگر زیادہ غور کرنیکے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اسمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں، اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے ۔ ایک دفعہ بلانیکے لہجے میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مۓ مردافگن عشق"، یعنی کوئی ہے جو مۓ مردافگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق"، یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ (از یادگار غالب)

(۴) کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز ۔ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس شعر سے دو نازک معنی پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس بت پر جان قربان کرنا عین ایمان ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بت میرا ایمان ہے پس جان ایمان پر سے قربان ہے

(۵) مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور ۔ رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

"رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم"، کیونکہ دیارِ غیر میں میرا کوئی شناسا نہ تھا اسلئے اگر وہاں بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں موت آئی تو کچھ زیادہ ذلت

نہوئی - یا یہ کہ وطن سے دور مارے جانے میں بیکسی کی شرم رہگئی کیونکہ اگر وطن میں مارا جاتا تو بیکسی کی تکمیل نہوتی - ۱۲

(۶) قاصد کے آتے آتے خط اکساور لکہ رکہوں		میں جانتا ہوں جو وہ لکہینگے جواب میں

میں جانتا ہوں جو وہ لکہینگے جواب میں" یعنی مجہکو معلوم ہے کہ وہ کچہ نہ لکہینگے - مطلب یہ ہی کہ اگر اُن کی جانب سے کسی تحریر کے آنیکی امید ہوتی تو دوسرا خط لکھنے کے لئے اسکا انتظار کیا جاتا - لیکن چونکہ مجہکو خوب معلوم ہی کہ وہ کچہ نہ لکہینگے اسلئے جواب خط کا انتظار بیکار ہے چاہیئے کہ" قاصد کے آتے آتے الخ"

(۷) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی		منہ چہپانا ہم سے چہوڑا چاہیے

کہتا ہے کہ تم مجہ سے خصوصیت کے ساتہ منہ چہپانا چہوڑ دو یعنی جسطرح سب کے ساتہ بے تکلف بیحجاب اور بیگانہ وار رہتے ہو اسیطرح سے میرے ساتہہ بہی رہو کیونکہ اس قسم کی بیگانگی دوستی کا پردہ ہوتی ہے یعنی اس سے لوگوں کو محبت کا حال معلوم نہیں ہونے پاتا - ۱۲

مثالاً یہ چند اشعار اور اُنکے علاوہ اور بہت سے شعر ایسے ہیں جنکے مفہوم پر جسقدر غور کیجیئے گا اُسیقدر اُسکی نزاکت دریافت ہوتی جائیگی -

ان چند مخصوص خوبیوں کے علاوہ مرزا کا کلام شاعری کے عام محاسن کے اعتبار سے بہی ممتاز نظر آتا ہے -

استعاروں کی ندرت، تشبیہوں کی تازگی اور اشاروں کی نزاکت و لطافت کی مثالوں سے مرزا کا دیوان بہرا پڑا ہے -

عامیانہ مذاق اور مبتذل بازاری الفاظ نیز فحش اور ہجو سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہی - مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہی لیکن اُنہوں نے عشق کے معنی داغ دہلوی یا رند لکہنوی کے مانند بوالہوسی کے نہیں لئے ہیں اور اسلئے اُنکے خیالات میں دناءت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہی جس کی

مثال شعرائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید ہی اور متاخرین شعرای دہلی کے کلام میں کمیاب ہے ہمنے مرزا کی شاعری کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسکی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے لکھا ہی ورنہ از قبیل شاذ انکے دیوان میں ایسے اشعار اور الفاظ بھی موجود ہیں جنپر مذاق صحیح اور زبان صحیح دونوں کی جانب سے اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

۱- پنیں میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے		کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

اس شعر کا پست مذاق مرزا کی شان شاعری کے بالکل خلاف ہی جسے ہم عام طور پر مبتذل خیالات اور الفاظ سے پاک بیان کر چکے ہیں۔

۲- غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے		یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے
۳- بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے		مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
۴- جلا ہی جسم جہاں دل بھی جلگیا ہوگا		کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

یہاں دوسرے شعر میں "بودا" تیسرے میں "بھوں" اور چوتھے میں "کریدتے ہو" نہایت ناگوار اور ثقیل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

۵- خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں		کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

اس شعر میں پہلا مصرعہ خوب ہی لیکن دوسرے شعر میں "جاناں کا دامن" نہایت غیر فصیح واقع ہوا ہی

۶- بیٹھا ہی جو کہ سایۂ دیوار یار میں		فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

یہاں کشور ہندوستان کی فارسی ترکیب میں اعلانِ نون غلط ہی اگرچہ اسکی نسبت یہ تاویل ہو سکتی ہی کہ مرزا کے وقت تک ایسا لکھنا ناجائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۷- دل اسکو پہلے ہی نازو ادا سے دے بیٹھے		ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

یہاں "تقاضے کا" کی جگہ "تقاضا کا" بالکل بے قاعدہ اور محض بضرورت قافیہ استعمال کیا گیا ہی۔

۸ - سادہ پرکار ہیں خوباں غالب - الخ

یہاں خوباں کا لفظ اردو محاورے کے خلاف ہے۔

۹ - قیامت ہی کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب	وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہی مجھسے
۱۰ - شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے	داغِ دل بیدرد نظرگاہ حیا ہے

ان دونوں شعروں میں "نہیں" کی جگہہ "نہ" غلط آیا ہے۔

۱۱ - آمد سیلاب طوفان صدای آب ہے	نقش پا جو کان میں رکھتا ہی انگلی جادہ سی
بزم مے وحشتکدہ ہی کسکی چشم مست کا	شیشے میں نبض پری پنہاں ہی موج بادہ سے

یہاں پر دوسرے شعر پر نظر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہی کہ قافیہ "بادہ" اور "جادہ" ہے لیکن پہلے شعر میں اردو ترکیب کے اعتبار سے "جادی سے" چاہئے نہ کہ "جادہ سے" اور اسلئے قافیہ غلط ٹھرتا ہے۔

۱۲ - اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں	غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

یہاں پر قاعدے کی روسے "مجھے" کے بعد "اپنی اوقات سے" آنا چاہئی تھا لیکن مرزا نے خلاف قاعدہ "مجھے میری اوقات سے نفرت ہی" نظم کر دیا ہے۔

مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبای نظم لکھنوی نے اپنی شرح دیوان غالب میں مرزا کی اس قسم کی اور بھی بہت سی غلطیاں دکھائی ہیں جنکا کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔

ہماری نزدیک صحت زبان و محاورہ کی جانب سے بے پروای مرزا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہی بلکہ شعرائے دہلی عموماً خوبی مضمون کے مقابلے میں درستی الفاظ کا زیادہ خیال نہیں رکھتے ہیں۔

صحت زبان کے معاملے میں غالب کے دہلوی ہمعصروں میں سی استاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہیں اور اسی لحاظ سے ہمارے نزدیک اگرچہ بحیثیت مجموعی غالب ذوق و مومن سے افضل ہیں لیکن صرف اردو شاعری کے لحاظ سی ذوق کا درجہ غالب سے

اور غالب کا مرتبہ مومن سی بلند ہی۔

پولیٹکل خودکشی

قاضی کبیر الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا بمبئی اور اڈیٹر صاحب اُردوی معلی کا مسلمان پبلک کو ممنون ہونا چاہیے کہ اُنہوں نے نیشنل کانگرس کیجانب سے انگریزی زبان سی ناواقف گروہ کی غلط فہمی مٹانے کو رپورٹ انڈین نیشنل کانگرس کا خلاصہ اُردو میں شائع کیا۔ صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ تمام سوسائٹی کو انکا شکریہ ادا کرنا لازم ہی۔ اس خیال سے کہ اُنہوں نے مناسب طور سی اس بات کی کوشش کی ہی کہ اپنے ہم مذہبوں کو پولیٹکل خودکشی کی پالیسی سے روکیں نیشنل کانگرس کی شرکت کیجائے یا نہ کیجائے مگر تمام پولٹیکل تحریکوں سے علیحدگی کا افسوسناک نتیجہ یہ نظر آتا ہی کہ ملکی اور انتظامی اُمور میں حصہ لینے کی خواہش مسلمانوں سے مٹتی جاتی ہی اور وہ ایسی بے بسی کی حالت میں باوجود اپنے پولیٹکل اثر اور علمی ترقی کے پڑتے جاتے ہیں کہ یہ کہنا دشوار ہے کہ آیندہ اسکا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسوقت دیگر افرادِ قوم سی علیحدگی بلاشک متفقہ قوت کو کمزور کرتی ہی مگر جسقدر کہ دیگر اقوام کو نقصان نہیں پہونچتا ہی اس سے زیادہ خود مسلمان ہموطنوں کو پہونچ رہا ہی۔ کاش لیڈران قوم اسوقت بھی گزشتہ حالت کی جانچ کرتے اور ملکی پالیسی میں اُن تغیرات کو عمل میں لاتے جو انکی ہستی کے لئے ضروری ہیں۔

اس سال سے بڑھکر کسی زمانے میں قومی ہل چل ہندوستان میں نہیں پیدا ہوئی۔ تمام تعلیم یافتہ جماعت کے دلپر گذشتہ ۸ ماہ کے واقعات نے

کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے - اور مصیبت ہی میں پڑکر سہی مگر ایک قومیت کا خیال تمام ملک میں پھیل گیا ہے - اگر ہمکو اپنے ہموطنوں کی رائے کے اندازے کا موقع ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ ۲۰ سال کے زمانے میں گورنمنٹ کی کسی پالیسی نے ملک میں وہ اتحاد اور قومی ہمدردی نہیں پیدا کی جو لارڈ کرزن کی اس سال کی کارروائی اور تقریروں سے پیدا ہو گئی - ہندوستان کے باشندوں کے دلوں پر چوٹ لگی - ہندو اور مسلمان ہر ایک کے مُنہہ سے آہ کی آواز سنائی دی مگر افسوس کہ ایک گروہ نے اپنے آہ و فغاں کا اظہار اس طریقے سے کیا کہ حاکم وقت نے محسوس کیا کہ واقعی اوسکے نائبوں نے اس طریقے سے حکومت کی کہ باشندگان ملک اُس سے راضی نہیں رہے دوسری طرف قوم کی آہ و فغاں ظاہر کرنے والے لوگوں نے صرف اپنے بھائیوں کی ہستی مٹانے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ بلاخوف اسکے کہ ہمارے ہم مذہب کیا کہینگے قومی ترقی کے مخالفین کو خوشنودی کا سارٹیفکٹ دینے میں بھی تامل نہیں کیا اور اسکا موقع دیا کہ تمام قوم کی قوم کے اغراض و مقاصد کے سمجھنے میں غلطی کیجائے - یہ خودکشی کی اُس پالیسی کا جو عارضی منافع کی لالچ میں بعض مسلمان لیڈروں نے اختیار کی ہے، اول نتیجہ ہے لارڈ کرزن کی یونیورسٹی اور ویلیڈیشن ایکٹ نے تمام ملک میں برہمی پیدا کر دی - آخری مسودہ قانون پر جب کونسل وائسرائے میں مباحثہ شروع ہوا اور آنریبل مسٹر گوکھلے کی تقریر ہوئی اور اُنکے ساتھ تمام غیر سرکاری ملازم ممبران کونسل نے مخالفت کی آواز بلند کی تو لالہ لاجپت رائے نے کونسل ہال سے نکلکر مجھسے بیان کیا تھا کہ اب بھی ہندو قوم مردہ نہیں ہے یعنی جب تک وہ گوکھلے کے سے لوگ پیدا کریگی مردہ نہیں کہی جا سکتی - دو روز کے جب سنٹ ہاؤس یونیورسٹی میں تعلیم یافتہ جماعت کی نسبت حضور والیسرائے کو میں نے طعن و تشنیع کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے سنا اور بعد کے جلسے میں

اس تقریر پر لیڈران بنگال کی آزاد نکتہ چینی کے کلمے سُننے تو اطمینان پیدا ہوا کہ کچھ بھی ہو اب بھی مردہ ہندوستان میں خودداری کا خیال باقی ہے ہی اور اسی کے سہارے قومی ترقی کی دیوار بلند کیجا سکتی ہے ۔ والیسرائے کی تقریر کے خلاف جب ہندوستان کے مختلف حصص میں اظہار ناراضی کے جلسے ہوئے اور تعلیم یافتہ جماعت کے معزز لیڈروں کو اُن جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے دیکھا تو دل کو ڈھارس ہوئی اور یہ خیال مضبوط ہوا کہ اب بھی ملک میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو دل کی بات زبان پہ لاکر اعلیٰ ترین حاکم کے مُنہ پر کہہ سکتا ہے ۔ اسحالت میں میری مایوسی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے اور آپ خیال کرسکتے ہیں کہ میرے دلکو کیسی ٹھیس لگی ہو گی جب شمالی ہند میں آکر میں نے یہ دیکھا کہ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے تعلیم یافتہ اہل ملک سی ہمدردی کا جوشش کم ہو بلکہ جو لوگ زبان یا قلم سے کچھ کہسکتے ہیں وہ ملک کی عام راے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر رہے ہیں ۔ لارڈ کرزن کی کانوکیشن کی اسپیچ جسقدر اہل ہنود کو ناگوار ہو سکتی تہی اُسیقدر مسلمانوں کو اگر اُنہوں نے اہل ایشیا کی راست بازی صداقت اور ایمانداری کی معیار پر حملہ کیا تہا اگر اون کو لغو اور مبالغہ گو قرار دیا تہا اگر اُن کو مکّار اور چالاک بنایا تہا تو اس الزام سے مسلمانوں کو مستثنےٰ نہیں کیا تہا ۔ اتہام بیجا تمام مذاہب اور پیروان ملت اہل ایشیا پر تہا ۔ اتہام ایسا بیجا تہا کہ اینگلو انڈین اخبارات میں ایک کی بھی جرات نہیں ہوئی کہ لارڈ کرزن کی پالیسی کی تائید کرتا ۔ ایک بھی اینگلو انڈین تمام ہندوستان میں ایسا نہیں نکلا کہ جسکی کچھ بھی وقعت ہوتی ہو اور جسنے لارڈ کرزن کی حمایت کی ہو اگر حمایت ہوئی تو شمالی ہند کے اُن اردو اخبارات کے کالموں میں جو باموقع وبے موقع مسلمانوں کے نائب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ تائید ہوئی تو بھی

میں صاحبزادہ نصر اللہ خان کے جلسے میں جسنے رزولیوشن پاس کیا کہ ہم کو لارڈ کرزن کی پالیسی سے مطلق شکایت نہیں ہے۔ شمالی ہند کے اردو اخباروں یا اس بمبئی کے جلسے کی زیادہ وقعت نہ کیجائے مگر یہ باتیں ہمت کو پست کردینے اور ایک عظیم گروہ مسلمانانِ ہند کے گمراہ کردینے کو کافی ہیں۔ ان سے تعلیم یافتہ جماعت ہند کے زیادہ تحمل نہ کرنے والے گروہ اور مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

کنووکیشن کی تقریر کے بعد لارڈ کرزن کی تقسیم بنگالہ کی تحریک نے ملک میں جوش پیدا کیا بلا شک تقسیم بنگالہ کا اثر ہم باشندگان صوبجات متحدہ پر مطلق نہیں ہے مگر ہمکو بنگالیوں سے ہمدردی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تقسیم کا مسئلہ الغرض سے چھیڑا گیا ہے کہ بنگالیوں کا قومی شیرازہ ابتر ہوجائے اور اگر یہ خیال درست ہو تب بھی لارڈ کرزن نے اس تجویز کی منظوری کے وقت اُن تمام اُصولوں کو نظر انداز کیا ہے جن پر برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہندوستان میں قائم ہے۔ لارڈ کرزن نے رعایا کی عرض و معروض کی مطلق پروا نہیں کی اُنہوں نے سرکاری افسروں سے مشورہ نہیں لیا اور جن افسروں سے مشورہ لیا اونمیں سے جنہوں نے مخالفت کی اُن کی مخالفت کی پروا نہیں کی رعایا کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا، پوری اسکیم کبھی رعایا کے روبروپیش نہیں ہوئی۔ ایک بھی ہندوستانی اہل الرائے جسکا بنگال میں اثر ہو، لارڈ کرزن کی اسکیم کے موافق نہیں ہے متوسط درجوں کے علاوہ مالکان اراضی نیز غیر سرکاری ملازم یورپین بھی دل سے اس تجویز کے مخالف ہیں۔ ہندوستانیوں کے تمام اخبار اس تجویز کے خلاف ہیں۔ انگریزوں کے چار مشہور اخبار کلکتے میں ہیں اور چاروں لارڈ کرزن کی پالیسی کے مخالف ہیں تمام ملک کی ہمدردی بنگالیوں کے ساتھ ہے۔ مسلمانان بنگال بھی ہیمی

آواز سے مخالفت میں شریک ہیں لارڈ کرزن کی یہ تدبیر کہ نواب صاحب ڈھاکہ
کو اپنے موافق بناکر مشرقی حصہ بنگال کے مسلمانوں کو تقسیم بنگالہ کے موافق
بنائیں کامیاب نہیں ہوئی۔ مگر شمالی ہند کے مسلمانوں کے کانوں میں یہ پھونک
دیا گیا ہے کہ تمہارے لئے علیحدہ رہنے کی پالیسی مناسب ہی لہذا اسی پر اکتفا نہیں
کی گئی ہے کہ خاموشی اختیار کیجاتی بلکہ یہاں سے بنگال کے زخموں پر نمک چھڑ
جاتا ہے اور اس امید میں تقسیم بنگال کی تائید کیجاتی ہے کہ جدید صوبے میں
مسلمانوں کو اسامیاں زیادہ ملینگی۔ حالانکہ پائنیر تک لکھتا ہے کہ بنگالی قوت
شکست نہیں ہو سکتی اور مشرقی بنگال کے بنگالی ایسے ذہین اور فطرتی ہیں کہ
جدید صوبہ اسی طرح سے بنگالی صوبہ ہو جائیگا جیساکہ قدیم صوبہ تھا۔ اس مخالفت کے
کیا معنے ہیں اور اسکا کیا اثر پیدا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ طبیعتوں میں رنجش پیدا ہو
اور بجائے اتحاد کے تفرقہ بڑھے۔ لارڈ کرزن ہندوستان سے جا رہے ہیں
چاروں جانب سی بذریعہ تار ہمدردی کے سارٹیفکٹ اُن کی خدمت میں بھیجے جا
ہیں۔ لارڈ کرزن کی پالیسی سے اگر نقصان پہنچا ہے تو ہندو اور مسلمان دونوں
متوسط درجے کے ہندو خاموش ہیں تعلیم یافتہ جماعت کی قائم مقام کسی انجمن کی
یہ مجال نہیں ہی کہ اُنکی پالیسی سے خوشنودی ظاہر کرے مگر برعکس اوسکے اسلامی
انجمنوں سے خوشنودی کے تار بھیجے جا رہے ہیں مسٹر دادابھائی نوروجی نے
ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا ایک انگریزوں کا ہندوستان اور دوسرا
ہندوستانیوں کا ہندوستان۔ بلاشک انگریزوں کے ہندوستان میں لارڈ کرزن
نے برکتیں نازل کیں اور انجمن تجار کو البتہ موقع اظہار افسوس حاصل ہے کہ ا
بہتری چاہنے والا وائسرائے ہندوستان سے رخصت ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں
پر کونسی برکتیں نازل ہوئی ہیں، کونسی اونکی بیکاری دور کی گئی ہے کونسی اُ

ذرائع معاش بڑہائے گئے ہیں، کونسے اُنکے اختیارات وسیع کئے گئے جسپر یہ افسوس اور ناراضمندی کا اظہار ہو رہا ہے۔

یہ سب کارروائی اسوجہ سے ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پولیٹکل امور کیجانب مطلق توجہ نہیں ہے۔ جہاں نیشنل کانگرس سے علیحدہ رہنے کا وعظ کہا گیا وہاں پولیٹکل خودکشی تک نوبت پہونچ گئی یہ خودکشی صرف مسلمانوں ہی کے لئے مضر نہیں ہے جنکی آیندہ ترقی رُک جائیگی بلکہ تمام ملک کیلئے جس سے اُنکو مثل دیگر باشندگان ملک محبت ہی۔

نیشنل کانگرس سی شرکت کیجائے یا نکیجائے گو ہمکو یہ دیکھکر خوشی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان وکیل اور بیرسٹر جو اب تک کانگرس سے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ دلچسپی لینی چاہئے مگر کانگرس سے دلچسپی ہو یا نہو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بطور خود بیدار ہونا چاہئے اور ملکی امور میں وہ حصہ جد وجہد کا لینا چاہئیے جو اُن کا فرض ہے۔ پچھلے زمانہ میں علیحدہ رہنے کی پالیسی سے وہ نقصان اُٹھا چکے ہیں، اور ملک کو مضرت پہونچ چکی ہی۔ جن لوگوں نے علیحدگی کی پالیسی کا وعظ کہا تہا وہ یہ نہیں دکھلا سکتے گذشتہ ۱۷ یا ۱۸ سال میں مسلمانوں نے ہندو سے زیادہ کیا فوائد پولیٹکل اُمور میں دلچسپی نہ لینے سے اُٹھائے ہیں پچھلی غلط فہمیوں کی شکایت اور شکوہ بیکار ہے دو ماہ بعد محبان قوم بنارس میں زیر صدارت ایک ایسے ہموطن کے مجتمع ہونگے جنکے ایثار نفس کے مسلمان بھی مثل ہندوؤں کے قائل ہیں۔ اموقع پر وہ اصحاب جو لیڈری کا دعوی کرتے ہیں جمع ہوں اور کم سے کم اُن اُمور میں اپنے ہندو ہموطنوں سے اظہار ہمدردی کریں جن میں وہ اپنا نفع سمجھتے ہیں اور اوس پولیٹکل اتحاد کی جڑ ہندوستان میں مضبوط کریں جسپر ہماری آیندہ بہتری کا دارومدار ہی۔ اعتدال و احتیاط جسقدر بھی چاہیے عرض و معروض میں اختیار کیجائے مگر ساتھ

ہی زبان سے اُن خواہشات کا اظہار کیا جا ہے جنکے پورے ہونے پر ہموطنوں کی آیندہ خوشحالی قناعت اور برٹش سلطنت کا استحکام منحصر ہے۔

گنگا پرشاد ورما

دار السلطنت فرانس کی سیر

نمبر ۱

صبا بہ تہنیت پیر مے فروش آمد | کہ موسم طرب و عیش و ناو نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا | درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
بگوش ہوش نیوش از من و بعشرت کوش | کہ ایں سخن سحر از ہاتفم بگوش آمد

میں انگلستان جاتے وقت جب پیرس ہو کر گذرا تو تمام خیالات جو اس دار السلطنت فرانس کے متعلق نادیدہ ایک مدت سے میرے دل میں تھے جوش مارنے لگے اور اس خوبصورت شہر کی گرد و نواح کے مناظر نے مجھے ایسا از خود رفتہ کیا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ موسم گرما کی چھٹیوں میں جو یکم جولائی سے شروع ہوتی ہیں اُسے ضرور بالضرور بالتفصیل دیکھونگا گرمی کی چھٹیوں کا زمانہ اور وہ بھی شروع چھٹیوں کا زمانہ میں نے اسلئے اور مناسب سمجھا کہ پیرس اُن دنوں باغ و بہار کی طرح شگفتہ رہتا ہے۔ تمام اطراف یورپ سے امرا صرف عیش و عشرت کی خاطر ادھر کا رُخ کرتے ہیں اور فیشنیبل لائف کا ایسا دلفریب سین نظر آتا ہے کہ دوسری جگہہ اس کا خیال کرنا بھی محال ہے۔ یہ ازدحام جوں جوں گرمی بڑھتی جاتی ہے کم ہوتا جاتا ہے اور اسجگہ سے منتقل ہو کر سمندر کے کنارے کے مقامات میں منتشر ہو جاتا ہے۔

میرے چند فرانسیسی دوستوں نے پیرس کا تذکرہ پہلے ہی مجھسے کیا تھا خاص کر اُس شکر لب۔ دلفریب اور خوش طبع لیڈی۔ مدمازل بینیٹ نے اس خوبی کے ساتھ یہاں کی دلچسپیوں۔ یہاں کے مناظر اور لوگوں کے حالات مجھسے بیان کئے تھے کہ اکثر

میرے کانوں میں وہی آواز گونجا کرتی تھی اور شوق دلکو مضطرب کئے دیتا تھا۔
مُدّاَزل سے میں نے چند مرتبہ اپنا ارادہ ظاہر کیا مگر سوا اتفاق سے کبھی اُسی عملی صورت میں لانے کی نوبت نہیں آئی - ایک دن جب میں نے ٹک کا نیلے فیتے کی گوٹ لگا ہوا ٹکٹ جو سیاحوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے یکایک اوسکے سامنے میز پر رکھدیا تو میرے اس قصد پر کسیقدر اُسے حیرت مگر زیادہ مسرت ہوئی اور نہایت توجہ سے مجھے سمجھنا شروع کیا کہ غیر ملک میں اسطور پر کام کرنا۔ اسطرح لوگوں سے ملنا اور فلاں فلاں مقامات دیکھنا۔

دوسرے دن میں علی الصباح مختصر سا سامان تیار کر کے اپنے دوستوں سے جو اُسی مکان میں رہتے تھے رخصت ہونے گیا تو پھر اُس سراپا الطاف وکرم اور مجموعہ اخلاق نے مجھے سمجھایا کہ دیکھو جنگی کے افسروں سے اس طور پر کام نکالنا چاہیے۔

غرضکہ باول ناخواستہ میں رخصت ہوکر ½ ۱۰ بجے لندن برٹین ریلوے پر سوار ہوکر روانہ ہوا - یہ ٹرین جسمیں پلمن کارس یعنی چرٹ ہنچہ اور گپ شپ لڑانے کے لئے علیحدہ سیلون لگے تھے لیکن جنمیں سوائے اوّل درجے کے مسافروں کے دوسرا کوئی نہیں جاسکتا تھا بے انتہا تیزی کے ساتھ اور بغیر کسی مقام پر ٹھیرے بندرگاہ نیوہے ون (Newhaven) پر جا پہونچی جہاں ایک چھوٹا سا خوبصورت اسٹیمر ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔

سمندر کا یہ راستہ ہمنے ½ ۳ گھنٹے میں طے کیا - اس رفتار سے زیادہ انگلش چینیل میں کبھی اسٹیمر تیز نہیں جاتا - اس اسٹیمر پر سوائے کھانے کے اور ہر قسم کا انتظام نہایت اچھا تھا - مجھے افسوس ہے کہ اس کھانے کی خرابی نے میرا آدھا لطف کم کردیا سمندر کی برق وش موجوں کو آخر کار خیر باد کہکر فرانس کے بندرگاہ ڈیپ پر ہم لوگ اُترے جہاں اسباب کی جانچ کی گئی - ٹرین تیار کھڑی تھی اور مجھے کچھ انگریزی سکتے

فرانسیسی سکوں میں بدلوانا تہی - اسلیئے میں اُترتے ہی پہلے اُس مقام پر دوڑا ہوا گیا
جہاں ایک بڑہیا صرافہ بیٹھی ہوئی ہتی - میں نے خوردہ لیا اور اپنی گاڑی پر واپس آیا
گر جب آکر گنا تو معلوم ہوا کہ بڑی بی نے کچہ کم دیا ہی - میں پہر دوڑا ہوا اُنکی خدمت میں گیا
بڑی بی نے براہ مہربانی مجہسے کچہ حجت نہیں کی اور بلا تکلف کچہ فرینک نکالکر اور عطا فرمائے
مگر اب بہی جب میں نے ٹرین پر آکر گنا تو معلوم ہوا کہ ایک فرانک بڑی بی نے پہر دبا
رکہا - خیر اُنکی روح پر اُس ایک فرانک کا فاتحہ پڑہتا ہوا اسٹیشن سے روانہ ہوا -

اس ٹرین پر صرف اوّل و دوم درجے کے لوگ سوار ہو سکتے تہے - اسمیں لمبے لمبے دالان
سے بنے تہے جہاں ایک سرے سے دوسرے تک آدمی آجا سکتا تہا اور ایک رسٹاران کار لگی تہی
جہاں لوگ چار قہوہ اور جیرٹ وغیرہ پی سکتے تہے - جس کمرے میں میں تہا وہ کچا کچ بہرا تہا -
ہمارے ساتھ ایک انگریز اور اُسکی بیوی تہی جو سوئٹزر لینڈ جا رہے تہے - ایک فرانسیسی لیڈی
تہی اور ایسے ہی اور بہت سے لوگ تہے - یہ فرانسیسی لیڈی فرینچ مڈل کلاس میں سے تہی - یہ
بہت سے جواہرات پہنے ہتی اور اسکا لباس نہایت صاف اور ستہرا تہا - گلے میں اسکے سونے
کے خانے میں ایک آئینہ لٹک رہا تہا جسمیں بلا مبالغہ بحساب ۲۰ مرتبہ فی گہنٹے کے وہ اپنی صورت
دیکہتی جاتی تہی - میرا گمان ہی کہ اسکے پاس پاوڈر کا ایک بکس اور دیگر سامان آرائش بہی
جیب میں ضرور موجود ہوگا جسے وہ کہلی گاڑی میں استعمال کرنے کی ہمت نہیں کرتی تہی
یہ عورت نہایت دلچسپ اور بذلہ سنج تہی اور بلا تامل ہم سبہوں سے باتیں کرتی جاتی تہی -

گاڑی جسوقت جا رہی تہی - میں نے گردن نکالکر باہر کے میدانوں کو دیکہا - اس خوبصورت
مقام کا نام نارمنڈی تہا جو تاریخ میں اسقدر مشہور و معروف ہی - گرد نواح کی سبزی انتہا
دلچسپ اور عالیشان تہی - پہاڑ سر بفلک کشیدہ کہڑے تہے جنپر موسم بہار کا اُگا ہوا سبزہ
ابتک لہلہا رہا تہا - وادی کہسار سبزے سے بالکل ڈہکی تہی اور چہوٹے چہوٹے خوبصورت
چشمے ادہر اُدہر سے بہتے نظر آرہے تہے کہیں کہیں چہوٹے چہوٹے گاؤں نظر پڑ جاتی

تھی۔ جہاں ان چشموں کی ندیاں بن گئی تھیں اور نازک چھوٹے چھوٹے پل بندھے ہوئے تھے
اور کبھی پہاڑ یونہر آباد کوئی بڑا شہر نظر آجاتا تھا۔ اس حصہ ملک میں سے ہوکر دریا سین بھی
بل کھاتا ہوا جاتا ہے۔ دریا کے ہر دو جانب ہرے ہرے مخملی تختے ایسے پر لطف معلوم
ہوتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔ حُسن اتفاق سے اس مقام پر ایک جگہ ہماری گاڑی ٹھہری۔ اکثر
ہم میں سے باہر نکل آئے اور وادی کہسار اور جھیلوں کی بہار دیکھنے کے لئے تھوڑی دور ٹہلتے
چلے گئے۔ گاڑی قریب قریب ایک گھنٹہ یہاں ایسے مقام پر ٹھہری جہاں کوئی اسٹیشن نہ تھا
فرانسیسیوں کی ریلوے کے انتظام کو اسقدر ضعیف دیکھکر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ راستے میں
جو اسٹیشن ملے وہ بھی باستثناء روآن (Roen) کے نہایت بدنما تھے۔ روآن کا اسٹیشن
بہت عمدہ اور بڑا تھا وہاں ہماری گاڑی کسیقدر زیادہ ٹھہری۔ یہ شہر فرانس کے بڑے شہروں
میں ہے۔ اور اپنی خوبصورت عمارتوں اور عمدہ موقع کے لحاظ سے بہت مشہور ہے
ریل پر ہمیں صرف گرجوں کی اونچے اونچے مینار اور سفید سفید عمارتوں کی لمبی لمبی صفیں نظر
آتی تھیں لیکن یہاں کے کوہستانی قدرتی مناظر نے مجھے کچھ ایسا گرویدہ کر لیا کہ میں نے ارادہ
کیا کہ لوٹتے وقت ضرور یہاں کم سے کم ایکدن کے لئے ٹھیرونگا مگر افسوس کہ اس ارادے کو پورا نکر سکا
آٹھ بجے ہم لوگ پیرس گیر (اسٹیشن) سینٹ لازیر (Gare St Lazare) پر پہونچے
بیچارے انگریز کو مع اپنی بیوی کے تمام رات یہاں پڑا رہنا پڑا کیونکہ ٹرین دیر میں پہونچنے سے
سوئیٹزرلینڈ اکسپرس اُنہیں نہ ملسکا۔ سفر کی وجہ سے کسیقدر تکان مجھے معلوم ہونے لگی
تھی اسلئے میں سیدھا اسٹیشن سے نکلکر گاڑی پر سوار ہوکر روڈانٹن (Rue Danton) پہونچا۔
وہاں پہونچکر دربان عورت سے کہا کہ مسٹر منگا سے میں ملنا چاہتا ہوں اتنے سے مطلب کو سمجھانے کے
لئے کبھی اپنی گائڈ بک کھولتا۔ کبھی بہت سے حروف محذوف کر کے فرانسیسی تلفظ بنا کر حتی المقدور
سمجھاتا کبھی ہاتھ سے اشارہ کرتا کہ میرے دوست مسٹر منگا جو چھوٹے سے قد کے آدمی ہیں اون سے
ملنا چاہتا ہوں غرضکہ اللہ اللہ کر کے اُسکی سمجھ میں آیا۔ بڑھیا بہت متواضع اور خلیق تھی

نہایت مستعدی سے میرا اسباب اُٹھاکر اُس نے دروازے کا ایک برقی بٹن دبایا۔ دروازہ خود بخود کھلگیا اور ایک جھولے (لفٹ) پر بیٹھکر میں مکان کی تیسری منزل پر پہونچا جہاں منگا صاحب میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہمارے منگا صاحب یہاں صرف تھوڑی ہی سی مدت میں پورے پیرسین جنٹلمین ہوگئے تھے اور پیرس کی ثنا و صفت میں رطب اللسان اور انگلستان سے متنفر معلوم ہوتے تھے۔

یہ جگہہ جہاں میرا قیام تھا ایک قسم کا فیمِلی ہوسٹل تھا اور ایک نہایت خلیق و سن رسیدہ فرانسیسی عورت کے زیر نگرانی تھا۔ یہ عورت انگریزی بالکل نہیں جانتی تھی اور مجھسے اشاروں سے باتیں کرتی تھی۔ مسٹر منگا نے فرانسیسی میں بہت کچھہ مہارت پیدا کرلی تھی اور بخوبی فرانسیسیوں سے کلام کرسکتے تھے۔ ہمارے اس گھر میں دو فرنچ لڑکیاں بھی رہتی تھیں۔ جو بڑھیا کی نگرانی میں ہیں۔ پیرس میں تعلیم پاتی تھیں۔ یہ لڑکیاں اپنے ساتھہ کی انگریز لڑکیونکے مقابلے میں زیادہ خاموش تھیں اور سنجیدہ تھیں۔ مگر میری رائے میں انگریز لڑکیاں جسمانی حیثیت سے فرانسیسیوں سے زیادہ تندرست اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ اور اونکے چہرے سے جوانی کی شادابی اور جسم میں پھُرتی زیادہ معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باہر اُنکی زندگی کسقدر آزادی کیساتھہ گذرتی ہوگی اور انکی طبیعتوں میں کھیل اور تماشے کا کسقدر زیادہ شوق ہوگا۔ مگر زیادہ کھیل اور تماشوں کی نہ تو فرانسیسی لڑکیاں شوقین ہوتی ہیں نہ لڑکے۔ میرے دوست ان لڑکیوں میں ہلے ملے رہتے تھے۔ یہ اُنہیں فرانسیسی پڑھاتیں اور کھانیکے وقت خوب دل لگی کیا کرتیں۔ ایک اور فرنچ لڑکی تھی جو کبھی کبھی ہمارے یہاں آیا کرتی تھی۔ یہ لڑکی ہندوستان دیکھنے کی بہت شائق تھی اور ہندوستانیوں سے بہت دلچسپی ظاہر کرتی تھی اور صورت سے دیہات کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ اسکے حسن خداداد اور قدرتی بھولے پن لی جو دیہاتی لڑکیوں کے ساتھہ مخصوص ہوتا ہے، ہمارے دوست کو بہت مرعوب کردیا تھا۔ یہ لڑکی اکثر کچھہ گاکر سُنایا کرتی۔ اُسکی شیریں آواز ایسی تھی کہ زاہد خشک بھی محو ہوجائے۔ نغمہ لاہو

(جیبیا سکا) La Boma اُسی بہت پسند تہا اور ہمارے دوست مسٹر ملگا اکثر اسکی فرمایش کیا کرتے تہی - ہماری ساتہہ اس مکان میں ایک جرمن لیڈی بہی تہی - مجہے اس طرز کی عورت کو دیکہنے کا پہلے کبہی اتفاق نہیں ہوا تہا - اُسکے چہرے پر جوانی کی شادابی ضرور تہی مگر ساتہہ ہی ایک بات اور تہی جو طبیعت کو بچکا دیتی تہی - اُسکی صورت سی یہ ضرور معلوم ہوتا تہا کہ کسی عمدہ طبقے کی عورت ہی مگر وہ خاص سادہ ادا جو میں نے انگریز عورتوں میں دیکہی اور نیز وہ ادائے تصنع جسمیں اخلاق کوٹ کوٹ کر بہرا ہو جو میں نے فرانسیسی عورتوں میں پائی اُنکے مقابلے میں مجہے معلوم ہوا کہ یہ جرمن عورت بالکل اُن اوصاف سی معرّا ہے اور شاید عمدہ تہذیب اور شائستگی کی اُسے ہوا بہی نہ لگی ہو مگر باوجود اسکے یہ عورت جرمنی کے مڈل کلاس میں سی تہی - اسے دیکہکر میرے دل پر یہ اثر پڑا کہ امور خانہ داری میں جرمن بیویوں سے زیادہ دنیا میں کوئی اور عورت محنتی اور مشقت کرنے والی نہیں ہو سکتی یہ اپنے ہاتوں سے وہ وہ کام کرتی ہیں جو انگریز عورت کبہی کرنا گوارا نہیں کرتی مثلاً بچوں کی انتہا درجے کی پرداخت و نگرانی وغیرہ - اس لحاظ سے یہ جرمن عورتیں بمقابلہ یوروپین عورتوں کے زیادہ تر ہماری عورتوں سی ملتی جلتی ہیں - اور ہماری طرح اُنکی تمام توجہ امور خانہ داری کی جانب ہوتی ہی میرے خیال میں "بیویاں" یہ بہت اچہی ہوتی ہیں مگر عمدہ "ساتہی" نہیں ہوتیں - دنیا میں سب سے عمدہ "ساتہی" انگریز عورت ہوتی ہی جو اپنے بچوں کی نگرانی وغیرہ بالکل اناؤں دائیو نرسوں پر ڈالدیا کرتی ہی - اور خود چین سے سوشل لائف کے لطف اُٹہاتی ہی - جرمن میں عورتیں سوشل لائف کی زیادہ پروا نہیں کرتیں - مگر مجہے اُس عورت سے یہ سُنکر بہت حیرت ہوئی کہ اُنکی اعلیٰ طبقے کی عورتیں زیادہ نیک مشہور نہیں اور نہ بمقابلہ فرانس کی جرمن میں اُنکی زیادہ عزت کیجاتی ہی - اس عورت سی اور مجہسے اکثر دلچسپ باتیں ہوا کرتیں اور میں بے انتہا ممنون ہوں کہ اکثر مہربانی فرما کر وہ مجہے اپنے ساتہہ لیجاتی اور عجائب خانے وغیرہ میں اکثر باتیں بتایا کرتی تہی -

"راقم ممانی"

حضرت امیر شاہی علیہ الرحمۃ (از بیاض جناب ج۔ن۔ رینہ شوق)

اشک چو پردہ می درد طوطیاں راز را	چند بدل فرو خورم نالہ جانگداز را
شاہی ازیں سرود غم طرز جنون گرفت دل	رخصت گفت و گو مدہ طبع سخن طراز را

ولہ

بشمع نسبت بالائے دلکشت کردم	روا بود کہ بسوزی بدیں گناہ مرا
خطاے شاہی بیچارہ را قلم درکش	کہ ہست لطف عمیم تو عذر خواہ مرا

لااعلم (از بیاض مولوی سید امین الحسن صاحب موہانی)

بجون غلغلم کہ شب ز نالہ آرام تو می بردم	بہ تلخی خواب شیریں از دو بادام تو می بردم
دم مردن ببالینم ہجومے بود میگفتند	دم آخر بہر نام خدا نام تو می بردم

ناصری ـ چہ شود کم ز حسنت ار برسد * بوصال تو آرزومندے

اسیر (از بیاض مولوی سید اکبر حسن موہانی)

مشغول یاد اوست دل پارہ پارہ ام	رقصد ز شوق بر سر مژگاں نظارہ ام

لااعلم ـ من با دو چشم گریاں بنشستہ در فراقت * تو شادمان و خرم با دیگراں نشستہ

ایضاً ـ واقف نہ ز درد دل ناتوانِ من * اینک بلب رسید ز دردِ تو جانِ من

حزیں ـ بوے ز زلفے بگریباں صبا ریختہ اند * طرفہ شورے بدماغ دل ما ریختہ اند

حکیم محمد تقی شیرازی ـ دوش در بزم تو ذوق گریہ ام بیتاب کرد * انچہ آتش میکند با شمع با من آب کرد

مرزا مظہر ـ چرا ز چشم تو حال دلم تباہ شود * بران مباش کہ روزِ کسے سیاہ شود

مرزا غالب (ماخوذ از ضمیمہ شرح غالب مرتبہ حسرت موہانی مشتمل بر غیر مطبوعہ اشعار غالب)

ـ جاتا ہوں جدھر اُٹھتی ہے بکی اُدھر انگشت * یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت

ـ پھرے وہ سوے چمن آتا ہے خدا خیر کرے * رنگ اڑتا ہے گلستاں کو ہواداروں کا

ـ استغنا ہے کہ دم طرب آمادہ کرو * برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

(۱۷) "بیجا وہ ہوا کہ ماکر جا بیا"

اعتراض تھا کہ "برہم ہوا" کے محل پر "بیجا ہوا" کہنا مبتذل بازاری زبان ہے۔ جواب کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ بھی منجملہ نسیم کی اُن لغزشوں کے ہے جنکو میں دیباچے میں تسلیم کر چکا ہوں۔ جا جا کی مناسبت کا خیال کر کے نسیم نے بیجا کا لفظ استعمال کر دیا جو ملکے اپنے میں غلط تھا۔" لیکن باوجود اسکے مسٹر چکبست کو اسمیں شک ہے کہ نسیم کے زمانے میں بھی یہ لفظ بازاری تھا یا نہیں۔ کیونکہ نسیم سے بچاس ساٹھ برس پیشتر میر تقی میر نے کہا ہے "بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا"۔ خیر چاہے انہیں شک ہو مگر اور سب لوگوں کو یقین ہے کہ یہ لفظ ناسخ و آتش کے زمانے میں بالکل بازاری تھا۔ اس جھگڑے میں میر انیس مرحوم کو نسیم کا ہم مرتبہ بنانے کے لئے اُن مرحوم کے کلام پر بھی ایک اعتراض کر دیا گیا کہ اُنہوں نے "جگہ" کی بعوض "جاگہ" نظم کیا ہے۔ اب تعصب بھی نہیں ہوتے۔ مگر واجد علی شاہ کے عہد تک یہ لفظ اردو زبان میں موجود تھا۔ اُسکے استعمال میں میر انیس ہی مخصوص نہیں بلکہ مثنوی لذت عشق میں بھی (جو اس آخری عہد کے ایک شاعر کی تصنیف ہے اور غلطی سے نواب مرزا شوق کی خیال کیجاتی ہے) موجود ہے۔ "نظر ایک جاگہ پہ جمتی نہ تھی"۔ مسٹر چکبست کے کہدینے سے یہ لفظ مبتذل نہیں ہو سکتا۔

(۱۸) "سمجھا کے بجھا کے دست پاکے" اعتراض تھا کہ "اُردو میں دست رس پانا کہہ سکتے ہیں مگر دست پانا قابو پانے کی جگہ ہرگز جائز نہیں۔" جواب یہ دیا گیا ہے کہ "فارسی کا محاورہ ہے دست یافتن۔ نسیم نے اسکا ترجمہ کر دیا"۔ مگر میں کہتا ہوں کہ نسیم نے یہی غلطی کی کہ ایک فارسی محاورے کا ترجمہ بے سمجھے بوجھے اردو میں کر دیا اور اس بات کا اندازہ نہیں کیا کہ اردو میں بھی یہ محاورہ ہے یا نہیں۔ اور ایسے محاوروں کا ترجمہ کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ مگر چکبست صاحب نے اس سے زیادہ کمال یہ کیا ہے کہ نظیر میں رند کا یہ مصرعہ پیش کر دیا ہے۔ ع "بعد مردن نہ دیا تو نے اگر دوش مجھے"۔ اور فرماتے ہیں "دوش دادن فارسی کا محاورہ ہے۔ رند نے اُس محاورے کا ترجمہ بالکل نسیم کی طرح کیا ہے۔" اول تو اسکا کوئی ثبوت نہیں کہ "دوش دادن" فارسی کا محاورہ ہے۔ بہار عجم میں صاف لکھدیا ہے کہ جن لوگوں نے "دوش دادن" کا محاورہ فارسی میں استعمال کیا انہوں نے اُردو سے ترجمہ کر لیا ہے اور اس محاورے کو مشتبہ بتایا ہے۔ مگر میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ہے لیکن اسکے ساتھ اردو محاورہ بھی ہے "کندھا دینا"۔ لہذا یہ ترجمہ محاورے کا نہیں۔ بلکہ رند نے صرف اتنا کیا کہ "کندھا" کے لفظ کے عوض فارسی کا لفظ "دوش" لغوی و متعارف معنوں میں استعمال کیا۔ جو بارہا اردو میں استعمال ہو چکا تھا اور اسمیں کوئی مضائقہ نہیں۔ بخلاف اسکے "دست یافتن" صرف فارسی محاورہ ہے اسکے مقابل "ہاتھ پانا" اُردو محاورہ نہیں۔ نسیم نے اپنی نادانی سے یہ قیامت کی کہ فارسی محاورے کا ترجمہ کیا اور یہ نہ دیکھا کہ اس فارسی محاورے میں "دست" کا لفظ لغوی معنوں میں نہیں بلکہ محاورے کی اصطلاحی معنی

نہ مستعمل ہوا ہو۔ دست کے لغوی معنے "ہاتھ" ہیں۔ اُس سے قابو مراد لینا محاورے کے اصطلاحی معنے ہیں جو صرف فارسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ بھلا اس سے بڑی کوئی نافہمی ہو سکتی ہے کہ اول تو محاورے کا ترجمہ کیا۔ اور اس طرح سے کہ ایک لفظ کو دوسری زبان میں بجنسہ نقل کر لیا اور اُس سے بے دیکھے بھالے وہ معنے مراد لئے جو اصلی زبان میں مخصوص اور اصطلاحی تھے۔ اس موقع پر "انعام کرنے" کی نظیر پیش کرنا بھی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اُردو میں اگرچہ اکثر انعام دینا کہتے ہیں مگر اکثر اوقات "انعام کرنا" بھی بولتے ہیں۔ عام زبانوں پر ہے کہ "اُنہوں نے بہت کچھ انعام واکرام کیا" خالی انعام کرنا بھی بول جاتے ہیں۔ خواجہ آتش ہی نے نہیں کہا۔ میر صاحب بھی کہہ گئے ہیں ؎

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں ، جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

(۱۹) تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی

اس مصرع پر دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ اُردو میں جانی کا لفظ معشوقہ کے سوا کسی اور کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بے تمیزی اور غلطی ہے۔ مگر گلزار نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ نہیں بلکہ روح افزا سے پہلی ہی ملاقات میں کہتا ہے "جی بہلانہ جانی" اور وہ جواب دیتی ہے "تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی" اسکا جواب طعن آمیز الفاظ میں جو کچھ دیا گیا ہے اُسکا ماحصل یہ ہے کہ لفظ جانی کے استعمال کے جو حدود بتائے گئے ہیں وہ نسیم کے زمانے میں نہ تھے۔ سچ یہ ہے کہ انسان اگر عقل صائب سے کام لے تو بہت سی دشواریاں دور ہو جایا کریں مسٹر حکیمت گلزار نسیم کے مصرعوں اور اعتراض کو پڑھ کے ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو نہ وہ اُردوئے معلی کا ڈیڑھ صفحہ غارت کرتے اور نہ مجھے زیادہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے مانا کہ "جانی" کے لفظ کو میں نے اصل سے زیادہ محدود بتایا۔ مگر کیا اُن کی عقل میں اتنی بات بھی نہ آسکتی تھی کہ یہاں نامحرم لوگوں اور برابر کی عمر والوں کے متعلق گفتگو ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ماں باپ بیٹے بیٹی کو یا بڑے بزرگ خردوں کو بھی جانی کہہ دیا کرتے ہیں بحث تو اسمیں تھی کہ جس موقع پر تاج الملوک نے روح افزا کی سی غیر اور جوان عورت کو جانی کہا ہے اُس موقع پر بھی کوئی اُردو بولنے والا کسی شریف زادی کو جانی کہہ سکتا ہے۔ اور اسکی بھی کوئی نظیر پیش کی جا سکی ؟ اول تو روح افزا اور تاج الملوک دونوں جوان تھے۔ مگر گھڑی بھر کو میں یہ بھی مانے لیتا ہوں کہ تاج الملوک صاحب پریوں کے اس گھرانے میں بڑے بوڑھے بن گئے تھے۔ لیکن اسکا کیا جواب ہے کہ جس وقت یہ گفتگو روح افزا اور تاج الملوک میں ہوئی ہے۔ اُسوقت تک دونوں کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ تھی۔ یہی خیال فرما کے ایڈیٹر صاحب اُردوئے معلی نے بھی لکھدیا کہ "یہ تاویل بہت کمزور ہے۔ ماں کا بیٹے سے یا کسی بزرگ کا اپنے چھوٹوں سے جانی کے لفظ سے

خطاب کرنا محبت بزرگانہ پر محمول کیا جا سکتا ہی۔ لیکن ایک عورت سو کسی مرد کا بلا تعارف سابقہ "دھانی" کہنا ضرور قابل اعتراض ہی"۔

اسی مصرع پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تجھ پاس کا لفظ تیرے پاس کی جگہ کہاں کی زبان ہی؟" اسکا جواب یہ ملا ہی کہ آج کل ضرور ناجائز ہی مگر سودا و میر کے زمانے سی لیکر آتش و رند و نسیم و نواب مرزا شوق کے زمانے تک یہ محاورہ تھا۔" نظیریں جو پیش کی گئی ہیں اُن کی بنا پر میر کے کلام سے" تو" کے مقام پر" تجھ" کا۔ سودا۔ رند اور شوق لکھنوی کی کلام سے" تجھ بن" کا۔ آتش کے کلام سے" تجھ بغیر" کا اور اکیلے ایک رند کے کلام سے "مجھ پاس" کا ثبوت ملتا ہی۔ یہ سب ترکیبیں اگرچہ متروک ہو تی جاتی ہیں مگر کسی نہ کسی حد تک اب بھی زبان پر باقی ہیں۔ مگر ایسے محاورت میں چونکہ قیاس کو دخل نہیں لہذا ان کا حکم ہر محل اور ہر اس قسم کے لفظ پر نہیں جاری کیا جا سکتا" تجھ پاس"۔ نہ اسوقت کسیکی زبان پر ہے اور نہ ناسخ کے بعد سے کسی اور کی زبان پر تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے دوست نے ہزار سر مارا "تجھ پاس" کی ایک نظیر بھی ہاتھ نہ آئی۔ اور اسیوجہ سے کہا جاتا ہے کہ نسیم کی ایسی لغزش ہے جسکی کوئی مثال نہیں ملسکتی۔

(۴۰) پتھرا گئی چشم حلقۂ در

اعتراض تھا کہ حلقۂ در فارسی میں کنڈی کو کہتے ہیں۔ اور یہاں معنے جب بنیں گے جب حلقۂ در سے دروازے کا چوکھٹا مراد لیا جائے۔ جواب یہ دیا گیا ہے کہ مٹھ کی چھت کڑاے کی تھی اور اوس کا دروزہ محراب دار تھا۔ نسیم نے حلقۂ در سے یہاں محراب در مراد لی ہی۔ جیسے کہ بدر چاچ قلعۂ دہلی کی تعریف میں کہتا ہے "چہ قلعہ الیست کہ قوسے ز حلقۂ در اُو" بیشک بدر چاچ نے "حلقہ در" سے دروازے کا حلقہ مراد لیا ہے۔ مگر چونکہ اس میں ایک عام محاورے سے گریز کیا تھا لہذا اُسے خود ہی "قو۔ سے" کے لفظ سے کھولدینا پڑا ظاہر ہے کہ اگر حلقہ در ـــــ سے محراب در کے معنے پیدا ہوگئے تھے جیسا کہ مرتکب سمجھے ہیں تو پھر بدر چاچ کو "قوس" کا لفظ لانے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی؟" اسی قوس" کے لفظ نے بتایا کہ یہاں "حلقہ در" سے زنجیر نہیں مراد لی گئی ہے۔ فارسی میں جہاں کہیں بھی "حلقہ در" کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں وہاں اُن سے سوائے زنجیر کے اور کوئی معنے مراد ہی نہیں لئے گئے ہیں۔ اسیطرح یہ کہ ارشاد ہوتا ہے "یہ بھی خیال رہے کہ فارسی شعرا کنڈی کے لئے حلقہ بیرون در زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اور حلقۂ در سے عموماً محراب در مراد لیجاتی ہے"۔ "حلقہ بیروں در" کے معنے "باہر کی کنڈی" ہیں۔ بیشک

جہاں باہر کی کنڈی کہنا ہوگا وہاں حلقۂ بیروں در کہینگے اور جہاں مطلق کنڈی کا لفظ استعمال کرنا ہوگا وہاں صرف حلقہ در کہیں گے ۔ اگر ہمارے دوست کا یہ خیال ہے کہ مطلق زنجیر کے محل پر زیادہ تر حلقۂ بیروں در کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ اُن کی غلطی ہے زیادہ جستجو کی ضرورت نہیں کہ "پیرایۂ خرد" ایک بچوں کے پڑھنے کی کتاب ہے ۔ اُس میں سب کے پہلے گلدستۂ دانش کا انتخاب ہے اور اُسی میں صفحہ ۱۳۱ پر یہ الفاظ ہیں ۔ "شبے آں دوست بہ درِ خانۂ او آمد و حلقہ در زد" تو اسکے معنے بقول مسٹر چکبست کے یہ ہوئے کہ وہ اسکی محراب کو مارنے لگا ۔ کیونکہ "حلقہ در سے عموماً محراب در مراد لیجاتی ہے"

(۲۱) اک دن پنجرا اُٹھا کے لائی — حسن آرا کو وہ کل سُجھائی

اعتراض یہ ہے کہ اُردو میں صرف مادی مشینوں کے معنے میں کل کا لفظ مستعمل ہے ۔ اور جادو اور عمل کی نسبت اسکا استعمال ہرگز نہیں جائز ہے ۔" جتنا پُر لطف جواب اس اعتراض کا ملا ہے شاید اور کسی اعتراض کا نہ ملا ہوگا ۔ پہلے تو تصریح کی گئی ہے کہ "کل" کے بہت معنے ہیں جو حاشیہ پر بتا بھی دئے گئے ہیں ۔ اور میں اس تازہ واقفیت حاصل ہونے پر اپنے دوست کا شکر گزار ہوں ۔ اسکے بعد ارشاد ہوا ہے کہ کل کے معنے ترکیب کے بھی ہیں ۔ مگر اس کا نہ طرز استعمال بتایا اور نہ کوئی ثبوت دیا ۔ اور مصیبت یہ کہ کہا جاتا ہے اس شعر میں "کل" کا لفظ اُنہیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے ۔ لہذا سوا اسکے کہ جس اصول پر ہمیشہ عوام نے گلزار نسیم کے اشعار کی داد دی ہے میں بھی جواب کی داد دیدوں اور کیا کر سکتا ہوں ؟ لیکن زور دار بحث یہ ہے کہ نسیم کا مصرع چاہے بنا ہو یا نہ بنا ہو میرا یہ دعوے ضرور غلط ہے کہ "کل سے صرف مادی مشینیں مراد لیجاتی ہیں" کیونکہ مثنوی میر حسن میں ہے ۔

یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کا تجھے — ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے

اور اس سے بھی زیادہ ثبوت اسی مثنوی کے اس دوسرے شعر میں ہے ۔

جو اُترے تو کل اُس کی یوں جوڑ لو — جو برعکس چاہے تو وہ موڑ لو

واقعی پُرزے جوڑنا اور مختلف ترکیبوں سے اِدھر اُدھر موڑنا خاص الخاص طلسم اور جادو کا کام ہے مادی مشینوں کو اس سے کیا تعلق ! بھلا اس سے زیادہ حیرت انگیز بھی کوئی بات ہوسکتی ہے کہ جو اشعار خاص اس امر کا ثبوت ہیں کہ کل مادی مشین کو کہتے ہیں وہی پبلک کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اُسکے مخالفت میں پیش کیے جاتے ہیں ۔

(۲۲) دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی

اعتراض تھا کہ "فاختہ نہیں پڑہائی جاتی" جواب یہ ہے کہ وہ طلسمی فاختہ تھی اور نسیم کے لئے خاص آرڈر دے کے بنوائی گئی تھی - لہذا پڑہائی جاتی تھی - مگر اسکا بھی خیال نہ رہا کہ جو مصنوعی چیز بنوائی جاتی ہے اسمیں حتی الامکان وہی خصائص پیدا کئے جاتے ہیں جو اس اصلی چیز میں ہوں - مگر یہاں بنانے والوں سے یہ حماقت ظاہر ہوگی کہ بنایا تو فاختہ تھا اور اُس میں اوصاف وہ پیدا کردے جو توتے یا مینا میں ہوتے ہیں - اس جواب میں ایک علاوہ بریں' بھی ہے - وہ یہ کہ "اکثر فقیر فاختہ پالتے ہیں اور اُسے پڑھاتے بھی ہیں" - مگر غالباً وہ بکاولی ہی کے باغ میں رہتے بھی ہونگے - یہ بھی فہمائش کی گئی ہے کہ "کسی نئی بات کو قابل اعتراض قرار دینا واجب نہیں" جی ہرگز نہیں - اعتراض تو ہمیشہ اُنہیں باتوں پر کرنا چاہئے جو پُرانی ہوں اور ہمیشہ سے ہوتی آئی ہوں - کیونکہ دیکھئے "عام طور سے کبوتر اُڑائے جاتے ہیں مگر خلیل خاں فاختہ اُڑا گئے" اور یہ آپ کو یاد ہی نہیں رہا کہ کبھی کبھی بعضے آدمی بھی اُڑ جایا کرتے ہیں - غریب نثر قصہ لکھنے والے پر اس شعر کے جواب میں بھی تہمت صاف کردیا گیا ہے - اور کمال یہ ہے ہمارے دوست اصل قصے کو کبھی دیکھتے نہیں ہیں صرف اُس حسن عقیدت کی بنیاد پر جو نسیم کے ساتھ ہے اُس غریب کو ملزم ٹھہرادیا کرتے ہیں - جس طرح چوسر کے کھیل کے موقع پر اصل قصے میں سانپ کا نام نہ تھا اور ہمارے دوست نے اُسکے مصنف کو الزام دیدیا - ویسی ہی کارستانی اس موقع پر بھی کی گئی ہے - چنانچہ لکھتے ہیں "اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ اعتراض صحیح ہے تب بھی اسکا الزام اُس شخص کے سر ہے جسنے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نہ کہ نسیم کے سر" ناظرین اردوئے معلی کو مشرطکبست کی تحریر دیکھ کے یقین آگیا ہوگا کہ اصل قصے میں پڑہائی جانے والی فاختہ موجود ہوگی - اب وہ اصل قصے کی عبارت ملاحظہ فرمائیں "روز افزا کا یہ جی لگا کہ ایک ساعت اُس سے جدا رہنا دشوار ہوا - پھر یہ ارادہ کیا کہ اُسکو حرز جان کی طرح گلے سے لگائے رکھئے - مگر دشمنوں کی نظر سے چھپائے رکھئے - آخر ایک طلسم اُسکے گلے میں باندھا اور قمری بنا کر ایک سونے کے پنجرے میں رکھا - پھر تو وہ سرو گل اندام روز بھر تو لٹکائے رکھتی تھی رات کو پنجرے سے نکال کے پھر آدمی بناتی تھی اور صبح تک اُسکی صحبت سے انواع و اقسام کی کیفیتیں اُٹھاتی تھی" اب بتائیے کہ یہ فاختہ بکاولی کے اصلی قصے میں پڑہائی جاتی تھی

کہ اُسے نسیم ہی نے پڑھایا! ایسی ہی غلط بیانیوں سے گلزار نسیم کی غلطیاں دور ہونگی؟

(۲۳) دانائی تھی بات کا سمجھنا

اعتراض مبہم الفاظ میں یہ تھا کہ "دانائی تھی بھونڈا معلوم ہوتا ہے" جواب میں چند اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں مشتبہ اور مشتبہ بہ میں تذکیر و تانیث کا اختلاف ہے اور فعل مشبہ بہ کے مناسب لایا گیا ہے۔ ان نظیروں کو بھی سن لیجئے ع سرگزشت اپنی ہی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا" ع موج شراب جادہ تھی راہ صواب کا" ع حیرت موسی تھی پردہ جلوہ دیدار کا" اس سے اور گلزار نسیم کے مذکورہ بالا مصرع سے کسی قدر لگاؤ نہیں۔ اُسمیں تشبیہ سرے سے ہی نہیں مگر چاہے جوڑ ملے یا نہ ملے یہ کہنے کو تو ہو گیا کہ سندیں بہت سی پیش کردیں۔ حالانکہ ہمارے اعتراض کا منشا یہ تھا ہی نہیں۔ ہمارا مقصود صرف اسقدر تھا کہ محاورے میں "دانائی کی بات" "یا دانائی کا کام" کہتے ہیں نہ "دانائی تھی" جیسا کہ نسیم نے کہا۔ دانائی کا لفظ تنہا ایسے محل پر البتہ استعمال کیا جاتا ہے جب کہنا ہو کہ "اُسمیں دانائی تھی" اس اعتراض کو فصاحت اور بھونڈے پن سے تعلق تھا مگر مسٹر چکبست نے تذکیر و تانیث کی بحث چھیڑ دی۔

(۲۴) داغا تو سے چلے تفنگ سے وہ | چھوٹے قید فرنگ سے وہ

اعتراض تھا کہ "تفنگ کی چال کو انسان کی چال سے کیا واسطہ؟" جواب میں مسٹر چکبست نے پہلے تو تاویل کی کہ "تفنگ چلنے سے گولی کا چلنا مراد ہے" مگر پھر آپ ہی خیال آگیا کہ کوئی یہ پوچھ بیٹھا کہ تفنگ چلنے کے معنے گولی چلنے کے کس زبان میں ہیں تو کیا جواب دینگے؟ فوراً یہ کہا کہ "اگر مان بھی لیا جائے کہ تفنگ چلنا گولی چلنے کے معنوں میں نہیں استعمال کیا جاتا تب بھی شرر کے اعتراض کا جادو چلتا نہیں نظر آتا"، اسلئے کہ ایسی تشبیہیں نزاکت شاعرانہ سمجھی جاتی ہیں۔ آتش کہتے ہیں ع صورت پیرہن تنگ نکل جاؤنگا" خواجہ وزیر کہتے ہیں "آستین کا ہے ترے کوس انیس منزل قاتل" انہیں کا ایک اور شعر ہے۔

ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ کا | مانگوں گا مے کشی کو پیالہ تفنگ کا

قلق کہتے ہیں۔ اسکی تلوار کے رومال کا بہانا تو نہیں | آب شمشیر کی تاثیر جو تیزاب میں ہے

ولہ ایسا کانٹا ہے خار مژگاں کا | وزن کر لیتا ہے زرجاں کا

رند کہتے ہیں۔ دور ہوتا روح طاہر سے کثافت جسم کی | گھاٹ پر اُسکی دھوبی کو نہانا چاہیے

اسمیں شک نہیں کہ اس قسم کی تشبیہیں اُردو شاعری میں تھیں اور معیوب تھیں مگر پھر بھی ان سب اشعار اور نسیم کے بے تُکے شعر میں زمین آسمان کا فرق ہے - اس اصول کو سب شعرا سمجھے ہوئے تھے کہ تشبیہ کے لئے ضرورت ہے کہ لفظی مشابہت کے علاوہ کچھ حقیقی و مادّی مناسبت بھی ہو- چنانچہ یہ بات کم و بیش ان سب نظیروں میں موجود ہے وزیر کے مصرع میں آستین کو کوش سے تشبیہ دگئی ہے اور اُسکے بعد والے شعر میں وہ بندوق کے پیلے کو اگرچہ بہت مختصر ہوتا ہے جنگ کی ضرورت سے جام شراب کے مانند قرار دیتے ہیں - قلق نے پہلے شعر میں یہ کیا ہے کہ جو رومال تلوار میں بندھا رہتا تھا اُسکے ایک ٹکڑے میں بھی کاٹنے کی تاثیر پیدا کرنا چاہی ہے جسکو زیادہ تعلق محض تاثیر سے ہے - اور دوسرے شعر میں وہ مژگاں کے کانٹے سے زرِ جان کا وزن محض اسلئے نہیں کراتے کہ کانٹے کا لفظ جھولی ترازو اور خار میں مشترک ہے بلکہ اسلئے کہ "آنکھوں سے تول لینا" محاورہ ہے رنگینے سرو ہی کے گھاٹ پر صرف "گھاٹ" کے لفظ کی وجہ سے نہیں نہلایا بلکہ اسلئے کہ سروہی کا مقتول خون میں نہا ہی جاتا ہے - صرف ایک خواجہ آتش کے مصرع میں البتہ یہ بات ہے کہ محض لفظی مشابہت سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے - مگر محض لفظی مشابہت اُن کے کلام میں اسقدر کم ہے کہ بقول ایڈیٹر صاحب ریاض الاخبار کے میں اسے منجملہ اُنکے بچپن اور نومشقی کے کلام کے خیال کرتا ہوں -

(۲۵)	وہ پوری کرکے جو گیا بھیس		جنگلے کی راہ سے چلا دیس	

اس پر اعتراض یہ ہے کہ تاج الملوک فقط دیس کی ضرورت سے جنگلے کی راہ بھیجا گیا - جواب میں مجھے الزام دیا جاتا ہے کہ میں نے سیاق کلام سے چشم پوشی کی - جس سیاق سے معترض نے مثنوی کے چار شعر نقل کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ دریا کا راستہ چھوڑ دیا تو خواہ مخواہ جنگلے کی راہ اختیار کرنی پڑی - بیشک دریا اور جنگلا مانعۃ الخلو ہیں - دریا نہ ہو تو ضرور ہے کہ جنگل ہو - اور جنگل نہ ہو تو لازم ہے کہ دریا ہو - قطع نظر اسکے اسباب کا لحاظ ہی نہیں کرتے کہ بفرض محال مان بھی لیا کہ دریا کے عدم سے جنگل ہونا لازمی ہے تو اُسی جنگل کہتے ہیں یا جنگلا ؟

(۲۶)	نقشہ اُسکو ہوا کہ بس وہی ہے		ان ساروں سے گندہ کب ہوئی ہے	

اسپر دو اعتراض ہیں (۱) "اسکے دل پر نقش ہوا" کی جگہ "نقش اُسکو ہوا" کہنا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ (۲) محض سادوں کا لفظ ٹھیک نہیں "سادہ مزاج" "سادہ لوح" یا "سادے آدمی" اور "سادے لوگ" کہہ سکتے ہیں۔ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہاں اب ناجائز سمجھا جاتا ہے مگر نسیم کے وقت میں جائز تھا۔ ثبوت یہ کہ شیخ ناسخ فرماتے ہیں۔

سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں　　　نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

اس جواب کی کمزوری کا اسی سے پتہ چل سکتا ہے کہ خود ایڈیٹر صاحب اُردوئے معلیٰ نے بھی حاشیے پر لکھ دیا کہ "یہ سند کمزور ہے۔ اور اعتراض صحیح ہے" میں حیرت سے پوچھتا ہوں کیا مسٹر چکبست کے نزدیک نسیم کے الفاظ "وہ نقش اُسکو ہوا" اور شیخ ناسخ کے الفاظ "نقش ہیں" ایک ہی طرح کے ہیں؟ اور انمیں کوئی فرق نہیں؟ نسیم کے نقش کو "اُسکو" نے ایسا بگاڑا ہے کہ قیامت تک اُس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اور ناسخ نے جس وضع سے "نقش ہیں" کہا اس طرح اُن دنوں کیا آج بھی جائز ہے پھر معلوم نہیں اتنی خفت کیوں گوارا کی گئی کہ "اس زمانے کے لحاظ سے اعتراض بجا ہے"

دوسرے اعتراض کا جو "سادہ" کے لفظ پر ہے اتنا معقول جواب دیا گیا ہے کہ جسقدر حیرت کیجائے کم ہے یعنی یہ بھی نسیم کے زمانہ میں جائز تھا۔ چنانچہ ناسخ فرماتے ہیں۔

ترک کرواتا ہے عشق سادہ رو　　　زاہد بے دین بھی کتنا سادہ ہے

اور جان صاحب کہتے ہیں ؎

کتنے سادے ہو کہ جٹی مانگتے مینا سی ہو		میں بھبو کا لعل منگوادوں تمہیں دو چار رخ	

مگر یہ سنکے شاید مسٹر چکبست گھبرا جائیں گے کہ ناسخ اور جانصاحب دونوں کے شعروں میں "سادہ" کا لفظ صحیح و فصیح ہے اور نسیم کے شعر میں غلط۔ اسبات کو ہر اہل زبان بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے کرمفرما کو محسوس نہ ہوسکی۔ اصل یہ ہے کہ "سادہ" صفت ہے اُسکا استعمال جبھی ٹھیک ہو سکتا ہے جب کہ موصوف بھی مذکور رہو۔ دونوں مذکورہ اُستادوں کے کلام میں موصوف موجود ہے۔ ناسخ نے زاہد کو سادہ قرار دیا ہے اور جان صاحب "تم" کو سادہ بتاتے ہیں بر خلاف اسکے نسیم کے مصرع میں کوئی موصوف نہیں ہے۔ شاید کہا جائے کہ غائب کی ضمیر "اِن" موجود ہے۔ لیکن "اِن" ضمیر نہیں اسم اشارہ ہے جسکے بعد مشار الیہ

کا لانا لازمی ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے دوست اب اس نازک فرق اور نحوی مسئلے کو سمجھ گئے ہوں گے۔

(۴۷) دیووں نے اُدھر محل بنایا کشتی سے وہ دُخت رز کو لایا

اس پر اعتراض یہ ہے کہ "دخت رز" شراب کو کہتے ہیں۔ مگر نسیم نے اُس سے معشوقہ مراد لی ہے۔ جواب میں مسٹر چکبست کی یہ جرأت قابل داد ہے کہ فرماتے ہیں "معترض کا غالباً یہ خیال ہے کہ دخت رز سے کوئی معشوقہ عورت مراد لینا جائز نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے ثبوت یہ ہے کہ آتش کہتے ہیں۔

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

اور قلق کہتے ہیں ؎

لبالب بادۂ گلرنگ سے دل کا پیالا ہے
وہ مے کش ہوں کہ میں نے دخت رز کو گھر میں ڈالا ہے

ارشاد ہوتا ہے" اور ظاہر ہے کہ نہ آتش شراب کو نور جہاں بیگم کہہ سکتے تھے اور نہ قلق شراب کو گھر میں ڈال سکتے تھے" ہرگز نہیں۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ قلق نے دخت رز کے گھر میں ڈالنے کو اپنی مے کشی کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ جواب لغت کی کتابوں میں دیکھنے اور نیز کسی شاعر سے مشورہ لینے کے بعد قید تحریر میں لایا جاتا۔ "رز" فارسی میں انگور کو کہتے ہیں اور شراب چونکہ اُس سے پیدا ہوتی ہے اسلئے شعرا میں دختر رز کہلاتی ہے۔ اور اُسی سے نقل کر کے غیاث میں لکھا ہے "دختر رز۔ شراب انگوری" شعرا دخت رز کی لفظی مناسبت اور نیز اس خیال سے کہ اُس سے سرور حاصل ہوتا ہے اکثر اوقات اپنی کثرت بادہ گساری اور اُسکے ذوق و شوق کے ثبوت میں دعویٰ کر دیا کرتے ہیں کہ "شراب ہی ہماری معشوقہ ہے" شراب ہی پر موقوف نہیں جوش محبت ظاہر کرنیکے لئے انسان ہر غیر ذی روح چیز کو اپنی معشوقہ کہہ سکتا ہے۔ اسی کے مطابق مذکورہ اشعار میں آتش و قلق نے بھی شراب کو اپنی معشوقہ بتا دیا۔ مگر آج تک اس حماقت میں کوئی نہیں مبتلا ہوا تھا کہ اپنی اصلی معشوقہ کو "دخت رز" کہہ دے۔ واقعی یہ عجیب تماشے کی بات ہے کہ دیگر شعرا نے تو شراب کو معشوقہ بتایا۔ مگر یہاں نسیم نے مزے میں آکے خود اپنی معشوقہ کو شراب بنا ڈالا ماشاءاللہ اور اس سے زیادہ لطف کی یہ بات ہے کہ یہ شاعرانہ نزاکت بتائی جاتی ہے ایسی نزاکت

لو پہلا کون سمجہ سکتا ہے ؟ جب تک کوئی اتنی ہی غلطیوں کا سارٹیفکٹ نہ حاصل کرے جتنی کہ نسیم سے اپنی مبرا عمری یعنی چند گنتی کے شعروں میں ہوئی ہیں اُسوقت تک یہ نزاکتیں اُسکی سمجہ میں نہیں آسکتیں۔

(۲۹) حوض اُسکی ہوئی یہ دیکھتے ہی فوارہ تو گم خزانہ باقی

اس پر فحش گوئی کا اعتراض تہا۔ جواب میں کہا گیا کہ اُس زمانے کے کسی شاعر کا کلام فحش سے نہیں پاک تہا۔ اور سنتے ہیں کہ جواب میں بہت سے اساتذہ کے فحش اشعار بہی نقل کئے گئے تھے جن کو اڈیٹر صاحب اردوئے معلی نے بیہودہ وخلاف تہذیب دیکہ کے نکال ڈالا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُس دور کے شعرا وصال کے موقعوں پر اکثر فحش گوئی کرجاتے تھے اور نہ ایسے فحش پر میرا اعتراض ہے۔ ورنہ اعتراض کرنیکے لئے گلزار نسیم میں بہت سے اشعار موجود تھے۔ میرا اعتراض اُس بازاری شہدوں کے فحش پر ہے جو پہلے مصرع میں ہے۔ اگر غور سے دیکھیے تو اردو کی تمام مثنویوں میں وصال کے موقع پر فحش اشعار ملینگے۔ مگر اُن میں سے کسی میں بہی اس قسم کا فحش نہیں ہے جیساکہ اس شعر کے مصرع اول میں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض دیوانوں میں اس قسم کے فحش اشعار بہی ملجائیں۔ مگر اُن سے استناد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ شعرا مختلف حالتوں اور صحبتوں کے لحاظ سے مختلف رنگ کے اشعار کہہ جاتے ہیں جن میں سے بعض میں نہایت بے اعتدالیاں ہوجاتی ہیں ایسے اشعار کے کہتے وقت شعرا کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ وہ عام لوگوں کے سامنے پیش کئے جائیں۔ بلکہ وہ محدود سوسائٹی کے لئے ہوتے ہیں اُن کے بعد اُن کے کلام کے جمع کرنے والے ایسے اشعار کو بہی داخل کلیات کردیا کرتے ہیں۔ اور یوں وہ کلام جو کسی خاص وقت وخاص صحبت کے لئے تہا عام نظروں کے سامنے پیش ہوجاتا ہے۔ مگر مثنوی کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ لکہی ہی عام لوگوں کے لئے جاتی ہے۔ لہذا اوس میں ایسی بے اعتدالیاں ہرگز قابل معافی نہیں ہیں۔

(۳۰) دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل

اعتراض تہا کہ یہاں سیل کے کچہ معنے نہیں رہتے۔ اسکا جواب مسٹر چکبست یہ دیتے ہیں کہ فارسی لغت میں "قطرہ زن" کے معنے شتابندہ کے ہیں۔ یعنی سیل دوڑتا ہوا دریا سے

جا ملا۔ اُنکے اس جواب کو بہ خلوص کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں یہ "قطرہ زن" کے ان معنوں کی بابت میرا خیال نہیں گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنا ضرور کہونگا کہ ایسے غیر معروف وغیر مانوس الفاظ کا استعمال خلاف فصاحت ہے۔ "قطرہ زن" کا فارسی محاورہ کبھی اس سے پہلے بھی اُردو میں استعمال ہوا تھا۔

(۳۱) اٹس فیل کیا دہند آ ئی

اعتراض تھا کہ "فیل سے تشبیہ صرف ہندی کی ضرورت سے دیکھی ہے مگر کسقدر برا معلوم ہوتا ہے" جواب یہ ہے کہ "اسکو قبول عام کی سند مدت ہوئی مل چکی ہے۔ یہ مصرع ضرب المثل ہوگیا ہے" اب اسکے بعد میں سوا اسکے کیا کہہ سکتا ہوں کہ قبول عام کی سند تو ساری مثنوی کو مل چکی ہے۔ پھر تمام اعتراضات کے جواب میں یہی فقرہ کیوں نہ فرمادیا۔ یہ زحمت بیکار ہی گوارا کی۔ رہا اس مصرع کا ضرب المثل ہونا شاید اسی سوسائٹی میں ہو جسکی ٹکسالی زبان نسیم کی مثنوی ہے۔ لکھنؤ کی کسی اور صحبت میں تو کبھی یہ مصرع سُنا نہیں گیا۔

(۳۲) ہلکا ہوا وہ گراں ہوئی وہ

اعتراض تھا بکاولی تو پتھر کی ہونے کی وجہ سے گراں ہوئی مگر ایسی حالت میں تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوئے؟ جواب یہ ہے کہ ہلکا ہونیکے معنے اس مصرع میں سبک اور خفیف ہونیکے ہیں۔ اور گراں ہونیکے یہ معنے ہیں کہ بکاولی اہل محفل کی طبیعت پر گراں ہوئی محاورے کی استعمال کے لئے ایک خاص قسم کا سلیقہ ہی چاہئے۔ وہ یہ کہ محاورات اس طرح استعمال کئے جائیں کہ سننے والے کا خیال خود ہی اُنکے معانی کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اور لغوی معنوں یا دوسرے معنوں کا اشتباہ نہ پیدا ہو۔ ہمارے دوست نے سند میں جتنے اشعار پیش کئے ہیں اُنہیں سے اس سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ قلق کے مذکورہ بالا مصرع میں دونوں محاورے موجود ہیں "گراں" کے معنوں کو "خاطر" کے لفظ نے کھولدیا۔ اور ہلکا ہونے کے معنوں کو "یار کی نظروں" نے واضح کردیا۔ اسی طرح جان صاحب کے مصرع "کردیا ہلکا مجھے منجھلی بوا کے سامنے" میں "ہلکا" کے مطلب کو الفاظ "منجھلی بوا کے سامنے" واضح کررہے ہیں۔ اب اس اصول کو ذہن نشین کرنیکے بعد بتائیے کہ نسیم نے "ہلکا ہوا وہ گراں ہوئی وہ" میں دونوں محاوروں کو کس بے سلیقگی و بدتمیزی سے استعمال کیا ہے؟

(۳۳) نسیم کے متعدد مصرعوں پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ان میں افعال کا استعمال ایسی بُری طرح سے

ہوا کہ نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک ٹھیک ہی۔ نہ دہلی والوں کے نزدیک۔ وہ مصرعے حسب ذیل ہیں۔ ع

خاتم کے نگین بتلائے ہوتے (یعنی خاتم کے نگیں انہوں نے بتائے ہوتے یا خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا۔)

ع حیلہ کر کے چھپا لی یک چند (یعنی اسکو چھپایا)

ع مردانہ لباس سے نکالی (بجائے اوسکو نکالا)

ع بھڑکائی جمیلہ مادر اسکی (بجائے اسکی ماں جمیلہ کو بھڑکایا)

ع چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی (یعنی "جلی ہوئی کو جلایا")

ع اُس شب کو بغل میں آکے جاگا (یعنی جب وہ آئی تب جاگا)

ع پر دوسری شب وہ جا کے جاگا (یعنی "جب وہ جائی تب جاگا")

ع بائیں دیکھا کہیں نہ پائی۔ (یعنی کہیں نہ پایا)

ع یہ جاگے ہوئی وہ فتنہ بیدار (یعنی "اسکے جاگنے کے بعد بیدار ہوئی")

ع بیدار کیا وہ ماہ پیکر (یعنی "اس ماہ پیکر کو بیدار کیا")

ع الفت سے روکی دل لگی کو (یعنی دل لگی کے لئے اُسے روک لیا)

ع منہ بولی بہن بنائی اُسکو (یعنی "بنایا اسکو")

ع وہ جائی کہا یہ پردہ پوشی (یعنی "وہ جائی تو کہا")

تعجب ہی کہ اس عام اعتراض کے جواب میں ہمارے کرمفرما نے سب کے پہلے یہ فرمایا ہی کہ "بے شک آجکل جو زبان کا رنگ ہی اُسکے لحاظ سے افعال کا استعمال اس صورت پر غیر فصیح معلوم ہوتا ہی" حالانکہ کشمیری اُردو میں بجنسہ یہ افعال اسی شان و وضع سے اب تک موجود ہیں۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہی کہ نسیم کو زبان کی یہ ترکیبیں معاصر شعرا سے نہیں بلکہ خود اپنے گھر میں ملی تھیں۔ لیکن اس تجاہل عارفانہ سے زیادہ کمال یہ کیا گیا ہی کہ کوشش کی گئی ہی جو دھبے نسیم کے دامن میں لگے ہیں کل اُردو اساتذہ سخن کے دامنوں میں بھی لگا دئے جائیں۔ چونکہ اس موقع پر نظیر میں بہت سے اشعار پیش کئے گئے ہیں لہذا میں ایک ایک کو نقل کرکے بتاتا ہوں کہ محض نافہمی سے کیسے کیسے اُستادوں کا کلام بگاڑنے کی بیکار کوشش کی گئی ہے۔ لہ

لہ اس مقام پر حضرت معترض کے مضمون کا ایک صفحہ شاید غلطی سے روانہ ہونے سے رہگیا اور ہمارے پاس نہیں پہونچا اسلئے ہم مجبوراً اسکو حذف کرتے ہیں۔

۳۴ (اس مقام کی بھی چند سطریں نثار دیں)

شوقؔ لکھنوی: شکل دکھلاؤ کبریا کے لئے ✤ بام پر آؤ ذرا خدا کے لئے

"دکھلاؤ" پہلے مصرع اور فقرے میں ہے اور "آ" دوسرے مصرع اور فقرے میں۔

جانؔ صاحب (پڑی ہیں سر میں جو بیک اب ایسی کر زیج ہو جینے سے جی ہمارا۔ مامانی اماں تیں سر میں ڈالول منگادو ہتوڑا سا مجکو پیارا) "ہمارا" پہلے مصرع اور فقرے میں ہے "اور میں" دوسرے مصرع اور فقرے میں۔

اب ان سب اشعار کو پڑھ کے نسیم کے مصرع کو پڑھئے "فرمایئے کیا خطا تمہاری" ایک ہی مصرع اور ایک ہی فقرے میں "فرمایئے" بھی ہے اور "تمہاری بھی" جس عیب کی نظیر بھی مشکل سے ملسکتی ہے۔ اور پھر کمال یہ کہ از سلف تا خلف سب کہتے آئے ہیں۔ ؏ میں تو ڈوبا ہوں مگر یار کو بھی لے ڈوبوں گا۔ میں نے مانا کہ سب کہتے آئے ہیں مگر افسوس شاعری سے واقف ہوکے اور سمجھ بوجھ کے۔

(۳۵) رہرو کو دیا بہ لطف و اکرام ✤ آئے آرام جاتے پیغام

اس پر میں نے اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "پیغام کی جگہ "انعام" کا لفظ ہوگا غلطی سے "پیغام" ہوگیا۔ مسٹر چکبست کو اسمیں بھی تامل ہے۔ فرماتے ہیں انعام ہونے کی وجہ "سرا میں جو مسافر ٹھہرتے ہیں اُن کو سرا کا مالک کسی قسم کا پیغام تو دیکستا ہے مگر انعام کیوں دینے لگا؟" بجا ارشاد ہوا مگر (معاف فرمائیگا) میں تاج الملوک کو ایک بادشاہ اور بادشاہزادہ خیال کرتا تھا۔ اور سمجھا تھا کہ بادشاہ سرا بنوائے گا تو مسافروں کو انعام دیگا۔ اور جیسا کہ پہلے مصرع میں کہا گیا ہے "لطف واکرام" سے پیش آئیگا۔ اپنے سفیروں اور ایلچیوں کو چھوڑ کے مسافروں کے ذریعے سے "پیغام" بھیجنے کی اُسے ضرورت نا حق ہوتی ہوگی۔ لیکن اب مجھے اپنے دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تاج الملوک اس سرا کو بنوا کے مسافروں کے ذریعے سے اپنے دوستوں اور برادری والوں کو "پیغام" بھیجا کرتا تھا۔ خیر یوں ہی سہی۔

(۳۶) دیکھا تو تمام دشت گلزار ✤ دائیں بائیں دو رستہ بازار

اس شعر کے متعلق بھی میں نے یہ کہا تھا کہ نسیم نے اصل میں "دو دستہ" کہا ہوگا مطابع کی غلطی سے "دو رستہ" ہوگیا۔ مسٹر چکبست بوا۔ میں "دو رستہ" کے لفظ کو صحیح بتاتے اور تعلق اور میر حسن کی مثنویوں سے نظیریں بھی پیش کرتے ہیں۔ مگر میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ "دو دستہ" صحیح ہے اور ان نظیروں کی نسبت بھی میرا یہی خیال ہے کہ شاعر نے "دو دستہ" کہا ہوگا چھاپنے والوں نے

"دو رستہ" بنا دیا۔ آخر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔ یہ لفظ اُردو نہیں فارسی ہے۔ اور ترکیب بھی فارسی ہی وضع کی ہے۔ فارسی کے کسی لغت میں "دو رستہ" کا پتا نہیں۔ اور غالباً اُردو لغات بھی اس سے خالی ہونگے۔ معنوں پر غور کیجئے تب بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ "دو دستہ" ہی صحیح ہے۔ "دو دستہ" کے معنے "دونوں ہاتھوں پر" یا "دونوں پہلوؤں پر"۔ اسکے مقابل "دو رستہ" کے کچھ معنے ہی نہیں۔ انسان کسی راستے پر گزر رہا ہو تو اپنے دونوں جانب کو "دونوں ہاتھوں پر" یا دونوں بازوں پر" کے الفاظ سے تعبیر کر سکتا ہو اور کرتا ہے۔ "دونوں راستوں" پر کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسلئے کہ راستہ ایک ہی ہے دو نہیں ہیں۔ اس قسم کے مشتبہ الفاظ کی تصحیح مشتبہ اشعار کے پیش کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ اگر تحقیق مقصود ہے تو لغت سے کوئی سند پیش کیجئے۔

اسکے بعد میں نے گلزار نسیم کے اُن اشعار کو پیش کیا تھا جن میں مسٹر ہکیبت کا ایڈیشن دیکھ کر مجھے تصرف بیجا کا خیال گزرا۔ کیونکہ گلزار نسیم کے اور عام ایڈیشن جو فی الحال بازار میں فروخت ہو رہے ہیں اُن میں وہ اشعار زیادہ صحیح اور فصیح و با محاورہ معلوم ہوتے ہیں چنانچہ مسٹر ہکیبت کے دعوے کے مطابق ان کے ایڈیشن کو میں نے اصلی قرار دیا۔ اور سلیم نامی کے ایک ایڈیشن کو جو صحیح اور واضح چھپا ہوا ہے بازاری ایڈیشن قرار دیکے دونوں کا مقابلہ کیا۔ اسپر ہمارے دوست فرماتے ہیں "واقعی تنقید اسی کا نام ہے"۔ مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اسکے سوا اور کون سی صورت مستند اور بازاری ایڈیشنوں کو مقابلے کی ہو سکتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ سلیم نامی کی مثنوی اسقدر صحیح عمدہ اور واضح ہو کہ اُس سے مسٹر ہکیبت والی مثنوی کو کوئی نسبت نہیں۔ وہ صرف عمدہ ہی نہیں چھپی ہے بلکہ اُسکی بنا پر گلزار نسیم کے اوپر اتنے اعتراض نہیں ہو سکتے جتنے کہ اس مستند اور خاص مصنف کے صحیح کئے ہوئے نسخے کی نقل کی بنا پر وارد ہوتے ہیں۔ اس مقابلے کے نتیجے میں جن مصرعوں میں مجھے اختلاف نظر آیا یا تصرف کا خیال گزرا وہ اگرچہ شمار میں زیادہ ہیں مگر میں نے نمونے کے طور پر صرف تیرہ مندرجہ ذیل مصرع پیش کئے تھے:-

(عام نسخوں کے مطابق)	(مسٹر ہکیبت کے نسخے کے مطابق)
(۱) گلزار کی سیر خوب بھائی	گلزار کی سیر کیا خوش آئی
(۲) روشن ہے چراغ اور فتیلہ	روشن تھے چراغ اور فتیلہ
(۳) دو دل جو ہوں جا ہیئے پہ راضی	دو دل جو ہوں جا بئیں راضی

(۴)	بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا	بولی وہ جمیلہ کہ کروں کیا
(۵)	پو پھٹتے ہی جگ اُن کا لوٹا	پو پھٹتے ہی جگ اُنھوں کا لوٹا
(۶)	تھا اوپر ہی کون آنے والا	اوپر کا تھا کون آنے والا
(۷)	جنّی تھی ہمیشہ دختر اُس کو	جنّی تھی ہمیشہ دختر اُس کو
(۸)	قاصد نے جو رخ پری دکھایا	قاصد نے رُخ پری دکھایا
(۹)	قسمت سے مفر ہے اب سنا من	قسمت سے مفر ہے اب یہ مامن
(۱۰)	مہتابی پہ چاندنی سی سوئی	مہتابی پہ چاندنی میں سوئی
(۱۱)	صیاد نی لائی پیالنی کر صید	صیاد تھی لائی پیالنی کر صید
(۱۲)	چلئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر	چلیے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر
(۱۳)	جاتے تھے اُدہر سے دو جواری	چلتے تھے اُدہر سے دو جواری

ان میں سے سات مصرعوں یعنی نمبرہائے (۴) (۵) (۷) (۸) (۹) (۱۱) (۱۲) کی نسبت مسٹر چکبست لکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر میں واقعی کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔" اب ہی "اکثر" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ صاف صاف نہیں قبول کرتے کہ ان سب میں کتابت کی غلطی ہے یا ان میں سے کون کون کاتب کے قلم کا شکار ہوئے ہیں بلکہ اگر "اکثر" سے وہ معنے لئے جائیں جن معنوں میں مسٹر چکبست نے "اکثر" کے لفظ کو بعض جگہ استعمال کیا ہے تو یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان سات مصرعوں میں سے بھی دو ہی ایک میں کتابت کی غلطی ہے۔ مگر اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ جو مصرعے ان سات کے علاوہ ہیں اُن کی غلطی کا کون مجرم ہے یہ بھی شبہ باقی رہتا ہے کہ ان سات مصرعوں میں بھی اگر کاتب کی غلطیاں ہیں تو کس کاتب کی؟ "چکبستی ایڈیشن" کے کاتب کی "یا دیا شنکری ایڈیشن" کے کاتب کی؟ مگر یہ آخر الذکر شبہ مسٹر چکبست کے اس فقرے سے شکوک طور پر رفع ہو سکتا ہے کہ "ان مصرعوں کے علاوہ اور جن اشعار پر شرر کو اصلاح یا تصرف کا شک ہوا ہے وہ اسی حالت پر ہیں جس حالت میں کہ وہ اصلی ایڈیشن میں پائے گئے تھے" افسوس کہ باوجود تلاش مجھکو وہ صحیح ایڈیشن نہیں ملا مگر اُنکے بیان سے مشتبہ طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصرع ہائے مذکورۂ بالا میں سے نمبر (۴) (۵) (۷) (۸) (۹) (۱۱) (۱۲) کو تو مسٹر چکبست کے کاتب نے تصرف کرکے بگاڑا۔ اور نمبرہائے (۱) (۲) (۳) (۶) (۱۰) (۱۳) اصل کے مطابق ہیں لہذا اُن کو خود نسیم کی غلطیاں خیال کرنا چاہئے۔ کیونکہ جب خود اُنھوں نے تصحیح کی ہے تو

اگر غلطیاں رہ بھی جاتیں تو اس قسم کی نہ ہوتیں کہ ایک محاورہ سے دوسرا محاورہ ہو جائے۔ اور بجائے غلطی ہو جانیکے اصلاح دینے کا احتمال پیدا ہوتا ہو۔ الغرض وہ مصرعے جن کی غلطیوں کے ذمہ دار خود نسیم قرار پاتے ہیں یہ چھ مصرعے ہیں۔

(عام نسخوں کے مطابق)	(نسیم کے ایڈیشن کے مطابق)
گلزار کی سیر خوب بھائی	(۱) گلزار کی سیر کیا خوش آئی
روشن ہے چراغ اور فتیلہ	(۲) روشن تھے چراغ اور فتیلہ
دو دل جو ہوں چاہنے پہ راضی	(۳) دو دل جو ہوں جانبین راضی
تھا اوپری کون آنے والا	(۴) اوپر کا تھا کون آنے والا
مہتابی پہ چاندنی سی سوئی	(۵) مہتابی پہ چاندنی میں سوئی
جاتے تھے اُدھر سے دو جواری	(۶) چلتے تھے اُدھر سے دو جواری

ان مصرعوں کی صحیح حالت معلوم ہونے سے چونکہ نسیم کی کئی اور فاش غلطیاں کھل گئی تہیں اسلئے اعتراض کی زد سے بچانیکے واسطے ہمارے دوست نے تحریر فرمایا ہے "نامی پریس کی مثنوی کو جس شخص نے ترتیب دیا ہے اُس نے اکثر قدیم محاوروں کی بدلے اس زمانے کے محاورے لکھ دئے ہیں۔ غالباً اسی بنا پر شرر فرماتے ہیں کہ بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہیں بلکہ بنا دیا۔ میری رائے میں اس قسم کا تصرف کرنا طالبانِ فن زبان کے حق میں ظلم کرتا ہے۔ چاہے عامیانہ مذاق کے لوگ ایسے تصرفات کو پسند کریں کیونکہ اُن کی نظر وسیع نہیں ہوتی ہے مگر نقادانِ سخن جانتے ہیں کہ مرتب کا فرض یہ ہے کہ وہ گنجینہ دار معانی کی چھوڑی ہوئی امانت میں کسی طرح کی خیانت نہ کرے۔" لیکن ہمارے مہربان نے بیچارے "نامی پریس" کے ترتیب دینے والے کو ناحق ہی ملزم ٹھہرایا۔ اسلئے کہ یہ تصرفات نسیم کے تھوڑے ہی زمانے بعد ہو چکے تھے بازار کے دیگر نسخوں میں بھی ایسا ہی ہونیکے علاوہ ہمارے پاس کانپور کے "مطبع حسینی شیخ ولایت حسین ابن منشی حسین بخش" کا ۱۲۷۲ء کا چھپا ہوا ایک ایڈیشن گلزار نسیم کا موجود ہے جو خود نسیم کے ایڈیشن کے بارہ ہی برس بعد چھپا تھا۔ اُس میں مذکورۂ بالا چھ مصرعوں میں سے چار نامی پریس کے ایڈیشن کے مطابق ہیں۔

"روشن تھی چراغ اور فتیلہ" میں "تھی" غلط تھا اُسے اصلاح دیکے "ہے" بنا دیا ہی۔

"دو دل جو ہوں جانبیں راضی" میں جانبین کا لفظ بغیر نون کے غلط تھا اُسے بدل کے "چاہئے یہ" بنایا ہے "چلتے تو اُدہر دو جوار ہی" میں "چلتے تو" غلط تھا۔ اُسکی جگہ "جاتے تو" بنایا۔

"مہتابی پہ چاندنی میں سوئی" صحیح مگر معمولی مصرع تھا۔ لہذا "میں" کی جگہ "سی" بنا کے ایک اعلیٰ درجے کی نزاکت پیدا کی گئی ہے۔ ان قدیم اصلاحوں اور ترمیموں سے بخوبی ثابت ہوتا ہی کہ مسٹر چکبست کے خیال کے مطابق نامی ہی ہریں کی صحیح نے ان مصرعوں کو خلاف محاورہ اور غلط نہیں سمجھا بلکہ نسیم کے قریب ہی ماننے رہی میں یہ قابل اصلاح اور غلط سمجھے گئے اور مطابع نے مناسب اصلاح اُسیوقت سی دینا شروع کر دی۔

میں نے آخر میں لکھا تھا کہ "بعض حضرات کو یقیناً یہ تحریر ناگوار گذریگی۔ اور میں بھی دل سی چاہتا ہوں کہ اُنہیں سخت ناگوار گذرے کیونکہ ایسی صورت میں وہ شاید جوش سے جواب لکھیں گے" میری اس تمنا کو مسٹر چکبست نامناسب بتاتے ہیں۔ اور میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ واقعی نامناسب تھی کیونکہ مجھے اسکا اندازہ نہ تھا کہ اُنکا یا اُنکے ہم قوم و ہم خیال لوگوں کا جوش کس مذاق کا ہوا کرتا ہے۔

یہ مضمون اگرچہ بہت بڑھ گیا ہی اور ناظرین پر بار گذرے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہایت ہی محدود ہی۔ گلزار نسیم کو اگر سمجھ کے پڑھیے اور اُسپر غور کی نظر ڈالئے تو اوّل سے آخر تک غلطیوں سے مملو نظر آتی ہے۔ اُردو میں شاید یہی ایک نظم ایسی ملیگی جسمیں یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ کن کن شعروں میں غلطیاں ہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ کوئی شعر غلطیوں سے بچا ہوا بھی ہے یا نہیں گویا اسمیں یہ خاص صنعت رکھی گئی ہی کہ ہر ہر شعر کو پڑھ کے اُسکی خوبیاں دکہائیے۔ اور پھر اسی کے ساتھ اُسکے معائب بھی نکال کے پیش کیجئے۔ نہ کوئی شعر کسی حُسن سے خالی ہے اور نہ کوئی شعر عیب سے پاک ہی۔ فقط

(محمد عبدالحلیم شرر)

بمبئی کانگرس اور مسلمانونکا نفع نقصان

(نوٹ بر مضمون حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس دتاولی)

گزشتہ پرچۂ انڈووی معلی میں ایک نہایت سلجھا ہوا مضمون حاجی موسیٰ خانصاحب کا طبع ہوا ہے جس لہجے میں حاجی صاحب نے مضمون لکھا ہے وہ ہزار ستایش اور آفریں کے لایق ہے یہی طریقہ ہے جس سے غلط خیالات اور باہمی شکوک رفع ہو کر یکجہتی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اگر ایسے ہی ہندو دل اور انصاف کی نظر سے کانگرس کی کارروائیوں پر ابتدا سے توجہ کی گئی ہوتی تو آج کانگرس کیطرف سے یہ غلطی فہمی اور تنافر جو مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے یا پھیلایا گیا ہے نہ ہوتا۔ بہرحال حاجی صاحب کی رائے غور کے قابل ہے اور میں اسپر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

رزولیوشن نمبر ۲-۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵-۱۶-۱۶-۱۷، ۱۸-۲۰-۲۱-۲۲ سے حاجی صاحب کو کلی اتفاق ہے یا کم از کم وہ اختلاف کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے اور مسلمانوں کو اسکی تائید کی صلاح دیتے ہیں، اسلئے انپر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذیل کے رزولیوشنوں میں کسیقدر ترمیم چاہی گئی ہے میں انہیں پر بحث کرتا ہوں۔

رزولیوشن اوّل۔ حاجی صاحب چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ سروس میں ہندو اور مسلمان نسبتاً داخل ہوں، یہ ایک دل خوش کن خواہش ہے اور اگر یہ طے ہو جائے تو ایک بڑی وجہ مناقشت کی جو دونوں قوموں میں ہے مٹ جائے مگر افسوس ہے کہ اسکا عملدرآمد صرف ہمارے صوبے اور پنجاب میں ہو سکتا ہے، دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی حالت ایسی ابتر ہے کہ یہ درخواست کسیطرح قابل پذیرائی نہیں ہو سکتی کیونکہ اب ہر ایک چھوٹے بڑے عہدے کیلئے تعلیم کی شرط ہے اور مسلمان اسمیں پورے نہیں اتر سکتے اسلئے جبتک مسلمانوں کی تعلیمی ترقی نسبتاً ہندوؤں کے برابر نہو جائے یہ درخواست رعایت بلا استحقاق جسکو حاجی صاحب خود ناپسند کرتے ہیں، علاوہ ازیں ہر صوبے میں تعداد النسبتی ہندو اور مسلمانوں کی مختلف ہے اور بھی بہت سے ایسے وجوہ ہیں کہ یہ مسئلہ لوکل کانگرس میں طے ہونا چاہیئے۔ اگر ہندو اور مسلمان لیڈر ونمیں باہم میل جول ہوتا تو یہ باتیں بہت آسانی سے طے ہو جاتیں مگر رونا تو اسیکا ہے کہ روز بروز منافرت بڑہتی جاتی ہے۔

اگر کانگرس کی اسپرٹ اور اس رزولیوشن کے مفہوم کو غور سے دیکھئے تو اس رزولیوشن میں یہ ترمیم بالکل بیجوڑ معلوم ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے یورپین لوگوں کو خاص حقوق دے رکھے ہیں۔ اور کانگرس انہی حقوق کے خلاف گفتگو کرتی ہے اسلئے یہ بات بالکل نامناسب ہے کہ کانگرس خود مختلف استحقاق اور حقوق جُدا گانہ پیدا کرائے۔ اسکو وہ مٹانا چاہتی ہے۔ مزید براں کانگرس کی ہیئت سے یہ درخواست ہے

کہ عہدہاے سرکاری بہ مقابلہ نہ دیے جائیں اور جب عہدے مقابلے سے ملیں تو نسبت کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسلمان کوشش کر کے نسبت سے زیادہ جگہیں حاصل کرسکتے ہیں البتہ یہ امر قابل بحث ہے کہ مقابلہ بذاتہٖ کیسا ہے، اسکو میں اسوقت نہیں چھیڑونگا صرف اسقدر لکھنا چاہتا ہوں کہ اندنوں جہاں جہاں امتحان مقابلہ جاری ہے وہ نہایت ناقص اصول پر ہے، مثلاً اسی صوبے میں جسوقت ڈپٹی کلکٹری کا امتحان مقابلہ ہوتا تھا اسمیں جو مضامین داخل تھے اس سے ایک گریجویٹ کی قابلیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ نہایت ادنیٰ درجے کے مضامین تھے اور وہ مضامین اس عہدے کے کسی کام کے بھی نہ تھے۔ مقابلے کا امتحان ہمیشہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سے خاص مہارت اس کام کی معلوم ہوجسکے لیئے امتحان لیا جائے۔ اگزیکٹو کام کے لیئے اگزیکٹو لیاقت، جوڈیشل کام کیلئے جوڈیشل لیاقت، اگر ایسا امتحان مقابلے کا قائم ہو تو میں خیال کرتا ہوں کہ بہت مفید ثابت ہو اور مسلمانوں کو بھی کوئی وجہ شکایت کی نہ رہے۔ بہر حال میری رائے ہے کہ حاجی صاحب کی یہ تجویز کانگرس میں پیش کرنیکی نہیں بلکہ ہر صوبے میں جدا جدا طے کرنیکے لائق ہے۔

رزولیوشن نمبر ۷ میں بالکل وہی بحث ہے جو اول رزولیوشن میں کی گئی ہے۔

رزولیوشن نمبر ۸۔ حاجی صاحب نے اپنے ریمارک کچھ ایسے الفاظ میں لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس کاشتکاروں کی حامی اور زمینداروں کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پنجاب میں جو رزولیوشن قانون قرضداری کے متعلق پیش ہوا تھا وہ محض اس وجہ سے واپس لیا گیا کہ مسلمان زمیندار اسکو ناپسند کرینگے۔ ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ کانگرس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُسنے تمام ضروریات کا احاطہ کر لیا ہے، قومی اور ملکی ضروریات لاتعد و لاتحصی ہیں اور ایک ضرورت کے پیش کیئے جانیسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسری ضرورت سے انکار کیا جاتا ہے۔ اگر کبھی کسی نے اسطرف توجہ دلائی ہوتی اور کانگرس نے اُسے نامنظور کیا ہوتا تو البتہ قابل اعتراض بات تھی۔ لیکن اتنا معلوم رہے کہ اسوقت کاشتکاروں کی تحقیقات حالات زیادہ اہم ہو رہی ہے اور اگر اس امر میں کانگرس کی اسپرٹ دیکھی جائے تو وہ ملک کی زرعی حالات سے بحث کرتی ہے جنمیں کاشتکار اور زمیندار دونوں شامل ہیں۔

رزولیوشن نمبر ۹۔ یہ رزولیوشن کونسل کے ممبروں کے متعلق ہے اور ہمیشہ سے معرکۃ الآرا رہا ہے، اس رزولیوشن میں حاجی صاحب کے چند بیانات سے مجھے افسوس کے ساتھ اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ انکا یہ خیال ہے کہ ہندو بالقصد مسلمانوں کو نہیں منتخب کرتے اور قومی تعصب کو کام میں لاتے ہیں مگر

یہ بالکل غلط ہے ۔ نواب سید محمد اسوقت والیسراے کی کونسل میں، مدراس کیطرف سے منتخب ہوئے ہیں
اور تجویز ہے کہ آیندہ بھی وہی منتخب ہوں۔ مسٹر رحمت اللہ سیانی بارہا ممبر منتخب ہوئے اور مسٹر جعفر رحمت اللہ
اور مسٹر ابراہیم رحمت اللہ بھی ممبر منتخب ہو چکے ہیں* اور کانگرس والوں ہی نے ان بزرگوں کو ممبر کیا ہے۔
میں اسبات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس صوبے میں کوئی مسلمان انتخاب سے ممبر نہیں ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اس
میں کتنا بڑا مغالطہ لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ کونسل کی ممبری کوئی محض اعزازی شے نہیں ہے جو مسلمانوں کو
نہیں دیگئی اور مسلمانوں کی قوم تباہی میں آگئی۔ بلکہ ہمیشہ ایسے ممبر منتخب کئے جاتے ہیں جو کونسل میں
انہیں اصول پر کام کریں جو کانگرس کی خواہش کے مطابق ہوں اسمیں کیا ہندو ہوں اور کیا مسلمان۔
چونکہ اس صوبے کے قریب قریب تمام تعلیم یافتہ مسلمان کانگرس کے خلاف ہیں، اسلئے انکی شکایت
کانگرس سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے کرنی چاہیئے۔ جہاں مسلمانوں کا ایسا برتاؤ نہیں ہے وہاں کے
مسلمان منتخب بھی ہوئے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اپنے مخالف کو
اپنا وکیل مقرر کریگا؟ نہیں ہرگز نہیں! بس یہ الزام کانگرس والونپر اتہام سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا فقط۔
دوسری بحث نسبت کی تعین کی ہے۔ اگرچہ مینے خود اپنے مضمون اپریل ۱۸۹۱ء میں اس تعین
نسبت کو مسلمانوں کے رفع شکایت کا ایک علاج بتایا ہے مگر چونکہ اسوقت بحث مسلمانوں کے
نفع نقصان سے ہے اسلئے میں کہتا ہوں کہ اس تعین سے مسلمانوں کو کوئی نفع نہیں پہنچیگا اس کی
دو صورتیں ہو سکتی ہیں، اگر کونسل کے ہندو اور مسلمان ممبر کسی امر پر متفق ہیں تو یہ تعین نسبت فضول ہے
اور اگر اختلاف ہے تو ہندو ہی زیادہ ہونگے اسصورت میں بھی یہ نسبت فضول ہوگی البتہ یہ خواہش بجا اور
بالکل بجا ہے کہ مسلمانوں کے خاص ضروریات کے لئے کم از کم ایک مسلمان ممبر ضرور کونسل میں ہونا چاہیئے۔
مگر یہ باتیں باضابطہ طے کرنے کی نہیں ہیں۔ رہگیا یہ خیال کہ ہندوؤنکو ہندو منتخب کریں اور مسلمان کو مسلمان
ایک ایسا بے اصول خیال ہے جسے حاجی صاحب کیجانب منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ اسپر جو
نوٹ اڈیٹر صاحب نے دیا ہے وہ کافی ہے۔

رزولیوشن نمبر ۱۲ اخراجات فوجی کی نسبت کانگرس کی کبھی یہ رائے نہیں ہوئی ہے کہ اسکی تعداد
یا سامان ضرورت سے کم کیا جائے، بلکہ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ یہ فوج جسکا ایک بڑا حصہ فوائد انگلستان
کی غرض سے رکھا گیا ہے، اپنے اخراجات خزانہ انگلستان سے حاصل کرے اور حاجی صاحب کے

* اور ابھی حال میں مولوی شرف الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا بنگال کی کونسل میں ممبر بنائے گئے ہیں۔ اڈیٹر

بھی اس رائے سے اختلاف نہیں ہے اور نہ کسی سمجھدار شخص کو ہوسکتا ہے۔
رزولیوشن نمبر ۱۹ سلکٹ کمیٹی میں اگر صوبجات متحدہ اور پنجاب سے کوئی مسلمان نہیں رکھا گیا تو اسکی شکایت کانگرس سے کیوں کیجاتی ہے کانگرس کی فہرست ڈیلیگیٹ اُٹھا کر ملاحظہ فرمائیے کہ ان صوبوں سے کتنے لائق مسلمان شرکت کانگرس کے لئے گئے تھے اور انہیں سے کتنے اس کام کے لائق تھے

ع۔ سعدی از دست خویشتن فریاد

حاجی صاحب کو امید ہے کہ اس سال مسلمان کثرت سے کانگرس میں شریک ہونگے اور اُن کی شکایتیں رفع کردیجائینگی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔
اول تو مسلمانوں کو جو کچھ شکایات کانگرس کی طرف سے ہیں وہ خیالی شکایات ہیں اور اگر کچھ واجبی شکایات بھی ہیں تو انکے رفع کرنیکی خود مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر مسلمان ایسا کرتے اور کانگرس میں انکی شنوائی نہوتی تو بیشک اُنکو اختلاف اور علحدگی کا حق تھا مگر انہوں نے تو بلا سوچے سمجھے اول ہی روز سے آستینیں چڑھالیں۔ اب بھی بہت کچھ وقت ہے اگر مسلمان اس طرف توجہ کریں۔ کانگرس نے تو یہانتک طے کردیا ہے کہ اگر کسی رزولیوشن سے ہندو یا مسلمان مجموعتاً اختلاف کریں تو وہ قطعی خارج کردیا جائے۔ مگر کانگرس تو مسلمانوں کی نظروں میں ایسی ہوّا بنا دیگئی ہے کہ وہ اسکے قریب ہی نہیں پہنچ سکتے۔ اگر اس صوبے کے تعلیم یافتہ مسلمان اس سال کثرت سے شریک ہوئے تو امید ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور ہوجائینگی اور آئندہ یہ کام زیادہ اتفاق اور زور شور کے ساتھ ہوگا۔ راقم ”مسلمان“

”تنقید“

(۱) مجروح مرحوم | کی تحقیق سکن کے متعلق ہمارے پاس کئی تحریریں پہونچی ہیں جناب مولوی حبیب الرحمن خانصاحب رئیس بیکن پور لکھتے ہیں کہ
” اگست و ستمبر سنہ حال کے مشترکہ نمبر اردوی معلیٰ میں آپنے مجروح کی نسبت لکھا ہے کہ وہ پانی پت کے ساکن تھے۔ جہاں تک میرا علم ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ خود میر مجروح نے مجھسے بیان فرمایا تھا کہ وہ قدیم باشندہ دہلی تھے۔ اردو بازار (قریب قلعہ) میں اُن کا مکان تھا۔ غدر میں

مکان کھُد گیا۔ یہ برباد خانہ ویرانی کا داغ لیکر باہر نکل گئے۔ کچھ روز پانی پت میں رہے تھے میرزا غالب کی وہ تحریر جسکا حوالہ مضمون میں ہے وہیں پڑ گئی تھی۔ اب عرصے سے چڑیا کے چھتے میں تھے تھی۔ میں وہیں اونسے دربار ملا تھا۔ پہلی ملاقات میں اپنی یہ غزل سُنائی تھی ؎

رہرو راہ فنا ہوں مجھے کیا دیکھتے ہو — قطرۂ اشک ہوں اک جنبش مژگاں نہیں

اپنے استاد میرزا غالب کا ذکر اس خلوص سے کرتے تھے کہ جوش عقیدت ٹپکتا تھا مثنوی ابر گہربار اور باد مخالف کے اشعار پارسی کے لہجے میں پڑھکر سُنائے تھے لہجہ عجیب و غریب چیز ہے۔ حالانکہ بارہا وہ اشعار سنے اور پڑھے ہے لیکن اُسوقت کا سا لطف کبھی نہ آیا۔"

شمس العلما مولانا ذکار اللہ صاحب کی تحریر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے لیکن مولانا کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "پانی پت انصاریوں کے محلے کے رہنے والے" سے مرزا غالب کی مراد مولانا حالی سے ہے۔ کیونکہ حضرت حالی نے یادگار غالب میں خود اس خیال کی تردید فرمادی ہے۔

(۲) **لارڈ کرزن اور مسلمان** لارڈ کرزن کے زوال حکومت پر اہل ہند کو عام طور پر کسی قسم کا افسوس نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہیئے تھا۔ صرف بعض گمنام انجمنوں یا بعض حد سے زیادہ وفادار لوگوں کی جانب سے اظہار ہمدردی کے تار پہونچے اور بمصداق "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" خاص اہتمام کے ساتھ بلا توقف شملے سے روانہ ہوکر اینگلو انڈین اخباروں میں شائع ہوئے۔ اس ترکیب و تحریص کا خاطر خواہ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غرض و تملق میں سے جو لوگ خاموش تھے انکو بھی وائسرائے کیجانب سے جواب تار حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اظہار ہمدردی میں سبقت لیجانیکا ایک قابل افسوس کمپٹیشن (مقابلہ) قائم ہوگیا۔

آج فلاں نواب کا تار پہونچا تو کل فلاں راجہ کا۔ آج اس رائے بہادر نے پروانۂ خوشنودی حاصل کیا تو کل فلاں خان بہادر وائسرائے کے جوابی پیغام شکریہ سے سربلند ہوا۔ چنانچہ سلسلہ بسلسلہ نوبت ہمارے علی گڈھ کالج تک بھی پہونچی اور بعض ظاہر دار ٹرسٹیوں نے اپنے ساتھ چند تعلیم یافتہ ٹرسٹیوں کو بدنام کرنیکے علاوہ تمام مسلمانوں کو ذلیل اور رسوا کیا۔

ہمکو امید تھی کہ ایام تعطیل کیوجہ سے شاید کالج کو یہ فخر حاصل ہو لیکن خان بہادر حاجی محمد اسمٰعیل خان

صاحب جوائنٹ سکرٹری نے خان بہادری کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کو کسی صورت سے
جائز نہ سمجھا اور جس طرح سے ممکن ہوا بذریعہ تار چند ٹرسٹیوں کو اپنا ہمخیال بنا کر سرخروی حاصل کی
مسلمانوں کو لارڈ کرزن سے ہمدردی کرنیکی یہی تین وجہیں ہو سکتی ہیں کہ

(۱) یا تو لارڈ صاحب نے ملک ہند کو کوئی نفع پہونچایا ہو۔

(۲) یا مسلمانوں نے بحیثیت قوم کوئی خاص فائدہ اُٹھایا ہو۔

(۳) یا اور بھی محدود صورت میں صرف علی گڈہ کالج کی کوئی غیر معمولی مدد کی گئی ہو۔

سو امر اول کی نسبت پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کو لارڈ صاحب بہادر سے کوئی قابل ذکر نفع نہیں پہونچا اور اگر بفرض محال پہونچا بھی ہو تو علی گڈہ کالج کو، جو ایک تعلیمی مرکز ہے، کسی وائسرائے کی ملکی کامیابی پر مبارکباد کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

امر دوم کے متعلق بھی لارڈ صاحب مسلمانوں کے کسی شکریئے کے مستحق نہیں ہیں۔

حضور نظام سے برار کا ملک انہیں نے لیا اور سرحدی صوبہ قائم کر کے وہاں کے نیم آزاد مسلمانوں پر سختیاں انہیں نے بڑہائیں اور کالجوں کی فیس بڑہا کر مسلمانوں کی تعلیم میں اور بھی دقتیں پیدا کرنے کی کوشش انہیں نے کی۔

اب رہی صرف تیسری وجہ یعنی خاص علی گڈہ کالج سے ہمدردی اسکا حال یہ ہے کہ وائسرائے بہادر نے مسلمانوں کی سب سے بڑی آرزو یعنی محمدن یونیورسٹی کی خواہش کے خلاف اوّل خود علی گڈہ میں تشریف لا کر تقریر فرمائی اور پھر کچھ دنوں کے بعد یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں صاف صاف لکھدیا کہ علی گڈہ میں کوئی نئی یونیورسٹی نہیں بن سکتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہاں تک واقعات کو پیش کر کے ہم خان بہادر صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے کسی بنا پر وائسرائے کو ہمدردی کا تار بھیجکر ہمدردان ملک کے دلوں کو خواہ مخواہ صدمہ پہونچایا نیز یہ بھی پوچھتے ہیں کہ انکو کیا حق تھا کہ صرف چند ٹرسٹیوں کی رائے لیکر تمام ٹرسٹیوں کی طرف سے تار روانہ کریں درانحالیکہ ہمکو بوثوق معلوم ہے تعلیم یافتہ ٹرسٹیوں میں سے اکثر انکی اس ناواجب تجویز کے سخت مخالف تھے حتی کہ شاید نواب محسن الملک بہادر نے بھی "میں اسپر غور کروں گا" کہکر اُسے ٹال دیا تھا۔

غزل از جناب خان بہادر مولوی سید علی محمد صاحب شاد (عظیم آبادی)

زمانہ چاہیئے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اُس کا
بہت دیر آشنا ہو ای جبیں شوق ناز اُس کا

رہے ہے دل بستگی غم سے بڑھ ہے سوز و گداز اُسکا
گرہ کھل جائے گی دل کی تو کھل جائیگا راز اُسکا

عدی مجنوں کی تیرے بار خاطر ہو تو ہو لیلیٰ
اُٹھاتے ہیں مزا صحرا نوردانِ حجاز اُسکا

نہ چھوڑے جستجوئے یار خضر شوق سے کہہ دو
کسی دن خود لگا لے گی پتہ عمر دراز اوسکا

جفا و مہر میں بھی فرق کرنا سخت مشکل ہے
وہ خود چاہیں تو ہو عاشق کو حاصل امتیاز اُسکا

نگاہ فتنہ خو کو آج تک بھولا نہیں ہوں میں
وہ سفاکی وہ بیباکی وہ چالاکی وہ ناز اُسکا

کہاں یہ تاب طاقت ہے کہ ہم قفل دہن کھولیں
خزانے کی طرح دلمیں لئے بیٹھے ہیں راز اُسکا

دل اک محمل نشیں کے ساتھ مدت سے ہے آوارہ
پتہ کچھ ڈھونڈھ کر لکھیں مقیمانِ حجاز اوسکا

اب اسکا ذکر کیا قاصد یہ جو گزری وہ ہو گزری
نہ کہنا اس خبر کو شاد سے دل ہے گداز اُسکا

غزل جناب نواب سید محمد رضا صاحب موج عظیم آبادی

اوروں کو دیکھتی نہیں آنکھیں سوائے دوست
ناآشنائے خلق ہے زود آشنائے دوست

خوش ہوں جو سانس تک بھی نہ لوں بے رضائے دوست
ای دل ہزار جانِ گرامی فدائے دوست

گھیرے ہے دلکو الفتِ بے انتہائے دوست
مجھکو نہیں تمیز جفاؤ وفائے دوست

دل رازدارِ صحبتِ ناز و نیاز ہے
آنکھیں ہیں محوِ لذتِ شوقِ لقائے دوست

خلوت میں شب کو جب اُسی رو کر پکاریئے
بے اختیار آتی ہے دلسے صدائے دوست

الزام کیا جو آنکھوں نے دیکھا نہ اور کچھ
حق ہے کہ اس جہان میں تھا کیا سوائے دوست

انسان کی کیا بساط فرشتے بھی ہیں اسیر
اللہ رے تطاولِ زلفِ رسائے دوست

ہر چند ضبطِ آہ سے دل ہو گیا ہے خون
پھر بھی کھلا نہ حال کسی پر سوائے دوست

دونوں جہاں کا جسنے تعلق مٹا دیا
پہنچا ضرور تا درِ دولت سرائے دوست

دیکھا ہے میں نے آنکھوں سے اپنی جمالِ یار
اکثر سُنی ہے کانوں سے اپنے صدائے دوست

شہنا کا حال آج تلک ہو سکا نہ فاش
کم بخت نے کہاں سے اُتاری صدائے دوست

روشن اُسی کے فیضِ قدم سے ہیں مہر و ماہ
ہے طوطیائے چشمِ فلک خاکِ پائے دوست

اسکے سوا بساط میں کیا ہے فقیر کی
آئے تو فرشِ راہ ہیں آنکھیں برائے دوست

آئے گی قبر میں بھی برابر یہی صدا
سونے نہ دے گی چین سے فغانِ یادِ دوست

کچھ اسکی قدر رہروِ بینا سے پوچھیے
کیا جانے کور دل شرفِ نقشِ پائے دوست

ظلمت کا حال بادِ صبا سے سنوں گا میں
جھکنا پڑے گا غیر کے آگے برائے دوست

غنچے نہوں صبا کا ہوا جن پہ دسترس
کیا منہ کھلے کسی سے جو بندِ قبائے دوست

جس شئے پہ جا پڑی تو پھر اٹھتی نہیں نظر
اللہ رے ان آنکھوں کو شوقِ لقائے دوست

اے موجِ طولِ ہجر تو کرتا ہے مجھے ہلاک
رکھے ہیں جان آج تلک وعدہائے دوست

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

ایذائے بیقراری فرقت نہ پوچھیے
سب پوچھیے حضور یہ حالت نہ پوچھیے

نازک مزاج آپ ہیں اور حال غم فزا
انجام کارِ دردِ محبت نہ پوچھیے

رونا غمِ فراق میں ہنسنا وصال کا
عاشق سے دونوں باتوں کی لذت نہ پوچھیے

ایسا ہو بتاؤں تو شرمندہ ہوں حضور
سینے میں دل ہے کسکی امانت نہ پوچھیے

نام وصال پر مرا چہرہ نہ دیکھیے
اندازہٗ خیال مسرت نہ پوچھیے

دل اور زباں دونوں سے آپسمیں ساز تھا
وجہ بیانِ طولِ شکایت نہ پوچھیے

شب ہجر جو دیکھی خواب میں تصویر موت کی
ایسے مریضِ عشق کی حسرت نہ پوچھیے

ہر اشک میں تھا غرق سفینہ حیات کا
طوفانِ گریۂ غمِ فرقت نہ پوچھیے

بار نگاہِ شوق سے رنگ رخ اوڑ گیا
ہمسے حضور اپنی نزاکت نہ پوچھیے

جینے کی کچھ خوشی ہے نہ مرنیکا کوئی غم
رازو نیازِ اہلِ محبت نہ پوچھیے

محشر جو مست بادۂ عہدِ شباب ہیں
اون کا مزاج اون کی طبیعت نہ پوچھیے

غزل جناب مولوی حکیم عبد الہادی خانصاحب وفا رامپوری

یہ مشق سادگیہائے تمنائے نہاں تک
لکھیگا خامہ حسرت تمہیں آرام جاں کب تک

رہوں منت کش غمخواری ہفت آسماں کب تک
سراپا مال اپنا اور یہ بار گراں کب تک

دل افسردہ اور سرگرمی آہ و فغاں کب تک
اٹھیگا آتش خاموش سے آخر دھواں کب تک

دہلی میں سے کوئی صاحب کوئی قواعد لسانی معقول طور پر مرتب اور شائع فرماتے
اور اہل پنجاب اُن کے قاعدوں کو توڑتے اور اُن کی زبان کو خراب کرتے تو اُن کا
اعتراض بجا ہوتا۔ اب اُردو سیکھنے کے صرف دو ذریعے ہوسکتے ہیں:-

۱- دلّی اور لکھنؤ کے مستند شعرا کے دیوانوں اور نثر کی چند کتابوں کا مطالعہ
۲- عمر کا ایک قرار واقعی حصہ دلّی یا لکھنؤ میں بسر کرنا

فرداً فرداً دونوں طریقے بیکار ہیں۔ کیوں کہ صرف کتابوں کے مطالعے سے کسی زبان
پر قدرت حاصل کرنا چاہو تو نہیں ہوتی اور صرف کسی جگہ رہنے سے عام بول چال سے
آدمی واقف ہوجاتا ہے اور اتنا مذاق بھی پیدا ہوجاتا ہے کہ مشکل سے وہ کسی لفظ
یا محاورے کو صحیح یا غلط کہہ سکے مگر جب تک نظم و نثر کی کتابوں سے مدد لیکر وہ تحقیق
نہ دے زبان آوری محال ہے۔ ہاں ان دونوں طریقوں سے فائدہ اٹھانے کی
صورت میں ممکن ہے کہ اردو سیکھی جاسکے۔ لیکن اس کے ناممکن العمل ہونے سے
کون انکار کرسکتا ہے کہ کوئی صرف زبان کے درست کرنے کو لکھنؤ یا دلّی میں جا پڑے
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا،،

اور جب پھر پنجاب جائے تو صحیح اور فصیح اردو خود ہی لکھا کرے اور خود ہی بیٹھا پڑھا
کرے، اور خود ہی کوثر کی دُھلی زبان بولا کرے اور خود ہی سنا کرے۔

یہ امر مولانا نذیر احمد دہلوی اور حضرت شرر لکھنوی جیسے حضرات کی توجہ کا محتاج
ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے دوست سید فضل الحسن صاحب حسرت ضرور اس طرف
توجہ فرمائیں گے۔ اُردوئے معلّے میں ایک مضمون میں نے "غیر منصرف" پر دیکھا
لیکن شاید اس سلسلے میں اور مضامین نہیں لکھے گئے یا بہت کم لکھے گئے۔ میں
چاہتا ہوں کہ اُردو رسائل میں مسائل زبان پر اکثر بحث ہوا کرے۔ ایسی بحث
نہیں جس میں پنجابی اور ہندوستانی یا کشمیری اور مسلمان کا ناگوار جھگڑا درپیش ہو

بلکہ ایسی بحثیں ہوں جنسے تحقیق مدنظر ہو۔

چنانچہ ایک مضمون "نے" اور "کو" کے استعمال پر میں لکھتا ہوں۔ امید ہے کہ جو حضرات اس میں کوئی کمی یا خرابی پائیں گے ضرور ظاہر فرمائیں گے۔

"نے" اور "کو"

۱۔ "نے" ایک حرفِ معنوی ہے جو فعل متعدی کے فاعل کے بعد آتا ہے۔ اُسے اسی وجہ سے علامتِ فاعل کہتے ہیں۔

۲۔ **قاعدہ**۔ جب کسی فعل متعدی معروف کا ماضی مطلق یا کوئی اور ماضی جسمیں ماضی مطلق کی صورت بجنسہ قائم رہے، پہلے کا فعل واقع ہو تو اسکے فاعل کے ساتھ "نے" ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے، جیسے

ماضی مطلق: زید نے عمرو کو مارا

مثالِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں

تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا ..... آتش

ماضی قریب۔ زید نے عمرو کو مارا ہے۔

محروم اُس کے خوانِ تجلی سے کون ہے۔

حصہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا .... امیر

ماضی بعید۔ زید نے عمرو کو مارا تھا

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر

تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں ..... ذوق

ماضی مشکوک۔ زید نے عمرو کو مارا ہو۔ زید نے عمرو کو مارا ہوگا

ابتدا سے رمضان میں ہے عید کی دھوم

کس کا فر نے دکھایا نہ ہوا ابرو اپنا .... داغ

بست ہمسایہ اُس گلشن کے زنجیری رہا ہوئیں
کبھو تم نے بھی میرا شور نالوں کا سنا ہوگا ...... میر

ماضی تمنائی - زید نے عمرو کو مارا ہوتا۔

تیری زلفوں نے بل کھایا تو ہوتا
ذرا سنبل کو لہرایا تو ہوتا .... آتش

۳ - گر ماضی مطلق کے آگے جب "گیا" یا اُس کا کوئی صیغہ بڑھا کر ماضی استمراری بناتے ہیں تو اس فاعل کے ساتھ نے نہیں آتا جیسے زید عمرو کو مارا کیا یعنی زید عمرو کو مارتا رہا۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا — مومن

۴ - فعلِ لازم کے ساتھ "نے" کبھی نہیں آتا۔ بعض افعال ایسے ہیں جن میں تعدیہ ضعیف ہے اُن کا حکم بھی مثل افعال لازم کے ہے - یہ تعداد میں بہت تھوڑی ہیں: بولنا، بھولنا، ہارنا، جیتنا۔

بولنا:
میں جو بولا، کہا کہ "یہ آواز ٭ اُسی خانہ خراب کی سی ہے" ...... میر
ایک بولی "تو کیا نڈر ہے بڑا ٭ کتنا دیدہ دلیل ہے تیرا" .... قلق
بولے وہ اشک دیکھ کے چشم سیاہ کا ٭ "آئینہ کھیلتا ہے ہرن کا شکار آج" امیر

بھولنا:
بوسۂ چشمِ غزالاں مجھے یاد آتے ہیں — نہیں بھولا میں مزہ میوۂ صحرائی کا۔ آتش
بھولے ہم اُنکو پہلے ہی ناراض کر دیا — جو سکے ہم، اُنسے کرنے تھی شکوہ دعا کے بعد۔ داغ

ہارنا:
ہارے ہفتاد و دو ملت مجھ سے بحث عشق میں
تھا تو تنہا پر دیا میں نے بہتر کا جواب .... امیر

۵ - **مستثنیات** - بعض افعال متعدی ایسے ہیں جن کے ساتھ اکثر محاورے میں "نے" کو حذف کر دیتے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:- سمجھنا، پکارنا، سیکھنا، پڑھنا

ن کے ساتھ "نے" کا لانا بھی درست ہے۔ لیکن اوّل الذکر دو افعال سے "نے"
و حذف کرنا اکثر و بیشتر فصیح ہوتا ہے۔ اِن کا صحیح استعمال ذیل کی مثالوں سے
معلوم ہوگا:-

(۱)
نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے — اُسے تیرِ قضا اسکو یہ تیرِ قضا سمجھے۔ ذوق
دل شکستہ مگر اُس یار نے سمجھا ہم کو — خط بھی جو خطِ شکستہ ہی میں لکھا ہم کو۔ 〃
خاک میں ملکے بھی میں اُسکو نہ دشمن سمجھا — گردشِ چرخ کو اک گردشِ دامن سمجھا۔ آتش
لگا کے زلف کو شانے نے جو اُنگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا...... ذوق

(۲)
وہ بلا دوست ہیں جب کوئی کڑی آئی ہے
نام لے لے کے پکارا ہے بلا نے ہم کو..... امیر
موت نے مجھکو پکارا کہ مرے قاتل نے
"آئیے آئیے" مقتل سے صدائیں آئیں..... داغ
ہوں وہ مے کش جو کروں رُخ درِ توبہ کی طرف "بہکے جاتے ہو" پکاری دہنِ خم مجھکو۔ امیر

(۳)
پامال کر دیا فلکِ بد شعار نے — سیکھے ترے چلن روشِ روزگار نے۔ داغ
یہ سیکھا ہے تو اشکِ غمّاز کس سے — مری آنکھوں میں بن کے جاسوس رہنا۔ داغ
گھر میں تیرے پاس ہی جاتا نہیں — اب تو سیکھا ہے مرے ڈھنگ آئینہ۔ ناسخ
خطبہ بلبل نے پڑھا تیری بہارِ حسن کا — نام گلبن سنتے تھے جسکا وہ سبز ہو گیا۔ آتش

(۴)
سبحان اللہ، آج میر صاحب کیا اچھا مرثیہ پڑھے۔
ماشاء اللہ، آپ خوب پڑھے۔

۶- **قاعدہ** - جو فعل دو فعلوں سے مرکب ہوتے ہیں جیسے کھا جانا، لی لینا

"دینا" وغیرہ - اُن کے ساتھ "نے" کا استعمال فعل موخر پر قیاس کیا جاتا ہے۔
جیسے زید سو گیا۔ وہ کتاب بھول گیا۔ میں قلم لے آیا۔ وہ ایک بندوق اٹھا لایا۔ زید نے
مزدور کو بلا لیا۔ وہ کھانا کھا چکا۔ زید نے دوات کو پھینک دیا۔

یاد کے اب یار کی تنہائی میں دیکھو لگا لیتی ہے (امیر) لے چلی ہے بیکسی گورِ غریباں کی طرف
تمہید رنج و غم کی ابتدا ہی پوری نہیں ہوتی (شاد) ہیں صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر
لایا ہے میرے قتل کا مضمون پیامبر (داغ) یاں انتظار رہتا ہے مجھے خط کی رسید کا
وہ بیٹھے بیٹھے جو دے بیٹھے قتلِ عام کا حکم (امیر) ہنسی تھی اُن کی کسی پر کوئی عتاب نہ تھا

مستثنیات: - (۱) "دکھائی دینا" "سجھائی دینا" "سنائی دینا" وغیرہ باوجودیکہ افعال
سے مرکب ہیں اُنکے ساتھ "نے" کا لانا جائز نہیں۔ جیسے رات کئی تارے دکھائی
دیئے۔ مجھے رات ایک آواز سنائی دی۔ تمکو بھی کچھ سجھائی دیتا ہے؟ وغیرہ

(۱) "چل دینا" "چلا جانا" کے معنی میں جیسے زید چل دیا۔

وقتِ صید آیا تصور جب قضا کے تیر کا (امیر) چل دیا صیاد سہما چھوڑ کر نخچیر کا

"ہنس دینا" اور "رو دینا" کے ساتھ "نے" کا لانا اور حذف کرنا دونوں جائز ہیں
لیکن چونکہ یہ افعال بجائے خود لازم ہیں حذف اولیٰ ہے۔

محبت نے کی جب مری دستگیری ٭ مقدر نے رو رو دیا ہاتھ مل کر ...... داغ
دردمندی اسکو کہتے ہیں کہ روزِ حشر بھی ٭ رو دیا میں، دل بھر آیا سُنکے نالہ غیر کا ...... امیر

۷- قاعدہ- "نے" جب کسی اسم کے بعد آتا ہے تو وہی عمل کرتا ہے
جو اور حروف "کا" "کے" "سے" وغیرہ کرتے ہیں۔ البتہ بعض ضمائر پر "نے"
خاص عمل کرتا ہے۔

(۱) "میں" اور "تو" پر بخلاف اور عوامل کے "نے" کوئی عمل نہیں کرتا۔
چنانچہ میں نے، تو نے لکھا

تو نے تاج گنج دیکھا۔

(۲) "اِن"، "اُن"، "جن" اور "کن" "نے" کے داخل ہونے سے "انہوں"، "اُنھوں"، "جنہوں"، اور "کنھوں" ہو جاتے ہیں چنانچہ

انھوں نے کہا اُنھوں نے سنا۔

جنہوں نے اُسے جھوٹ جانا وہ چُپ ہو گئے۔

کنھوں نے کہا؟

۸ - چند غلط جملے مع صحیح صورتوں کے درج ذیل ہیں۔ جن سے "نے" کا استعمال خوب واضح ہو جائے گا:-

غلط	صحیح
(۱) مولوی صاحب نے ایک جملہ بولا۔	مولوی صاحب ایک جملہ بولے
(۲) اُس لڑکے نے جھوٹ بولا	وہ لڑکا جھوٹ بولا۔ (دیکھو فقرہ ۴)
(۳) میں نے بازی ہاری۔	میں بازی ہارا (〃)
(۴) میں نے دو روپیے ہارے اور چار جیتے	میں دو روپیے ہارا اور چار جیتا (〃)
(۵) میں نے گھر جانا ہے۔ ف۱	مجھے (یا مجھکو) گھر جانا ہے۔
(۶) میں نے احمد کو پانچ روپیے دینے ہیں۔ ف۱	مجھے احمد کو پانچ روپیے دینے ہیں۔
(۷) لڑکے نے خوب چال چلی ف۲	لڑکا خوب چال چلا۔ (فقرہ ۴)
(۸) اس نے دیر تک پڑھا کیا۔	وہ دیر تک پڑھا کیا۔ (فقرہ ۴)

ف۱ "جانا ہے"، اور "دینے ہیں" میں ماضی مطلق کی صورت قائم نہیں اس لئے "نے" اس کے ساتھ کسی طرح جائز نہیں۔ "جاتا" فعل لازم ہے۔ علاوہ بریں "جانا" اور "دینا" مصدر ہیں اسوجہ سے وہ کسی جملے میں فعل نہیں واقع ہو سکتے، جب تک صورت تصریفی میں نہ ہوں۔ ایسے جملوں میں اگر کسی لفظ کو فعل قرار دیجئے تو وہ "ہے" یا "ہیں" وغیرہ افعال ناقص ہیں۔ اُن سے "نے" کو کیا واسطہ؟

ف۲ "چال" مفعول بہ نہیں وہ مفعول مطلق ہے اور "چلنا" فعل لازم ہے

منہ سے بولے تو کہا "آئینہ"۔ کھیل کھیلے تو خود آرائی کا ...... داغ

(۹) میں نے ایک مکان کرائے پر لیا ہوا[1] ہے	میں نے ایک مکان کرائے پر لیا ہے (یا لے رکھا ہے)۔
(۱۰) میں نے کھانا کھایا ہوا ہے	میں کھانا کھا چکا ہوں۔
(۱۱) میں نے تمہارا قلمدان احتیاط سے رکھا ہوا ہے۔	میں نے تمہارا قلمدان احتیاط سے رکھدیا ہے (یا رکھ چھوڑا ہے)
(۱۲) اُس نے اس بات کو پہلے ہی سے جانا ہوا تھا۔	وہ اس بات کو پہلے ہی سے جانتا تھا (یا جان چکا تھا)
(۱۳) اگر میں نے سبق پڑھ لیتا تو کیا خوب ہوتا	اگر میں سبق پڑھ لیتا تو کیا خوب ہوتا۔ .... (فقرہ ۲)
(۱۴) اگر میں سبق پڑھ لیا ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔	اگر میں نے سبق پڑھ لیا ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ .... (فقرہ ۲)

۹۔ "کو[2]" ایک حرف معنوی ہے جو اکثر مفعول کے ساتھ آتا ہے۔ ضمائر اور اسمائے اشارہ کے ساتھ "کو" کی جگہ کبھی "ے" بھی آتی ہے۔ ان دونوں کو علامت مفعول کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مفعول کے ساتھ علامت ہمیشہ آئے اُسے اکثر حذف کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے قواعد کلیہ کم ہیں۔ زیادہ تر دار مدار سماعت پر ہے۔ مفاعیل خمسہ میں سے مفعول معہ کے سوا اوروں کے ساتھ علامت آتی ہے جن کے لئے حسب ذیل قواعد مقرر کئے جا سکتے ہیں۔

---

[1] جب ماضی مطلق کے کسی صیغے کے ساتھ "ہوا" لگاتے ہیں تو وہ اسم مفعول ہو جاتا ہے فعل نہیں رہتا۔ لہذا اُس کے ساتھ "نے" کسی طرح جائز نہیں۔ فعل کے پوری طور پر ختم ہو جانے کو کہیں "چکا" "یا لیا" سے اور کہیں "دیا" اور کہیں "چھوڑا" وغیرہ افعال امدادی سے ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ امثلہ بالا سے واضح ہے۔

[2] "کو" واو مجہول کے ساتھ صحیح ہے اور واو معروف غلط تلفظ ہے۔

۱۰۔ مفعول بہ کے ساتھ :۔

قاعدہ ۱: جب مفعول بہ ذی عقل ہو تو اُسکے ساتھ علامت مفعول کا آنا
ہے جیسے میں اپنے چھوٹے بھائی کو بہت چاہتا ہوں اُسے یہاں بھیجدو۔ محمود کو
یہاں سے آؤ۔

قاعدہ ۔۲۔ جب مفعول بہ غیر ذی عقل ہو تو علامت کو اکثر حذف کرتے
ہیں لیکن کبھی لاتے بھی ہیں۔ جیسے "زید نے سبق یاد کیا" اور "زید نے سبق کو یاد

جب سے ایسے بُرا ہیں یہ ہوا وہم کا حال
خم کیا سر کو لئے دوڑ کے دانش کے قدم ...... امیر

قاعدہ ۔۳۔ جب کسی فعل کے ایک سے زیادہ مفعول بہ ہوں تو مفعول
اوّل سے اگر وہ غیر ذی عقل ہے ہمیشہ علامت مفعول حذف کرینگے جیسے
زید نے خالد کو دو روپئے دئے۔ سنار نے زیور کو خوب جلا دی۔

کہاں ساماں تھا وحشت میں کہ نامہ یار کو لکھتا
دیا قاصد کو پُرزہ پھاڑ کر میں نے گریباں کا ...... امیر

موسیٰ کو تیری حکم سے دریا نے راہ دی	آتش	فرعون کو تو نے غرق کیا رود نیل

لیکن " میں نے اپنے نوکر خدا بخش کو احمد حسین صاحب کو دے دیا

کیوں صبح شب وصل خدا کو مجھے سونپا
دشمن ہی کو دیکھ جو مری حق کی دعا ہو
داغ

۱۱ ۔ مفعول فیہ کے ساتھ۔

"میں"، "اندر"، "پر" وغیرہ کی جگہ کبھی "کو" بھی لاتے ہیں "کو"
جگہ "ہی" کبھی مفعول فیہ کے ساتھ نہیں آتی۔ جیسے زید گھر کو گیا۔ میں دو
کو جاؤں گا۔ دوسری شوال کو اسکی شادی ہے۔

۱۲- مفعول لہ کے ساتھ۔

"کے لئے" اور "کے واسطے" کی جگہ کبھی "کو" بھی لاتے ہیں۔ لیکن "سے" کبھی نہیں آتی۔ جیسے وہ مجھے خط لکھنے کو بلاتا تھا۔ میں خط لکھنے کو گیا تھا۔

روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ ✣ حکمت الدولہ جو تھا منشیِ یاقوت رقم... امیر

قاعدہ - جب جملہ کا اصل فعل اُن افعال میں سے ہو جن کے فاعل کے ساتھ "نے" آتا ہے تو مفعول لہ کے ساتھ "کو" (یا "کے لئے" یا "کے واسطے") لگانا ضرور ہے۔ ورنہ اختیاری چنانچہ "وہ مجھ خط لکھنے بلاتا تھا" غلط ہے۔ اور میں خط لکھنے گیا تھا (یا خط لکھنے کو گیا تھا) صحیح۔

یاد آئیں تری آنکھیں تو یہ سمجھی دمِ نزع	(امیر)	حوریں فردوس سے آئی ہیں بلانے ہمکو	
نے چلے داغ ہزاروں چمن ہستی سے ✣ زندگی لائی تھی کیا سیر دکھانے ہمکو۔ امیر			
عیش کرنے کو بتو تم کو کیا ہی پیدا	(امیر)	رنج اٹھانے کو بنایا ہے خدا نے ہمکو	

مستثنیٰ "دنیا" اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے[۱] (امیر) کہتا ہے یہ شوقِ قتل ہردم بدم لینے ✣ دیتی قضا کو۔ ۱۳- مفعول مطلق کے ساتھ۔

"کو" کا استعمال اختیاری ہے جیسے "زید کھیل کو خوب کھیلا" اور "زید کھیل خوب کھیلا" لیکن کو اکثر حذف کیا جاتا ہے۔

۱۴- "کو" اسما و ضمائر پر وہی عمل کرتا ہے جو "کا" "نے" "سے" وغیرہ حروف کرتے ہیں مگر اُس کی قائم مقام "ے" بعض ضمیروں اور اسمائے اشارہ پر حالت جمع میں خاص عمل کرتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

"ہم" "ہمیں" اور "تم" "اِن" "اُن" "کِن" اور "جن" "تمہیں" "انھیں" "اُنھیں" "جنہیں" اور "کنھیں" ہو جاتے ہیں۔

[۱] بشرطیکہ جملے کا اصل فعل نہ واقع ہو بلکہ بطور فعل امدادی کے آیا ہو جیسے مثال میں ہے۔

۱۵۔ "کو" جب کسی مصدر کے بعد آتا ہے تو دو معنی پیدا کر سکتا ہے۔
(۱) کے لئے (جیسا کہ مفعول لہٗ کے بیان میں مذکور ہوا)
(۲) والا۔ اور ایسی حالت میں اکثر مستقبل قریب کا فائدہ دیتا ہے جیسے وہ آنے کو ہے یعنی وہ (عنقریب) آنے والا ہے۔

اے زاہد چل دیا تو بزم سے تشنہ کام
تیری دعوت کو شراب خوشگوار آنے کو تھی .... داغ

۱۶۔ "کو" افعال کے صلے کے طور پر بھی آتا ہے لیکن وہ طویل بحث ہمارے مضمون سے دور جا پڑتی ہے اسلئے یہاں قلم انداز کی جاتی ہے۔

۱۷۔ "کو" کا ایک غلط استعمال آج کل اردو اخباروں میں بکثرت رائج ہے جسکے غلط ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ یعنی مفعول مالم یسمّ فاعلہ کے ساتھ "کو" کا لانا۔ جیسے لڑکوں کو شرارت سے باز رکھا جائے۔ اس غلطی کی طرف میں خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں :۔

چونکہ فعل مجہول کے فاعل کا نام ظاہر نہیں ہوتا اور مفعول فاعل کی جگہ لیتا ہی اس لئے مفعول مالم یسمّ فاعلہ "قائم مقام فاعل" یا "نائب فاعل" کہلاتا ہے اور مفعول نہیں شمار کیا جاتا۔ ایسی حالت میں اس پر کسی طرح علامت مفعول داخل نہیں کی جا سکتی۔ نہ اسکی کوئی ضرورت ہے۔ فعل کی تعداد اور جنس پر "نائب فاعل" وہی عمل کرے گا جو فاعل کرتا ہے۔ چنانچہ "لڑکے شرارت سے باز رکھے جائیں" صحیح ہے اور "لڑکوں کو شرارت سے باز رکھا جائے" قطعاً غلط۔

۱۸۔ "نے" اور "کو" کی موجودگی یا غیر موجودگی سے جملے کے فعل پر جو عمل ہوتا ہے اسکے لئے ذیل کے کلیے مقرر ہیں۔

قاعدہ۔ ۱۔ جب "نے" نہ آئے (اور مفعول کے ساتھ "کو" یا "سے" آئی

یا نہ آسے) تو فعل تعداد اور جنس میں ہمیشہ فاعل کا تابع ہوگا جیسے زید گھر گیا حمیدہ
سبق بھولی ہم بات کو بہتے - لڑکے کتابیں پڑھتے تھے -

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر
زمیں کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر ..... امیر

اشک ساں جنبشِ مژگاں نے کیا گم مجکو	امیر	لغزشِ پا ہوئی دریا کا تلاطم مجکو

قاعدہ - ۲ - جب "نے"، آسے اور مفعول بہ کے ساتھ "کو" یا "سے" نہ آئے
تو فعل تعداد اور جنس میں ہمیشہ مفعول بہ کا تابع ہوگا - جیسے زید نے خط لکھا۔
زید نے خطوط لکھے - زید نے چٹھی لکھی - زید نے چٹھیاں لکھیں -

اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی	دبیر	نرغے میں گھرا ہے وہ ید اللہ کا جانی
وہ مثل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی خضر نے	ذوق	لے گیا خط ذقن دلکو سوئے گرداب کھینچ

سراپا پاک ہیں دھوئے جنہوں نے ہاتھ دنیا سے ...... ذوق

نہ کی کس نے سفارش میری وقتِ قتل قاتل سے امیر کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا

فائدہ - جب کسی متعدی بدو مفعول کا مفعول اول غیر ذی عقل ہوتا ہے تو اس سے
"کو" حذف کر دیتے ہیں۔ (قاعدہ ۳ - فقرہ ۱۰) - مفعول ثانی کے ساتھ "کو"
ہوتا بھی ہے - لیکن ایسی تمام صورتیں قاعدہ بالا کے تحت میں آتی ہیں - جیسے
میں نے زید کو دو روپے دیے -

تم نے دی کوہکن و قیس سے مجکو نسبت
کوئی دیوانہ نہیں میں کوئی مزدور نہیں .... داغ

دمِ آخر تصور بندھا ترے رخ کا	آتش	طرف کو کعبے کے کروٹ بھی قضا نے دی

قاعدہ - ۳ - جب "نے" بھی آسے اور مفعول بہ (اول) کے ساتھ "کو"
یا "سے" بھی، تو فعل نہ فاعل کا تابع ہوگا نہ مفعول کا بلکہ ہمیشہ واحد مذکر غائب ہوگا

جیسے زید نے لڑکوں کو مارا - زید نے لڑکی کو مارا - زید نے لڑکیوں کو مارا - لڑکیوں نے کتابوں کو پڑھا -

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا
ذوق

۱۹- چند غلط جملے مع صحیح صورتوں کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جو فائدے سے خالی نہیں :-

غلط	صحیح
(۱) میں نے حامد دیکھا	میں نے حامد کو دیکھا - (فقرہ ۱۰ - قاعدہ ۱)
(۲) اس نے مجھ سے کھانا کھانے کہا -	اس نے مجھ سے کھانا کھانے کو کہا (فقرہ ۱۲)
(۳) مسلمانوں کو اس امر سے روکا جائے -	مسلمان اس امر سے روکے جائیں (فقرہ ۱۷)
(۴) مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی بنایا جائے -	مدرسۃ العلوم یونیورسٹی بنایا جائے (")
(۵) زید نے نماز پڑھا -	زید نے نماز پڑھی (فقرہ ۱۸ قاعدہ ۲)
(۶) میں نے رخصت لیا -	میں نے رخصت لی (" ")
(۷) زید نے اپنی درخواست کو بھیجی -	زید نے اپنی درخواست بھیجی - (قاعدہ ۲) زید نے اپنی درخواست کو بھیجا (قاعدہ ۳)

فقط (صدیقی)

زلزلے کی حقیقت

اپریل ۱۹۰۵ء میں جو زلزلہ اس ملک میں آیا تھا اسکا ذکر اخباروں میں طرح طرح سے ہوا - بعض جوتشیوں اور منجموں اور فقیروں نے جو غیب کی باتوں کے بتانے کے مدعی ہیں اسکے دوبارہ آنے کی تاریخیں اور اوقات مقرر کئے

اور جھوٹے ہونے پر بھی ذرا شرمندہ نہ ہوئے۔ اس زلزلے کی مصائب کا اور مصیبت زدوں کی امداد کا بہت دنوں چرچا رہا۔ گورنمنٹ کی رزولیوشن بھی پاس ہوئے پانچسو روپیہ سے زیادہ چندہ دینے والوں کے نام مشتہر ہوئے۔ اس زلزلے کا بیان نہایت مختصر سرسری طور پر میں بیان کرتا ہوں۔

جب کوئی زلزلہ ایسا آتا ہے جیسا کہ ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو کانگڑہ و دھرم سالہ میں آیا یا اس سے بھی بڑا تو بہت سے آدمی اسکو اپنے اعتقاد مذہبی کے موافق یہ سمجھتے ہیں کہ آدمیوں کی بدافعالی اور زشت کاری کے سبب سے یہ قہر الٰہی زلزلے کی صورت میں اُن پر نازل ہوا ہے۔ کتب مقدسہ میں بہت سی مثالیں ایسی موجود ہیں کہ جب قوموں نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں اپنے پاؤں بہت پھیلائے تو خداوند عالم نے اپنا قہر قدرتی حادثات ارضی و سماوی کی صورت میں ایسا نازل کیا کہ وہ قومیں نیست و نابود ہو گئیں پس ایسے متقدمین کے نزدیک تو دھرم سالہ و کانگڑہ پر اس بلا کے آنے کا سبب ان کی کثرت زناکاری و شراب خواری ہوگی جو حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ بات مفید ہے کہ آدمی اس طرح خدا سے خائف ہو کر اپنے گناہوں سے تائب ہوں اور ارتکاب عصیاں سے اجتناب کریں مگر یہ ایک بات اعتقاد کی ہے جو کسی عقلی دلیل کی محتاج نہیں لیکن عقلاً گناہ اور زلزلے میں علت معلول کا تعلق نہیں ہے جس کا عقلاً ہر حادثے کے لئے ہونا ضرور ہے۔ گناہ کو زلزلے سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ آفتاب کے طلوع و غروب سے اگر انسان ہزار گناہ کرنے لگے تو آفتاب کے طلوع و غروب پر اسکا اثر ذرہ برابر نہ ہوگا ایسی ہی اگر انسان سرتاپا معصیت میں مستغرق ہو تو اسکے باعث سے زلزلہ نہیں آئے گا۔ دھرم سالہ و کانگڑہ کے بیچارے باشندوں نے اپنے ہمسائے کے اضلاع کے رہنے والوں سے

کیا زیادہ گناہ کئے تھے جسکے سبب سے اس زلزلے نے زمین کے نیچے سے اپنا سر نکال کر پانچ منٹ میں یہ قیامت برپا کی کہ سیکڑوں معصوم بچوں کے سر و نکو انکے ماؤں کے کلیجے پر مونگوں کی طرح دل دیا - ہزاروں بے گناہ عورتوں اور مردوں کو بے گور و کفن دفن کر کے پیوند زمین کر دیا - کوئی گھر باقی نہیں رکھا جسکو زمین کی برابر نہیں کیا - پندرہ بیس ہزار جانوں کو پانچ منٹ میں تلف کیا - اور جنکو زندہ بھی چھوڑا تو ایسا خستہ حال اور شکستہ بال و بے خانمان بنایا کہ لاکھوں روپیے کا چندہ بھی انکو اپنی حالت پر بحال نہیں کر سکتا - یہ کہنا جناب الٰہی میں بڑی گستاخی ہے کہ وہ ہرم سالہ میں فسق و فجور زیادہ ہوتا تھا اور اس بلا کے نازل ہونے پر بھی وہاں کے باشندوں کا یہ حال ہو کہ اپنے عزیز و اقارب کا کچھ ماتم نہیں کرتے بلکہ اکے معاوضے کے لینے کے لئے بڑی سرگرمی دکھاتے ہیں -

اصل حال یہ ہے کہ ہماری مادر مہربان زمین کو ایک رعشے کی بیماری ہے جسکے سبب سے اسکے طبقہ بالا کے اوپر یا اندر ایک تموج ہوتا ہے اور آس پاس پھیلتا ہے اور ہمارے حواس کو محسوس نہیں ہوتا - اس قسم کا رعشہ ہمیشہ سطح زمین پر ان صورتوں میں پیدا ہوتا ہے - اول جب آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانی سے پہاڑوں کے بڑے بڑے حصے آپس میں ایک دوسرے پر پھسلتے ہیں دوم مصنوعی یا قدرتی چیزیں سرنگوں کی طرح اڑتی ہیں سوم زمین پر کوئی بھاری چیز گرتی ہے چہارم گاڑیوں یا آدمیوں کے دھما دھم چلنے سے زمین پر دھکے پہنچتے ہیں پنجم چاند سورج اور سیاروں کی کشش کے سبب سے زمین کے طبقہ بالا پر زور اور دباو پڑتا ہے خاص کر جسم گشندہ کے تحت اس دباؤ اور زور سے جو بیس گھنٹے میں ایک دفعہ مد و جزر آنے سے ایک گردش

پیدا ہوتی ہے شستم کرہ ہوا کے دباؤ اور درجہ حرارت کے تغیر و تبدل سے زمین کے طبقۂ بالا میں ایک جنبش پیدا ہوتی ہے ان سب صورتوں میں زمین کے رعشے کو ہم اپنی روزمرہ کی بول چال میں یہ نہیں کہتے کہ زلزلہ آیا مگر سائنس میں اسکو بھی زلزلہ کہتے ہیں۔

ہماری بڑھیا مائی دھرتی کو ایک دوسری بیماری تشنج کی ہے جب اسکی آنتوں میں آبخرے اور آتشین مواد ایسے بھر تے ہیں کہ اس میں سمائے نہیں تو بڑے زور شور سے وہ اپنے تئیں اس قید سے چھٹا کر اپنے پاؤں پھیلانا چاہتے ہیں تو اسکے شکم میں کچھ کا مروڑا پیدا ہوتا ہے اور اسکے پیٹ میں بادل کی گرج یا گاڑیوں کے چلنے کی آوازیں گڑگڑ پیدا ہوتی ہیں وہ بیقرار ہوکر کروٹیں لیتی ہے جس سے زمین کی وسعت عظیم میں بڑی ہل چل پڑتی ہے اسکو ہم روزمرہ کی بول چال اور سائنس میں کہتے ہیں کہ زلزلہ آیا۔

اس تشنج کا اس وضع سے زور سال بھر میں بارہ تیرہ دفعہ ہوتا ہے جس کے سبب سے اتنی ہی دفعہ بحساب اوسط ساری دنیا میں زلزلے آتے ہیں جن میں خفیف زلزلے بہت اور شدید زلزلے تھوڑے ہوتے ہیں۔

جب آتش فشاں پہاڑ آتش فشانی کرتے ہیں تو اُس سے پہلے یا پیچھے یہ زلزلے ضرور آتے ہیں جیسی کہ جزائر جاپان میں۔ بعض ملکوں میں صدہا برس گذر جاتے ہیں کہ ایک زلزلہ بھی نہیں آتا جیسے کہ ملک مصر میں۔ غرض بعض زلزلوں کا آنا قیامت کے آنے سے کچھ کم نہیں ہوتا وہ اوج کو حضیض اور حضیض کو اوج بناتے ہیں۔ پہاڑوں کو بلندی سے پستی میں لاکر وادی اور وادی کو پستی سے بلندی پر چڑھا کر کوہ بناتے ہیں سیال کو منجمد اور منجمد کو سیال بناتے ہیں۔ ایسی لکد کوب سے زمین کی گردن کو توڑ دیتے ہیں۔ ناچنے جاتے ہیں اور ہزاروں

جانوروں کا شکار کھیلتے جاتے ہیں صدہا آدمی انسے بھاگتے ہیں مگر وہ کب انکو ہاتھ تلے سے نکلنے دیتے ہیں ان کی گردن پکڑکر سر کو زمین پر رگڑتے ہیں اور جان نکال لیتے ہیں۔ شہر کے شہر پیوند زمین کردیتے ہیں یا ان کو ڈھا ڈھوکر کھنڈر بناتے ہیں۔ عمارات عالیشان کو سرنگوں بناکے خاک میں ملاتے ہیں۔ ہری بھری کھیتوں کا نام ونشان باقی نہیں رکھتے۔ سرسبز وشاداب باغوں کے بلند درختوں کو جڑ پیڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ شہروں کی صورتیں ایسی مسخ کردیتے ہیں کہ اہل شہر نہیں پہچانتے کہ یہ ہمارا شہر ہے۔ دریاؤں کو تالاب اور تالاب کو دریا بنا دیتے ہیں۔ سمندر کی تہوں میں اٹھکر اسکی سطح پر تلاطم کا طوفان اٹھاتے ہیں اسکے پرانے جزائر کو پانی میں ڈبو دیتے ہیں اور پانی کو ہٹاکر نئے جزیرے پیدا کردیتے ہیں۔ غرض زمین کو ایسا تہ وبالا کرتے ہیں کہ اسمیں جا بجا پستی وبلندی پیدا ہوتی ہے جسکے سبب سے زمین انسان کے بسنے کے قابل ہوگئی ہے ورنہ وہ ہموار ہوتی اور شاید ایسی پانی کے نیچے ہوتی کہ اس میں انسان جل مانس ہی ہوکر رہ سکتا۔ بس اس خیال سے زلزلہ بھی خدا تعالی کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو بساتا بہت اور اجاڑتا تھوڑا ہے۔

حضرت خضر کو بحر ظلمات میں آب حیات کا ملنا ایک مشتبہ امر ہے مگر محققین سائنس کو زمین کے اندر ظلمات میں جالستان زلزلوں کے آنے کا سبب ملجانا ایک محقق امر ہے۔

مدتوں تک زلزلوں کا اصلی حال زمین کے اندر پردے میں منہ چھپائے بیٹھا رہا۔ محققین اس پردے کے اندر مدتوں تک تاک جھانک لگاتے رہے اور اپنے قیاسات دوڑاتے رہے کہ اس پردہ میں کون بیٹھا ہے یہ قیاسات انکے غلط ثابت ہوتے رہے جس سے انکو مایوسی ہوتی رہی کہ یہ پردہ نشین ہم کو

نہیں معلوم ہوگا کہ کون ہو۔ مگر عالم فطرت کے محقق صادق اپنی تحقیق کی بلند پروازی میں شکستہ بال نہیں ہوئے۔ انکی حواس ظاہری سے کوئی چیز پاتال ہی جا کر کیوں نہ چھپے اور دریا کی تہ میں کیوں نہ چلی جائے وہ اپنے نور عقل سے اس تاریکی میں بھی اپنی تحقیق سے دست کش نہیں ہوتے۔ جو یندہ یابندہ انکو اپنی مقصو کا دُرِ شاہوار یوں ہاتھ آیا کہ جزائر جاپان کے شہر ٹوکیو کی یونیورسٹی نے ایک فیکلٹی ([illegible]) مقرر کی جسمیں غیر ملکوں کے بھی محققین حقیقت شناس شامل تھے انہوں نے زلزلوں کے مسائل کو بھی سائنس کی صورت میں ڈھال لیا اور اس سائنس کا نام سیس مولوجی رکھا اور ایسے آلات بنا لئے جن سے زلزلوں کی یہ حالتیں صحیح صحیح دریافت ہوجاتی ہیں۔ اوّل تھوڑی دیر پہلے سے زلزلوں کا آنا۔ دوم زلزلے کے زوروں کی خفت و شدت اور ان کی مقداریں سوم زلزلہ جس رقبے میں پھیلے اسکی وسعت کی مساحت چہارم زلزلے کی رفتار کی سمتیں خواہ وہ اُفقی ہوں یا آڑی ترچھی پنجم اسکی حرکت کی رفتار کی مقدار۔ اُن آلات کا بیان بغیر اُن کی شکلوں کے بنائے سمجھ میں نہیں آئیگا اور شکلوں کا ٹھیک ٹھیک بنانا اور چھپوانا دشوار ہے۔ میں مصور نہیں کہ انکی تصویریں بنا دوں اسلئے انکے بیان کو چھوڑ کر ایک سیدھے سادے آلے کا بیان لکھتا ہوں جو بغیر شکل کے بھی پڑھنے والوں کی سمجھ میں آجائیگا۔

جاپان میں بہت زلزلے آتے رہتے ہیں اسلئے انہوں نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو اکثر گھروں میں لگا رہتا ہے ایک مقناطیس کی سلاخ سے لوہے کی سلاخ کو چسپاں کرکے کسی دھات کی طاس یا تھالی میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ خدائے تعالی کی عجیب و غریب قدرت ہے کہ زلزلے کے آنے سے کچھ دیر پہلے لوہے اور مقناطیس کی [illegible] قوت کشش معطل ہو جاتی ہے اسلئے لوہے کی سلاخ مقناطیس

کی سلاخ سے جدا ہو کر طاس میں گر تی ہے اور اس سے چنا چن کی آواز پیدا ہو تی ہے جسکو گھر والے سنکر ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ زلزلہ آنے کو ہے اور جلدی سے ایسی احتیاطیں کر لیتے ہیں کہ زلزلے کے آنے سے اُن کا کچھ نقصان نہیں ہوتا ۔ فقط (ذکار اللہ)

زمینداران ہندوستان کی موجودہ حالت اور انکا افلاس

ہماری یہاں تیس کروڑ باشندگانِ ہند میں زمینداروں کا گروہ معزز اور مالدار خیال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس گروہ سے جسکو دیکھو سواے بعض کے وہ مقروض ہی نظر آتا ہے ۔ کہیں سُنتے ہیں کہ ۵۰ ہزار قرض کی فکر ہے اور کہیں ڈیڑھ لاکھ بنک سے لینے کا انتظام ہو رہا ہے ۔

شروع سنہ ۱۹۰۴ء میں مجھکو خیال پیدا ہوا کہ ان کی ایسی حالت کیوں ہے چنانچہ اسی غرض سے پہلے میں نے مذکور الصدر لوگوں سے ملکر واقفیت پیدا کی بعدازاں چھوٹے زمینداروں کیطرف متوجہ ہوا اور انکو اوّل الذکر سے بھی ابتر حالت میں پایا اسوقت میں بطور مشتے نمونہ از خروارے ایک زمیندار صاحب کے جمع و خرچ یکسالہ کو دکھلانیکی کوشش کرونگا (جو ایک مُسلم موضع کے مالک ہیں اور بفضلہ قرضدار نہیں ہیں) جسکے ملاحظے سے ظاہر ہوگا کہ وہ باوجود پانچسو روپے کے مالگذار سرکار ہونیکے کس تکلیف میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ حالانکہ اسقدر مالگذاری دینے والا دیہات اور چھوٹے زمینداروں میں معزز اور مالدار سمجھا جاتا ہے ۔

تفصیل حساب جمع و خرچ

کُل نکاسی موضع الف ایکہزار روپیہ

(۱)	(۲)	(۳)
مالگذاری سرکار دولت مدار صما عنہ ۵۲۲	تنخواہ شحنہ موضع بحساب للعہ ماہوار ملعہ	گذارہ والدہ صاحبہ عـہ ماہوار ماعنہ ۱۲۰

(۴)

دربان خدمتگار سائیس بہنیں کی خدمت کرنیوالا - بلبذارسے سودا لانیوالا بغرضکہ طالب علم کی قلمی [illegible] ماہوار [illegible]

(۵)

ملازمہ - باورچی ماما - بہرہ - ماشطہ سے [illegible] ماہوار [illegible]

(۶)

صرف بہنیں دو آنہ یومیہ [illegible] ماہوار [illegible]	مرمت مکان [illegible]	پارچہ پوشیدنی [illegible]	انعام تہوار ہندو مسلمان [illegible]
قیمت اخبار ہفتہ وار [illegible]	صرف نیوتہ شادی [illegible]	متفرق خرچ [illegible]	[illegible]

کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ کل [illegible] روپیہ مد متفرقات میں بچت ہے اور تمام بال بچوں کا کھانا اسی رقم پر منحصر ہے - زمیندار صاحب سرا پیشہ شغل کاشتکاری وغیرہ کچھ نہیں کرتے ہیں - تو اب سوائے اسکے کہ چند روز کے بعد فاقہ کشی کریں اور کیا ہو سکتا ہے

چنانچہ مشکل سے مالگذاری ادا ہوتی ہے اور بارہا فاقہ پر فاقہ ہوتا ہے مگر شاباش ہے اس بھلے آدمی کو کہ قرض نہیں لیتا - حساب مذکورہ بالا کے دیکھنے سے ہر شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ زمیندار مذکور کیوں زیادہ صرف کرتے ہیں - مثلاً صرف نمبر (۲) میں شحنے کی کیا ضرورت ہے - خود روپیہ وصول کریں - صرف نمبر (۳) دس روپیہ ماہوار زیادہ ہے اسی طرح صرف نمبر ۴ و ۵ و ۶ کی بہی کوئی ضرورت نہیں لیکن میں نہایت ادب سے مذکورہ بالا اعتراضات کی بابت کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں - بابت صرف نمبر (۱) واقعی مالگذاری زیادہ ہے اور اسکی ادائگی میں جو تکلیف فاقہ مست زمیندار کو ہوتی ہے وہ تھوڑی ہے - لگاسی دینے کے بڑھانے کی تدبیر جو زمیندار کو معلوم ہے وہ بیدخلی کاشتکار ہے - مگر جہاں اور بانسیاں ہیں وہاں مقدمہ بازی بھی ایک خاص اثر رکھتی ہے اور اسمیں اسیطرح آفتیں ہیں جسطرح اوروں میں - دیکھئے جب اضافہ لگان کے لالچ میں پہنسکر زمیندار کاشتکار کو بیدخل کرتا ہے تو روزمی کو جاتا دیکھکر وہ جوڈیشل تک مقدمہ لڑاتا ہے - اسٹامپ وغیرہ اخراجات مقدمہ میں

زمیندار صاحب کی کل آمدنی سالانہ صرف ہوجاتی ہے۔ بعد کو اگر زمیندار نے مقدمہ جیت لیا تو وہ کاشتکار دیگر کاشتکاروں کی مدد سے (جو یہ حال دیکھکر مخالف ہوجاتے ہیں) زمیندار صاحب پر کوئی صیغہ فوجداری کا معاملہ پولس میں رجوع کر دیتا ہے۔ یہاں زمیندار صاحب کو ابتدا ہی میں اسقدر خرچ کرنا پڑتا ہے جو جوڈیشل کے صرف سے کہیں بڑھ جاتا ہے۔ اب سوائے قرض کے کہاں سے روپیہ آوے۔ مذکور الصدر معاملے کی طرح دو تین معاملے ہوئے کہ زمیندار صاحب قرضدار ہوگئے اور سود کی رفتار شروع ہوئی رفتہ رفتہ جب شیطان کے آنتے (سود در سود) کی نوبت آئی تو جائداد کھو بیٹھے۔

بابت صرفہ نمبر ۲۔ ایک حد تک یہ اعتراض ٹھیک ہو سکتا ہے۔ کہ روپیہ زمیندار خود وصول کر لیوے۔ مگر شحنے کا گانوں میں رہنا ضروری ہے۔ اکثر زمیندار گانوں میں نہیں رہتے ہیں۔ علاوہ اسکے زمیندار کا در بدر پھرنا اور ہر ایک کھلیان اور مکان پر جاکر تقاضا کرنا خالی از آفت نہیں ہے۔ تقاضائے بشریت ہے۔ کسی پر خفا ہوا وہ ضرور ناراض ہوگا اور کسی نہ کسی موقع پر اُسے تنہا پاکر گانوں والے اُسکی خبر لینے پر مستعد ہونگے۔ اور معاملے کو ایسا خفیہ کرینگے کہ پولیس کو تفتیش کا موقع بھی نہ رہے زمیندار کے واسطے گانوں میں شحنے کا رکھنا ضروری امر ہے۔ ہاں اگلے زمانے میں کچھ اسکی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ گانوں والوں کو خوف رہتا کہ تھا ہمارے یہاں کے آدمی سے کسی موقع پر بدلا لیا جائیگا علاوہ بریں ان دنوں میں زمیندار چوکیدار اور مقدم سے اپنا کام لیتے تھے اور وہ لوگ مثل ملازم کل کام زمیندار یعنی کا انجام دیتے تھے۔ اور اُسکو اپنا کار منصبی جانکر کبھی انکار نکرتے تھے۔ اب عجیب حال ہے کہ خواہ زمیندار صاحب بلاتے بلاتے تھک جاویں مگر چوکیدار بلا کیوں پاس آنے لگا۔ یہی حال مقدم کا ہے۔ اسوقت سے اور اُسوقت سے زمین اور آسمان کا فرق ہے سچ تو یہ ہے

کہ اصول حکومت سے زیادہ زمینداروں کو مفلس کرنے والی اور کوئی چیز نہیں ہے
اسیطرح قیاس میں آسکتا ہے کہ پولیس سے اب اُلٹی تعلیم یہ دیجاتی ہے کہ زمیندار
کے پاس تک نہ جانا، وہ تمہارا کیا کرسکتا ہے اور یہ ایک حد ٹھیک ہے بلکہ بالکل
ٹھیک کہنا چاہیئے۔ اسی طرح پٹواری صاحب ہیں کہ بیشتر زمینداروں کے کچے کھاتے
لکھنا اون کا پہلا کام تہا۔ اب اونکو انکے افسر ایک منٹ تک کی چھٹی نہیں دیتے۔
زمیندار کے پاس تک اُن کا جانا مشکل ہے۔ اور نہ زمیندار کے حکم سے وہ کچھ کام
کرتا ہے۔ بلکہ قانون گو وغیرہ کا حکم اُسکے لئے ایک صحیفہ آسمانی سے بڑھا ہوا ہے
اسیطرح حجام اور کہار اور دہوبی اور چمار وغیرہ اپنا اپنا کام روزمرہ آآکر زمیندار
کے مکان پر کرتے تھے اور ہر ایک اپنی اپنی باری پر مستعد ہوکر کام کرتا تہا۔ زمیندار
کو اُسکا معاوضہ سوائے اسکے کچھ نہیں دینا پڑتا تہا کہ دو دو چار چار بیگہ اراضی بنام
تہا و جاگیر و باغ اُن لوگوں کو عطا کردے اور بس کیا اچھا طریقہ تہا اور کیسی سہولیت
سے تہوڑی سی فیس دیکر زمیندار اپنا کام نکال لیتے تھے۔ اب معاملہ دگرگوں ہے
کہ معقول اُجرت دینے پر بھی زمیندار کو کام کرنے والا آدمی نہیں ملتا۔ بڑہئی
اور لوہار سال بہر کام کرتے تھے تو سالانہ اُن کا بھی کچھ غلّہ بندھا ہوا تہا۔ اب بغیر
مرادی صرف کئے ایک کیل تک کوئی نہیں لگاتا۔

بابت صرفہ نمبر ۲۔ چونکہ جائداد وراثتاً ملتی ہے لہذا اپنے شوہر کے انتقال کے بعد
ہر عورت پیشتر سے معقول زر گذارہ کی دستاویز تحریر کرالیتی ہے اور بصورت
انکار مقدمہ بازی سے چھٹکارا نہیں ہوتا اور اسطرح یہ صرفہ بمجبوری قبول
کرنا پڑتا ہے۔

بابت صرفہ نمبر ۴ و ۵۔ واقعی صرفہ تو زیادہ ہے مگر تفصیل کار پر اگر نظر ڈالیجاوے
تو ہر شخص خیال کرسکتا ہے کہ کسقدر کام ہے اور بغیر ملازم و ملازمہ نہیں ہوسکتا

ہی - اور بڑی ضرورت یہ ہے کہ فلاں صاحب ایک گانوں کے زمیندار ہیں - بھلا یہ تمغہ کب اس خرچ کو کم ہونے دیتا ہے -

بابت صرف نمبر ۶ - یہ صرفہ زمینداران کیواسطے بہت ضروری ہے - کیونکہ جس روز فاقہ ہوتا ہے یہی چیز زمینداران کے کام آتی ہے -

---

زمینداروں کی حالت آج کل ایسی خراب واقع ہوئی ہے کہ اسے لکھتے ہوے افسوس معلوم ہوتا ہے - ہر گروہ کے افراد پر صرف ایک ٹکس ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص دوکان کرتا ہے تو بس اسکو اُسکے منافع پر ٹکس ادا کرنا پڑے گا لیکن اس گروہ زمینداران پر ٹکسوں کی کوئی تعداد ہی نہیں کیونکہ جو ملازم اونکے گانوں کی طرف بڑہتا ہے وہ اپنے مقررہ ٹکس کے طلبی میں کوشش کرتا ہے - کوئی کہتا ہے کہ لرھی لکڑی چاہئی ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ سالانہ روپیہ جو ملتا ہے عنایت فرمایئے - کوئی ایماندار اگر کچھ طلب نہیں کرتا ہے تو دعوت میں عداوت پوری کرتا ہے - ہاں کسی سے اگر ذرا بھی انکار کیا تو فرماتے ہیں کہ دیکھا جاویگا - وہ کہتا یہ ہے کہ جب کوئی حاکم آیا تو فوراً اُس زمیندار بیچارے کو پیش کر دیا کہ حضور یہ رسد نہیں دیتا ہے اور اُس حق مقررہ سے معلوم کسقدر زیادہ صرف کرا دیا - اور اگر حاکم صاحب تیزی کر گئے تو آبرو بٹے میں گئی - اگر دوسرے صیغے کا معاملہ ہو تو دوایک دفعہ دو چار جھوٹی رپورٹیں لکھا کر فوراً مشتبہ کیا اور خاموشی سے دفعہ ۱۱۰ کے حوالی کر دیا - غرضکہ جو گانوں میں آتا ہے وہ ایک ٹکس تشخیص کنندہ اور وصول کرنیوالا ہوتا ہے - ہماری رحیم گورنمنٹ نے دو روپیہ سیکڑا ٹکس قحط سالی معاف کر دیا بس کیا تہا ملک کے نیک لوگ پکار اُٹھے کہ بڑا رحم کیا - چاروں طرف سے شکریوں کا تار بندہگیا - اور واقعی کچھ رحم بہی کیا گیا - اس لفظ شکریے پر مجھکو اسوقت ایک پرانا

قصہ یاد آگیا ہی جو گو مضمون کو طویل کر دیگا مگر خالی از مذاق نہیں۔ یعنی کسی موقع پر ایک ولایتی (افغانی) اور ایک ہندوستانی دونوں کہانے میں شریک ہوئے۔ بعد فراغت طعام ہندوستانی صاحب فرمانے لگے کہ اللہ صاحب میں آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپنے مجھکو اسوقت دال روٹی مرحمت فرمائی۔ چونکہ یہ کلمہ بآواز بلند کہا گیا تہا ولایتی صاحب اسکو سنکر بگڑے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ شور غل سنکر آس پاس سے کئی آدمی جمع ہو گئے۔ سبب نزاع دریافت کرنے پر ولایتی صاحب نے ہندوستانی کی بڑی شکایت کی اور کہا کہ ایسے ہی لوگوں نے اللہ صاحب کی عادت بگاڑ دی۔ ذرا ذرا سی چیز پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم تو جب شکریہ ادا کرتا ہے کہ زردہ پلاؤ عمدہ عمدہ کہانا وہ ہمکو دیوے۔

خیر۔ اس ٹکس کی معافی بمقابلہ بہت سے ٹکسوں کے ہملوگوں کو کیا فائدہ پہونچا سکتی ہی۔ ہاں رحم تو جب ہوتا کہ جسقدر اس ٹکس سی قحط فنڈ میں جمع ہے (جسکی تعداد کروڑوں روپیہ ہے) اُس روپیہ سے کوئی ریلوے لاین یا کوئی بڑا کارخانہ گورنمنٹ سے جاری کیا جاتا اور بہر حصہ رسدی اُسکا منافعہ ہم زمینداران کو ملتا تو ہم اور نہیں یہی سمجھتے کہ چلو تمام دنیا کے ٹکسوں ہی سے نجات ہوئی۔۔ اچھا اب زمیندار گانوں سے چلکر تحصیل کے دروازہ پر کھڑا ہے اور اس شکل میں پڑا ہے کہ تین چار طرف سے نوچا کھسوٹی ہو رہی۔ اور بغیر ٹکس ادا کئے ہوئے کیا ممکن ہے کہ سہو لیت سے زر مالگذاری جمع ہو۔ لفظ "دیکھا جاویگا" جسکا ذکر پیشتر کر چکا ہوں اُسکی چشم دید مثال پیش کرنا بہتر ہوگا:۔ ایک نمبردار صاحب سے کسی چپراسی نے یہی دل خوش کن وعدہ کیا تہا۔ چنانچہ جب حاکم تحصیل دورے پر تشریف لائے تو اون کے پڑاو پر ایک بڑہئی کی ضرورت ہوئی۔ چپراسی مذکور قصبے میں تشریف لائے۔ اتفاق سے اُن نمبردار کے مکان پر ایک بڑہئی مزدوری پر کام کرتا تہا۔ پس بڑہئی سے کہا کہ

چل۔ اس بیچارے سے جو بات صحیح صحیح تھی کہدی کہ میں مزدوری پر کام کرتا ہوں قصبے میں سینکڑوں بڑہئی ہیں کسیکو لیجاؤ۔ چپراسی یہ سنکر واپس گیا۔ اور صاحب سے کہدیا کہ فلاں شخص نے (وہی نمبردار) ایک بڑہئی کو چھین لیا۔ وہاں سے فوراً حکم ہوا گرفتار کرلاؤ۔ اب کیا تہا دو تین چپراسی آموجود ہوئے۔ حسن اتفاق سے نمبردار کو اسکا پتہ پیشتر سے چلگیا تہا اور مقولہ بہی چپراسی کا یاد تہا بس وہ بیچارے گہر سے مفرور ہوگئے۔ اور بڑہئی گرفتار ہوگیا۔ اگر نمبردار صاحب ملجاتے تو کوئی کسر نہ اٹھا رہتی۔ اسوقت تو نمبردار صاحب بچ گئے مگر پہر دوبارہ نہ بچ سکے اور انہی چپراسی نے انکی آبروریزی کرکے چھوڑی جسکا شرح ذکر کرنا میرے احاطۂ امکان سے باہر ہے۔ فقط "فیاض علی" از شاہ آباد ضلع ہردوئی۔

از بیاض جناب ج-ن صاحب بیدہ شوق تخلص
عندا امام شہید

شدم زشوق سراپا نگاہ و در باغش	برنگ قطرۂ شبنم برہنہ پا رفتم
برائے بوسۂ آں پای نازنین امروز	تمام خون شدہ در پردۂ حنا رفتم

حضرت امیر شاہی

چشم ستمگرت کہ بخون در کمین نشست	تیغے کشیدہ در رہ مردان دین نشست
سرو سہی کہ خاستہ بود از چمن بناز	چون دید شکل وقد ترا بر زمین نشست

مولانا نور سیں فرونی

خدنگت میگذشت از سینہ دل بگرفت پیکانش	چو مہمانی کہ مانعی رود گیرند دامانش

عرفی

ہر چشم بہ نگاہی برد جانانہ چنیں باید	یک جرعہ خرابم کرد پیمانہ چنیں باید

غزل طپش از بیاض جناب محمد یوسف صاحب صبا انصاری ساکن بمبئی

معذور ہو رنجور ہو غمگیں ہو حزیں ہو — یہ سب ہو پر اک آدمی عاشق نہ کہیں ہو
مانند نگیں نقش مقدر نہیں مٹتا — گو سجدۂ صد سال سی فرسودہ جبیں ہو
بہتر ہے نہوں عرض شکایت میں سکمر — تا خاطر عاطر پہ گرانی نہ کہیں ہو
غمناک ہو بلبل تو جگر چاک ہو گل بھی — کیا معنی کہ دلکی نہ خبر دلکے تئیں ہو
آزردہ و رنجیدہ ہر اک بات پہ ہم سے — ہر دم یونہیں رہتے ہو چلو تم بھی یونہیں ہو

حسرت کی نگہ کہتے ہیں اسکو ہی طپش ہم
جو دید میں شکل نگہ بازپسیں ہو

مصحفی (از بیاض حسرت موہانی)

زلفوں کی برہمی نے برہم جہاں مارا — پلکوں کی کاوشوں نے سینونکو چھان مارا
اترائیو مت حسن پہ نادان بہت کچھ (برہم زدہ) — دیکھا ہے ان آنکھوں نے مری جاں بہت کچھ
کس آئینہ سے تری اٹکی ہے حسن آنکھ — رہتا ہی تو ان روزوں جو حیران بہت کچھ

غزل عبد اللہ خاں مہر مرحوم شاگرد مرزا نسیم دہلوی ماخوذ از دیوان مہر عطیہ عبد الحکیم صاحب خلف مہر مرحوم

صدمۂ دوری احباب نپوچھو کیا ہے — مجھسے حال دل بیتاب نپوچھو کیا ہے
چشم اختر بھی ہوئی میری مقابل میں سفید — عالم دیدۂ بیخواب نپوچھو کیا ہے
سرنگیں چشم سے ہوتے نہیں کس کس کے خون — جوہر تیغ سیہ تاب نپوچھو کیا ہے
کوئی کیا جانے جو کچھ دلپہ گزرتی ہے یہاں — ہم جو ہیں رات سے بیتاب نپوچھو کیا ہے
امتحاں عشق مجازی میں یہاں تھا منظور — سبب عالم اسباب نپوچھو کیا ہے
یار ہے صحن چمن ہے لب جو ہے اے مہر — لطف سیر شب مہتاب نپوچھو کیا ہے

دارالسلطنت فرانس کی سیر

(۲)

فرانس کی کنواری لڑکیاں بالکل انگریزوں سے مختلف ہوتی ہیں - ہماری لڑکیوں کی طرح ایام دوشیزگی بھر انکی جذبات طبیعت کی اُمنگ اور خیالات دبائے جاتے ہیں جب ذرا بڑی ہوجاتی ہیں تو ماں باپ اونکے لئے بہت سی گڑیاں لاتے ہیں انکے واسطے یہ لڑکیاں کپڑے سیتی ہیں کھانے پکاتی ہیں اور اونکی پرداخت کا پورا انتظام کرتی ہیں۔ اس طریقے سے آگے چلکر اُنہیں خود اپنے بچوں کی پرداخت و تعلیم و تربیت کے طریقے اور اُمور خانہ داری کے اسلوب آجاتے ہیں۔ مدرسے بمقابلہ انگریز لڑکیوں کے جلد ہی بیٹھ جاتی ہیں اور بخلاف انگریز لڑکیونکے تمام کھیل کود کی باتوں سے بالکل غیر متوجہ ہوکر اپنے لکھنے پڑھنے کا گھر کا اور گڑیوں کا کام اس محنت سے کرتی ہیں کہ دیکھنے والو کو حیرت ہوتی ہے - اونہیں صرف وہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو مائیں خود اچھی طرح دیکھ بھال کر دیتی ہیں - اونکا یہ بچپن کا زمانہ ہماری لڑکیوں کی طرح بالکل نادانی ناسمجھی اور سادگی میں گذرتا ہے - صبح کو ۶ بجے اُٹھتی ہیں اور شام کو آٹھ نو بجے سو جاتی ہیں اور یہ تمام زمانہ اسی ایک غیر دلچسپ رفتار کے ساتھ ختم ہوتا ہے نہ تو انگریز لڑکیوں کی طرح ادہر اُدہر اُچھلتی کودتی پھرتی ہیں نہ کہیں ٹینس کھیلتی۔ نہ کبھی کسی پکنک پارٹی میں شریک ہوتی ہیں۔ کہیں نکلتی ہیں تو ماں کے ساتھ یا کسی اَنّا دائی کو ہمراہ لیکر دکانوں پر سودا سلف کرتی ہیں۔ وہاں یہ عام خیال ہے کہ کوئی عمدہ چال چلن کی شریف لڑکی اکیلی کہیں سڑک کے اس کنارے سے اُس کنارے تک جانے کی ہمت نہ کریگی - انگریز عورتیں جب فرانسیسوں کی اس شرقی تربیت کی طرف نظر کرتی ہیں تو اُن کی بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کسطرح یہ لوگ رہتے ہیں اور دُنیا میں کیسی قید کے عادی ہوکر زندگی بسر کرتے ہیں جبتک کہ کوئی شخص فرانس میں اچھی طرح

رہا نہ ہو اور اسپر بھی کسی فرانسیسی خاندان کے ساتھ ملے لے نہیں اسوقت تک فرانسیسی لڑکیوں کا یہ ایشیائی طرز زندگی اُنکی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا - ہملوگوں کو بھی جو ایشیا کے رہنے والے ہیں اپنے ہاں کے سے طریقے یورپ کے ایک ایسے بڑھے چڑھے شہر میں دیکھکر جہاں کی عورتوں کی آزادی شہرۂ آفاق ہے حیرت سی ہوتی ہے اور یقین نہیں آتا مگر نفس الامر یہی ہے - بخلاف انگریز لڑکیوں کے فرانسیس لڑکیاں بالکل نہیں جانتیں کہ انکی زلف کے گردیدہ کون ہیں اور کہاں ہیں - وہ انگریزی جذبات محبت کے پینگوں اور خیالات کی اُمنگوں سے بالکل ناواقف ہوتی ہیں حتی کہ اُنھیں اپنے حسن خداداد کا احساس بھی بالکل نہیں ہوتا - اظہار محبت کے الفاظ اگر کبھی اُنکے کانوں میں پڑے ہونگے تو ماں باپ کے منہ سے - کسی غیر کے منہ سے یہ الفاظ اُنہیں کبھی نہیں سنائی دیتے -

سترہ برس کی عمر میں فرانسیس لڑکیاں شادی کے قابل سمجھی جاتی ہیں - اور اُنکے ماں باپ کو بر تلاش کرنیکی جلدی پڑ جاتی ہے - ۲۵ برس تک اگر انکی شادی نہ ہو تو اولڈمیڈ (   ) سمجھی جاتی ہیں - ہمارے ملکوں کی طرح فرانس میں بھی اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرتی ہے تو بہت بری سمجھی جاتی ہیں - انگریز لڑکیوں کی طرح محبت کرکے شادی کرنے کی اُنہیں تعلیم نہیں دیجاتی بلکہ شادی کے بعد محبت کرنا سکھایا جاتا ہے اپنے منگیتروں سے صرف اپنے ماں باپ یا بھائی بہن کی موجودگی میں ملسکتی ہیں - اور اگر کسی ناچ گانے کے جلسے میں جوان جوان لڑکے موجود ہوں تو وہاں لڑکیاں نہیں جا سکتیں -

ان کی شادیاں بھی نہایت سادے طریقے سے ہوتی ہیں اس شادی میں بخلاف انگریزی لڑکیوں کی جوشش جذبات کے ماں باپ کی دانشمندی اور فرزانگی کا اثر پایا جاتا ہے - جب بات ٹھیک ہونے والی ہوتی ہے تو لڑکی

ماں تعارف کے طور پر صرف دو تین مرتبہ لڑکے کے گھر جاتی ہے اور باتوں باتوں میں اپنی لڑکی کی خوبیاں اور جہیز وغیرہ سب کا ذکر کر دیتی ہے۔ لڑکے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر نوجوانوں کی طرح جب اُسکی زندگی خوب عیاشی اور آزادی میں گذر چکتی ہے تو دُنیا کے خیال سے اُسے شادی کی فکر ہوتی ہے اور کسی پادری سے اکثر اپنے ارادے کا اظہار کرتا ہے اور اگر کوئی ملجاتا ہے اور بتاتا ہے کہ فلاں جگہ ایک لڑکی ہے تو وہ فوراً اُن لوگوں سے ملنے کی کوشش کرتا ہے اور لڑکی کے ماں باپ سے ملاقات کر کے معاملہ طے کرتا ہے۔ اگر اس ملاقات میں کامیابی ہوتی ہے تو فبہا ورنہ اپنا سا مُنہ لیکر دوسری طرف خیال دوڑاتا ہے اگر بات ٹھیک ہو جاتی ہے تو لڑکے کی ماں یا کوئی اور قریبی عزیز لڑکی کے گھر آتا ہے اور تعارف کے طور پر اسطرح خطاب کرتا ہے "مڈمازل - میرا لڑکا آپ کی خوبیوں - عمدہ طریقوں - اعلیٰ شرافت اور حسن خداداد کا گرویدہ ہوا ہے اور مجھسے متمنی ہے کہ آپ کو شادی کا پیام دوں" لڑکی کو اوسکے ماں باپ پہلے سے پڑھا دیتے ہیں اور وہ اسطرح جواب دیتی ہے "مادام میں آپکے صاحبزادے کی خواستگاری سے بہت خوش اور اُن کے اس پیام کو منظور کرتی ہوں" اسکے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا منگنی ہوئی۔ اسکے بعد دونوں منگیتر ایک دوسرے کے ہمراہ ہوا خوری کو بھی آجا سکتے ہیں مگر گھر کے کسی بڑے بوڑھے کے ہمراہ - اسکے تھوڑی ہی مدت بعد شادی کی تقریب انجام پاتی ہے۔ مگر ان ایام دوشیزگی کے بعد ایک ایسی آزادی کا عالم اُنکے سامنے آتا ہے جسکا پہلے وہ کبھی خیال بھی نہیں کرسکتی تھیں - اُن کی عادت رفتہ رفتہ عیش پسندی کی پڑ جاتی ہے اس عیش پسندی کے سامان ہر طرف مہیا ملتے ہیں اور جس قعر میں وہ گرتی ہیں اُسمیں پڑنے کا ہرگز انھیں احساس نہیں ہوتا - شوہروں سے محبت صرف واجبی ہی سی رہ جاتی ہے اور سوسائٹی ہر شخص سے ملنے جلنے ، مرے اور عیش و نشاط کے سامان

ایسی دلفریب صورت میں پیش کرتی ہیں کہ ایک محویت کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے اور اپنی حالت کی خبر نہیں رہتی باسحالت بیچ انکے قدم نہیں ٹہرسکتے اور وہ تمام خوبیاں جو کنوارے پن میں اُنکے لئے زیور ہوتی ہیں ایک ایک کرکے خیرباد کہنے لگتی ہیں۔

یہ حالات جو میں نے بیان کئے فرانس کے عام طرز معاشرت اور تمدن کو ظاہر کرتے ہیں اور فرانسیسی بیاہتا عورتوں کے قابل اعتراض طریقے اُن کی اس طرز معاشرت کے اکثر نتیجے ہوتے ہیں مگر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر شخص ایکسا نہیں ہوتا اور جیسا میں اوپر بیان کرچکا ہوں اس عام قاعدہ کے مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔

بیاہتا اور کنواری عورتوں کی اس قدر متضاد طرز معاشرت کو بیان کرکے اب میں اپنے سلسلہ واقعات کی جانب پھر متوجہ ہوتا ہوں۔

یہ دوسرا دن ہے کہ میں نے فرانس کے اس عظیم الشان دارالسلطنت میں قدم رکھا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ تھوڑی تھوڑی دھوپ نکل آئی تھی جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور میں اپنی قیامگاہ سے نکلکر بولوارسناحی شیل (Boulevard St. Michel) میں سے گذر رہا ہوں۔ اس سڑک کے مقابل شیطان کا ایک بت تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور گرداگرد پریاں کھڑی ہیں جنکے مُنہ سے پانی کی دھاریں نکل رہی ہیں۔ اس قسم کے بت جو فنون لطیفہ کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں اور جو انسانی جذبات کی تصویر اور متخیلہ کی پرواز کے معراج خیال کئے جاتے ہیں اپنے رنگ میں انوکھے اور مخصوص فرنچ آرٹ کے نمونے ہوتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اس فن کو جس درجۂ کمال تک پہونچایا ہے میں آگے چلکر ذرا اُسے تفصیل سے بیان کروں گا۔ ان بتوں کا مقابلہ اگر لندن کے بتوں سے کیا جائے جو اُس عظیم الشان دارالسلطنت میں شارع عام پر نظر آسکتے ہیں تو حیرت انگیز تفاوت نظر آئیگا۔ نلسن کی یادگار جو لندن میں بہترین تصور کیجاتی ہے ایک بہت اونچے ستون کی شکلیں

بنائی گئی ہے جسکے اوپر اُس امپرالیجر کا بت نصب ہے پیرس میں بالکل اسی وضع کا ایک ستون ہے جسپر نپولین کا بت نصب ہے لیکن بجائے اُس سادگی کے جو نلسن کی یادگار میں پائی جاتی ہے نپولین کی یادگار سرتاپا مرصع ہے - اوپر سے لیکر نیچے تک برابر اسمیں اُن تمام لڑائیوں سے جو نپولین لڑا ہے اُبھری ہوئی تصویریں بنی ہیں - ان تمام بتوں میں جو پیرس کے سڑکوں پر کھڑے ہیں اس نپولین کے بت کے علاوہ وکٹر ہیوگو کا ایک بت بھی اپنی خوبی اور لطافت میں بہت کچھ ممتاز ہے - ایک ستون پر یہ مشہور ڈراما نویس پریوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہے - یہ پریاں شعر و شاعری کے دیبیان ہیں جو گویا نظم کی بیش بہا مضامین اسکے دل میں القا کر رہی ہیں اس بت سے بڑھکر اور کوئی عمدہ مثال اس فن لطیف کی ملنا محال ہے - یہ سب کچھ بت تراشی تو کیا خود شاعری معلوم ہوتی ہے -

اس دن کچھ حصہ میں سے تھا حصہ گرالقل باور ([illegible] Louvre) اور لارڈیکاڈرو (Le Trocadero) کو دیکھا - اپنے مقام سے تھوڑی دور چلکر ہم لوگ دریائے سین (Seine) کے ایک خوبصورت پل پر پہونچے چند سیڑھیاں نیچے اُترکر ایک چھوٹے سے خوبصورت کمرے میں داخل ہوئے جو پانی پر حرکت کرتا تھا یہاں ایک پنس کا ٹکٹ خرید کرکے تھوڑی دیر تک ایک چھوٹی سی دخانی کشتی کا انتظار کیا - اسطرح کی کشتیاں برابر ہر جگہ سین (Seine) میں چلتی ہیں اور انپر بیٹھکر ہوا کھانا یا سفر کرنا نہایت پر لطف معلوم ہوتا ہے - تمام راستہ نہایت ٹھنڈی اور جانبخش ہوا میں کٹتا ہے - ان کشتیوں پر بیٹھکر تھوڑے سے خرچ میں ہم پیرس کے ہر حصے میں جاسکتے ہیں اس موقع پر جب مجھے لندن کی دریائے ٹیمس کا خیال آیا تو دونوں میں ایک بیّن فرق معلوم ہوا - ٹیمس پر لوگ اسطور کی آمد و رفت نہیں رکھتے اور نہ کسی تفریح کے لئے اُسپر ہوا کھانے جاتے ہیں - میرا خیال ہے کہ اُسپر اسطرح جانا کچھ

دلچسپی کا باعث بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُسکے دونوں طرف بڑی بڑی عمارتیں چلی گئی ہیں جنہیں باستثنا سے چند کسی قسم کی دلچسپی نہیں پائی جاتی بمقابلہ اُسکے یہاں پرسیر میں اسقدر لطف آتا ہے کہ اجنبی کے لئے تو محویت کا سا عالم ہوتا ہے دونوں جانب نہایت دلفریب مناظر سامنے ہوتے ہیں جنکی بہار کو کثیر التعداد خوبصورت پلوں نے اور بڑھا دیا ہے۔ پانٹ اسکندر سوم (Pont Alexander III) ان سبھوں میں بڑا اور دنیا کے بہترین اور خوبصورت پلوں میں شمار کیا جاتا ہے جسکے ستونوں پر کانسے کے بت آفتاب کی شعاعوں میں چمکتے بہت پیارے معلوم ہوتے ہیں دریا کے داہنے اور بائیں نہایت خوبصورت اور عمدہ عمارتیں ہیں ان میں بھی سب سے زیادہ خوبصورت ایک عمارت ہے جو بڑی نمائش کے زمانے میں سجائی گئی تھی اور اب بھی جسمیں بچوں کے لئے نمائش کے طور پر بہت سی چیزیں رکھی ہیں۔

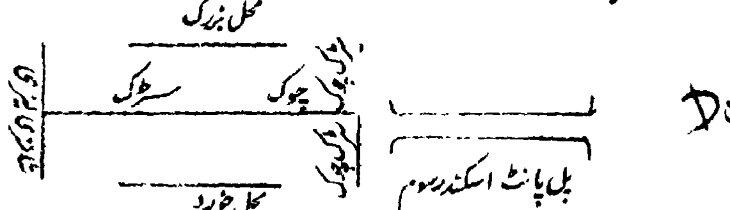
ٹاور (Eiffel Tower) کے قریب ہم لوگ کشتی پر سے اُتر پڑے اور ٹکٹ خرید کر کے ایک چھوٹے سے کھلے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے جسنے بجلی کے ذریعہ سے اوپر کی جانب صعود کرنا شروع کیا یہ کمرہ آہستہ آہستہ حرکت ہوا دو مقاموں پر ٹھیرا اسپر سے تمام پیرس کا سین نظر آتا تھا۔ میں نے چند اور بھی مقامات کے مناظر دیکھے ہیں لیکن جو اثر میرے دل پر پیرس کے منظر کا اُسکی خوبی اور لطافت کی وجہ سے ہوا وہ کسیکا نہ ہوا ہوگا۔ لندن کے مقابلے میں یہ شہر بہت چھوٹا معلوم ہوتا تھا مگر جو سماں کی صفائی۔ زمین کی شادابی اور زرخیزی ہرے ہرے کھیتوں کا شہر کے باہر باہر حاشیہ اور سب سے زیادہ ایک مسرت اور انبساط کا اثر جو ہر شے میں معلوم ہوتا تھا یہ ایسی خوبیاں ہیں جو لندن میں کہیں نہیں پائی جاتیں۔ اور وہاں کے گھبرا دینے والے بلکہ تکلیف دہ کہرے سے تو بھلا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو کسی خاص اور پہلے سے بنائے ہوئے نمونے

پر تعمیر کیا ہے جسمیں لندن کے سے عدم تناسب کے بجائے ہر شے سے استادی اور کاریگری کا اظہار ہوتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ بخلاف لندن کے یہاں نہ تو مکانات بیرون شہر واقع ہیں اور نہ عمدہ (Suburbs) نواح جسکیہ آخر الذکر رہنے کا طریقہ بھی بہت کچھ عمدہ اور آرام کا معلوم ہوتا ہے اور میں اسنے بہت پسند کرتا ہوں اور بلا پس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ جو گھر کا لطف اور آرام مجھے لندن میں ایسے نواح شہر کے مقامات پر ملتا ہے یہاں نہیں ملتا ہم جو کچھ یہاں کے لوگ عذر میں پیش کرتے ہیں بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا شہر بہت صاف اور ہوادار ہے اور یہاں دھوپ بھی خوب نکلتی ہے اور کوئی چیز کہرے وغیرہ کے مثل ہمیں تنگ نہیں کرتی اسلئے ہمیں باہر جانیکی ضرورت نہیں۔

لوگوں کے مکانات بمقابلہ لندن والوں کے مجھے زیادہ عمدہ بنے ہوئے دکھائی دیئے۔ کمرے وغیرہ نہایت خوبصورت آراستہ ہوتے ہیں مگر پائیں باغ اور مکانات بیرون شہر (باستثناے چند) مجھے کہیں نہیں نظر آئے۔

اس بلندی پر سے پیرس کا پینورا ما (Panorama منظر) نہایت ہی عالیشان اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دریاے سین (Seine) ایک معشوقانہ انداز سے ان نازک خوبصورت پلوں میں سے گذرتا ہوا اپنی دونوں جانب شاندار اور پاکیزہ عمارتوں کو چھوڑتا ہوا بصد خوبی جھکا کھاتا ہوا جاتا ہے ہر طرف دخانی کشتیاں شفاف سطح آب پر دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ٹاور پر سے نہایت آسانی کے ساتھ شہر کے تمام بازار اور چوک دیکھے جا سکتے ہیں اور بائی ڈی بولون (Bois de Boulogne) کے دو رویہ درختوں کی صفوں کا نظارہ تو درحقیقت محو کن ہوتا ہے۔ محل لا تروکادرو (Le Trocadero palace) ٹاور (Tower) کے بالکل مقابل واقع ہے اور ایک بہت عالیشان عمارت ہے۔ سامنے ایک باغ ہے جو وسعت میں لب جو تک چلا گیا ہے

اور وسط میں ایک فوارہ ہے جسنے اپنی خوبی اور دلفریبی سے اس باغ کی زینت کو دوبالا کر دیا ہے - میری خیال میں سب سے زیادہ دلفریب منظر پانٹ اسکندر سوم (Pont Alexandre III) کا ہے یہ نفیس اور خوبصورت پل جنمیں لاکھوں فرانک صرف ہوئے ہیں اسطور پر واقع ہے -



پل کے چاروں کونوں پر اونچے اونچے ستون نصب ہیں جنپر نہایت خوبصورت کانسے کے بت استادہ ہیں - پل کا ہر برج دیبیوں کی ابھری ہوئی تصویروں سے مرصّع ہے سامنے کے جانب محل خورد اور محل بزرگ اور لیز نولیں (Invalides) یعنی مقبرہ نپولین اپنے چمکتے ہوئے گنبدوں سے اُسکی دلفریبی کو اور زیادہ کرتے ہیں -

ٹاور (Tower) کی دونوں منزلوں پر بکثرت ریفرشمنٹ روم ہیں اور ایک تھیٹر بھی ہے - جو منزل سب سے اونچی ہے اُسپر چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ہیں جو ٹاور کی تصویریں اور دیگر متفرق چیزیں بیچتی ہیں - یہاں میرا وقت نہایت مسرت اور دلچسپی کے ساتھ گذرا اور گردوپیش کے تمام منظر کو میں نے دیر تک ایک بڑی دوربین سے جو وہاں اسی غرض کے لئے رکھی رہتی ہے خوب دیکھا اور پورے تین گھنٹے کے بعد اُترکر اُن کمروں میں داخل ہوا جو کل کے ذریعے ٹاور کے اوپر نیچے آتے جاتے ہیں -

حکام وقت کا خیال ہے کہ اس عالیشان مینار کو منہدم کر دیں - شاید کہ بنیاد میں کچھ ضعف پیدا ہو چلا ہے اور حالت غیر قابل اطمینان ہو گئی ہے -

بڑی افسوس کی بات ہوگی کہ پیرس سے ایسی عالیشان عمارت کالعدم کر دی جائے -

اسکے بعد میں لاتریکاڈرو کو دیکھنے گیا یہ ایک اونچی اور عالیشان عمارت ہے جسکے چار طرف نہایت ہی دلفریب منظر ہے ۔ اونچے اونچے سرسبز درخت اور درختوں کی سایہ دار دورویہ روشیں ہر طرف سے گویا احاطہ کئے ہوئے ہیں ان درختوں کے نیچے بنچیں بھی ہیں جہاں تھکے ماندے پیدل چلنے والے لوگ ذرا آرام لیتے ہیں یا کوئی بڑھیا اپنی لڑکیوں سمیت ذرا بیٹھکر دھوپ کی تمازت سے پناہ لیتی ہی ۔

اس عمارت کے ایک حصے میں کچھ سرکاری دفتر ہیں۔ باقی حصے میں دو بڑے بڑے عجائب خانے ہیں ۔ ان دونوں میں جو سب سے بڑا ہے اُسمیں فرانس کے مختلف زمانوں کے فن سنگ تراشی کے نمونے جمع ہیں یہاں مجھے سب سے زیادہ فواری پہاٹک اور نفیس ترشے ہوئے بُت پسند آئے ۔ انکے اوپر جو کام کیا گیا ہے وہ بھی لاجواب ہے لاتراکاڈرو کے بعد میں نے اپنے مکان پر آکر کچھ کھانا کھایا اور تیسرے پہر کو نپولین کا مقبرہ دیکھنے گیا ۔

اوہ ! نپولین ! صرف یہ نام ہی ابتدائی زمانے میں میری روح کو ہلا دیتا تھا۔ تھوڑی دیر تک میری یہ حالت رہی کہ گویا نپولین کا چہرہ در و دیوار سے میری طرف گھور رہا ہے اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو فی الحقیقت ایسا ہی ہے۔ اُسکا اثر اب بھی اس عظیم الشان شہر کی اینٹ اینٹ سے پایا جاتا ہے اور باشندوں کے دلوں کو حب الوطن کی بے انتہا جوش سے بھر دیتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اُس گریٹ ماسٹر (Great Master) کی روح اب بھی اس شہر کے اوپر منڈلاتی رہتی ہو۔ عجائب خانے تمام اسکے واقعات کی تصویروں سے بھرے پڑے ہیں۔ عظیم الشان محراب جسے آرچ ڈی کانکارڈ (Arch de Concord) کہتے ہیں اُسکی فتوحات کی ایک لازوال یادگار ہے ۔ ایک اور ستون ہے جسپر ایک سرے سے لیکر دوسرے تک نپولین کے ایام زندگانی کے بہت سے مشہور

مشہور واقعات کندہ ہیں اوپر خود اُس کا بُت نصب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی ابتک اس عجیب غریب شخص کی کسقدر پرستش کرتے ہیں ڈڈنولی (Madonna ...) ایک بہت بڑی عمارت ہے جسمیں دو تین عجائب خانے بھی ہیں۔ ایک میں نپولین کے زمانے کی باقی ماندہ اشیا۔ اُسکے ہتھیار۔ اُسکی تلوار۔ اُسکا کوٹ اور اوسکے خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ دوسرے میں بہت سی مورتیں رکھی ہیں جو فوجی وردیاں پہنے۔ فرانسیسی فوجی ترقی کی مختلف زمانوں کو بتا رہی ہیں۔ قبر سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا گرجا ہے جسکے نیلے اور سبز شیشوں میں سے روشنی چھن چھنکر مقبرے پر پڑتی ہے۔ جو لوگ گرجے میں عبادت کرتے ہیں اونکے مُنہ بھی مقبرے ہی کی جانب ہوتے ہیں۔ اس مقبرے کے اندرونی حصّے میں میں نے کسیقدر اپنے تاج محل کے اندر کے حصے کی سی جھلک پائی مگر اُس حُسن و خوبی کی تصویر کے مقابلے میں یہ مقبرہ تو کیا دنیا کی کوئی بھی چیز نہیں ٹھہر سکیگی۔

اسکے موزوں اور وسیع دالان مجھے بہت ہی پسند آئے۔ قبر ایک خاص قسم کی حوض نما خانے کے اندر واقع ہے جو بالکل سنگ موسیٰ کا بنا ہوا ہے قبر کے چاروں طرف اُن تمام لڑائیوں کے نام کندہ ہیں جو نپولین لڑا ہے۔ اور گرداگرد اُس زمانے کے باقی ماندہ جھنڈے اور پھریرے جنھیں اوس نے غنیم سے چھینا تھا سجے ہوئے رکھے ہیں اور اسطرح سے گویا کہ اوسکی روح کو کسیقدر تسکین دیتے رہتے ہیں۔ اس قبر میں داخل ہونیکے لئے ایک بہت بڑا کانسے کا پھاٹک نصب ہے لیکن اندر کے حصے کو دیکھنے کی اجازت کسی کو نہیں نپولین کا مذہب ابھی تک کسیکو ٹھیک طور پر نہیں معلوم۔ ہر شخص کو اسمیں شبہ ہی اور بہت لوگوں کا خیال ہے کہ اسکا میلان اسلام کی طرف زیادہ تھا میں نے صرف اس میلان ہی کے خیال سے اُسکے روح پر فاتحہ پڑھا اور اُسکی نجات کے لئے دعا کی۔ دو ماتی ،،

تنقید

(۱) اردوی معلی ابتدا میں اردوی معلی کے مقاصد کا دائرہ ہمنے بہت وسیع رکھا تھا لیکن اب یہ ارادہ کرلیا ہے کہ آیندہ اسکے مضامین کا زیادہ حصہ لٹریچر اور پالیٹکس سے متعلق ہوا کرے گا چنانچہ اسی لحاظ سے اس سال کے مانند سال آیندہ میں بھی اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے دو دیوانوں کے علاوہ بنارس کانگرس کی اردو رپورٹ بھی بلا قیمت نذر ناظرین ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

سال رواں کے حساب میں رپورٹ بمبئی کانگرس کے علاوہ اس ماہ کے پرچے کے ہمراہ دیوان میر سوز و دیوان قائم حاضر کئے جاتے ہیں۔

(۲) غزلیات شاد "جناب شائقین کے اصرار سے ہمنے حضرت شاد خان بہادر کی غزلونکو اردوی معلی میں شائع کرنیکا قصد کرلیا ہے اور اسکے لئے اپنے رسالے کے آخری دو ورق مخصوص کردینا چاہتے ہیں۔ باوجود بیحد تقاضوں اور اصرار کے جناب شاد نے اپنا کلیات شائع نہیں فرمایا۔ آخر ایک عزیز دوست کی عنایت سے بہت سی غزلیں جناب ممدوح کی ہمارے ہاتھ آگئی ہیں جنمیں سے چند اس ماہ میں بھی درج رسالہ کیجاتی ہیں امید ہے کہ آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا۔"

(۳) گلزار نسیم پھرایا سر کو تیرے زمزموں نے او بلبل جو خفا ہو تو کہوں خوشنوائی مشکل ہے

اردوی معلی (اگست و ستمبر و اکتوبر) میں حضرت شرر کا ایک طولانی مضمون گلزار نسیم کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسمیں میرے اس مضمون کی تردید کی فکر کی گئی ہے جو کہ میں نے حضرت موصوف کے اعتراضات کے جواب میں لکھا تھا کیا اچھا ہوتا اگر حضرت شرر کا یہ مضمون اتنا ہی پر معنی بھی ہوتا جتنا کہ پر جوش ہے۔ اس مضمون کے متعلق میرا کچھ لکھنے کا ارادہ نہ تھا مگر اسمیں چند ایسی باتیں نظر سے گذریں جو نا واقفان سخن

کے گمراہ کرنے کے لئے غول بیابانی سے کم نہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوا کہ مختصراً کچھ عرض کیا جائے۔

گلزار نسیم کی بحث کے شروع سے تین عنوان قائم ہیں۔

(۱) اولاً یہ کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے یا نسیم کی۔

(۲) ثانیاً یہ کہ اسکی زبان لکھنو کی مستند زبان ہے کہ نہیں۔

(۳) ثالثاً یہ کہ حضرت شرر کے اعتراضات صحیح ہیں کہ غلط

(۱) عنوان اولین کی نسبت حضرت شرر نے مارچ ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں یہ رائے ظاہر فرمائی تھی کہ گلزار نسیم یا تو آتش کی تصنیف ہے، یا اسمیں جسقدر محاسن ہیں وہ آتش کی زبردست اصلاح سے پیدا ہوئے ہیں اس رائے کی تائید میں حضرت موصوف نے بہت سے منطقی دلائل پیش کئے تھے اور اکثر بزرگوں کی زبانی شہادت کا بھی حوالہ دیا تھا۔ میں نے اپنے مضمون میں اس دعوی کو بے ثبوت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اپنے جواب الجواب میں حضرت شرر نے بھی اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنی رائے واپس لینے کو تیار ہوں اس عنایت کے لئے میں انکی عنایت فرما کا مشکور ہوں۔

(۲) عنوان دوم کے متعلق حضرت شرر نے اپریل ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں کسقدر جوش کے ساتھ تحریر فرمایا تھا کہ "ضرورت بھی ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کردیا جائے کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنو کی (مسلم و مستند) زبان نہیں ہے" اس اعلان کی تردید میں میں نے دو دلائل پیش کئے تھے۔

(الف) اوّلاً یہ کہ گلزار نسیم کی زبان کے مستند ہونے کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ امیر اللغات اور بہار ہند میں اسکے شعر زبان اور محاورے کی بحث میں سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

(ب) نیز یہ سب جانتے ہیں کہ یہ مثنوی آتش کی اصلاح کے بعد شائع ہوئی ہے۔ پھر اسمیں ایسے شعر کہاں سے آ گئے جن کی نسبت حضرت شرر کا ارشاد ہے کہ ان کی زبان لکھنؤ کی بازاری زبان بھی نہیں ہے۔ اپنے جواب الجواب میں حضرت شرر نے ان دلائل کا جواب کچھ نہیں عطا فرمایا ہے۔ حالانکہ بحث کا سب سے ضروری حصہ یہی تھا۔ لہٰذا اس خاموشی سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت موصوف اپنا یہ دعویٰ بھی واپس لینے کے لئے نیم راضی ہیں۔

(۲) عنوان سوم کی نسبت حضرت شرر نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور قریب قریب میرے تمام پیش کردہ اسناد کی تردید کسی نہ کسی پہلو سے کی ہے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت موصوف کی ایک تاویل بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ جن دعووں کی بنیاد پر آپ نے تاویلیں پیش کی یا تو وہ خلاف واقعات ہیں یا لاعلمی پر مبنی ہیں یا کسی اور پہلو سے قابل اعتبار نہیں ہیں۔ مجموعی طور پر ان لغزشوں کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ سخن فہموں کیلئے اشارہ کافی ہے۔

(الف) پہلی بات تو قابل غور یہ ہے کہ جواب الجواب میں حضرت شرر نے قدیمی اعتراضات سے درگزر کر کے بالکل دوسرے قسم کے اعتراضات پیش کئے ہیں۔ مثلاً پہلے یہ اعتراض تھا کہ "بینائی کے چہرے پر نظر کی" ایک بے معنی مصرعہ ہے۔ اب فرماتے ہیں کہ "نظاری کرنے" کے بدلے "نظر کرنا" غلط استعمال ہوا ہے۔

پہلے اعتراض تھا کہ "یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی" ایسا محاورہ ہے جسکے کوئی معنی نہیں اب ارشاد ہوتا ہے "یہاں سانس" سے "فرصت"ؑ مراد لی گئی ہے۔ اسکے لئے سند درکار ہے۔

ع حالانکہ یہ محض غلط ہے۔ یہ مصرع (یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی) اس موقع پر استعمال ہوا ہے جبکہ صحرائے طلسم میں روح افزا سے اور تاج الملوک سے ملاقات ہوئی ہے اسوقت روح افزا کے منہ سے بکاولی کا نام نکل گیا ہے۔
چنانچہ ؎ نام اس سے بکاولی کا سنکر ✽ رونے جو لگا وہ سر کو دھن کر ✽ پوچھا اسنے کہ آدمی زاد ✽ تو کیوں رہا کہ فریاد
والا خزمن مغیں پر پڑی برق ✽ بالجبر منغیں میں ہوا غرق ✽ واں سپانس جیسی ہے اسکو تم کی ✽ یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

پہلے یہ نیم اخلاقی اور نیم شاعرانہ اعتراض پیش کیا گیا تھا کہ "جانی" کا لفظ سوائے معشوقہ کے (اور وہ بھی خلوت کے وقت) دوسروں کی شان میں نہیں ہو سکتا - اب یہ اصول اخلاق قائم کیا گیا ہے کہ "باپ بیٹی بیٹے کو بلکہ بڑے بزرگ خردوں کو بھی جانی کہہ دیا کرتے ہیں"

پہلے اس مصرع پر (جنگلے کی راہ سے چلا دیں ۵) یہ اعتراض تھا کہ تاج الملوک فقط دلیں کی ضرورت سے جنگلے کی راہ بھیجا گیا" اب ارشاد ہوتا ہے کہ "جنگل" کی جگہ "جنگلا" غلط ہے -

پہلے اعتراض تھا کہ "ہلکا ہوا ہوا وہ گراں ہوئی وہ" میں "ہلکا ہوا" غلط ہے - اب ارشاد ہوتا ہے کہ غلط تو نہیں ہے مگر بدسلیقگی اور بدتمیزی سے استعمال کیا گیا ہے پہلے یہ کہا گیا تھا کہ "پان کا بیڑا" خلاف محاورہ ہے محض "بیڑا" کافی ہے - اب ارشاد ہوتا ہے کہ جانصاحب اور امیر کے اشعار میں تو "پان کا بیڑا" اچھا معلوم ہوتا ہے مگر نسیم کے یہاں بدنما معلوم ہوتا ہے پیشتر یہ اعتراض تھا کہ "ٹھہر" ہائے متحرک کے ساتھ "اُردو میں غلط ہے" اب یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میر کے یہاں صحیح ہے نسیم کے یہاں غلط ہے - وغیرہ وغیرہ - اس قسم کی گریزیں قصیدے میں اچھے معلوم ہوتی ہیں مگر ایک علمی مباحثے کے مضموں میں ضرور بدنما ہیں -

کیونکہ اگر اسیطرح ہر مضمون میں اعتراضات کا مرکز بدلتا رہے تو بحث خاتمہ پر آہی نہیں سکتی

(ب) اکثر یہ تدبیر کی گئی ہے کہ میری پیش کردہ اشعار میں جو مصرع سند کا ہے اس سے چشم پوشی کی گئی ہے اور دوسرے غیر متعلق مصرع کا خاکہ اڑایا گیا ہے مثلاً "نظر کرنے" کی سند میں خواجہ وزیر کے شعر کا پہلا مصرع - (نرگس پہ نظر کیجے دوبارہ کہ وہ کٹ جائے) پیش کیا گیا تھا مگر حضرت شرر نے اس شعر کے دوسرے مصرع - (ہو جائے نظر ثانی میں اسکی نظر آنکھ) پر بحث کی ہے - "اُٹھائی چنگال" کی سند میں ملا شہیدی کے شعر کا پہلا مصرع (البتہ رنگ حنا بر چنگل خود اے نگار) پیش کیا گیا تھا مگر حضرت شرر اس شعر کا دوسرا مصرع (یا خون عاشقان تر کرد چنگال را) سند میں لیتے ہیں - وغیرہ وغیرہ (باقی آئندہ) ہیچ مرزا ابن ہیبت

۵ [illegible] یہ اعتراض [illegible] غلطی [illegible] - ۵ [illegible] جنگلا [illegible] شعر میں "جنگلا" بعینہ اسی طرح استعمال ہوا ہے جیسا کہ نسیم کے شعر میں"

حصۂ نظم

غزل جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح
لوٹ جاؤں گا میں داماں کی طرح

پاؤں پھیلائے ہیں دیلاں کیطرح
ہاتھ کھینچا ہے گریباں کی طرح

جل گیا مجھ پہ یہ دوہرا خنجر
پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کی طرح

تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم
توڑ ڈالا جسے پیماں کی طرح

میں تو کہتا ہوں اجل آجائے
دم نکلتا نہیں ارماں کی طرح

سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے
تیغ آئی تری احساں کی طرح

میرے غماز کا منہ ہے کالا
میرے ہی نامۂ عصیاں کی طرح

پُر کدورت ہے مرا دل ایسا
خاک اُڑاتی ہے بیاباں کی طرح

نظم کے پاس تھا کیا دل کے سوا
کھو دیا اُسکو بھی ایماں کی طرح

غزل جناب نواب یوسف حسین خانصاحب یوسف لکھنوی

چاند سا جس نے وہ رخ وہ قد بالا دیکھا
جلوۂ قدرت اللہ تعالیٰ دیکھا

ہے عیاں مردمک چشم سے اللہ کی شان
ورنہ یوں کسنے اندھیرے میں اُجالا دیکھا

حال اسلام کھلا شیخ کا بتخانے میں
جسمیں تسبیح تھی اب ہاتھ میں مالا دیکھا

کانپ اُٹھا عرش ہوا دیدہ گردوں خوناب
آبدیدہ جو مرے پاؤں کا چھالا دیکھا

آسیا ایک فقط شکر خدا کرتی ہے
ورنہ خاموش ہے جس منہ میں نوالا دیکھا

جای عبرت ہے جہاں کیوں نہ پڑھیں فاعتبروا
مکڑیوں کا محمد شاہ پہ جالا دیکھا

ہائے یوں وادی غربت میں اُٹھا لاشۂ قیس
کہ نہ تابوت پہ چادر نہ دوشالا دیکھا

کوچۂ یار میں جنت کا سماں تھا دم صبح
نہ اندھیرا نظر آیا نہ اُجالا دیکھا

تھک کے جب وادی پرخار میں ہم بیٹھ چکے
دیکھ کر سوئے فلک پاؤں کا چھالا دیکھا

دن بھلے تھے تو موافق تھا زمانہ یوسف
وقت بد میں نہ کوئی پوچھنے والا دیکھا

غزل جناب نواب سید محمد رضا صاحب مونسؔ عظیم آبادی

اُسنے تو کبھی شکل چھپائی ہی نہیں تھی
ہر آئینہ دل میں صفائی ہی نہیں تھی

محشر میں بھی سنور کے گئے اُسکی ادا سے
اُسکی تو کہیں رائی دوہائی ہی نہیں تھی

منزل پہ پہنچتے ہی تھکن مٹ گئی اسطرح
جیسے کوئی تکلیف اُٹھائی ہی نہیں تھی

محشر میں کھلی وعدۂ فردا کی حقیقت
اب تک یہ مرے ذہن میں آئی ہی نہیں تھی

اللہ غنی اُس نگہِ ناز کا عالم
پلٹی تو خدائی کی خدائی ہی نہیں تھی

گھبرائی ہے یوں دلمیں مرے یاد تمہاری
جیسے کبھی اس گھر میں یہ آئی ہی نہیں تھی

یہ جام تو آخر کا غضب ڈھا گیا ساقی
ایسی تو کبھی تو نے پلائی ہی نہیں تھی

مژدہ جو سُنا وصل کا آئی ہے مری موت
یوں پھر گئی جیسے ادھر آئی ہی نہیں تھی

غزل جناب ضمیر الدین احمد صاحب عرشؔ مقیم گیا تلمیذ اُستاد تسلیم مدظلہ لکھنوی

صورتِ تصویر ہم ذوقِ بیاں رکھتے نہیں
منہ تو رکھتے ہیں مگر منہ میں زباں رکھتے نہیں

کچھ عجب عالم نظر آیا عدم آباد کا
نام والے خواہشِ نام و نشاں رکھتے نہیں

مائلِ افسردگی ہر دم رہی اپنی بہار
اس چمن میں کچھ بھی ہم خوفِ خزاں رکھتے نہیں

رکھتے ہیں اک اور ہی دنیا جو ہیں اہلِ فنا
یہ زمیں رکھتے نہیں یہ آسماں رکھتے نہیں

برق سے کیا لاگ ہمکو خوف کیا صیاد کا
ہم تو اس گلشن میں فکرِ آشیاں رکھتے نہیں

ہیں حبابِ آبجو دو چار اپنے ہمسفر
اور ہم بحرِ جہاں میں کارواں رکھتے نہیں

باغباں تجکو مبارک چار دن کی چاندنی
ہم دماغِ سیرِ باغ و بوستاں رکھتے نہیں

آسرے تیرا گورِ غریباں پھر وہ بہرِ فاتحہ
اور ہم جز بے نشانی کچھ نشاں رکھتے نہیں

وہ چمن اپنا نہیں جسمیں کہ ہو خوفِ خزاں
جسکو بجلی پھونک دے وہ آشیاں رکھتے نہیں

آئی پیری عرشؔ اپنا قافلہ آگے بڑھا
ہم ندیم و لطفِ بزمِ دوستاں رکھتے نہیں

غزل جناب منشی عطا حسین خانصاحب عطا شاگرد عرش گیاوی

آہ فرقت میں کارگر نہوئی
جان دے دی مگر سحر نہوئی

کچھ غم دوست کچھ خیال عدو
چین سے مرکے بھی بسر نہوئی

رو دیئے کسطرح میرے مرنے پر
آستین ایک دن بھی تر نہوئی

کھو دیا عشق نے عطا ایسا
موت آئی ہے مجھے خبر نہوئی

غزل جناب سید محمد سلطان صاحب شعلہ نبیرہ جلیس الدولہ بہادر مرحوم شاگرد محشر لکھنوی

تیرے کوچے میں ستائیگا کہانتک کوئی
ہم نہ اٹھیں گے اٹھائیگا کہانتک کوئی

حشر تک اب تو اندھیرے میں بسر ہونی ہے
شمع تربت پہ جلائیگا کہانتک کوئی

مدد اے ضبط نہ اف منہ سے نکلنے پائے
ظلم سے باز نہ آئیگا کہانتک کوئی

کشتۂ ناز بجز حشر نہ اٹھے گا کبھی +
فتنہ ہر روز اٹھائیگا کہانتک کوئی

نام تو اپنا زمانے میں رہیگا جانباز +
دیکھیں دنیا سے مٹائیگا کہانتک کوئی

مرنے والے سے دم نزع وہ فرماتے ہیں +
ہم نہ مانینگے منائیگا کہانتک کوئی

دل بیتاب ٹہرنے نہیں دیتا شعلہ
اپنی محفل میں بٹھائیگا کہانتک کوئی

غزل جناب عبد الغفار خانصاحب اختر الہ آبادی بی-اے

بہار اس جوش پر اور چارہ گر مصروف درماں ہیں
بیاں ہیں اور تدبیریں جنوں ہی کے دلاماں میں

اثر ہے خودنمائی کا تری خون شہیداں میں
نہ کیونکر رنگ گل بنکر نمایاں ہو گلستاں میں

جب ان کا ذکر آیا بیخودی میں ہونٹ تک آیا
کسیکا نام نکلی کیطرح دوڑا رگ جاں میں

یقیں تھا کسکو اس تکرار پر وعدے کی ایفا کا
مگر اک لطف تو حاصل ہوا اسکی نہیں ہاں میں

دل تنگ اور خیال یار ای نیرنگی قسمت +
پہنسایا شوق بے پایاں کو کس تنگ ظرف دلمیں

رہا پاس ہمارا بیخودی میں اسقدر باقی +
کہ پاس غیر کو ہمنے جگہ دی طاق نسیاں میں

مچلنا صورت زیبا پہ جسکا کھیل ہے اختر
وہی دل لیکے تجھ تک آئے ہیں بزم حسینانِ میں

غزل جناب شفق عماد پوری تلمیذ حضرت امیر مینائی مغفور

رہینگے جتنے دن دنیا میں ہم رونے کو آئے ہیں
سہینگے اے فلک تیرے ستم سہنے کو آئے ہیں

کہاں جائینگے انکو قبر کی تھوڑی جگہ دیدو
تمہارے مرنیوالے در پہ مر رہنے کو آئے ہیں

بھری محفل میں کرلے آبرو اے ضبطِ غم میری
کہ قطرے اشک کے آنکھوں میں کچھ بہنے کو آئے ہیں

نکرنا اے لحد پہلو تہی ہم مرنیوالوں سے
قیامت تک تری آغوش میں رہنے کو آئے ہیں

جلایا ہمنشیں نے مرتے دم مجکو یہ دم دیکر
اُٹھو وہ کچھ لبِ جانبخش سے کہنے کو آئے ہیں

جو دیکھا ناتواں مجکو کہا غیروں نے محفل میں
یہی ہیں جو مرے جور و ستم سہنے کو آئے ہیں

ہم اپنا مدعا کہتے تو کہئے کہکے کیا پاتے
نہو جہاں آپنے اتنا ہی کیا کہنے کو آئے ہیں

ہزاروں درد و غم لاکھوں بلائیں سیکڑوں صدمے
اکیلے ایک ہم اتنے الم سہنے کو آئے ہیں

لگا ہے آنا جانا جائینگے آخر شفق اکدن
رہا ہے کوئی دنیا میں کہ ہم رہنے کو آئے ہیں

غزل (ناتمام) حسرت موہانی

نہاں شان تغافل میں ہے رمز امتیاز اُسکا
باندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز اُسکا

نگاہِ آرزو تابِ نگاہِ یار کیا لاتی
اگر حائل نہو جاتا حجابِ کارسازِ اُسکا

زمانا یاد ہے ابتک وہ لطفِ اوّل اوّل کا
گوارا کیسے ہو یارب عتاب جاننگداز اُسکا

غلط ہے شکوہ سنجی میری عشق ناشکیبا کی
بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسن بے نیاز اُسکا

چھڑایا دم زدن میں دلکو فکر شادی و غم سے
قیامت تھا اخر تھا جلوہ حیرت نواز اُسکا

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا
وہ شمع پارسا اسکی وہ عشق پاکباز اُسکا

قطعہ تاریخ انتقال خان بہادر مولوی زین العابدین مرحوم از شار تمنا علی صاحب تمنا کاکوروی	حیف زین العابدین شد از جہان بے ثبات ۔ برد از یاران شکیب و همنشیں ۔ مصرعہ برجستہ گفتم بہر سال وفات ۔ رفت در جنت بیاکر دید بہر زین العابدین ۱۳۳۰ ہجری قدسی

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر مدظلہ

یہ غزلیں سنہ ۷۶ء سے سنہ ۸۳ء تک کی ہیں

(غزلیں)

خوشا وہ وقت کہ عالم میں تو ہی تو ہوگا ۔۔ جدھر کو آنکھ اُٹھاؤ مقام ہو ہو ہوگا
کبھی تو آپ کے حسرت زدہ سمجھ لیں گے ۔۔ کبھی تو موقع اظہار آرزو ہوگا
زمانہ گذرے گا رندوں کا اسی بہار میں یوں ۔۔ کہ لب پہ نام ترا ہاتھ میں سبو ہوگا
جواب ہم تری باتوں کا کیا ابھی سمجھیں ۔۔ خدا کو علم ہے کیا طرز گفتگو ہوگا
خیال رنج نہ دیگا اجازت گفتار ۔۔ ترا غبار بھی جب سرمۂ گلو ہوگا

کبھی تو یاد کرو وہ بھی دن کہ جب اے شاد
بغل میں دفتر غم یار روبرو ہوگا

غزل

ہے ہے مری چشم حیرت کا سبب دردِ دل اُنسے کہہ جانا ۔۔ دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنے کچھ سوچ کے انکار بجا نا
مانا کہ فقط موہوم سہی ملنے کی مجھے اک آس تو ہے ۔۔ دیدار تو ہو لے دیدۂ تر بہنا ہو اگر تب بہہ جانا
اُٹ اُٹ وہ ہتھیلی سے انگشت نما کی چھپانا آنکھوں کو ۔۔ برچھی کا ادا کی چل جانا اُس تیر نگہ کا رہ جانا
ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہئے ۔۔ منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زبانیں کہہ جانا
سُن لیں دلِ نالاں کی باتیں بیکار بگاڑیں کام اپنا ۔۔ وہ ظلم کریں یا جور و ستم اے شاد ہمیں تو سہہ جانا

مطلع

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا ۔۔ ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

مطلع

سینے سے چلا جب نالۂ دل تیر تار نفس خود ٹوٹ گیا ۔۔ اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا

غزل

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

احوال جوانی پیری میں کیا عرض کروں اک قصہ ہے
وہ طرز گئی وہ وضع گئی - انداز گیا اسلوب گیا

کیا اسکا سبب میں عرض کروں کیا اسکو ایسی پیش آئی
میں رہتا ہو آیا تھا یہاں - جب یہاں سے گیا محجوب گیا

طاقت جو گئی اب حیرت سے تصویر کا عالم رہتا ہے
وہ آخر شب کی آہ گئی وہ نعرۂ یا محبوب گیا

مشہور ملقب شاد سے تھا عنقا ہوا جسکے ننگ سے سب
صد شکر جہاں کی محفل سے آخر وہ سگِ معیوب گیا

زیست ہے نام تیری فرقت کا
کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا

ہاتھ میں خاک ہے دنیا ہے
پاؤں پھیلا ہوا ہے وحشت کا

زندگی بھی لقب اسی کا ہے
نام مرنا بھی ہے محبت کا

حالِ دل سب بیاں کروں کیونکر
حشر کل ایک دن ہے مہلت کا

کھتے ہیں اس جہاں کی صورت گر
بھول چرہا ہے تیری صورت کا

عیش و عشرت کہاں نصیب اے شاد
ساتھ چھوٹا ہے اب تو حسرت کا

رہے گا وردِ زباں اوروں کو کام ترا
سند ہوا فصحا کے لئے کلام ترا

ہوئے خوش لیا جب کسی نے نام ترا
خوش اعتقاد ہیں - کرتے ہیں احترام ترا

مطیعِ عشق بنایا ہے ایک عالم کو
کہاں کہاں نہیں جاری ہے حکمِ عام ترا

وہ ولولے نہ رہے - وہ صفائیاں نہ رہیں
مگر دلوں میں نہیں اندلوں مقام ترا

نہ اضطراب ہے باقی نہ بے قراری ہے
یہیں تو موت نے پہونچا دیا پیام ترا

تو ہی بتا کہ رسائی ہو شاد کی کیونکر
کمند آہ سے اونچا بہت ہے بام ترا

غزل

حیران ہو رہی ہر شئے ہیں ہو جلوا اُس کا
ترک نعمت جو کروں ترک ہو گویا اُسکا

چشم بینا میں کہاں چھپتی ہے دو دن کی بہار
گل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہو شیدا اُسکا

نہ ملے گا وہ کبھی یوں نہ کہو نامہ برو
ڈہونڈھ لیگا کسی تدبیر سے جویا اُسکا

اپنی ناکامی کا کیا ذکر۔ مگر حشر کے دن
کیا قیامت ہے کہ منہ دیکھے گی دنیا اُسکا

ہو خفا اُس سے تو جائی کدہر اُسکا عاشق
باغ اسکا ہی جدائی غار تو صحرا اسکا

آسماں نے بھی اسی چال کو مانا ہوگا
چلتے چلتے ہے یہ تاکید کہ آنا ہوگا

بال سلجھاتے ہیں ہر وقت۔ مگر بعد مرے
یوں ہی رکھا ہوا آئینہ پہ شانا ہوگا

ہم غریبوں کا بھی والی نکل آئیگا کوئی
نہ ملے خلد تو دوزخ میں ٹھکانا ہوگا

روح چپتی ہے جو آتا ہے عدم کا مذکور
موت کہتی ہے مقرر تجھے جانا ہوگا

زندگی تک فقط اسے شاد عدادت کر لے
میرے مر جانے پہ مداح زمانا ہوگا

یہ خیال چاہیئے ناز کو کہ محل سمجھ لے حجاب کا
مری آہ کی نہ سُنی اگر تو گلہ عبث ہے نقاب کا

ترے عاشقوں کی بھلی کہی۔ یہ اُمنگ ہی تری عمر میں
کہ وہ کام کر گئے شیب میں کہ جو مقتضا ہی شباب کا

مری قاصدوں کی خبر صبا جو سُنا سکے تو یہ جا سُنا
کوئی انتظار میں مر گیا کوئی منتظر ہی جواب کا

یہ عجیب رمز ہے عشق کا کہ کو دیکھ کے کٹ گیا
کہاں روح اسکو سمجھ سکے۔ یہ دماغ ہی تو حباب کا

جو امیدوار ہو وصل کا سہ کہیں بس جہاں میں وہ خوش ہو کیا
کہیں داستاں ہی نیاز کی۔ کہیں تذکرہ ہی عتاب کا

وہ جو مر گئے تر و دامن میں وہیں غرق اپنی خطا لیں
کہ رہینگے شکر ثواب کا نہ گلہ کرینگے عذاب کا

یہی آرزو ہی ملیں اگر تجھے شاد مجلس وعظ میں
کہیں اُٹھنے کا نہیں جھک کہ ہم کہ یہ حال کیا ہی خباب کا

مطلع

سراپا یاس ہوتا جا بسراپا درد ہوتا جا
جہانتک بن پڑے ای جسم لاغر زرد ہوتا جا

غزل

غفلت میں ہوئی اوقات بسر ای عمر گریزاں کچھ نہ کیا
جانیکا وہانکے شوق ہی تھا ۔ جانیکا ساماں کچھ نہ کیا

مانا کہ بڑی سفاک ہو تو ۔ بالفرض بڑی جلاد ہو تو
میں جیتا رہا تا صبح اگر تو ای شب ہجراں کچھ نہ کیا

تکلیف کسیکو گر پہونچی تو اسمیں تکلف کیا نکلا
حیراں رکھا گر قاتل کو ۔ تو دیدۂ حیراں کچھ نہ کیا

کچھ ضبط نہ اپنے کام آیا بات آگئی آخر کہنے میں
سب ہمنے کیا جو ہمسے ہوا ۔ پر تمنے مری جاں کچھ نہ کیا

تربت پہ بلائیگا اُنکو یہ خام خیالی ہے دلکی
وہ گھر میں کریگا کیا آکر جسنے سر میداں کچھ نہ کیا

ای ننگ جہاں ای شادؔ حزیں کچھ شرم بھی اسکی ہو کہ نہیں
ای جہل مرکب ! ای حیواں ۔ ای بیخبر انساں کچھ نہ کیا

غضب ہے یار کا صورت دکھاکے رہجانا
پھر اسکے ناز سے رُخ مسکراکے رہجانا

نصیب حسن نہیں بخت کی ہے کوتاہی
سوالِ وصل کا ہونٹوں تک آکے رہجانا

سوالِ وصل میں جائیگی ایکدن مری جاں
غضب کریگا ترا منہ بناکے رہجانا

دلا بہت نہ الجھ ۔ نامہ برکو کیا میں نے
سکھا دیا تہا کہ جانا تو جاکے رہجانا

یہ جسم شادؔ کسی طرح پاک تو ہوجائے
گلی میں یار کی جانا تو جاکے رہجانا

محبت کرکے ہم بھی بے وفا ہوتے تو کیا ہوتا
بایں ظلم و ستم اور تم خدا ہوتے تو کیا ہوتا

ڈھونڈہوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جسکی حسرت و غم ای ہمنفسو وہ خواب ہیں ہم

ای شوق برا اس وہم کا ہو مکتوب تمام اپنا نہ ہوا
واں چہرے پہ انکے خط نکلا یاں بھولے ہوئے القاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے " آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم "

ہو دلمیں تڑپتے جی بھر کر پر ضعف نے مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا سیماب بھی سیماب ہیں ہم

ای شوق پتا کچھ تو ہی بتا ۔ ابتک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پہولوں نے ای شادؔ یہ کہلا بھیجا ہی
آجاؤ جو تمکو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

فقط

کلام بیان

چند روز ہوئے ایک دوست کی عنایت سے میرا گزر عثمانیہ ریڈنگ روم و لائبریری میں ہوا۔ اسکے سکرٹری نے اپنی عنایت سے تمام کتابیں دکھائیں علاوہ رسمی کتب اُردو فارسی انگریزی کے ان کے پاس ایک مجموعہ اپنے بزرگوں کی قلمی کتب کا بھی ہے جو درحقیقت قابل قدر ہے۔ اسمیں مجھے بیاںؔ کا دیوان بھی ملا میں نے لے دیکھنا شروع کیا چونکہ کلام اچھا تھا اسلئے میں نے چاہا کہ اُردوئے معلی میں جو اُردو زبان کی معقول خدمت کر رہا ہے اور خصوصاً ایسے مضامین کے لئے وقف ہے اسکے متعلق کچھ لکھوں اور کسیقدر اسکا انتخاب کرکے بھیجوں۔ غالباً پسند خاطر ناظرین ہوگا۔

بیاںؔ تخلص ہے۔ نام خواجہ احسن اللہ وطن دہلی ہے مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ چنانچہ دیوان کی پہلی غزل میں لکھتے ہیں ؎

بندے سے ثنا حضرت استاد کی کیا ہو — مظہر ہے خداوند کی وہ شان اتم کا

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

جب سے شاگرد ہوا حضرت مظہر کا بیاں — کیا شاگردی کا اقرار سب اُستادوں نے

کسب باطن حضرت مولانا فخر الدین قدس سرہ کی خدمت میں کیا۔ چنانچہ ان کی شان میں لکھتے ہیں ؎

تجھ سے کوئی چاہتا ہے فیل اور فرس — رکھتا ہے کوئی نعیم عقبے کی ہوس
اے فخر زماں دین بیاںؔ جان جہاں — میں تجھ سے تجھی کو چاہتا ہوں اور بس

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

ہے قبلۂ امید مرا فخر الدین — میں ذرہ و خورشید مرا فخر الدین
اُس جان جہاں پہ مرگ ہے تہمت محض — ہے زندہ جاوید مرا فخر الدین

ایک اور جگہ غزل میں فرماتے ہیں۔

تجھکو کس نام سے اے فخر مری یاد کروں
باپ ہے پیر ہے مرشد ہے خدا ہی کیا ہے

ان کا جو دیوان مجھے ملا وہ بہت مختصر سا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام بہت زیادہ نہیں تہا چنانچہ ایک مثنوی میں جو انہوں نے ایک اعتراض کی تردید میں لکھی ہے اس امر کا خود اعتراف کیا ہے - فرماتے ہیں

یوں سُنا ہے ان دنوں میں ایک جا
ذکر آیا تہا مرے اشعار کا

وہ جو ہیگی ڈیڑہ جز کی کلیات
جمع ہیں جسمیں مرے اکثر نکات

کہتا ہے کہنا اسے قرآن ہے
مختصر وہ جو مرا دیوان ہے - وغیرہ

اسمیں کچہہ شک نہیں کہ دیوان مختصر ہے مگر اکثر اشعار عمدہ ہیں - جسکا اندازہ اس انتخاب سے ہو سکتا ہے جو آیندہ اوراق میں دیا جائے گا -

آخر عمر میں حیدرآباد چلے آئے تہے - نواب نظام علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ کا زمانہ تہا - یہاں ان کی بہت شہرت ہوئی اور اکثر لوگوں نے فخر شاگردی حاصل کیا - معلوم نہیں کہ دربار میں بہی ان کی کچہہ قدر ہوئی یا نہیں - مگر ان کے اس شعر سے حسرت ٹپکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تک انہیں دربار میں رسائی نہیں ہوئی تہی

گر میری خبر پوچہیں بیان حضرت آصف
کہیو اسی کوچے میں بدستور پڑا ہوں

نواب نظام علیخاں بہادر کی تعریف میں ایک دو قصیدے قطعے اور رباعیاں اس دیوان میں موجود ہیں - آخر حیدرآباد ہی میں انتقال کیا - اُنکے ایک شاگرد رای گلاب چند ہمدم نے جو صاحب دیوان گزرے ہیں اُن کی تاریخ وفات میں یہ شعر لکھے ہیں -

ماہ صفر بجمعہ از دہر چوں بیاں رفت
صد نالہ از تہ دل تا اوج آسماں رفت

تاریخ رحلت او ہمدم چو جستم از دل
نالید و گفت ہا الف اُستاد از جہاں رفت

۱۲۱۴

زبان سادہ اور قدیم ہے - مگر کلام میں چاشنی اور شیرینی ہے - دور از قیاس استعارات اور پیچیدہ بندشوں سے کام نہیں لیا - جو کچہ کہا ہے صاف ستہری زبان میں مگر اسی میں ایسے ایسے شعر پیدا کئے ہیں جو نشتر کی طرح اپنا اثر کر جاتے ہیں - چونکہ صاحب باطن تہے اسلئے تصوف کی جہلک بہی پائی جاتی ہے - اور طبیعت پستی کی طرف نہیں جاتی صاف

سیدھی زبان میں بند مضامین کا بیان کرنا اور گرسنے پاتا درحقیقت کمال ہے۔ اور یہی وجہ ہے ان کا کلام استادانہ ہے۔ انکے بعض اشعار میں میر اور درد کی سی گھلاوٹ پائی جاتی ہے گو ان کے کلام کی شہرت نہوئی۔ اور اب تک دفتر گمنامی میں پڑا رہا لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے خون جگر سے اردو کے پودے کو سینچا ہے اُن کی محنت اور کمال کی داد دیجائے۔ اور اگر کہیں کوئی بات کام کی ہو تو وہ نگاہ قدر سے دیکھی اور گوش توجہ سے سُنی جائے۔ رباعیات خصوصًا بہت اچھی لکھی ہیں۔ اور بعضی میں بالکل نیا انداز پیدا کیا ہے۔ قصیدے صرف دو لکھے ہیں ایک منقبت میں دوسرا نواب میر نظام علیخاں بہادر نظام الملک آصف جاہ کی تقریب سالگرہ پر۔ اسی بحر و ردیف و قافیہ میں سودا کا بھی ایک قصیدہ ہے۔ غبار کا قافیہ بیان نے جس طرح سے باندھا ہے سودا کو نصیب نہیں ہوا۔ اور درحقیقت عجب مضمون ہاتھ لگا ہے۔

(بیان) ہے اتفاق جہاں میں عروج کا باعث | فلک کو پہونچے ہے باندھے اگر غبار گرہ

(سودا) فلک کو پہونچے سر گرد باد مجھ دل کا | جو ساتھ آہ کے بخشش کے ہو غبار گرہ

پائدار کے قافیے میں دونوں نے تعلق دل کی گرہ باندھی ہے مگر مضمون متضاد ہیں غالبًا ان کا یہاں لکھنا خالی از لطف نہوگا۔

(بیان) گرہ تو اور بھی دنیا میں ہیں کئی محکم | عجب ہے دل کی تعلق سے کی پائدار گرہ

(سودا) جہاں میں جو ہے گرہ اسکو پائداری ہے | نہیں ہے وابستگی دل کی پائدار گرہ

بیان نے اور دو مرثیے بھی لکھے ہیں۔ لیکن آج کل کے مرثیہ گوئیوں کی طرح نہیں جنھوں نے اسے کمال فن شاعری کے اظہار کا حیلہ بنا رکھا ہے۔ بیان نے جو کچھ لکھا ہے وہ سیدھی سادی اور پُر اثر زبان میں واقعات کو نظم کر دیا ہے۔ چنانچہ انکے ایک مرثئے کا پہلا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

گیا یہ کون دنیا سے نراسا | لیا جنگل میں جا کر کن نے باسا

گلا کاٹا گیا کس کا پیاسا | رسول اللہ کا پیارا نواسا

ادب کہتا ہے تو کچھ مت بیاں کر
محبت بولتی ہے سب عیاں کر

اب میں بیان کے کلام کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

ان سنے ایک حرف مہر سر نہ کیا
تجھ نے میرے کچھ اثر نہ کیا

مت سمجھ بے حواس اے ہمدم
شکوۂ ہجر میں جو سر نہ کیا

اک دم وصل اس میں بھی رنجش
سینے یہ ذکر جہان کر نہ کیا

گو کہ خسرو نے سو بنائے قصر
دل میں شیریں کے ایک گھر نہ کیا

کیا غبار ایکے دل میں تھا کہ بیان
خاک پر بھی مری گزر نہ کیا

سب کچھ بیان سے تب ہم جانینگے ہو سکیگا
جب ہاتھ کو وہ اپنے دنیا سے دھو سکیگا

جس دل کو فرش گل پر آرام تھا نہ اکدم
بستر پہ خار و خس کے وہ کیونکے سو سکیگا

اس راہ عاشقی میں چلنا اسے روا ہے
سر اول قدم پر جو شخص کھو سکے گا

تقلید کر بیان کی رویا تو لہو الدمیں بھی
پر لخت دل مژہ میں کیونکر پرو سکے گا

قفس ہی میں رہائی کے لئے کیا کیا نہیں کرتا
پھڑکتا ہوں تڑپتا ہوں کوئی پروا نہیں کرتا

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید مانی کی مورت ہوئی تو کیا

مت پوچھیو بیان سے کہ تیں کام کیا کیا
پھر آج کا بھی روز کیا شام کیا کیا

یہ حساب دوستاں در دل مثل مشہور ہے
پر عجب ہیں دوست جو دل میں بھی کرتے ہیں حساب

خانہ ویراں کچھ ہم بھی کہتے تھے کہ ہو لیکن بیاں
اب یہی ڈر ہے یہی گھر خانۂ الفت خراب

تو بزم سے اٹھا کہ ہوئی تلخ مے کشی
میں سچ کہوں شراب کو سمجھا حرام آج

خم جسکے پاس ہے وہ فلاطوں سے کم نہیں
جمشید ہے وہ جسکو میسر ہے جام آج

اس زلف میں ہو گر سر مو دسترس مجھے
سمجھوں گا یہ کہ ہاتھ لگا روم شام آج

ہمارا ضعف بصارت ہے مانع دیدار
وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

خدا کے واسطے مت کیو ہر کسے کم ہے
کہ اسکے سنتے ہی ساقی خمار ہے موجود

چمن زمانے کا آنکھوں میں اب کھٹکتا ہے
کہ گل جہاں نظر آتا ہے خار ہے موجود

جہاں ہے مار یہ لازم نہیں کہ ہو واں گنج
جہاں ہے گنج وہاں ایک مار ہے موجود

حال غربت میں دیکھئے کیا ہو
رہ خطرناک اور منزل دور
گو کہ ہے یار تو بدل نزدیک
سیکڑوں کوس مجھسے ہے دل دور
جز خدا آشنا نہیں کوئی
کشتی ٹوٹی ہے اور ساحل دور

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثل خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

گو کہ ناصح کو اعتبار نہیں
دل یہ میرا کچھ اختیار نہیں
وہ نگاہیں جگر میں پیر گئیں
کون سا وار ہے کہ پار نہیں
وقت آنے کا اپنے تو مت پوچھ
مجھکو کس آن انتظار نہیں
ورنہ خفاش چشم کو سب ہے
مہر کس ذرہ میں دوچار نہیں
جھانک ٹک باغ دل میں اپنے بیاںؔ
اس چمن میں بھی کم بہار نہیں

چراغ صبح ہوں یا آفتاب وقت آخر ہوں
کوئی ساعت کا مہماں ہوں کوئی دم کا مسافر ہوں
تمنا بادشاہی کی کسی سفلی کو ہووے گی
میرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہوں
ہوس اسباب آزادی کے سب برباد دیتی ہے
گرفتار علائق اے ہوا میں تیری خاطر ہوں
نہ بتخانے میں ہندو ہے نہ کعبے میں مسلماں ہے
وفا کے آستانے پر مگر اب میں ہی حاضر ہوں
بیاںؔ باطن میں بدتر آپ کو پاتا ہوں حیواں سے
یہ اس کا فضل ہے جو صورت انساں ظاہر ہوں

ڈرتا نہیں مرنے سے کہ رنجور پڑا ہوں
افسوس کہ اُس در سے بہت دور پڑا ہوں
صد حیف کہ دریا کے کنارے رہوں تشنہ
خم پاس اور افسوس کہ مخمور پڑا ہوں
خورشید سر شام ہوں یا شمع سحرگاہ
میں دوری میں اُس ماہ کے بے نور پڑا ہوں
گر میری خبر پوچھیں بیاںؔ حضرت آصف
کہیو اُسی کوچے میں بدستور پڑا ہوں

تم ہمکو دیکھتے ہو ہم تمکو گھورتے ہیں
سنے حرف و سنے حکایت گویا کہ مورتیں ہیں
اب یار کی گلی میں یہ شغل رہ گیا ہے
آتے بسورتے ہیں جاتے بسورتے ہیں

عالم ہیں سینے یا سفینے میں
یاں سفینے میں ہے نہ سینے میں

کہتا ہے کون ہجر مجھے صبح و شام ہو
پر وصل میں بھی لطف نہیں جو مدام ہو

ہرچند سبز ہے گل بہتر گلزار ربت تحفہ	دل اٹکے اگر اپنا تو خار ربت تحفہ
بوسے کے نام ہی پہ سے لگے کاٹنے زباں	کتنی عمل سے آگے مکافات بڑھ گئی
کوئی ایسا جہاں میں سے نکلے	کہ درست امتحاں میں نکلے
سو برس میں نہ نکلے دل کی خلش	اور نکلے تو آن میں نکلے
کچھ یہ لازم نہیں کہ جنس عزیز	مصر ہی کی دکان میں نکلے
گر کوئی ہووے مستعد ہو رہا	یوسف اس کارواں میں نکلے
رسوا نہ کر خدا سے ڈرا ای چشم تر مجھے	آتا ہے اوسکی بزم میں بار دگر مجھے
میں سست گام قافلہ عمر تیز رو	تنہا نہ چھوڑ جائیں کہیں ہمسفر مجھے
ساقی تری نگاہ کے صدقے میں ایکبار	دونو جہاں کی فکر سے کر بیخبر مجھے
جتنا ستم کرے وہ اٹھاؤنگا میں	اوسکی عوض میں حق نے دیا ہے جگر مجھے
جادو تھی سحر تھی بلا تھی	ظالم یہ تیری نگاہ کیا تھی
کہیہ ہر ہے کہاں ہی خوشدلی تو	جیسے ہی کبھو تو آشنا تھی
شیریں بھی تمھی سی تھی ستمگر	لیلی بھی اگرچہ بیوفا تھی
فرہاد پر اسقدر نہ تھا ظلم	مجنوں پہ نہ یہ غضب جفا تھی
مارا ہے بیان کو جن ادای شوخ	کیا جانئے کونسی ادا تھی
کون کہتا ہے چاہ مشکل ہے	لیکن اوسکا نباہ مشکل ہے
ترک مشکل نباہ مشکل ہے	سخت کافر یہ چاہ مشکل ہے
صلح اور جنگ تجھکو سب آسان	مجھکو ہر طرح آہ مشکل ہے
حال میرا نہ پوچھ عشق میں تو	گاہ آسان و گاہ مشکل ہے
کوئی سمجھائیو یارو مرا محبوب جاتا ہے	مرا مقصود جاتا ہے مرا مطلوب جاتا ہے
مبارک ماہ کنعاں ای زلیخا چشم ما روشن	بس اتنی بات کہنے مصر میں یعقوب جاتا ہے
جو گل کے قفس میں خبر جائیگی	تو کیا سن کے بلبل نہ مرجائیگی
نہیں آہ کرتا میں اے ہمنشیں	جو سینے تو کیا بے اثر جائیگی

سلگتی ہے اک آگ مدت سے یاں
اس آتش کی گرمی کدہر جائیگی

ق بیان کا یہ پیغام لیجائیو
صبا اوسکے کوچے میں گر جائیگی

جو ہم بن تمہاری گذرتی ہے خوش
ہماری بھی تم بن گذر جائیگی

میں جانتا تہا وصل کی شب بھی دراز ہے
آنکھیں جو کھل گئیں تو در صبح باز ہے

میری محنت پہ تین نگاہ نہ کی
کبھو جھوٹی بھی واہ واہ نہ کی

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ
دل میں اُس شوخ کے تو راہ نہ کی

اسی امید و بیم میں گذرے
نگاہ کی اُن نے پہر نگاہ نہ کی

آفریں صبر کو بیان تیرے
مرگیا ضبط سے پر آہ نہ کی

بت خود کام چلا جاتا ہے
صبر و آرام چلا جاتا ہے

کس کے مکھڑے سے خجل ہو خورشید
سر نگوں شام چلا جاتا ہے

عمل نیک سدا رہتا ہے
جم نہیں جام چلا جاتا ہے

ہے کدہر قیس کہاں ہے فرہاد
عشق سے نام چلا جاتا ہے

عشق میں صبر کی دولت سے بیان
بارے کچہ کام چلا جاتا ہے

مجہے غم سے اسواسطے پیار ہے
کہ میرے برے وقت کا یار ہے

کہاں یاں سے لیجاؤں میں جنس دل
جہاں ہے تہی از خریدار ہے

مری ناؤ پہونچی ہے آ منجدہار
تری اک توجہ سے بس پار ہے

ق سر یار سے کوئی اتنا کہو
کہ ظالم بیان سخت بیمار ہے

خبر لے شتابی کہ مرتا ہے اب
پہر آوے نہ آوے وہ مختار ہے

بہار آئی ہے اے ناصح ہمیں بیباک رہنے دے
ہماری طور پہ ہمکو گریبان چاک رہنے دے

ہزاروں قصر جنت کی برابر میں سمجہتا ہوں
اگر گردون دوں آسودہ زیر خاک رہنے دے

فرشتوں کی عبادت کا مصلے ہے مراد امن
اگر آلودگی دنیا کی اُسکو پاک رہنے دے

جسواسطے آئے ہیں وہ کام تو کچہ کر لے
آغاز اگر کہو یا انجام تو کچہ کر لے

روزانہ رہے غافل سمجہتا نہیں کیا حاصل
گو صبح سے تہی غافل اب شام تو کچہ کر لے

با زو بیٹے افلاطون یا عقل کو کہو مجنون   دنیا میں بہر مضمون اک نام تو کچھ کرے
آیا وہ مہ تاباں جاں ہمنے کری قربان   جب آوے کوئی مہمان اکرام تو کچھ کرے

اپنے دہان میں گھر کر چکا ہے   اشک کے قطروں میں اثر چکا ہے
پائے طلب کھینچ کے بیٹھوں کہاں   خانہ نشینی کو بھی گھر چکا ہے
دام میں جو شخص کہ اپنے پھنسے   اوسکی کبھو لینی خبر چکا ہے
دل ہے تجھے جیسا کہ خدا نے دیا   مجھکو بھی ویسا ہی جگر چکا ہے
بس ہے بیان حسرت دیدار اور   کیا ہے تجھے اب خاک بسر چکا ہے

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے   یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

جھگڑتے تجھسے پیار سے حجاب آتا ہی   وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے

خدا تجھے مری آغوش سے جدا نہ کرے   یہ بات کہتے بھی ڈرے ہے دل خدا نہ کرے

میں نہ اب تک اے بت محبوب سمجھتا تھا تجھے   خوب سمجھا تھا تجھے کیا خوب سمجھا تھا تجھے
دل میں اپنے غور کرتا ہوں ترا شیوہ دیکھ   کیا سمجھکر طبع نے مرغوب سمجھا تھا تجھے
غالب آنا عشق کا ای عقل اب کیا ہی عجب   میں تو پہلے روز ہی مغلوب سمجھا تھا تجھے

کہا تھا ساربان کے کان میں لیلی نے آہستہ   کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

رباعیات

لوٹا خاروں نے باغ آل احمد   آشفتہ کیا دماغ آل احمد
ہو صبح کبھو نہ شام غم کی اوسکے   گل جن نے کیا چراغ آل احمد

کیا ظلم بیان وہ تندخو کرتا ہے   رسوا جو اوسکو کوبکو کرتا ہے
کہتے ہے تجھے کمبخت نہیں آتی شرم   یہ کسکی شکایت ہے جو تو کرتا ہے

در تعریف خضاب عالمگیر بادشاہ گذرانید

اے قبلۂ آفاق شہ والاجاہ   کیا خوب ہوا خضاب کرنا باللہ
میں روئے مقدس کو کہا تھا کعبہ   بس چاہئے ہو لباس کعبی کا سیاہ

"عبد الحق"

علم الحیل

علم الحیل سے ہماری مراد میکانیکس سے ہے اور ہم اس مضمون میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں آلات سازی کو کس قدر فروغ تھا، بزرگان قوم کس انہماک اور مصروفیت سے ادھر متوجہ تھے اور مسلمانوں نے کیا کیا چیزیں ایجاد کی تھیں۔ اہل عرب عموماً فن میکانیکس کو علم الحیل اور کبھی علم المحرکات بھی کہتے ہیں۔ ہم نے بھی انہیں کے اتباع میں اس سبجکٹ کو، جو شاید کئی نمبر میں ختم ہوگا، عنوان مذکور سے شروع کیا ہے۔

مسلمانوں کے فضل و کمال کا افسانہ اس دور جاہلیت میں بیان کرنا شاید بے موقع ہوگا، اور ایسی حالت میں کہ بقول موسیو سڈلی[1] "ترقی یافتہ دنیا میں اگر مسلمانوں کو پہچاننا چاہو تو ان کے طبعی جہل و توحش سے پہچان لو۔" آجکل قوم کی مایہ الامتیاز صفت بے علمی رہ گئی ہو، بزرگوں کے کمالات پر فخر کرنا استخوان فروشی سے زیادہ نہیں، لیکن تمام دنیا یہ تسلیم کر چکی ہے کہ قوم کے لئے یہی باتیں تازیانۂ عبرت ہیں اور اگر غفلت دور ہو سکتی ہے تو اسی طریقہ سے کہ ہر فرد کے دل میں ذہن نشین ہو جائے کہ ہم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ہماری موجودہ حالت ضرور قابل رحم ہے اور ایسی حالت میں کہ قوم کا غالب حصہ علم سے بے بہرہ ہے، یہ دکھانا کہ قدمائے اسلام میں علم ہی نہیں عمل کی صفت بھی تھی، قوم کے چہرہ پر کسی طرح نہیں پھبتا، لیکن اس قسم کی تحریکیں بسا اوقات مفید ہی ثابت ہوئی ہیں۔ اور میرے خیال میں اس طرز کی جتنی کوششیں اہل ملک کے تنبہ کے لئے کی جائیں بے سود نہیں۔

عام طور سے یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے علم میں جس قدر ترقی کی عملی پہلو اسی قدر ضعیف ہوتا گیا اور تخییل میں اتنا منہمک ہوئے کہ صنعت آلات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ ممکن ہے یہ رائے ایک حد تک صحیح ہو لیکن کلیۃً جو نتائج اس سے نکالے جاتے ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں۔ تاریخ ہم کو بتا رہی ہے کہ مسلمانوں میں میکانیکس کا خاصہ رواج تھا اور امویوں اور عباسیوں کے عہد میں بہت سے مسلمان

[1] موسیو سڈلی فرانس کا ایک مستشرق ہے۔ بالفعل اس کے ایک مضمون کا ترجمہ تونس کے مشہور اخبار "الصواب" میں بعنوان "علم الفلک فی الاسلام" شائع ہو رہا ہے۔ ۱۲

اس شعبہ میں باکمال مشہور تھے، اور صرف علم ہی نہیں عملی پہلو اسقدر قوی و مستحکم تھا کہ سیڈری جنبر ٹوس عربس[1] کا فرنچ مصنف مسلمانوں کی ایجادات و اختراعات کی گوناگونی دیکھکر اسقدر متحیر ہوا کہ اُسنے مکانیکل آلات کی ایجاد کو مسلمانوں کا ایک قومی خاصہ سمجھکر خیال کیا کہ اس بدیہی بات کا تذکرہ ہی غیر ضروری ہے۔

علامہ ابن الندیم نے صنعت سازوں کی جو فہرست دی ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن یعقوب رقاص علی بن سعید الاقلیدسی، احمد بن علی بن عیسی (یہ شخص خود ابن الندیم سے قریب العہد تہا) محمد بن الحسن (یہ شخص آلات سازی میں بڑا ماہر تہا۔ اس فن میں اُسنے کتابیں بھی لکھی تہیں جن میں ایک "صنعۃ البنادق" کا تذکرہ کتاب الفہرست میں بھی ہے) وغیرہ اکثر نامورانِ اسلام مکانیکس میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور ۳۷۷ھ تک، جب کہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست لکھی ہے، یہ فن غیر معمولی فروغ پر تہا۔ سرسری طور پر اسکا یوں بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے غلام بھی صناع، مخترع، اور موجد گزرے ہیں، اور تم کو یہ دیکھکر تعجب ہوگا کہ خفیف، ابن اسلام، شجاع، علی بن احمد المہندس، جابر بن سنان الحرانی ابن قرہ، سنان بن جابر، فراس بن حسن، حامد بن علی اور ابن خبیہ، جن کے نام صناعوں کی فہرست میں پیش کئے جاتے ہیں، یہ سب مختلف مسلمان خاندانوں کے غلام تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کا کیا سلوک تہا اور کس درجہ تک اونکو تعلیم دیجاتی تہی۔

اس سے زیادہ حیرت اسوقت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آلات کی ایجاد میں سلمان عورتیں بھی مردوں سے کچھ کم مشہور نہ تہیں۔ علامہ ابن الندیم نے صفحہ ۲۸۵ میں بضمن تذکرہ آلات جن صناعوں اور موجدوں کی فہرست دی ہے، اُن میں "سیدہ عجلیہ" نامے ایک مسلمان خاتون کا نام بھی مذکور ہے جو اُس زمانہ کی مشہور صناعہ تہی۔ آلات کے متعلق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہر حران واقع شام میں بنتے تھے اور پھر وہیں سے تمام پہیلے۔ سلطنت عباسیہ میں اس کو بہت ترقی ہوئی یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مامون الرشید سے پیشتر مسلمانوں میں آلات سازی کا زیادہ

[1] [best guess; rotated handwritten margin note, largely illegible:] ... جلد دوم صفحہ ۲۶۹ ... کتاب ... اور ... کی عبارت ... سے ... علی بن یعقوب ... المقتطف ... لاحظہ ...

رواج نہ تھا۔ مامون الرشید کو جب رصدگاہ بنوانے کی ضرورت ہوئی تو الحج تا میں ایک شخص نے آلہ ذات الحلق بنایا جو ابن الندیم کے وقت تک بغداد میں موجود تھا۔ ابن الندیم کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

کانت آلالات تعمل بمدینۃ حران ومن ثمہ تشتت وظہرت ولکنہا زادت واتسع اللصناع العمل فی الدولۃ العباسیۃ منذ ایام المامون الی وقتنا ھذا فان المامون لما اراد الرصد تقدم الی ابن خلف المرو روذی فعمل لہ ذات الحلق وھی بعینہا عند بعض علماء بلدنا ھذا وقد عمل المرو روذی الاسطرلاب[۱]	آلات شہر حران میں بنا کرتے تھے اور یہیں سے پھیلے اور بڑھے۔ سلطنت عباسیہ میں خلیفہ مامون کے زمانہ سے صناعوں کا کام ترقی کر گیا اور اب تک ترقی پر ہے۔ مامون نے جب رصدگاہ بنوانی چاہی تو ابن خلف نے آلہ ذات الحلق طیار کیا جو جیسا ہمارے اسی شہر (بغداد) کے ایک عالم کے پاس موجود ہے۔ انہیں ابن خلف نے اسطرلاب بھی بنایا تھا۔

ابن الندیم کے آخری جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اسطرلاب کے پہلے بانی ابن خلف ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شرف کے مستحق ابراہیم فزاری ہیں، چنانچہ خود ابن الندیم نے بھی ایک مقام پر تصریح کر دی ہے۔

الفزاری وھو ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب الفزاری من ولد سمرۃ بن جندب وھو اول من عمل فی الاسلام اسطرلابا[۲]	فزاری کا نام ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب فزاری تھا سمرہ بن جندب کی اولاد میں تھے۔ اسلام میں اسطرلاب کے پہلے بانی یہی ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اسطرلاب ابراہیم فزاری یا اور کسی مسلمان کی ایجاد ہے اسطرلاب اسلام کے بہت پیشتر ایجاد ہو چکا تھا۔ پہلے مسطح بنا کرتا تھا (اسطرلاب مسطح کا موجد بقول ابن الندیم ابیون بطریق تھا) اور پھر اسلام میں حلقہ دار بننے لگا۔ اس اصلاح کی اختراع البتہ مسلمانوں نے کی اور کچھ تعجب نہیں کہ اس اصلاح کے موجب ابراہیم فزاری ہوں، کیونکہ اسلام میں اسطرلاب سازی کی ابتدا انہیں سے ہوئی اور خود انہوں نے اسطرلاب حلقہ دار بنانے کی ترکیب میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، جسکا تذکرہ ابن الندیم نے بھی کیا ہے۔ اسکے علاوہ ابراہیم فزاری آلہ مسطح و مسطح کے بھی

[۱] ابن الندیم بغدادی صفحہ ۲۸۴ [۲] ابن الندیم صفحہ ۲۷۳

موجد ہیں۔

ذیل کی جدول میں ہم چند مشہور مسلمان موجدوں اور صناعوں کی مختصر سی فہرست دیتے ہیں، یہ نقشہ کسی خاص کتاب سے ماخوذ نہیں اور نہ کسی خاص کتاب میں مکانیکس کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ مثلاً کتاب الفہرست کے جابجا مقامات میں (صفحہ ۲۷۱ سے صفحہ ۲۸۵ تک) بعض باتیں ملجاتی ہیں۔ کتاب المحاضرات (صفحہ ۳۷) میں ایک ضمنی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دور سے باہم گفتگو کرنے اور ایک دوسرے کی بات سن لینے کے لئے ایک آلہ (ٹیلیفون) ایجاد ہوا تھا اور "شُترہ"، اسکا نام تھا، لیکن نہ تو آلہ کی ہیأت ترکیبی معلوم ہوتی اور نہ یہ پتا چلتا ہے کہ کس عہد میں ایجاد ہوا اور کس نے ایجاد کیا تھا۔ نقشہ موعودہ درج ذیل ہے۔

نام	کیفیت
ابن ابی عباد	مشہور صناع تھا۔ آلہ ذات الشعبتین کی ترکیب میں ایک کتاب لکھی تھی اور ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جس سے دور کی چیزوں کا فاصلہ دریافت ہوسکے۔
ابو علی الحسین بن محمد	گھڑی ساز تھا اور گھڑی سازی کے فن میں ایک کتاب بھی بنام "کتاب علم الساعات" لکھی تھی۔ مختلف ترکیب کی گھڑیاں بنائی تھیں اور گھڑی کے اکثر پرزے اسکی ایجاد ہیں
محمد بن الحسن	گولہ کا موجد ہے اور گولہ چلانے کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ وہ گولہ کو "بُندق" لکھتا ہے اور اسکی جمع "بنادق" لاتا ہے۔ ناظرین کو اس سے بندوق کا دھوکا نہو۔ کیونکہ اُس زمانہ تک بندوق ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ بندق فارسی لفظ "بُندہ" کا معرب ہے۔ گولہ اور گولی دونوں کو بندق کہسکتے ہیں اور بعض اوقات میں غلہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
حکیم مورطس	کئی قسم کے باجوں کا موجد ہے۔ ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس سے ۶۰ میل فاصلہ کی آواز سنائی دیتی تھی اس آلہ کی ترکیب میں اسکی ایک کتاب بھی ہے۔

ابوالحسین	مقیاس سازی میں اسکو خاص دستگاہ تھی - ایک کتاب اس سبجکٹ پر تصنیف کی تھی کہ وہ کونسا طریقہ ہی جس سے بغیر ارتفاع آفتاب دریافت کئے وقت معلوم ہو سکے - گھڑی سازی کی ابتدا اسی وقت سے سمجھنی چاہئے -
ابراہیم فزاری	اسطرلاب حلقہ دار کا موجد ہے اور زوال آفتاب کی ایک مقیاس بنائی تھی - آلۂ مُبطح و مُسطح اُس سے منسوب ہے -
ابن خلف -	مرورود (ایران میں مرو کے نام سے دو شہر مشہور ہیں - مرورود اور مرو شاہجہان) کا باشندہ تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود اور اُسکے غلام اور غلاموں کے غلام سب کے سب موجد و صناع تھے علی بن عیسی خود ابن خلف کا غلام تھا - اور خفیف و احمد و محمد یہ تینوں علی بن عیسی کے غلام تھے - خفیف کا غلام علی بن احمد المہندس تھا اور اُسکا غلام ابوالربیع حامد بن علی - غلاموں کا یہ خاندان فن مکانیکس میں نہایت سربرآوردہ تھا اور یہ سب باکمال صاحب فن تھے -
بنی موسی	موسی بن شاکر کے بیٹے محمد و احمد و حسن مختلف علوم و فنون کی جامعیت کے ساتھ مکانیکس میں بھی صاحب فن اور مجتہد تھے - مورخین اُن کی ایجادات کو عموماً "حیل بنی موسی" لکھتے ہیں اور اس فن میں اُن کی کتابوں کے مجموعہ کا بھی یہی نام ہے - فرسطون بھی انہیں بزرگوں کی یادگار ہے -
ابوالفضل دمشقی	یہ نامور مہندس فن طبابت و انجینرنگ میں سربرآوردہ تھا اور در اصل یہی چیزیں اُسکی شہرت کا باعث ہوئیں، لیکن مکانیکس میں بھی اوسکی طبیعت موزوں واقع ہوئی تھی اور اس فن کی ایک خاص شاخ (نجاری) میں وہ خوب ماہر تھا - جامع اموی

	کی گھڑیاں اور بیمارستان کبیر (شفاخانہ واقع دمشق) اوسکی اصلاحات کو کبھی نہ بھولینگے۔
سید فتح اللہ شیرازی	یہ شخص دور اکبری کا فلاسفر تھا۔ ایجاد و اختراع کیطرف طبیعت بہت مائل تھی۔ ایک چکی بنائی تھی۔ جو آپسے آپ چلتی تھی اور خود بخود اسمیں آٹا پستا تھا۔ ایک خاص وضع کا آئینہ طیار کیا تھا جسمیں دور و نزدیک دونوں سے برابر عجیب و غریب طرح کی شکلیں نظر آتی تھیں۔ آلات حرب میں ایک قسم کی بندوق اوسکی یادگار ہے جو ایک گردش میں بارہ فیر کرتی ہے۔

گھڑی کے موجد بھی بقول مشہور مسلمان ہیں اور اسلام نے اکثر ناموروں کو ساعاتی کا لقب دیا ہے۔ ہارون الرشید نے شارلمین بادشاہ فرانس کے پاس جو گھڑی تحفہ میں بھیجی تھی، مورخین یورپ سے اسکا حال مخفی نہیں۔ جامع دمشق میں جو عجیب و غریب گھڑی تھی ابن جبیر اندلسی نے اسکا تذکرہ اپنے سفرنامہ (مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۷۱ و ۲۷۲) میں تفصیل سے کیا ہے۔ مدرسہ مستنصریہ کی آفتابی گھڑی کے حالات آثار البلاد (مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۱۱) میں مذکور ہیں۔ اور ایک گھڑی پر منحصر نہیں مسلمانوں نے سیکڑوں ہزاروں چیزیں ایجاد کی تھیں جن کے تذکرے مختلف کتابوں میں ملتے ہیں سلطان عبد المومن بن علی فرمانروائی مراکش نے جو کل کا صندوق بنوایا تھا مقری (مطبوعہ یورپ صفحہ ۴۰۵) نے اُس کی کیفیت لکھی ہے انشاء اللہ ہم اس عنوان پر کسی آیندہ نمبر میں ایک مبسوط آرٹیکل پیش کرینگے اور کسیقدر تفصیل سے دکھاینگے کہ اسلام میں کیا کیا آلات ایجاد ہوئے اور وہ کس اہمیت کے تھے۔ اس مضمون کو اُس آرٹیکل کی ضمیر قبل الذکر سمجھنی چاہیے۔

خادم قوم۔ عبد اللہ عمادی

آنریبل مسٹر گوپال کرشن گوکھلے (صدر انجمن کانگرس بنارس)

ہندوستان کے عام و خاص میں آج جو شہرت مسٹر گوکھلے کو حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ انکی ہر دلعزیزی کا اسوقت کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اگرچہ ملک میں اور بزرگان

قوم ہی موجود ہیں۔ جنکا اقتدار و اثر مسٹر گوکھلے سے بڑھا ہوا ہے مگر اندنوں مسٹر گوکھلے کو ان کی کونسل کی تقریروں اور ولایت کی کارگزاریوں نے وہ شہرت دی ہے کہ انکا نام زبان زد خاص و عام ہوگیا ہے۔ اسلئے اکثر لوگ ان کے حالات جاننے کے مشتاق ہیں پس بیجا نہوگی اگر ایک سرسری نظر انکی زندگی پر ڈالی جاسکے۔ ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسٹر موصوف نے قوم اور ملک کے لئے کسقدر ایثار نفس اختیار کیا اور اپنی ذاتی فوائد سے یک قلم چشم پوشی کر کے اپنی زندگی قوم کے لئے وقف کر دی۔ ممدوح جیسی سادی اور بے ریا زندگی بسر کرتے ہیں اسکا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو آپکے ساتھ رہتے ہیں۔ مگر عام حالات بھی انکے ایسے ہیں کہ انسے ملک کے نوجوانوں کے دلوں میں ایک جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ اور وہ اس امر کا یقین کر سکتے ہیں کہ اس پست اور خستہ حالت میں بھی ملک اپنے سچے بہی خواہوں کا قدرشناس اور حق گذار ہے۔ اور اگر انہوں نے سچے دل سے کچھ خدمت ملک کی کی تو وہ رائگاں نجائیگی۔

مسٹر گوکھلے کی والدین ادنی حیثیت کی شخص تھے ۱۸۶۶ء میں وہ کوتاپور میں پیدا ہوئے اور انٹرنس کلاس تک وہیں تعلیم پائی اسکے بعد الفنسٹن کالج بمبئی میں بی اے ہوئے انکی کالج کی زندگی بہت کامیاب رہی اور خاصکر ریاضی میں انہوں نے بڑی قابلیت دکھائی۔ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ مسٹر گوکھلے چند نمبروں کی کمی کے باعث اول درجہ میں بی اے پاس ہونے سے رہ گئے اگر وہ اول درجہ میں پاس ہو جاتے تو گورنمنٹ اسکالرشپ انکو ملتا اور پھر انکی زندگی اور ہی طرح کی ہوتی۔

اسکالرشپ سے ناامید ہو کر وہ پونا گئے تاکہ انجنیری کالج میں داخل ہوں مگر چونکہ دیر کر کے پہنچے تھے اسلئے وہاں بھی داخل نہ ہوسکے۔ اس سے بھی مایوس ہو کر انہوں نے نیو انگلش اسکول پونا میں نوکری کر لی۔ یہی اسکول اسوقت فرگوسن کالج ہے جسوقت مسٹر گوکھلے اسکول میں شامل ہوئے تھے۔ وہاں مسٹر تلک۔ مسٹر آگرکار۔ مسٹر نامجوشی ایسے سرگرم لوگ موجود تھے اور ان لوگوں نے عہد کیا تھا کہ [illegible]

ارزاں تعلیم پھیلانے میں اپنی زندگی صرف کردینگے - جسوقت مسٹر گوکھلے اس اسکول میں شامل ہوئے انکا قصد اس گروہ میں داخل ہونے کی نسبت قائم نہیں ہوا تھا مگر بالآخر انھوں نے بھی عہد کرلیا کہ ۷۵ ماہوار پر بیس برس تک کالج کی خدمت کرینگے اور بعد کو پچیس ۲۵ ماہوار پنشن لینگے - مسٹر گوکھلے نے یہ عزم ۱۸۸۴ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۸ برس کی تھی کیا تھا جسوقت اکثر نوجوانوں کے دلوں میں بڑے بڑے خیالات ہوتے ہیں اور آئندہ کی امیدیں انکے دلوں میں بہت زور کے ساتھ موجزن ہوتی ہیں - مسٹر گوکھلے بھی اس کشمکش سے مستثنیٰ نہ تھے انکے والد کا تو بچپن ہی میں انتقال ہوگیا مگر انکے بڑے بھائی زندہ ہیں اور وہ مسٹر گوکھلے سے نہ صرف نام و شہرت بلکہ مال و دولت کی توقع رکھتے تھے - اور ان کی والدہ کو بھی کچھ کم امیدیں نہ تھیں لیکن آخر ملک کا خیال ذاتیات پر غالب آیا اور کالج میں داخل ہوتے ہی پروفیسر گوکھلے نے یہ کوشش شروع کی کہ کسیطرح کالج کی عمارت وغیرہ مکمل کیجائے - فنڈ جمع کرنیکے لئے تین برس تک انہوں نے ملک دکن میں مسلسل دورہ کیا اور پروفیسر گوکھلے اور دوسرے بہی خواہوں کی کوشش سے دو لاکھ روپیے جمع ہوئے اور کالج کی عالیشان عمارت میدان کرکی میں تیار کی گئی - اس انسٹیٹیوشن کی نسبت لارڈ سینڈہرسٹ نے فرمایا کہ "یہ خیال کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان لوگ ایک باہمت اور بیغرضانہ کام میں اس سے بھی زیادہ کچھ کرسکتے ہیں جو اس انسٹیٹیوشن کے لائف ممبروں نے کیا ہے" - بعد ازاں لارڈ نارتھکوٹ نے کہا کہ میں اس کہنے پر مجبور ہوں کہ جب کوئی شخص یہ سنتا ہے کہ اعلیٰ قابلیت کے لوگوں نے بلا معاوضہ اپنی زندگی نیک کام کے واسطے وقف کردی ہے، تو وہ انکے حب الوطنی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہسکتا"

اگر اس بے غرض اور بے لوث گروہ میں شامل ہونا پروفیسر گوکھلے کی خوش نصیبی تھی تو اس سے زیادہ انکی خوش نصیبی یہ تھی کہ اوائل عمر میں مہادیو گوبند راناڈے کے سے اعلیٰ خیال اور محب وطن شخص کا اثر ان پر پڑا - ۱۸۸۵ء میں مسٹر راناڈے کو پونا کی

سروجنک سبھا کے اخبار کے لئے ایک لائق اڈیٹر کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے مسٹر گوکھلے کو جن کی عمر اسوقت ۲۲ برس سے متجاوز نہ تھی اس کام کے لئے منتخب کیا اور اسوقت ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ راناڈے نے کیسے شخص کو منتخب کیا تھا - خود پروفیسر گوکھلے کہا کرتے ہیں کہ راناڈے کی ۱۲ برس کی شاگردی میں مجھے لاتعداد فوائد حاصل ہوئے راناڈے نے انہیں ہندوستان کی مالی اور ملکی حالات کے سمجھنے میں ہر طرح مدد دی۔ اور بہت سی گورنمنٹ رپورٹوں اور بلو بکس کے خلاصے ان سے لکھوائے، آٹھ برس پروفیسر گوکھلے نے راناڈے کی سرپرستی میں اخبار کا کام انجام دیا اور ملک پر اپنی اعلیٰ قابلیت اور دوراندیشی اور معاملہ فہمی کا سکہ بٹھا دیا اہل ملک نے ان پر یہاں تک اعتماد کیا کہ لارڈ ویلبی کی کمیشن کے روبرو ملک کے دقیق مالی مسائل پر رائے دینے کے لئے پروفیسر گوکھلے، بابو سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر ڈی - ای - واچا اور مسٹر سبرامنیا آئیر کے ہمراہ ۱۸۹۷ء میں انگلستان روانہ کیا جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ انہوں نے کمیشن کے روبرو اظہار دئے اسکی تمام ممبران کمیشن نے تعریف کی جنمیں مسٹر ایل کورٹنی کا سا ہمہ داں اور واقف کار شخص بھی شامل تھا - کمیشن کے کام سے فراغت پاکر مسٹر گوکھلے نے لندن اور دوسرے مقامات پر ہندوستان کی حالات پر لکچر دینے شروع کئے جنکی تمام اطراف سے تعریف ہوئی - جسوقت وہ انگلستان سے روانہ ہونے والے تھے اسوقت پونا میں دو انگریزوں کے مارے جانیکا واقعہ پیش آیا - اور تمام انگلستان میں ایک اشتعال پیدا ہو گیا - لارڈ سینڈ ہرسٹ کے انتظام طاعون کی نسبت تمام بمبئی میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور پروفیسر گوکھلے کے نام خطوط کا تانتا بندھا ہوا تھا انہوں نے لوگوں کے اصرار سے انہیں خطوط کی بنا پر گورنمنٹ کے تشدد کے واقعات بیان کئے اور اہل ملک کے ذمے سے الزام کو اٹھانا چاہا۔ لارڈ جارج ہملٹن نے اسکی تردید کی - اور بمبئی گورنمنٹ نے مصمم ارادہ کیا کہ پروفیسر گوکھلے جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لئے جائیں - پروفیسر گوکھلے ابھی عدن بھی نہ آنے پائے تھے کہ لوگوں کے خطوط پہنچ چکے تھے کہ ہماری خط و کتابت کا حوالہ

ندیا جائے پس پروفیسر گوکھلے نے گورنمنٹ سے معذرت کی اور گورنمنٹ نے اُسے منظور کیا۔ اکثر لوگوں نے انہیں کمزور طبیعت بتایا مگر آنا ڈے نے اسکی تسکین کی اور کہا کہ بجائے کمزوری کے یہ واقعہ انکی دلیری اور استقلال کی شہادت دیگا چنانچہ بعد میں لوگوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اسوقت پروفیسر گوکھلے نے اپنی ذاتی بدنامی کو گوارا کرکے کتنے لوگوں کو مشکلات میں پھنسنے سے بچایا۔ ہندوستان پہنچکر اُنہوں نے طاعون کے انتظامات میں اپنی مستعدی سے گورنمنٹ کو ایسی مدد دی کہ سرکار لارڈ سینڈہرسٹ کو بھی اسکا اعتراف کرنا پڑا۔

مسٹر گوکھلے کی واقفیت اور کارگزاری نے انہیں بمبئی کونسل کا ممبر بنایا اور بمبئی کونسل میں قانون آراضی پر جو تقریریں اور مباحثے انکے ہوئے اُسنے اُنکی وقعت اور عظمت اور بھی بڑھادی یہانتک کہ غیر سرکاری ممبروں نے انہیں اپنی جانب سے وائسرائے کی کونسل کا ممبر منتخب کیا۔ وائسرائے کی کونسل میں جس شد ومد کی تقریریں اُن کی بجٹ کے موقع پر ہوتی رہتی ہیں اور یونیورسٹی بل اور قانون رازداری پر جیسے مباحثے اُنہوں نے کئے وہ ابھی لوگوں کی یاد میں تازہ ہیں۔ چنانچہ ان کی اس غیر معمولی لیاقت اور ہمدردی ملک کو دیکھکر گورنمنٹ نے بھی اُنہیں خطاب سی-آئی-ای سے سرفراز فرمایا۔ آجکل مسٹر گوکھلے بحیثیت ڈیلیگیٹ کانگرس ولایت میں تشریف رکھتے ہیں۔ جس تاریخ سے وہ وہاں پہنچے ہیں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ دو ایک تقریریں وہ نہ کرتے ہوں۔ اور جہاں وہ جاتے ہیں ہندوستان کی طرف سے عمدہ خیالات چھوڑتے ہیں۔ بہت سے امیدواران پارلیمنٹ سے یہ اقرار لینے میں اُنہیں کامیابی ہوئی ہے کہ آیندہ پارلیمنٹ میں وہ ہندوستان کے مسائل پر پوری توجہ کرینگے چنانچہ ممکن ہے کہ ان کوششوں سے ہندوستان کو بھلے دن دیکھنے نصیب ہوں۔

پروفیسر گوکھلے آخر نومبر میں انگلستان سے روانہ ہو گئے ہیں تاکہ آیندہ کانگرس

بنارس کے پریسیڈنٹ ہوسکیں - اس سال کی کانگرس کے لئے پروفیسر گوکھلے سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا تھا - اور ان کی اعلیٰ خدمات کی قدردانی اس سے بہتر صورت میں نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ آیندہ کانگرس کے پریسیڈنٹ بنائے جائیں - یہ خبر تمام ملک میں مسرت کے ساتھ سُنی گئی ہے اور لوگ نہایت اشتیاق کیساتھ ہنے آیندہ پریسیڈنٹ کے ایڈرس سننے کے لئے بیتاب ہیں - امید ہے کہ انکا یہ ایڈرس بھی ایسا ہی بے مثل ہوگا جیسی ان کی اکثر تقریریں اب تک ہوئی ہیں - فقط

دارالسلطنت فرانس کی سیر (۳) ماخوذ قبل

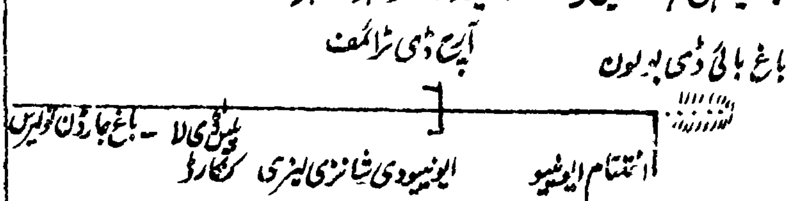
دوسری صبح ہم نے دو بہت عمدہ اور دلچسپ عجائب خانے دیکھے - ایک کا نام میوزی گلیراں (Musée Galliera) یہ ایک بہت خوبصورت چھوٹی سی عمارت ہے بعض بت اسمیں ایسے ہیں جنکی مثال کہیں اور نہیں ملسکتی تصویروں میں تو قلم اور رنگ کی مدد سے جذبات انسانی کو کاغذ پر اُتارنے کی کوشش کرتا ہے - بت تراش کا بھی یہی کام ہے مگر کہیں زیادہ سخت اور مشکل کیونکہ وہ پتھر کی ایک بے ترشی ہوئی ٹکڑے میں سے انسانی صورت کا ٹکڑا بناتا ہے اور انمیں جذبات کا اثر پیدا کرتا ہے - اسطرح کے بہت سے بت جو میوزی گلیراں میں ہیں ان جذبات انسانی کی گویا مجسم تصویریں ہیں - کوئی غم کی تصویر تھی - کوئی تنہائی کی - اور کوئی خوشی و مسرت کی مورت تھی اور کوئی خوف وہراس کی - یہ سب پتھر کے ترشے ہوئے بت اپنے بنانے والیکا اسقدر کمال ظاہر کرتے تھے کہ ہم لوگ سب بڑی دیر تک محو تماشا رہے - اسقدر خوبصورت اور نفیس سنگ مرمر کے بت میں نے لندن میں کہیں نہیں دیکھے - مجھسے لوگوں نے بیان کیا کہ اس خاص فن لطیف میں فرانسیسی ساری دنیا پر سبقت لیگئے ہیں - ایک زمانہ میں اٹلی والے بیشک بہت کچھ شہرت رکھتے تھے مگر اس زمانہ میں فرانسیسیوں نے انہیں بھی مات کردیا ہے اس عجائب خانہ میں بہت سے منقش قالین میں نے دیکھے - سُنا ہے کہ اس قسم کے قالینوں کی ساخت میں بھی فرانسیسی اپنا جواب نہیں رکھتے - ایک زمانہ دراز سے اسکام کی قدر یہ لوگ کرتے آئے

ہیں اور اب بھی پیرس کی قریب اسکا ایک کارخانہ موجود ہے۔

دوسرا عجائب خانہ جو یہاں دیکھا اوسکا نام میوزی گیمی (Musee Guimet) ہے۔ یہ کسیقدر سادہ وضع پر ہی اور پہلے عجائب خانے سے چھوٹا بھی ہے۔ مگر ہندوستانیوں کے لیئے دلچسپی کی سامان اسمیں بہت ہیں کیونکہ یہاں پر ہندوستان کے ہندوں اور بدھ مت والوں کی عجیب عجیب یادگاریں موجود ہیں۔ یہ شاید اُسی زمانے میں جمع کی گئی تہیں جبکہ ہندوستان پر فرانسیسیونکا بہت زیادہ اثر تہا۔ یہاں پر کثرت سے بت اور مورتیں اور کتابیں وغیرہ ہیں مگر اسلامی یادگاریں بہت کم میں نے دیکھیں۔

دن بھر خوب سیر کر کے ہم گھر واپس آئے دوسرے دن ذرا دیر کر کے نکلے۔ اور لاور (Louvre) کے بڑے عجائب خانہ کو جو ہماری گھر کے قریب ہی تہا دیکھنے گئے۔ یہ عمارت دنیا کی عظیم الشان عمارتوں میں سے ہے۔ ایک بڑا وسیع مربع صحن ہے جسکا چاروں طرف سے یہ عمارت احاطہ کیئے ہوئے ہے اس عجائب خانہ میں قلمی تصویروں کا بہترین مجموعہ میں نے دیکھا اور درحقیقت یہ کہنا نازیبا نہ ہوگا کہ یہ عجائب خانہ سرتاسر بڑی بڑی اور دلکش قلمی تصویروں سے بہرا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کمرے اسقدر وسیع اور کثرت سے ہیں کہ آدمی ٹہلتے ہی ٹہلتے تہک جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنی عظیم الشان اور عمدہ عمدہ تصویریں میں نے یہاں دیکھیں۔ افسوس کہ میں صرف ۲ گھنٹے سے زیادہ اسے نہ دیکھہ سکا اور یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی شخص اسقدر کم گھنٹوں میں اچھی طرح اسے دیکھہ سکے یہ مجموعہ تصاویر جسکا اوپر میں نے ذکر کیا اوسکی قیمت کا اندازہ محال ہے۔ صرف ایک تصویر کی قیمت ہزاروں پاؤنڈ ہوگی اور ایسی ایسی ہزاروں تصویریں یہاں ہیں۔ فتنہ (Commune) کیونس کے زمانہ میں قریب تہا کہ باغی انہیں جلا ڈالیں مگر آیندہ نسلوں کی خوش قسمتی سے بچگئیں۔ لاور (Louvre) کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ ان مختلف عجائب خانوں کا یہ خود ایک مجموعہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اسمیں خاص نمائش کی چیز گو کہ قلمی تصویریں ہیں مگر بتوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ قدیم مصریوں کے عجائبات کے مجموعے اور دیگر قدیم یادگاریں اس کثرت سے ہیں کہ صرف اونکے نام ہی اگر لکھے جائیں تو ایک کتاب بنجائے گی۔

اسکے بعد شام کیوقت ہم آرچ ڈی ٹرائمف (Arch de Triumph) دیکھنے گئے یہ بالکل لندن کی ماربل آرچ (Marble arch) کی طرح ہے مگر اُس سے کہیں زیادہ عظیم الشان اور خوبصورت - اپنے فتوحات کی پہلی یادگار میں نپولین نے اسے بنوایا تھا اس محراب کے تمام جانب بہت سی تاریخی سین ابھرے ہوئے نقوش ہیں کندہ ہیں اور فتح اور صلح کی تصویریں بنی ہیں - اس محراب پر چڑھکر گرد و پیش کے منظر کو اگر کوئی دیکھے تو بہت عظیم الشان معلوم ہوگا بارہ بڑے بڑے راستے جنپر دو رویہ درخت سایہ کئے ہوئے ہیں اس محراب کے پاس سے شروع ہوتے ہیں اور ہر راستہ کے کنارہ پر اس محراب کی عمارت بہت پر شکوہ و شان گویا ہر طرف حکومت کرتی معلوم ہوتی ہے - پیرس میں اگر کبھی غدر ہو تو گورنمنٹ سب سے پہلے اس محراب پر قبضہ کریگی یہ مقام ایسا ہی جیسا اگر توپیں نصب کیجائیں تو تمام شہر پر گولہ باری کیجا سکتی ہے - اسی محراب کے اوپر سے اوس سب سے انتہا درجہ دلکش ایونیو (Avenue) یعنی ایونیو ڈی شانزی لیزی (Avenue des Champs Elysées) کا نظارہ بخوبی ہو سکتا ہے - اُن راستوں میں جو آرچ ڈی ٹرائمف سے شروع ہوتی ہیں یہ راستہ سب سے زیادہ پر شوکت اور خوبصورت ہے -- یہاں میں نے بہت ہی گھنٹے اوس غیر متناہی سلسلہ فیشنبل لائف کے دیکھنے میں صرف کئے ہیں جسکا خیال کبھی میرے دل سے دور نہیں ہو سکتا تمام اطراف و اکناف عالم کے دولتمند لوگوں کی یہ تفرج گاہ دو رویہ درختوں سے آراستہ میلوں تک چلی گئی ہے - کہیں کہیں اسکی شکل مختلف ہو گئی اور نام بھی بدل دیا گیا ہے مگر سلسلہ سب ایک ہی ہے - ذیل کے نقشہ سے کسیقدر اندازہ ہو سکتا ہے



یعنی شروع میں جارڈن ڈی تولیرس (Jardin de Tuilleries) ایک نہایت خوبصورت باغ ہے اور لاور (Louvre) اور کئی ایک مشہور عمارتوں کے قریب واقع ہے - اس

باغ کا سلسلہ پلیس ڈی لا کانکارڈ (palace de la Concord) تک برابر چلا گیا ہے یہاں پر ایک بہت وسیع اور خوبصورت مربع میدان میں فرانس کی مختلف صوبوں کے متشکل خوبصورت بت بالترتیب کھڑے ہیں اور بیچ میں ایک قدیم مصری مینار ہے جسپر پرانے مصری حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے یہ چوپہل اوپر سے کٹا ہوا منارہ سوزن کلیوپیٹرا (Cleopatra's needle) کا جو لندن میں دریائے ٹیمس کے بند پر نصب ہے برادر توام ہی - یہ وہ جگہہ ہی جہاں فتنہ فرانس کے زمانہ میں سولی (گلوٹین) کھڑی کی گئی تہی اور میری انٹونیٹ وغیرہ کے (Mary Antoinette) سر قلم کئے گئے تہے - اس مقام سے ایک نہایت صاف ستہری سڑک دو رویہ سایہ دار درختوں سے آراستہ موج آسا کہیں اونچی کہیں نیچی شروع ہوتی ہے - اسکا نام شانزی لیزی ( ) ہی - دور فاصلہ پہ آرچ ڈی ٹرائمف ( ) کی شاندار عمارت نظر آتی ہی جہاں سے پہر اسی سڑک کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور باغ بائی ڈی بولون (Bois de Boulogne) تک چلا جاتا ہی اس سڑک کے دونوں جانب پیدل چلنے والوں کے لئے چوڑی چوڑی پگڈنڈیاں بنی ہیں جنکے اوپر دو رویہ سایہ دار درختوں کی چہت سی بنی ہوئی ہے - اسطرح گویا بیچ کی بڑی سڑک کے دونوں طرف دور تک باغ ہی باغ چلا گیا ہی - شام کیوقت اس سڑک پر ٹمٹم پر سوار ہوکر نکلنا بہت بڑی فیشن میں داخل ہی اسلئے شام کو فیشنیبل لوگوں کے نکلنے سی جو بہار معلوم ہوتی ہی اُسکا لطف کچھ دیکھنے ہی سے تعلق رکہتا ہی - یہاں تماشا دیکھنے کے لئے کرسی وغیرہ پر بیٹھنے کی فیس مقرر ہے اس جگہہ جو نظارہ پیش نظر ہوتا ہے اُسکا بیان محال ہی میں گھنٹوں یہاں بیٹھکر دنیا کی دولت - تہذیب اور حسن کا جلوہ دیکہا کرتا تہا - موجودہ تہذیب و تمدن نے جو جو عجائبات پیدا کئے ہیں اُن کا تماشا اسجگہ سی اچہا کہیں اور ممکن نہیں - امریکہ کے کروڑپتی - انگلستان کے نواب اور یورپ کے بڑے بڑے دولت مند لوگ سب یہاں نظر آئینگے جو صرف ایک مقصد یعنی عیش و نشاط کی غرض سی یہاں آئے ہیں -

مئی کے مہینے میں جو پیرس میں سب سے زیادہ بہار کا زمانہ ہوتا ہے ایونیوڈی شانزی لیزی (   ) پر سیر کرنے والوں کا اسقدر ہجوم ہوتا ہے کہ آدمی اُبلنے لگتے ہیں خوبصورت خوبصورت گاڑیاں - موٹر کارس بکثرت دکھائی دیتی ہیں اور بعض اوقات شام کے وقت ۵ بجے کے قریب اس مجمع کا انتظام پولیس کے قبضۂ اقتدار سے باہر ہوجاتا ہے مگر میرے خیال میں پولیس کا انتظام پیرس میں بالکل لغو ہے اور خاص کر اس سڑک پر جس جگہ گاڑیاں موٹر کارس وغیرہ نکل رہی ہوں تو اس پار سے اُس پار جانے میں اسقدر عجلت اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ آدمی پریشان ہوجاتا ہے اور ہر وقت اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں کچل نہ جائے - ان پیدل چلنے والوں کی پولیس والے ذرا سی بھی پروا نہیں کرتے میرے خیال میں فرنچ پولیس کو اس ہجوم پر عمدہ انتظام قائم کرنے کا بالکل سلیقہ نہیں اور لندن پولیس سے جب انکا مقابلہ کرتا ہوں تو میری نظر میں انکی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی - انگلستان کی عظیم الشان دارالسلطنت میں جہاں پیرس سے کہیں زیادہ ہجوم اور لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے - ایک لمبا زبردست پولیس کا جوان جو ایک طرف سیاہ ہلمٹ لگائے کھڑا رہتا ہے تمام گاڑیوں اور آمنی بسوں کے ہجوم کو ہجوم کو صرف اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے آن کی آن میں روک دینا بخوبی جانتا ہے اور پیدل چلنے والے ان امن و امان کے محافظوں سے انتہا درجے کے خلق کا برتاؤ معلوم کرتے ہوئے باسانی ادھر سے اُدھر ہوجاتے ہیں - یہاں کی حالت اسکے مقابلہ میں بالکل ہی الٹی ہے - علاوہ اسکے پولیس کے جوان بھی مجھے کچھ کمزور اور پریشان سے نظر آئے - پردیسیوں کے ساتھ انکا اخلاق بھی اچھا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو نہایت ہی خشک اور بد تہذیب معلوم ہوتے ہیں - " مالی "

از بیاض مرزا محمد ہادی صاحب بی۔اے عزیز لکھنوی

خالص

بچشم خویش نگر سحر سامری اینست | نظر در آئینہ کن شیشہ و پری اینست

اشرفی

گفتی کہ دل شکستہ کیست | در زیر لبم جواب لب شکست

لا ادری

ز صحبتی کہ کنم فکر پرستاری دل | آخر عمر من و اول بیماری دل

زلف سیہ سودہ دود آہ کیست | این شام تیرہ رونق بخت سیاہ کیست

لا اعلم

انتظارم نگذارد کہ نشینم جائے | انتظارت نگذارد کہ زجا برخیزم

اسیر اصفہانی

جلوہ آں سرو قامت دیدہ ام | من بچشم خود قیامت دیدہ ام

انتخاب بیاض مولوی عین الحق صاحب از بہرائچ

میلی

شوق من قاصد بید رد کجا می داند | اینقدر شوق تو دارم کہ خدا میداند

حیرتی

عید آمد و افزود غم را غم دیگر | ماتم زدہ را عید بود ماتم دیگر

ملک قمی

از آن بوعدہ وصلم امیدوار کند | کہ انچہ ہجر نکرد است انتظار کند

میلی

می نمایم خویش را وارستہ از سودای او | تا فریب عشق من کم سازد استغنای او

(از بیاض حسرت موہانی)

زلفوں سوا دسکی میں سنے جسدن کہ ہاتھ دہویا | ابر سیاہ آکر تربت پہ میری رویا

ہندوستان کی مالی حالت

بڑے بڑے نامی انگریزی مدبر اس بات کے قائل ہیں کہ انگلستان کی عظمت بہبودی و تجارت وغیرہ کا زیادہ تر دار و مدار برٹش گورنمنٹ کے تسلط ہند پر مبنی ہے لیکن جسقدر ناواقفیت یا تجاہل عارفانہ کا اظہار اس غریب ملک کے معاملات میں کیا جاتا ہے، ایسی لاپروائی شاید ہی اور کسی معاملے میں برتی جاتی ہو۔ شروع سے اب تک چند نیک دل و منصف مزاج بزرگوں مثل برک - برائٹ - بریڈلا - اور فاسٹ وغیرہ نے تو البتہ نہایت فصاحت کے ساتھ اس غریب ملک کی وکالت کی ہے اور برٹش پبلک کو انکے فرائض سے آگاہ کرنیکی کوشش بھی کی کہ ہند کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے اور انسانیت سے کام لیا جائے لیکن بمصداق ؎

کون سنتا ہے فغانِ درویش	قہر درویش بجانِ درویش

ہندوستان کی مالی حالت اور یہاں کی ریاست کے باب میں انگریز مدبروں و عوام الناس کے دماغوں پر اب تک عجیب قسم کے وہم غالب ہیں لیکن بقول مسٹر آر۔ سی۔ دت، عہد حکومت برطانیہ میں گو بعض محقق مورخین نے جنگی اور ملکی معاملات پر اکثر اچھے اچھے کارنامے تحریر کئے ہیں لیکن واقعی طور پر ابھی تک کوئی تاریخ یہاں کی مالی حالت کے باب میں منضبط نہیں ہوئی اور یہ مضمون حقیقت میں سب سے زیادہ نازک اور غور طلب ہے۔ باوجود خاص طور کے قدرتی فوائد حاصل ہونیکے ہندوستان روئے زمین پر سب سے زیادہ غریب اور فقیر ملک ہے۔ زمین شاداب، آب و ہوا زراعت کے لحاظ سے نہایت موافق، دھاتوں کی کانیں افراط کے ساتھ، باشندے دنیا میں سب سے زیادہ صلح پسند، محنتی اور ایماندار۔ یہ سب باتیں ایک طرف اور ہمارا افلاس ایک طرف اور افلاس بھی کیسا افلاس کہ بلا مبالغہ لاکھوں آدمیوں کو روزانہ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ جو کچھ کہ کارلائل نے ستر سال پیشتر انگلستان کے بارے میں

کہا تھا وہ آج ہمارے لئے سچ ہے کہ "زمین شاداب ہے سبزہ لہلہاتا ہے لیکن ملک کی تباہی قریب ہے" لاکھوں ایکڑ زمین جو سو سال کیا بلکہ ۵۰ سال پیشتر بھی بنجر پڑی تھی وہاں اب سبزہ نظر آتا ہے جہازی تجارت بمقابلہ سابق اس سو برس میں بدرجہا بڑھ گئی ہے کلکتہ - بمبئی - مدراس وغیرہ شہروں کی وسعت و آبادی کو کبھی وہ عروج نہ ہوا تھا جو آج حاصل ہے - بلحاظ تجارت کی گرم بازاری، شان و شوکت عمارات اور چہل پہل کے ان شہروں کا مقابلہ فرنگی شہروں کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے ۲۵ ہزار میل ریلوے سے وہی آسانی سفر میں آج یہاں بھی حاصل ہے جو اور شائستہ ملکوں میں - بلامبالغہ یہ لاکھوں میل تک کا سلسلۂ تار برقی خط و کتابت میں یہاں بھی وہی آرام و لطف دیتا ہے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں - مختلف قسم کی کارآمد کلیں جنکی ابتدا تو اب یہاں بھی ہو گئی ہے ہزاروں آدمیوں کی روزانہ پرورش کرتی ہیں - عدالتوں مدرسوں اور شفاخانوں اور دیگر سلسلوں سے ہزارہا آدمی کی معاش چلتی ہے - تاہم یہ غریب ملک قعر افلاس میں پڑا جاں بلب ہو رہا ہے - لاکھوں آدمی روزانہ آدھے پیٹ کھانا نہیں کھا سکتے - پچھلے ۳۰ سال میں ۲۲ اور ۴۰ سال میں ۸ قحط پڑے ہیں اور ان پچھلے قحطوں میں باوجودیکہ ریلوے نیز دیگر سرکاری انتظامات سے ہر قسم کا فائدہ اٹھایا گیا تاہم ڈیڑھ کروڑ جانیں تلف ہوئیں ملک کے باشندے نہایت محنتی و صلح پسند ہیں - برٹش گورنمنٹ نے ملک میں امن و امان و حفظِ جان و مال کا وہ بندوبست کر رکھا ہے کہ نعمتِ بے بدل ہے - بلکہ عوام الناس کی تعلیم و تربیت کی غور و پرداخت کے لئے مدرسے اور دارالعلوم بھی قائم کر دیئے ہیں اور ہم گونہ شائستگی و تہذیب کا اثر بھی ظاہر ہو چلا ہے - یہ سب کچھ ہے تاہم یہ امر واقعی ہے کہ ملک کی تباہی عنقریب ہے کیونکہ افلاس سب سے بڑی مصیبت ہے - نیا کے افلاس اور اسکے اسباب کی داستان سننے کے قابل ہے - ہاں پہلو میں دل اور دل میں درد چاہیئے -

پچھلے ۵۰ سال اور اُس زمانے کی کیفیت سننے کے قابل ہے - مذہبی

اور قومی جھگڑوں کی آگ تمام ملک میں بھڑک رہی تھی۔ تخت شاہی کے لئے خون خرابہ معمولی سی بات تھی۔ ملکی سازشوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سرحدی لٹیروں نے دلی کی جان ضیق میں کر رکھی تھی۔ شہر آن کی آن میں تباہ ہو جاتے تھے۔ اور بیچارے مظلوموں کی جانیں ضائع ہوتی تھیں۔ ملک میں بے آرامی و بے چینی آشکارا تھی یہ سب کچھ تھا لیکن ہند میں افلاس کا گذر ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس باغ پہلے نے ابھی خزاں کے ہاتھوں تباہی کی شکل نہ دیکھی تھی۔ یہ وہ گلشن تھا کہ یہاں گردہ آفاق کے بلبلوں کا جھرمٹ لگا رہتا تھا۔ دلی لٹی اور کئی بار بیطرح لٹی تاہم ہند کی دولت کا چرچا گلشن آفاق میں بوئے گل ہوکے مہکتا رہا۔ اس معشوق دلفریب کے بہت سے از خود رفتہ سودائیوں کو بہانا اسکی متوالی چتون نے دور دور سے طلبگاروں کو گھسیٹا، رقیبوں کو آپس میں بھڑوایا اور اُنکے کشتہ خون کا نظارہ اسکے دل کو کچھ ایسا بھایا کہ اپنے آپ میں محو ہوکر روز حشر کو دل سے بھلا دیا ان گورے کالوں کی لڑائی میں آخر کو لال منہ والے جیتے۔ اب جو اس مظلومہ کا بُرا حال ہوا وہ نہایت پر عبرت ہے۔ سارا بناؤ سنگار خاک ملگیا اور وہ سب تیوری کے بل آن کی آن میں نکل گئے حتیٰ کہ تن کی عریانی پر نوبت پہونچی۔ یہ سب کیفیتیں تو اٹھارویں صدی کا کرشمہ تھیں۔ اُنیسویں صدی سی غریب کی جان کے بھی لالے پڑے۔

اکثر متفرق فرنگی قومیں (یعنی ڈچ۔ فرنچ۔ انگریز۔ پرتگیز) ہندوستان کی تجارت پر قابض ہونا چاہتی تھیں تاہم ملک اسباب و اشیائے نفیس و پیداوار خام کی ایک کثیر تعداد غیر ملکوں کو بھیجتا تھا اور یہاں ہر ایک قسم کی صنعت و حرفت کا چرچا کافی تھا۔ یہ سب امور اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ سب حملے، تمام ملکی خانہ جنگیاں اور باہمی ناچاقیاں امن و امان میں کیسی ہی سد راہ ہوں تاہم ملک کی مالی حالت کے حق میں ضرر رساں نہ تھیں۔ ہاں جب سے سرکار انگلشیہ کے قدوم میمنت لزوم اس سرزمین پر جمے ملک کی مالی تباہی اُسیوقت سے شروع ہوئی۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بیچارے معمولی سوداگروں کو دبانا شروع کیا اور بعد ازاں سرکار انگلشیہ کی مدد

سودیسی اشیا کو ولایتی مال کے مقابلے میں بھڑا دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اب صرف پیداوار خام یہاں سے کوڑیوں کے مول جاتی ہے اور وہاں سے نفیس نفیس قسم کی چیزیں یہاں بنکر آتی ہیں اور نہایت گراں بکتی ہیں۔ سرکاری کاغذات اور اُن شہادتوں کے دیکھنے سے کہ جو پارلمنٹری کمیٹی کے روبرو پیش ہوئی تھیں صاف ظاہر ہوتا ہی کہ اٹھارویں صدی کیا بلکہ اُنیسویں صدی کے شروع تک ہندوستان سے نفیس قسم کا مال ساخت ہوکر باہر جاتا تھا۔ عمدہ ململ نفیس ریشمی اور اونی تھان۔ قیمتی کارچوبی مخمل اور دوشالے ایسے ایسے نفیس قسم کے یہاں سے تیار ہوکر باہر جاتے تھے کہ غیر ملک والے اور خاص کر انگریز اُنکے مقابلے کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ یہ صرف قصہ کہانی نہیں بلکہ واقعات ہیں جن کو جاننے والے جانتے ہیں اور انصاف پسند مانتے ہیں۔ حشر یہ ہوا کہ انگریزی تاجروں نے اپنی گورنمنٹ پر اسبات کا زور ڈالا کہ تجارت ہندکو کسیطرح روک کر انگریزی تجارت کو ہندوستان میں فروغ دیں۔ اور ہماری سرکار عالیہ نے ازراہ بخشش ہمارے اوپر یہ کرم فرمایا کہ مال درآمد پر یا تو محصول لگایا ہی نہ جائے یا لگایا ہی جائے تو برائے نام اور مال برآمد یا تو باہر بالکل جا ہی نہ سکے و اگر بالفرض محال جائے بھی تو محصول کافی ادا کرے یعنی ۱۰ فیصدی ۲۰ فیصدی ۴۰ فیصدی ۵۰ فیصدی ۱۰۰ فیصدی ۵۰۰ فیصدی حتیٰ کہ ۱۰۰۰ فیصدی غرضکہ ہندوستانی تجارت کا اسطرح گلا کاٹا گیا۔

۱۸۱۴ء میں ہندوستانی ساخت کا سوتی مال قریب بارہ لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ کے ولایت بھیجا گیا اور ولایت سے صرف ۴۶ ہزار پونڈ کا سوتی مال ہند میں آیا لیکن غور کرنے کا مقام ہی کہ صرف ۲۰ سال کے عرصے میں یہاں کی تجارت میں کیا کایا پلٹ ہوگئی۔ یہاں کے سوتی مال کی تجارت ۱۲ حصے کم ہوگئی اور ولایت کی ۶۰ حصہ بڑھگئی۔

۱۸۴۸ء ہاؤس آف کامنس کی ایک سیلکٹ کمیٹی اسبات کے دریافت کرنیکے لئے مقرر کی گئی کہ ہند میں روئی کی پیداوار کی کیفیت درست طور سے دریافت کرکے پیش کرے۔ جبکہ اوّل محصول بعدازاں انگریزی مال کے مقابلے نے ہندوستانی

تجارت کا کافی طور پر کام تمام کر دیا تو گورنمنٹ نے اسبات کی کوشش کی کہ ہندوستان میں اگر عمدہ روئی کی پیداوار خوب ہونے لگے تو پیداوار خام کے لحاظ سے بھی انگلستان کو امریکہ کا دست نگر نہ رہنا پڑے - اس کمیٹی کا میر مجلس ہندوستان کا سچا خیر خواہ جان برائٹ تھا - اکثر ایسی ایسی شہادتیں گذریں جنسے صاف ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کی تجارت کو سرکار نے محصول زائد لگا کر بالکل برباد کر دیا - دستکاروں کی روزی کھو دی - کروڑوں روپیہ سالانہ جو بلا معاوضہ ولایت جاتا ہے اُسکی بھی فریاد کی گئی لیکن باوجود میر مجلس کی دلی اور نہایت سچی کوشش کے سب کا یہ جواب کافی سمجھا گیا کہ بلحاظ دماغی اور اخلاقی حیثیت کے ہم ہندوستانی ایسے ذلیل ہیں کہ انصاف کے بھی مستحق نہیں -

سنہ ۱۸۵۴ء میں کپڑے بننے کا پہلا کارخانہ کھولا گیا اور کچھ ہی عرصہ میں ایسے کارخانوں کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی ، اور یہاں سے اچھے اور باریک قسم کا سوت باہر جانے لگا - سنہ ۱۸۵۹ء صرف ۸۱۳۶۰۴ پونڈ کا سوت باہر گیا اور سنہ ۱۸۷۰ء میں قریب میں لاکھ پونڈ کے - یہ ترقی بھی لنکا شائر والوں کو نہایت شاق گذری - اسی زمانے میں مارکوئس آف سالسبری ہندوستان کے سکرٹری آف اسٹیٹ تھے - آپنے جب سُنا کہ ایک سال کے عرصے میں یہاں پانچ مل قائم ہو گئے تو آپ کو سناٹا آگیا اور حکومت کے زور سے یہاں کی باقیماندہ تجارت کا خاتمہ بھی ضروری سمجھا گیا - انگریزوں نے تمام اپنی نو آبادیوں میں بلکہ خود انگلستان میں بھی ملکی تجارت کو فروغ و عروج دینے کے لئے ہمیشہ یہی اصول رکھا ہے کہ مال درآمد پر اسقدر کافی محصول لگا دیا جاتا ہے کہ اُسکے مقابلے میں اپنے یہاں کی ساخت کا مال ارزاں فروخت ہو سکے - یہی التجا ہندوستان کے بارے میں بھی کی گئی تھی - گویا محض انصاف چاہا گیا تھا ، کسی قسم کی رعایت کی خواستگاری نہ تھی - تاہم اُسمیں بھی ناکامیابی رہی - اور اُسکے جواب میں ولایت والوں نے یہ غوغا مچایا کہ وہ برائے نام محصول بھی جو کہ مال درآمد پر ہے ، کافی سے زیادہ ہے - اور اسکو برطرف کرنا لازم ہے - یہ اور اُلٹی ممانہ

گلے پڑی۔ باوجودیکہ ہندوستانی بہت چیخے چلائے وائسرائے کی کونسل کے بھی بعض ممبروں نے اختلاف رائے کا اظہار کیا تاہم ذرا بھی شنوائی نہ ہوئی۔ اور ۱۸۷۹ء میں وہ برائے نام محصول بھی جو مال درآمد پر تھا قطعی معاف کر دیا گیا۔ واہ کیا انصاف ہے۔ ایسی مستحکم بربادی کی تخم ریزی تو کسی عہد قدیم کے خود مختار سے خود مختار حکمراں سے بھی عمل میں نہ آئی ہوگی۔ یہ وہ زخم ہیں جو نالگا ہمیشہ ہرے رہینگے۔ جب علم الاقتصاد کے مسائل کافی طور سے یہاں کی ملوں کو برباد نہ کر سکے تو اخلاق محسنی کے گوارہ سے اُنکا اڑایا جانا قرار پایا۔ مینچسٹر والوں سے یہاں کی ملوں کے مزدوروں کی ردی حالت نہ دیکھی گئی بھلا ایسی قوم کے سے نرم دل لوگ یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ اُنکے ماتحت ملک میں غریب مزدوروں پر ظلم ہو۔ پس ایسے قوانین جاری کئے گئے جنسے فیکٹریوں کا ہفتے میں خاص خاص دن بند ہونا ضروری ہے اور خاص خاص عمر کے لڑکوں کو اُنمیں مزدوری کرنا منع ہے وعلی ہذالقیاس لارڈ ڈفرن کے زمانے سے روزافزوں فوجی اخراجات بے طرح زیر باری کا باعث ہو رہے تھے۔ اخراجات ولایت (ہوم چارجز) کی دائمی مد اور دیگر ایسی ہی فضولیات سے ہندوستان کی سرکار کو ۱۸۹۴ء میں بہت بڑا خسارہ ہوا۔ اسکے رفع کرنیکے لئے مزید محصول لگانے کی ضرورت پڑی اور آخر کار مال درآمد پر بھی محصول لگایا گیا۔ اور گو مال درآمد کا سب سے بڑا صیغۂ تجارت یعنی سوتی مال شروع میں محصول سے بری رہا لیکن آخر کار اُسپر بھی محصول لگایا گیا۔ لیکن انگریزی تاجروں کے شور نے پھر گورنمنٹ کو اسقدر مجبور کیا کہ اُن کی رعایت کی غرض سے بعض قسم کا سوت جو باہر سے آتا تھا خارج از محصول کیا گیا اور یہاں کی ملوں پر اُسکے عوض میں اور زیادہ محصول کر دیا گیا۔ اس ولایتی سوتی مال کو محصول سے بری کرنے میں سرکار ہند کو ۵۰ لاکھ روپے کا نقصان ہوا اور بوجہ یہاں کے ملوں کے محصول میں ۱۱ لاکھ روپے کا فضول اضافہ ہوا۔

جو کچھ کہ سوتی مال کی تجارت کی سرگذشت ہے وہی اور صیغوں کی بھی حالت ہے

چند سال تک تو یہاں کے ریشمی مال کا انگلستان جانا قطعی ممنوع رہا اور بعد ازاں جبکہ اجازت ہوئی بھی تو ۲۰ و ۳۰ فیصدی محصول رہا۔ اونی دوشالوں پر پہلے ۷۰ فیصدی محصول لگایا گیا پھر ۶۷ رہا اور آخر کار بعد مدت مدید کے ۳۰ فیصدی قائم ہوا ۱۸۴۰ء میں جب ان محصولوں کی زیر باری کی فریاد کی گئی تو صرف شہادت دینے والوں ہی نے نہیں بلکہ پارلمنٹری کمیٹی کے بعض ممبروں نے بھی صاف طور سے یہ جواب دیا کہ ولایتی تاجروں کا نفع نقصان بہ نسبت ہندوستانی کاریگروں کی داد و فریاد کی زیادہ غور طلب ہے۔

یہاں کی تجارت کی تباہی کا حال مل اور ولسن صاحب کی تاریخ ہند جلد ہفتم صفحہ ۳۴۳ میں یوں درج ہے۔

"بیان کیا جاتا ہے (۱۸۱۳ء) کہ ہند کا سوتی اور ریشمی مال بمقابلہ انگریزی مال کے ولایت میں ۵۰ یا ۶۰ فیصدی کی کفایت سے فروخت ہوتا تھا۔ پس ہند کی تجارت کو زک دینے کے لئے یہ ضروری ہوا کہ ۷۰ یا ۸۰ فیصدی محصول لگایا جائے یا ہندوستانی مال کی تجارت قطعی ممنوع ہو جائے اگر یہ ظلم نہ ہوتا تو آج منچسٹر اور پیسلی کی ملوں کا نام و نشان بھی نہ پایا جاتا۔ یا اگر آج ہندوستان غیر حکومت کے نیچے نہ رہا ہوتا تو اپنے یہاں کی تجارت کی کافی حفاظت کر سکتا تھا۔" جب یہاں کی تجارت صنعت و حرفت اور دستکاری کا یہ خراب حشر ہوا تب کل رعیت و باشندوں کی روزی کا دار و مدار کھیتی پر رہ گیا۔ آبادی کے ۴/۵ حصے کی گذر کھیتی باڑی سے ہوتی ہے اور اسکا جو کچھ پریشاں حال ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ سوائے بنگال۔ شمالی سرکار اور بعض چند قطعات مدراس کے کہیں بندوبست استمراری نہیں ہے اور یہ سخت مصیبت ہے۔ سرکار کی مالگذاری کاشتکار و زمیندار کو پنپنے نہیں دیتی۔ گو مولانا ذکاء اللہ خانصاحب بہادر نے اپنی حال کی تصنیف "آئین قیصری" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہمکو یاد نہیں کہ ہندوستان میں اراضی کے فوائد میں کبھی کسی گورنمنٹ نے اپنا حصہ اتنا کم لیا ہو۔ تاہم یہ کہنا بہت درست ہے کہ تمام متمدن دنیا میں کبھی کل پیداوار

پر ۸ فیصدی سے زیادہ محصول نہیں لیا گیا اور ہندوستان میں ۵۰ سے ۶۰ فیصدی تک ہے اور جو سختیاں کہ رعیت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حکومت اٹھائیں انکا بیان تو واقعی حیرت انگیز ہے - اور انکی داستان نہایت طویل - خلاصہ یہ ہے کہ ہماری تباہی میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی -

بیسویں صدی کا ہندی مورخ تاریخ کو ترتیب دینے بیٹھا تو ۲۰۰ صفحے کی کتاب میں صرف سرکار انگلشیہ کی شان میں کبت ہی گایا گیا - گو ہنری کاٹن سر ولیم وڈربرن اور لارڈ رپن کے سے مدبروں کی رائے میں انڈین نیشنل کانگرس باوقعت مجمع خیال کیا جاے لیکن اس مورخ کی رائے میں کانگرس کو مباحثے مکتب کے طالب علموں کی بق بق درق زق سے زیادہ باوقعت نہیں - گو برائٹ و ولسن سے باکمال محققین ہند کی حالت زیر سایہ حکومت سرکار انگریزی قابل افسوس خیال کریں لیکن یہ اردو زبان کا فاضل اجل دولت انگلشیہ کی مدح سرائی میں ہرگز تاخیر نہیں کر سکتا گو مسٹر دت اور ڈگبی یہاں کے افلاس کی کامل طور سے تصدیق کریں لیکن ہمارا مصنف ہند کو خوشحال ورئیس ہی بتائے جائیگا - میرا مطلب اس گفتگو سے صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپکو مورخ کی حیثیت میں عوام کے سامنے پیش کرتا ہے یعنی وہ شخص جو کسی ملک کی تاریخ اور کسی گورنمنٹ کے آئین سلطنت و طرز حکومت پر مورخ کی حیثیت سے یکقلم فیصلہ دینا چاہتا ہے اسکو واجب ہے کہ پیشتر تعصب و خوشامد کی عینک آنکھ سے اتار کر رکھدے اور انصاف کی نظر سے حال واقعی کو دیکھے - اور پھر مورخ کے قلم سے تحقیقی کیفیت تحریر کرے ورنہ گورنمنٹ کی شان میں کبت ہی گائے جانا تو کسی شخص کو خواہ کیسا ہی مشہور زباندان کیوں نہ ہو مورخ کا رتبہ نہیں بخش سکتا - تعجب ہے قیہ اور رونا ہی تو صرف اسبات کا کہ ہمارے ملک کے وہ مشہور و معروف بزرگ جنکے قلم میں تاثیر اور نام میں جادو ہے کس غضب کی ظاہر داری اپنے دماغ میں لیکر پیدا ہوئے ہیں کاش کہ وہ لوگ جنکو گورنمنٹ کی نمکخواری کا بار احسان مجبور کر دیا کرتا ہے کچھ ملکی ہمدردی کا بھی پاس کیا کرتے -

صاف تحریر ہمیشہ بار خاطر گذرتی ہے اور میرے صاحب قلم سے تو ضرور چھوٹا منہ بڑی بات تصور ہوگی لہذا اس بحث پر رائے زنی سے قطع نظر کرکے اب نفس مضمون کیطرف متوجہ ہونا چاہیئے یعنی اس امر کی جانب کہ ہند کے افلاس کی برٹش گورنمنٹ ذمہ دار ہے ابتک اسی کے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ گو اس مختصر سے مضمون میں اُسکی کافی داد دینا ناممکن ہے تاہم واقعات واقعی کا اظہار کر دیا گیا ہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ جو واقعات و دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ صرف میرے وہم نے پیدا نہیں کئے ہیں بلکہ اُن کی حقیقت اور اُنکا وجود واقعی طور پر مسلم ہے۔ دادا بھائی نوروجی نے پچھلے پچاس سال میں اُن کی حقیقت کو تمام دُنیا پر روشن کر دیا ہے۔ مسٹر دت و ڈگبی نے اپنے تصانیف کا ایک معتد بہ حصہ اُن پر مبسوط و مدلل مضامین تحریر کرنے میں صرف کیا ہے اور ان تواریخ و تصانیف کو وہ مرتبہ حاصل ہے جو دُنیا کے مشہور مورخوں نے ابتک پایا ہے اور لطف یہ ہے کہ ان واقعات و دلائل کی تردید میں ابھی تک کوئی باوقعت تحریر یا تجویز پیش نہیں ہوئی ہے۔ بس اس امر مسلمہ ہے کہ اسوقت ہندوستان زمانۂ سلف کی بہ نسبت زیادہ مفلس ہے۔ اور اس افلاس کی زیادہ تر سرکار انگلشیہ ذمہ دار ہے کسی شخص کو مناسب واقعی طور پر انکار کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اور یوں تو کہنے والے کی زبان کو کون پکڑ سکتا ہے۔

اب واجب یہ ہے کہ آیندہ اُمیدوں اور مناسب تجویزوں کا بھی کچھ تذکرہ کیا جائے اگر گذشتہ مصیبتوں اور ناکامیابیوں کی گورنمنٹ بہت کچھ ذمہ دار ہے، تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ آیندہ کی اُمیدوں و ترقی کا دارومدار بہت کچھ ہم ہندوستانیوں پر بھی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم خواب غفلت سے چونک کر اپنے آپ کو قعر ذلت سے نکالیں اور اپنی خود غرضی و نفس پرستی کو دور کرکے اپنی کوشش و ہمت کو ملک پر سے تصدق کر دیں۔ ہماری سامنے اپنے ہی ملک میں اُمید و ترقی کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں موجود ہیں جو پست ہمتی سے پست ہمت اور خود غرض سے خود غرض شخص کے دل میں بھی جوش پیدا

کر سکتی ہیں واقعی جس سرزمین نے نوروز جی سے بیٹے پیدا کئے وہ قعر ذلت میں ہرگز
نہیں پڑی رہ سکتی۔ درحقیقت جس زمانے نے گوکھلے کو وجود بخشا وہ ضرور ترقی و اُمید کا
زمانہ ہے۔ مایوسی کا خیال محض بے بنیاد ہے۔ یہ سچی تصویریں ہیں عاشقان و محبان
ملک کی یہ زندہ مثالیں ہیں جان نثارانِ قوم کی بس اے ہمت و اُمید مدد!

ہاں اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ مناسب ترکیبیں اور تجویزیں کونسی ہیں جنسے
ہم اپنے افلاس کو دور کرکے تجارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں وہ یادگار
عمارت کھڑی کر دکھائیں کہ زمانہ عش عش کرنے لگے۔ اور ہمارا سب افلاس دور ہو جائے
سب سے پیشتر یہ سوال ہے کہ اس عمارت کے تیار کرنے کے لئے دولت کثیر درکار ہے اسکا
جواب یہ ہے کہ دولت بصورت زر۔ تو ہندوستان میں کافی ہے۔ اُسکی قلت نہیں
کیونکہ اسوقت بلا مبالغہ کروڑ ہا روپیہ ہند کی زمین اپنے سینے میں چھپائے بیٹھی ہے لیکن
مشکل صرف یہ ہے کہ دفینوں کے اوپر بخل و پست ہمتی کے دو سانپ ایسے بیٹھے
ہیں کہ وہ خزانہ ایک طرح پر بیکار ہے۔ دولت تو قریب ہے لیکن ان کالوں کا مارنا
البتہ دشوار ہے۔ پوری کامیابی تو مشکل ہے تاہم ہمارے یہاں کے زرتشتیوں نے
اپنی عالی ہمتی و سخاوت کے ہتیاروں سے ان کالوں کو یکگونہ دفع کردیا ہے۔ لہذا اُمید
ہمارے ساتھ ہے۔ جب سرمایہ بہم پہونچا تو دوسری ہم یہ ہے کہ اس میدان تجارت سے
جہاں ہماری عظیم الشان عمارت کھڑی ہو گی اُن دست دراز ولایتیوں کو نکال باہر کریں
جنہوں نے ہمارے زمانۂ بیچارگی میں ہم پر ظلم کرکے ہم سے یہ میدان چھین لیا تھا۔ یہ کام
البتہ نہایت دشوار ہے مگر "سودیشی تحریک" نے بہت کچھ اُمید دلا رکھی ہے اور
ہمارے بنگالی بھائیوں نے اپنی ہمت سے اس میں بھی بہت کچھ کامیابی حاصل کرلی ہے
اور یہ جوش اگر اسیطرح زور پکڑتا گیا تو یقیناً یہ میدان بہت جلد سر ہو جائیگا جب
اس میدان سے ولایتی بھی نکال لئے گئے تو اس عمارت کی بنا ڈالنے کے لئے اچھے ہوشیار
کاریگروں کی ضرورت لاحق ہے۔ اُمید کہتی ہے کہ ہمت کی امداد سے کاریگر بھی جسقدر
ملسکتے ہیں بہم پہونچائی ہوں۔ جاپان اور امریکہ سے ہمارے ملک کے بعض طلبا ابھی

اچھی صنعتیں سیکھکر ملک کی مدد اور ہمت افزائی کے لئے آرہے ہیں گو ابھی ان کی
تعداد قلیل ہے۔ اُمید نے ہمت کو اُبھارا ہے اسلئے اسمیں بھی مایوسی نہیں ہے۔
اب شرکت اور میل جول سے کام کرنے کا خیال بھی عجیب تبسم کی شکل پیش کرتا ہے
اور پھر اُسکے ساتھ ایمانداری کا عہد بھی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے تاہم
امید کہتی ہے کہ دیکھو اُنہوں نے جو بنیاد ڈالکر ایک منزل کھڑی کرلی ہے یہ بغیر
شرکت و اتفاق کے ناممکن تھا۔ شرکت کا خیال ان میں ضرور ہوگا۔ اب یہاں اُمید
تو موجود ہے اور دلاسا دلا رہی ہے لیکن ہمت نظر نہیں آتی شاید ایمانداری کے
تلاش میں گئی ہوگی۔ اتنے ہی میں عقل و فراست نے ایک بات اور سُجھائی کہ منزل
تو تیار ہو جائیگی لیکن یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ اس کے حفاظت کے لئے پہرا
سنگین ہتھیاروں کا ہو ورنہ ولایتی پھر پہلے کی طرح مقابلے میں دبا لینگے اور یہ میدان
جیتا جتایا ہاتھ سے نکل جائیگا۔ یہ سب سوچ سمجھکر اب انتظار یہ ہے کہ یہ ادھوری عمارت
سطح پوری ہو۔ ہمت آئے اور ایمان کو ساتھ لائے۔ تو عمارت بھی سر بلند کرے
اُمید کہہ رہی ہے کہ دیکھو ہمت وہ بیٹھی ہے اسے اُٹھاؤ۔ ایمان وہ سوتا ہے اُسے
جگاؤ۔ غرضکہ جیسا اوپر تحریر ہوا ہے ہمکو اپنی ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے پہلے
یہ واجب ہے کہ میدان تجارت غیر ملک والوں کے ہاتھ سے چھین لیں اور اپنی تجارت کے
ایام طفولیت تک اُسکی کافی حفاظت کریں۔ اب تک روئے زمین پر جسقدر بڑے بڑے
تجارتی ملک ہیں اُن کی تاریخ بتا رہی ہے کہ شروع شروع میں وہاں کی صنعت و حرفت
کی کسقدر حفاظت کی گئی۔ امریکہ میں آج تک فری ٹریڈ (آزاد تجارت) نہیں ہے۔
کل مال درآمد پر محصول لگایا جاتا ہے اور خود انگلستان کی دوسری نوآبادیوں
مثلاً آسٹریلیا و کنیڈا وغیرہ میں بھی یہی روش اختیار کی گئی ہے لیکن ہند کے
حق میں یہ انصاف بھی جائز رکھنا گورنمنٹ نے مناسب نہیں سمجھا اسکا زیادہ شکوہ
فضول ہے کیونکہ اسمیں اب کوئی امید باقی نہیں۔ بہرحال ہم لوگ اپنی تجارت کی
حفاظت کرکے تو اسکو ترقی دے نہیں سکتے کیونکہ یہ ہمارے اختیار سے باہر ہے

پس ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ تجارت ولایتوں کے ہاتھ سے چھین لیں - اور اگر ہم حفاظت نہیں کر سکتے تو مجبوراً جی توڑ کر ایسا مقابلہ کریں کہ میدان ہمارے ہاتھ سے نہ جائے ولایتی تجارت کے روکنے کا اس سے زیادہ کوئی نفیس طریقہ نہیں ہو سکتا جو آجکل بنگال میں اس جوش و خروش کے ساتھ عمل میں لایا جا رہا ہے اور جسکا اثر قریب قریب ملک کے ہر شہر میں پھیل رہا ہے - یہ ہمت و جوش ہر نوع قابل تحسین و مرحبا ہے - صرف پندرہ روز میں بنگال میں ۱۶۷ جلسے ہوئے جسمیں ۶ لاکھ ۳۰ ہزار سے زیادہ کا مجمع یکسا میں موجود تھا - غریب و امیر خواندہ اور ناخواندہ سب میں یہی ایک چرچا ہے کہ دیسی اشیاء کا استعمال کرنا حق و ایمان ہے اور باہر کا مال استعمال کرنا یک لخت ترک کر دیا گیا ہے - اسکا اثر قریب قریب کل ہندوستان پر ہے اگر قدرے تفاوت خیال یا اختلاف رائے ہی تو اسکا کچھ مضائقہ نہیں ہے - نہ تو اسکی کوئی وجہ ہے کہ کل ہندوستان محض تقسیم بنگال کے لحاظ سے اس تحریک میں شریک ہو اور نہ یہ کوئی نفاست خیال ہو کہ صرف انگریزی ہی مال کا ترک استعمال کافی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ ہمکو "سودیشی تحریک" کا شامل حال ہونا اسلئے ضروری ہے کہ ملک کی مالی حالت اسباب کا تقاضا کرتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علاوہ انگریزی مال کے حتی الامکان ہم کسی غیر ملک کا مال بھی استعمال نہ کریں - کیونکہ اس میدان کے سر کرنیکا صرف ایک یہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے اور اسوقت کا موقع بھی غنیمت سمجھنا واجب ہے - بنگال کا جوش و خروش کسی لحاظ سے جاپان کی ملکی ہمدردی سے کم نہیں اور اسکی کامیابی میں بھی کسیکو شک نہیں ہو سکتا - تاریخ اسکی تصدیق کرتی ہے - لیکن اسی کے ساتھ اس امر کا لحاظ بھی ضروری اور واجبی ہے کہ سودیشی تحریک پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا اور دوسری عملی کارروائیوں سے لا پروا رہنا بھی سخت غلطی ہے - یعنی "سودیشی تحریک" کے جوش میں محض اس امر پر عرصے تک قانع رہنا کہ جیسا مال یہاں آسانی سے دستیاب ہو سکتا یا ہوتا ہے ہمارے واسطے کافی ہے' بالکل بیجا ہے - کیونکہ یہ جوش و خروش دائمی نہیں ہے ورنہ ہو سکتا ہے - اسوقت تو ممکن ہے کہ ہمارے یہاں کے رئیس زادے اور وضعدار شخص بھی جوش

میں اگر ریشم کی جگہ موٹا سوت پہن لینا گوارا کر لیں لیکن جب یہ جوش وخروش کم ہوجائیگا اسوقت ہی اسباب پر قائم رہنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگا اور جیتا جتایا میدان ہمارے ہاتھ سے جاتا رہیگا - پس ہمکو واجب ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے ایسی کوشش ہو کہ ہم ولایتی مال کے مقابلے کی ہر نوع تاب لاسکیں اور ایسی لڑائی لڑیں کہ پھر ولایتی کبھی اسطرف رُخ ہی نہ کریں -

گو صنعت وحرفت کے صیغے میں اسوقت کوئی مد بھی ایسی نہیں ہے جسکو فضول و ناقابل توجہ کہہ سکیں تاہم سوتی مال کی تجارت واقعی سب سے زیادہ قابل توجہ ہے کیونکہ اس مال کی تجارت کچھ ایسی عام ہے اور ضرورت بھی اس مال کی کچھ ایسی لاحق ہوتی ہے جو واقعی طور سے ہر فرد و بشر کو ملک میں پیش آتی ہے اور ایک یہی صیغہ ایسا ہے کہ اگر آج اسکی ترقی میں ہم لوگ کامیابی حاصل کرلیں تو ہماری مالی حالت سنبھل جائے - پس اس بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے -

سب سے پہلی ضرورت اس صیغے کی درستی کے یہ ہے کہ عمدہ نئی قسم کے دستی کرگے استعمال کیجائیں اس سے اسقدر فائدہ تو ضرور ہوگا کہ بجائے دن بھر میں صرف ۱۰ گز کپڑا تیار کرنیکے کم سے کم ۴۰ یا ۵۰ گز کپڑا تیار ہوجائیگا اور قیمت بھی صرف ۱/۵ رہجاویگی لیکن صرف یہی پوری کامیابی کے لئے کافی نہیں ہوسکتا - اور بھی بعض دقتیں ایسی ہیں کہ جنکا دفعیہ نہایت ضروری ہے - انمیں سب سے زیادہ ضروری اور غور طلب یہ ہے کہ ہمکو ہندوستان کا اچھا و باریک سوت دستیاب نہیں ہوتا اور مجبوراً ولایتی سوت باریک قسم کا استعمال کرنا پڑتا ہے - جسکے معنی یہ ہوئے کہ گو نئی قسم کی کرگے بھی استعمال کئے جائیں تاہم جب تک کہ باریک قسم کا سوت ہمکو اپنے ہی ملک سے دستیاب نہوگا اسوقت تک ہم انگریزی سوتی کپڑے کے مقابلے کا کپڑا اُس سے ارزاں تیار نہیں کرسکتے - پس یہ ضروری ہے کہ یہاں نفیس قسم کے سوت بنانیکی کوشش کیجائے اس سے دو بڑے فائدہ ہونگے اوّل تو ہم سوتی کپڑے میں انگریزی مال کا مقابلہ بخوبی کرسکیں گے اور دوسرے بہت سے غریب مزدوروں کو آسانی سے

روزی کا وسیلہ نکل آئیگا - اور وہ نقصان ۱۲ فی روپیہ کا جو ہمکو اس حالت میں ہوگا رفع ہو جائیگا کیونکہ جو مال ولایت سے یہاں آکر ۱۲ گز پڑتا ہے اگر انگریزی سوت سے یہاں تیار کیا جاوے تو ۱۲ گز سے کم میں دستیاب نہیں ہو سکتا -

یہاں کی بمبئی مل بھی ہر سال ایک اچھی خاصی تعداد سوت کی جاپان و چین وغیرہ کے واسطے باہر بھیجتے ہیں لیکن خرابی وہی ہے کہ سوت موٹا اور ادنی قسم کا ہوتا ہے اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اگر باریک سوت تیار کرنے کی کوشش بھی کیجاوے تو روئی کا نقص حائج ہوتا ہے یعنی کاتتے وقت تار بار بار اور بہت جلد جلد ٹوٹ جاتا ہے اور اسوجہ سے سوائے موٹے سوت کے باریک سوت تیار کرنا ناممکن ہے اور یہ نقص ہے ہندوستانی روئی کا - لیکن اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہاں کی روئی ہمیشہ سے ایسی ذلیل و خراب قسم کی نہیں ہوتی تھی - ڈھاکہ کی ململ نے جو شہرت حاصل کی تھی وہ اس امر کی شاہد ہے - اس خرابی کے واقع ہونیکا پہلا سبب تو ایک ہی زمین کا عرصہ دراز تک زیر کاشت رہنا اور دوسرا باعث اچھے اور برے قسم کے بیجوں کا ملا کر کاشت کرنا ہے - چاہئے یہ کہ اچھے قسم کے بیج برے بیجوں سے علحدہ کرکے کاشت کرنیکے واسطے مخصوص رکھے جائیں - اگر ایسا ہی عمل میں آئے تو بہت سی خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں - آسام و بنگال کے اکثر خطے اچھی روئی کی کاشت کے قابل ہیں پس اگر امریکہ و مصر کی روئی کے بیج انمیں ڈالے جائیں تو اچھی روئی آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے اور اسوقت نفیس قسم کے سوت کا مہیا ہونا بھی سہل ہو جائیگا - جس پر کل سوتی مال کی تجارت کا دارومدار ہے -

ہاں ایک وقت اور قابل گزارش ہے - یعنی غیر ملکوں سے رشتہ تجارت قائم کرنیکے لئے آڑھت کے مقامات کا ہونا بھی لازمی ہے جسکے بغیر ہم کو نقصان اور ہماری تجارت کو کافی فروغ ہونا دشوار ہوگا - مثلاً ایک خاص قسم کے ارزاں رومال یہاں سے خاص مصر کے واسطے تیار ہو کر جاتے ہیں - اور وہاں وہ خاص طور سے پسند کئے جاتے ہیں چونکہ مصر میں ہماری آڑھت نہیں ہے لہذا یہ مال سیدھا انگلستان

جاتا ہے - اور وہاں سے مصر - اب اگر ہماری آڑھت مصر میں بھی ہو تو یہ مال سیدہا مصر جا سکتا ہے - جسکے معنی یہ ہیں کہ صرف کشمیر کی کفایت ہو سکتی ہے - اسمیں ہمارا نفع اور غیر ملک والوں کا بھی فائدہ ہے - غرضکہ یہ ضرورت بھی قابل لحاظ ہے - اور ایسی ہی بہت سی ضرورتیں تجارت کے فروغ دینے کے لئے لاحق ہوتی ہیں جن کا انتظام لازمی و ضروری ہے - مجھکو خوف ہے کہ شاید یہ مضمون طویل ہو گیا ہے اسلئے اب کچھ اور زیادہ تحریر اس باب میں بار خاطر ناظرین ہو گی لہذا اسقدر عرض کر کے ختم بیان کرتا ہوں کہ گو اس قسم کے مضامین کا خشک ہونا ضروری ہے اور اسلئے شاید انکا مطالعہ کچھ ناگوار بھی ہو لیکن ماننا پڑیگا کہ تجارت اور ہندوستان کی مالی حالت کے مسئلے کافی غور و فکر کے مستحق ہیں - اور انکے متعلق کوشش و فکر ہر شخص کا فرض ہے فقط -

راقم کشن پرشاد کول

گلزار نسیم

(بقیہ مضمون مندرجہ اردوی معلی بابت نومبر ۱۹۰۵ء)

(ج) حضرت شرر نے اکثر یہ دلیل پیش کی ہے کہ میر و سودا کی سندیں بیکار ہیں، کیونکہ نسیم کے زمانے میں میر و سودا کی زبان متروک ہو چکی تھی - حضرت موصوف کا یہ خیال اردو زبان کی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے - نسیم کے زمانے میں میر و سودا کی زبان ترک ہو رہی تھی اور ناسخ و آتش اک نیا "اسلوب زبان" قائم کر رہے تھے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ آتش و ناسخ کی طرف سے یہ اعلان وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے کہ فلاں تاریخ سے فلاں محاورہ ترک کر دیا گیا - اب اگر اسے کوئی نظم کریگا تو وہ قانوناً مجرم خیال کیا جائیگا - برعکس اسکے اسوقت کی حالت اک انقلابی حالت تھی قدیم محاوروں کی فصاحت اور عدم فصاحت کے باب میں مختلف رنگ کی مختلف طبیعتیں ایک دوسرے سے متفق نہ تھیں - اور تقاضائے فطرت انسانی بھی یہی تھا - پس جو محاورہ ایک استاد قابل ترک خیال کرتا تھا دوسرا اسی کو فصیح سمجھتا تھا - مثلاً شیخ ناسخ فرماتے ہیں ؎

گرمی رخسار سے بیمار ہو گئی چشم یار	دہوپ کی شدت سے آہو کا گلا ہو جائیگا

یا ع ابتو ناسخ زور رند لاابالی ہوگیا

آتش نے کاتلا اور زور کو متروک قرار دیا ہے۔

"پہ ہی" تیر و سودا کے وقت میں، دور کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ آتش نے اس لفظ کو متروک قرار دیا ہے۔ مگر آتش ہی کے شاگرد حضرت رند فرماتے۔

ع پرے مجنوں کے جنگل سے بھی کوسوں وہ بیاباں تھا

آتش نے "جان" کو مونث کہا ہے۔ مگر رند کہتے ہیں ؎

مجھے دیکے دل جان کھونا پڑا ہے — غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

یہ بھی طرز قدیم کی پیروی ہے۔

"کبھی" کے بدلے "کبھو" آتش کے یہاں نہ ملیگا۔ مگر آتش کے شاگرد صبا کے شاگرد نواب مرزا شوق زہر عشق میں فرماتے ہیں ؎

آشنا دوست آگئے جو کبھو — جسنے دیکھا نکل پڑے آنسو

طوالت مضمون مانع ہے۔ ورنہ اس قسم کی متعدد مثالیں دیجا سکتی ہیں۔ پھر اگر نسیم نے "چکیے" "اور بیچا ہوا" وغیرہ نظم کرنے میں سودا و میر کی پیروی کی تو کیا گناہ کیا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہی زمانے میں قدیم محاوروں کے ترک کرنے پر سخت اختلاف ہے۔ حضرت جلال نے (اور اکثر اساتذہ لکھنو نے) "مگر" کی جگہ "پر" اور "تک" کی "تلک" نظم کرنا ترک کر دیا ہے۔ مگر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے ان قدیم محاوروں کو متروک نہیں قرار دیا ہے۔ اور اکثر اساتذہ حال اس معاملے میں انکے ہم خیال ہیں۔

(د) حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ فارسی کا شعر اردو میں حجت نہیں ہوسکتا مگر یہ صحیح نہیں ہے آتش نے کسی مشاعرے میں غزل پڑھی جسکے کسی شعر میں "بحر کافور" نظم کیا تھا۔ طالب خاں عیشی نے سر مشاعرہ "بحر کافور" پر اعتراض کیا۔ آتش نے سند میں

---

۵۷ امیر { ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں ✦ پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
اس بت نے نکالا تھا اگر مجھ تلک آتا ✦ کیوں بیٹھ رہا خانہ اللہ میں قاصد }

جامی کا شعر پڑھا ؏

دو پستانش بہم چوں قبہ نور — حبابے خاستہ از بحر کافور

ذوق مرحوم کے اس مصرع (یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے ہے) پر اعتراض ہے کہ "جا" کے بدلے "جائے" غلط ہے۔ محمد حسین صاحب آزاد "آب حیات" میں اس اعتراض کی تردید میں کسی فارسی استاد کا شعر پیش کرتے ہیں ؏

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے — بہ نیروے شخصے برآید ز جائے

اسی طرح اس دعوی کے ثبوت میں متعدد مثالیں مل سکتی ہیں کہ فارسی کی سند اردو میں حجت مانی گئی ہے پھر اگر "بحر کافور" کے لئے فارسی کی سند حجت ہو سکتی ہے تو "خالی چنگال" نے کیا قصور کیا ہے۔

بیشک "عربی" کی سند اردو میں نہیں حجت ہو سکتی۔ کیونکہ متعدد الفاظ ایسے ہیں جنکے معنی عربی میں کچھ اور ہیں اور فارسی میں داخل ہوئے پر انکے معنوں میں عظیم تغیر واقع ہو گیا ہے۔ اردو میں بیشک جو فارسی الفاظ مستعمل ہیں وہ عموماً انہیں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جن معنوں میں کہ وہ فارسی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پس اردو کے لئے فارسی کی سند تو حجت ہو سکتی ہے مگر عربی کی نہیں۔ حضرت شررؔ نے "لہجہ" کا مفہوم عربی کے لغت سے قائم کیا ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تماشا و سیر عربی میں فقط رفتار کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر اردو و فارسی میں اسکے معنی اور ہیں "اخلاص" عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں مگر فارسی اور اردو میں محبت اور پیار کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مشاطہ عربی میں محض "کنگھی" کو کہتے ہیں مگر فارسی اور اردو میں اُس عورت کو کہتے ہیں جو بناؤ سنگار کرتی ہے۔ اسیطرح "لہجہ" کے معنی عربی میں "زبان" کے ہیں مگر یہ ضرور نہیں کہ فارسی اور اردو میں بھی اسکا یہی مفہوم ہو۔

(د) "حمل" کے متعلق حضرت شررؔ نے واجد علیشاہ کی سند اسلئے نہیں مانی ہے کہ ان کا

؏ لفظ "حمل" پر حضرت شرر کا جو اعتراض تھا اسکی تائید میں حضرت موصوف نے اپنے جواب الجواب میں گلزار نسیم کا ایک مصرع پیش کیا ہے یعنی ؏ خورشید حمل ہوا نمودار۔ مگر حضرت شرر اس مصرع کے معنی نہیں سمجھے ہیں اس مصرع میں "حمل" سے "برج حمل" مراد ہے۔ جیسا کہ سیاق کلام سے ثابت ہے۔ وہ شعر اک اور نئے بنایا + بیں ماندہ کا بیشہ تا بہ آیا + بیٹے کو نقل لے دیا بار + خورشید حمل ہوا نمودار + وہ ورکہ صدف ماہ الورہ + وہ سیج کہ نذر نے آنکھ جسے سیرے

کوئی اُستاد نہ تھا۔ اسکا جواب میرے جولائی والے مضمون میں موجود ہے۔ یعنی بہار ہند و امیر اللغات میں واجد علی شاہ کے کلام سے سند لی گئی ہے۔ علاوہ اسکے لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ واجد علیشاہ ناسخ کے شاگرد رشید فتح الدولہ برق کے شاگرد تھے۔

"حیا اٹھانے" کی نسبت حضرت شرر کا یہ ارشاد ہے کہ مرزا محمو بیگ نے بہار ہند میں چونکہ اس محاورے کے متعلق کوئی شعر سند میں نہیں پیش کیا ہے لہذا یہ محاورہ غلط ہے۔ کیونکہ مرزا صاحب مرحوم بالذات کوئی سند نہیں ہیں اگر بفرض محال یہان ہی لیلیا جائے کہ مرزا صاحب مرحوم بالذات سند نہیں ہیں تب بھی حضرت شرر کی تاویل کی تردید نہایت آسانی سے ممکن ہے۔ کیونکہ بہار ہند کے دیباچے میں مرزا محمو بیگ نے صاف الفاظ میں لکھدیا ہے کہ جس محاورے کی سند نہیں درج ہے "اُسے بھی بحث کر کے چھان لیا ہے فقط اپنی سمجھ پر بھروسا نہیں کیا ہے" (بہار ہند صفحہ ۶)

(س) اس مضمون میں بھی حضرت شرر نے مجھے حسب دستور سابق تصرف بیجا کا ملزم قرار دیا ہے۔ آپکا یہ خیال ہے کہ اصل شعر یوں ہے ؎

لہر پر چڑھ رہی ہے کالوں کی | بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

اور میں نے اسمیں یہ تصرف کیا ہے کہ "لہر" کے جگہ "پہر" بنا دیا ہے۔ یعنی (زہر عشق)

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی | بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
(زہر عشق)

جب ۱۱ - مئی کے اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین صاحب نے "لہر" کی سند میں یہ مصرع (پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی) پیش کیا تھا تو حضرت شرر کیجانب سے کسی گمنام شخص نے یہی تاویل پیش کی تھی مگر منشی صاحب موصوف نے اپنے ایک مضمون میں (جسکا عنوان تھا مولانا بدر الشرر کی گلزار نسیم میں خاک بیزی) سیاق کلام سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ "پھر" کا لفظ اس شعر کے شروع میں ہونا لازمی ہے۔ یعنی اس شعر کے پہلے بھی اور بعد میں بھی دو تین شعر "پھر" سے شروع ہوتے ہیں۔

پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار | کر لو پھر ہم کو بھیچ بھیچ کے پیار
پھر مرے سر پہ رکھدی سر اپنا | گال پہ گال رکھدے پھر اپنا

پھر اسیطرح مونھ سے مُنہ کو ملو — پھر وہی باتیں پیار کی کر لو
پھر لہر چڑھ رہی ہے کانوں کی — بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھا لو تم — پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر لبوں کو چبا کے بات کرو — پھر ذرا مُسکرا کے بات کرو

اگر درمیان میں ایک شعر "پھر" سے نہ شروع ہو تو کسقدر کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے

حضرت شرر نے اپنے دعوی کی تائید میں دو دلائل پیش کئے ہیں، ولاً یہ کہ نواب مرزا نے ایک جگہ "لہر" کا لفظ بسکون "ہا" نظم کیا ہے اور ثانیاً یہ کہ یہ شعر زہر عشق کے غلط سے غلط ایڈیشن میں اسیطرح ملا (کسی ایڈیشن کا نام حضرت شرر نے تحریر نہیں فرمایا ہے مثلاً مطبع علی بخش یا فخر المطابع وغیرہ کا ایڈیشن)

حضرت شرر کی پہلی دلیل کے نسبت اسقدر عرض کرنا کافی ہے کہ نواب مرزا شوق نے کبھی "ہی نظم کیا ہے - اور میر و سودا کی پیروی میں "کبھو" بھی نظم کیا - ہے اسطرح "لہر" کے دو تلفظ اسوقت جائز تھے انہوں نے دونوں نظم کئے ہیں - اور ایسا کہنا ناممکنات سے نہیں ہے - مختلف اساتذہ نے ایسا کیا ہے میر حسن نے اپنی مثنوی میں "برس" بھی نظم کیا ہے اور "برس" بھی

میر حسن { یہ لڑکا تو ہوگا ولی کیا کریں — خطر ہے اسے بارھویں برس میں
{ نہ نکلے یہ بارہ برس شک، مہ — رہے [illegible] برج میں، یہ مہ چاردہ

یا لفظ "طرف" دو طرح پر نظم کیا ہے -

میر حسن { کنیزاں سرو کی ہر طرف ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
{ شتابی سے اُٹھ ساقی سیمبر — کہ چار و نظرف ماہ ہے جلوہ گر

سودا { مرض بہ بین و سبب جو و خود معالجہ کن — طبیب کیست فلاطون اگر تو بیمار
{ اگر عیادت مرضے کند عدالت تو — جسد بقاعدہ اعتدال نبض سقیم

[illegible] { گردوں پہ رنگ چہرہ مہتاب فق ہوا — سلطان غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا
{ اعدا کی نظم و نسق کی صورت بدل گئی — تیغ دو دم عرب کے ضمیر سا پہ چل گئی

اب رہا "غلط سے غلط" ایڈیشن کا خیال اسکے نسبت دو اک باتیں غور طلب ہیں۔ "فریب عشق" مطبع ہونا قانوناً ممنوع ہے۔ اسکے قلمی نسخے لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ میری نظر سے جو قلمی نسخہ گزرا اس میں "ہم" ہر اہر" تہا۔ کسی مطبوعہ نسخے میں ممکن ہے کہ "ہر اہر" چہپا ہو۔ مگر سیاق کلام سے اسکی تردید ہوتی ہے۔ "فریب عشق" کے "غلط سے غلط ایڈیشن" میں چہپا ہے ؎

	فرق اتنا تہا ہم میں اور اسمیں	رندی آخر تہی آگئی دم میں	

مگر عقل سلیم کا اشارہ یہ ہے کہ پہلا مصرع اصل میں اسطرح ہوگا۔ ع

فرق اتنا تہا اس میں اور ہم میں

اب دوسرے "تصرف بیجا" کا حال ملاحظہ ہو۔

""نظر کرنے" کی سند میں میں نے لکہا تہا کہ غیاث اللغات صفحہ ۴۸۲ "نظری۔ انچہ بدان نظر کنند و منظور بود۔ لفظ نظر او عطاں باشد۔ ایں اصطلاح اہل نذر است۔

حضرت شرر فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ مصنوعی ہیں اور مکیبت کے "بنائے ہوئے ہیں" حالانکہ "منشی نولکشور کے مطبع کے غیاث اللغات میں (جو کہ محشی" بہ نسخہ چراغ ہدایت مصنفہ خان آرزو ہے) یہی الفاظ صفحہ ۴۸۲ کے حاشیے پر موجود ہیں۔ چونکہ "نولکشوری ایڈیشن" نوے فیصدی لوگوں کے پاس موجود ہے لہذا میں نے محض "غیاث اللغات" لکہنا مناسب سمجہا۔ اور ایک غلطی اور ہوئی کہ حاشیہ صفحہ ۴۸۲ کے بدلے محض "صفحہ" میرے قلم سے نکل گیا۔ خیر اب میں حضرت شرر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ منشی نولکشور مرحوم کے مطبع کے غیاث اللغات کے صفحہ ۴۸۲ کے حاشیے پر جو نسخہ چراغ ہدایت منقول ہے اسکی سطر ۲۶ ملاحظہ فرمائیں تو انپر ان "مصنوعی الفاظ" کی حقیقت آئینہ ہوجائیگی۔

اس مضمون میں حضرت شرر نے مجہے یہ دوستانہ نصحت فرمائی ہے کہ "سچ یہ ہے کہ انسان اگر عقل صائب سے کام لے تو بہت سی دشواریاں دور ہوجایا کریں" مگر حضرت موصوف اسپر کم عمل کرتے ہیں ورنہ یہ "تصرف بیجا" کا الزام مجہہ پہ نہ عائد فرماتے۔

(باقی مضمون کے لئے دیکہو ضمیمہ اردوئے معلی یعنی صفحہ ۴۸ کے بعد۔)

غزلیات حضرت سید الشعراء مولانا شاد خان بہادر عظیم آبادی

پھر گئے راستے سے وہ گرد غبار دیکھ کر | رہ گئی مری بیکسی سوئے مزار دیکھ کر
تنگ نگر غار کو مان امی مری دل گرفتگی | جائیں گے خود قفس میں ہم اُن کی بہار دیکھ کر
رنج والم میں کون وی ساتھ بلا نصیب کا | چھوڑ دیا اُس نے دل کو فگار دیکھ کر
گزری ہوئے گلوں کی شکل آنکھوں میں اپنے پھر گئی | اور بھی دل تڑپ گیا ابکی بہار دیکھ کر
کوچۂ یار میں بھلا جانے کی اپنے مشکل کیا | یاس ہو جب امید کو جسم نزار دیکھ کر
شبنم اگر ہے چشم نم خندہ زناں ہی عندلیب | دونوں پہ دو اثر ہوئے ایک بہار دیکھ کر
وصل و فراق کی خبر کچھ بھی نہیں بتاؤں کیا | چھا گئی بیخودی یہاں نامۂ یار دیکھ کر

۱۸۸۵ء

شاد خلش جو دل میں تھی اُس کا بیان کر دیں کیا
اُن کے گلے میں صبح کو رات کا ہار دیکھ کر

حسن اگر ہو تو خود نمائی کر | چھوڑ دے بندگی خدائی کر
صفتِ نیک کو نہ کر بدنام | پارسا ہو تو پارسائی کر
بدنما ہو چلے ہیں ناخنِ غم | خونِ دل سے انہیں حنائی کر
لیکے قاصد پیام یار آیا | دیکھ اے روح پیشوائی کر

جب اُس آئینہ رو کی ہے یہ خوشی
شاد جا غیر سے صفائی کر

ہیں شاد تنہا اک طرف۔ دُنیا کی دُنیا اک طرف | سارا سمندر اک طرف۔ آنسو کا قطرا اک طرف
اُس آفتِ جاں کو کبھی پردہ اٹھانا ہی نہ تھا | اک سمت عیسیٰ دم بخود غش میں پڑا ہے موسیٰ اک طرف
ساقی بغیر سوال یہ ہو تجا میخانے کا اب | جام اک طرف ہے سرنگوں۔ خالی ہے صہبا اک طرف
دیدارِ جاناں کا بھلا کیونکر تحمل ہو سکے | ترچھی نگاہیں اک سُو۔ زلفِ چلیپا اک طرف

وہ تیغ لیکے کھنچتے ہیں۔ دیکھیں تو حق پر کون ہے
ہم اک طرف۔ شاد اک طرف۔ سارا زمانا اک طرف

غزل

سر پہ کلاہِ کج دھری زلفِ دراز خم بخم / آنکھ ہے چشم ہی غضب ترکِ نگاہ ہی ستم
چاند سی منہ پہ خال دو ایک ذقن پہ جیسے ایک / اُس سی خرابی عرب۔ اس سی تباہی عجم
عشوہ دلگداز وہ۔ ذبح کری جو بے چھری / ناز وہ دشمنِ وفا رحم کی جسکو ہے قسم
ایک تھا اپنے پاس دل غیر کے ہاتھ ہیں وہی / اک رہی اپنی زندگی وہ کہیں آرزو ہے کم
وقتِ عزیز جو گیا اُسکا محال ہے وجود / جتنے زمانے طے کئے طے ہوئی منزل عدم
نرگسِ پرخمارِ یار کرتی ہی کام زہر کا / بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم

طولِ کلام بے محل شاد اگرچہ عیب ہے
لکھتے کچھ اور حالِ دل حیف کہ رک گیا قلم

دل گیا سینے سے جب اپنے تو آزادی کہاں / جسکا مالک مرگیا اُس گھر میں پھر شادی کہاں
اُس گلی کی خاک جتنی چھاننی ہو چھان لیں / ای اجل پھر ہم کہاں اور دل کی بربادی کہاں
لاش اُٹھانے میں لیا اُس نے سہارا غیر کا / خرچ کی ہی نازکی نے ہاتھ کی بیدادی کہاں
گھر میں اپنی دی جگہ آخر عروسِ قبر نے / کھینچ کر لائی ہے ہم کو خانہ دامادی کہاں
ہی جگر میں کچھ دنوں اور کچھ دنوں دل میں قیام / چھوڑ کر اپنا محلہ جائے بربادی کہاں

پھرتے پھرتے عالمِ وحشت میں جا نکلے تھے شاد
خضرِ دشتِ غم سے چلائے کہ یا ہادی کہاں

مطلع

نہ میفروش۔ نہ بلبل۔ نہ بادہ خوار ہوں میں / سبب ہے کچھ جو تمناکشِ بہار ہوں میں

مطلع

قابلِ بیاں کی ہجر کی روداد بھی نہیں / سچ پوچھتے ہیں آپ تو اب یاد بھی نہیں

مطلع

بدعہد وہی۔ بلکہ دل آزار وہی ہیں / سب کچھ ہیں۔ مگر پھر مری غمخوار وہی ہیں
نعمت ہیں حسرتیں جو دلا انتہا کی ہیں / آخر نشانیاں یہ کسی آشنا کی ہیں

غزل

اُنھیں دیکھو کہ ابتک غفلتوں سے کام لیتے ہیں
ہمیں دیکھو کہ بے دیکھے اُنھیں کا نام لیتے ہیں

نکلکر دل سے جب دم آہ سینے میں اٹکتی ہے
مریضانِ جفا جُھک کر کلیجہ تھام لیتے ہیں

ہوا ناسور سینے میں تو دل شمعِ سحر کیونکر لا
ادھر ہم کام کرتے ہیں ادھر انعام لیتے ہیں

گریباں پھاڑنا سیر چمن ناحق سکھاتی ہے
انہیں ہاتھوں سے میکش میکدے میں جام لیتے ہیں

نظر بھر کر کہاں ساقی کی آنکھیں دیکھنے پائے
یہ تہمت مفت کی رنداں ہی انجام لیتے ہیں

نئے غم میں پھنسنا تا ہے فلک لیتا دیا قسمت
اگر بھولے سے نام راحت و آرام لیتے ہیں

مطلع

ہیں اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں
کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

غزل

۱۸۸۰ء

کبھی دم بھر گرہ دل کی بمشکل کھول لیتے ہیں
بہت کچھ صبر کرتے ہیں تو ہم ہنس بول لیتے ہیں

بظاہر کوئی اندازہ نہ ہوا انکی نزاکت کا
مگر جو تولنے والے ہیں سب کچھ تول لیتے ہیں

اُمید و آرزو جانے یہ بھی عادت نہیں جاتی
اسیرانِ قفس دیوار سے ہنس بول لیتے ہیں

نہیں آتا ہے رونا جب تلک کہوتے نہیں دلکو
ہوا ہر شے قیمت دے کے موتی مول لیتے ہیں

اسیروں کو صبا مژدہ بہار آنیکا دیتی ہے
جو اُڑنے کی نہیں طاقت فقط پر تول لیتے ہیں

نہیں ہے کوئی قابل گفتگو کے شاد دنیا میں
ضرورت بھر کو ہو کافی ہم اتنا بول لیتے ہیں

نازِ کرشمہ ساز کیوں۔ غمزۂ دلنواز کیوں
سب تو ہیں تیرے مبتلا اسپہ یہ امتیاز کیوں

دل ہے کدھر کہاں چھپا۔ مد نظر ہے کسکا حسن
کیا کہوں اسکی وجہ کو ترک ہوئی نماز کیوں

ہمسے اگر ہوا نہ ضبط۔ ہمنے کیا جو کچھ کیا
ہمپہ اگر نہ تھا وثوق ہمسے بیانِ راز کیوں

قامتِ فتنہ خیز کو خواہشِ حشر کس لئے
بازیٔ نو کی فکر میں نرگسِ نیم باز کیوں

اسکے اُجاڑنے کی فکر خود ہمیں مدتوں سے تھی
دلکا مرے عدو ہوا نالۂ جانگداز کیوں

شاد سخن کی جان ہے بادہ و نغمہ و سرود
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں

غزل

اُلفت بتوں کی حق ہی ہمارے یقین میں
چھوڑیں جو اسکو ہم تو خلل آئے دین میں

وہ حسرتیں لحد میں ہیں دُنیا تھی جن سے تنگ
وسعت کہاں کی آگئی دو گز زمین میں

ای چشم اشکِ خون کی روانی میں ہے کمی
ایسا نہ کر کہ داغ لگے آستین میں

آب و ہوا ہمیں نہیں دُنیا کی سازوار
اب جا رہیں گے اور کسی سرزمین میں

چاہے خنا تو گورِ غریباں کی سیر کر
دُنیا کی دولتیں ہیں اسی سرزمین میں

اُن سے نمازِ عشق ادا ہو محال ہے
اٹکیں جو آکے مدّ و ولا الضالین میں

روکو سمندِ فکر کی الیشاد اب لگام
بیکار خاک اُڑاتے ہو کیوں اس زمین میں

خضر کیا ہم تو اس جینے میں بازی سب سے جیتے ہیں
دم اب اُکتا گیا اللہ اکبر کب سے جیتے ہیں

سمجھ لے قاصدوں نے کچھ تو ایسی ہی خبر دی ہی
کہیں کیا تجھسے ای ناصح کہ کس مطلب سے جیتے ہیں

کسی صورت نہ مجھسے بڑھ سکے گی رات فرقت کی
کہ ہم بازی سیہ بختی میں بھی اس شب سے جیتے ہیں

اسے باور کرای غمخوار کب کے مر چکے تھے ہم
پیامِ وصل جب سے سن لیا ہی تب سے جیتے ہیں

زبانیں منہ میں ہیں سننے کو تشبیھیں سنے جاؤ
نزاکت میں کبھی اوراقِ گل اس لب سے جیتے ہیں

عبث دریافت کرتے ہو سبب اس سخت جانی کا
خدا معلوم ہم الیشاد کس مطلب سے جیتے ہیں

مطلع

رسوائیوں کی حد نہ رہی تیری راہ میں
حد ہی کہ خود ذلیل ہوں اپنی نگاہ میں

فنا کو چھد لحد پر وہ آکے روتے ہیں
کہاں کی چھیڑ نکالی ہے کہ ہم سوتے ہیں

اک غم فقط نہیں ہی دلِ ناشکیب میں
ایسے پڑے ہوئے ہیں بہت اپنی جیب میں

سینہ ہی ہمسے داغ داغ۔ چھلو دل فگار ہیں
سیری تو اصل کیا بھلا۔ مجھسے وہاں ہزار ہیں

کیا ہی سو شوق ہی نہ ظلم کریں جفا کریں
یہاں ہی خوشیوں سے کام نہ کریں تو کیا کریں

غزل جناب ... صاحب بیخود بدایونی

کبھی نظر سے ... دل مضطر جانا
سن لیا ... مر جانا
ساتھ ساتھ اہل تمنا کا وہ مضطر جانا
رہبری کرکے مری خضر بھی چکر میں پڑے
داغ گر حوصلگی دلکو گوارا ہو ا
ہدف ناوک بیدرد بنا رکھا ہے
کبھی بیدل نہ ہوے بادکشان الفت
جب کہا اُن سے کہ مرتے ہیں تو ہنسکر بولے
فکر پرسش سے کسیکی وہ پریشانی ہائے
سادگی سے یہ گماں ہے کہ بس اب ... آیا

... جانا
سبب ترک ستم ... جانا
اللہ اللہ ہے ترا بزم سے اُٹھکر جانا
اب انہیں ... میں اکثر جانا
ورنہ کچھ ہجر میں دشوار نہتا مر جانا
کیا ... کو مرے آپنے پتھر جانا
دور ... کو بھی دورہ ساغر جانا
زندگانی کا تو انجام ہی ہے۔ مر جانا
دادخواہ ... نہ وہ میرا سر محشر جانا
مطمئن ہوں کہ مجھے آپنے مضطر جانا

نشہ میں بھی ترے بیخود کی تعلی نہ گئی
بادۂ ہوش ربا کوئے کوثر جانا

غزل جناب مولوی حکیم عبد الہادی خانصاحب وفا رامپوری

اب چھوٹتے ہیں قید غم زندگی سے ہم
وہ التفات خاص ہے اور یہ فریب عام
جیتے بھی ہیں تو جیتے ہیں مرنیکی آس پر
پھر جنت امید ہے اور باغبان شوق
رسوائیوں کو مژدہ ہو کھل کھیلتے ہیں پھر
... ہے صراحی و مینا کہ لائے ہیں
... صبح قیامت کا قافلہ

فرصت کو ہو نوید کہ جاتے ہیں جی سے ہم
روتے ہیں دشمنی کو تری دوستی سے ہم
مرتے بھی ہیں تو مرتے ہیں کس بیکسی سے ہم
پھر رنگ اُڑا رہے ہیں تری سادگی سے ہم
اک جلوۂ شباب کی بے پردگی سے ہم
جوئے شراب میکدہ بیخودی سے ہم
باقی ہے رات اور چلے ہیں ابھی سے ہم

پاسِ وفا ہی ہے تو نبھائیں ایو فا
جو دل میں بات ہو نہ کہینگے کسی سے ہم

غزل اقبال بیگم صاحبہ از امرتسر

مجھے دُنیا مٹانے کے لئے کیا کیا ترستی ہو
کہ گویا صورتِ نقشِ کفِ پا میری ہستی ہے

ہزاروں حسرتیں رونق فزائی خانۂ دل ہیں
مری اُجڑی ہوئی گھر میں بڑی مخلوق بستی ہے

نہیں کہلتا کہ میں کسواسطے ہوں کون ہوں کیا ہوں
عجب سرِ نہاں دنیا میں یارب میری ہستی ہے

تری نظرِ دنیہ چڑھ جانا تری نظروں سے گرجانا
سرِ راہِ محبت یہ بلندی ہے وہ پستی ہے

گھٹا ادبار کی چھائی ہوئی ہے قوم کے سر پر
الٰہی تیری رحمت کی جگہہ حسرت برستی ہے

وہی یہ قوم ہے جو شائقِ علم و لیاقت تھی
وہی یہ قوم ہے جو محوِ عیش و مے پرستی ہے

وہی یہ قوم ہے دُنیا میں جو مخدومِ عالم تھی
وہی یہ قوم ہے جو اب حکومت کو ترستی ہے

وہی یہ قوم ہے جسکے نصیبو نمیں بلندی تھی
وہی یہ قوم ہے جسکی بلندی آج پستی ہے

ہُمائے دولت و حشمت کا سایا ڈھل چکا سر سے
قدمبوسِ مسلمانانِ عالم تنگ دستی ہے

کوئی اُٹھتا نہیں اب قوم کی مشکل کشائی کو
الٰہی اسمیں تیری احتیاجِ پیش دستی ہے

نہ پوچھیہ ای زاہدِ نافہم تو اقبالؔ کا مذہب
کہ کعبے کیطرح اسمیں بہی جا بُت پرستی ہے

کچھ عرضِ حال کرنے نپائے کسی سے ہم
کسطرح شکوہ سنج ہوں بیخودی سے ہم

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آگئی تہی آج
سو کتنے شرمسار ہوئے بیکسی سے ہم

اللہ ری مزاج کی حسرت پرستیاں
گویا کہ آشنا ہی نہیں ہیں ہنسی سے ہم

ہمدردی الم سے بڑھا اور بہی الم
باز آئے ہمنشیں تری اس دوستی سے ہم

وہ بر سرِ جفا ہیں تو ہم مائل وفا
تنگ آگئے ہیں شوق کی دلبستگی سے ہم

ابر بہار میں نہ ہوائے جناں رہی
یعنی نہ ہاتھ کہینچ سکے میکشی سے ہم

کسدرجہ دلپذیر ہے حیرانیٔ جنوں
فارغ ہیں شوقِ عزت فرزانگی سے ہم

[illegible]

گلزار نسیم (سلسلے کے لئے دیکھو صفحہ ۱۳ رسالہ ہذا)

(ش) اعتراض نمبر ۳ - کے جواب میں اصل دلیل میں نے یہ پیش کی تھی کہ لفظ "نرالا" (دیکھا تو یہ ہی شگون نرالا) سے یہ
کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنف قصہ نے اس واقعے کو (بیٹوں نے بگاڑ دیا دکھا سانپ) خود حیرت انگیز اور بر خلاف قانون قدرت
ظاہر ہے - اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر بفرض محال یہ اعتراض صحیح مان لیا جائے تب بھی یہ الزام اس شخص کے سر ہے جسنے قصے کے
واقعات کو مرتب کیا ہے۔ حضرت شرر اصل جواب کی تردید میں تو قاصر ہیں محض آپنے یہ لکھدیا ہے کہ "مذہب عشق" میں یہ واقعہ
موجود نہیں ہے۔ یہ جواب کافی نہیں ہے۔ گل بکاولی کا قصہ اصل میں سنسکرت کا قصہ ہے۔ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا اور فارسی
سے اردو میں مختلف حضرات نے اسکے ترجمے کئے۔ خدا جانے نسیم نے کس ترجمے کو نظم کیا ہے۔ "مذہب عشق" میں اکثر حکایتیں ایسی ہیں
جو گلزار نسیم میں دوسری طرح پر نظم ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ وہ ترجمہ نہیں ہے جو گلزار نسیم کی تصنیف کے وقت نسیم کے سامنے تھا۔

خیر مجھے اس جگہ پہ زیادہ سروکار نہیں ہے۔ میں نے تو لفظ "نرالا" سے ثابت کر دیا تھا کہ حضرت شرر کا اعتراض بیجا ہے
اسکا کچھ جواب ابھی تک نہیں عنایت ہوا ہے۔ "فاختہ پر باسنے" کی نسبت بھی یہی جواب کافی ہے۔

(ص) حضرت شرر نے چند ایسی تاویلیں پیش کی ہیں جنکا جواب دینے میں مجھے شرم آتی ہے۔
مثلاً "جوابات" نمبر ۴ - ۵ - ۶ - ۲۱ - ۲۷ میں عمداً سیاق کلام سے چشم پوشی کیگئی ہے۔ اور درمیان سے ایک فقرہ
چن لیا گیا ہے اور اسپر بحث کی گئی ہے۔ "حلقۂ در" کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصب عقل سلیم پر
کسقدر غالب آسکتا ہے خصوصاً "پان کے بیڑے" کی نسبت یہ ارشاد کہ "قبلہ صاحب اور امیر کے شعر میں پان کا بیڑا اٹھانا
نہیں ہے مگر نسیم کے مصرع میں بدنما ہے" واقعی لاجواب ہے۔ مگر میں کہونگا کہ اور اسناد کی نسبت ناحق حضرت شرر نے
اسقدر تاویلیں "پیدا کرنے" کی زحمت گوارا فرمائی۔ ہر سند کے جواب میں یہی الفاظ کافی تھے۔

جواب نمبر ۱۴ کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ ناسخ کی شعر میں تو مطبع کی غلطی سے ستم پیدا ہو گیا ہے اور اگر ایسی غلطی ہو سکتی
ہے تو نسیم کے ایسے شاعر سے۔ یہ منطق بھی علمی مباحثوں کے لئے نہایت نامناسب ہے۔ اسیطرح "تقلید لفظی"، "تمہ پاہوں"
"شتر گربہ"، "دہ کل"، "داناتی"، "سادہ"، "دست یافتن"، وغیرہ کی نسبت جو تاویلیں پیش کی گئی ہیں اور جو نازک فرق
اور نحوی مسئلے ایجاد کئے گئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے حضرت شرر کے ذیل کے فقرے کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

"کہ گلزار نسیم کا کوئی شعر نہ کسی حسن سے خالی ہے نہ کوئی شعر عیب سے پاک ہے"، مگر یہ فقرہ جس
کیفیت دماغی کا اشارہ کرتا ہے وہ قابل افسوس ہی نہیں ہے بلکہ قابل رحم ہے اور اسلئے قابل معافی ہے۔

مجکو اپنے عنایت فرما حضرت شرر سے ایک دوستانہ شکایت اور ہے یعنی آپنے اس مضمون میں مجکو اور میرے ہمخیال در

ہم قوم حضرات کو پرش بیجا کے الفاظ کا مجرم قرار دیا ہے۔ فقرات مندرجہ بالا کی بجائے واقعی کیا بیجا ہوا اگر کسی حضرات میرے خلاف الکشن کی مجلس اور ان انڈائنے میں سرگرم ہیں کہ میں نے نسیم کے مقابلے میں آتش وناسخ کو مٹا دیا ہے بلکہ ان کا اعلان بلند باتیں کر لیں مگر ایسے حضرات سے مجھے شکایت نہیں۔ کیونکہ الخلق یشبہ یہی ہے بیشک حضرت شرر کا یہ طنز آمیز فقرہ انصاف کے خلاف ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا (چکبست کا) اور اسکے ہم خیال اور ہم قوم لوگوں کا جوش کس مذاق کا ہوتا ہے اور میں نے اس بحث کے متعلق صرف تین مضمون لکھے ہیں ایک جولائی کے اردوئے معلی میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا ۱۱ اگست کے اودھ پنچ میں شائع ہوا اور تیسرا ۱۸ ستمبر کے اودھ پنچ میں شائع ہوا ہے۔ میں حضرت شرر سے استدعا کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے مندرجہ بالا الفاظ کسی قسم کی ذمہ داری کے خیال سے لکھے ہیں تو مجھے بتائیں کہ میرے کس مضمون سے جوش بیجا کا اظہار ہوتا ہے اور میں نے کس مقام پر دائرہ تہذیب سے باہر قدم رکھا ہے۔

میری تائید میں منشی احمد علی صاحب شوق۔ منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ حضرت شوق کا مضمون نہایت سنجیدہ اور مدلل تھا۔ منشی سجاد حسین صاحب کے مضامین میں بیشک ظرافت کا چٹخارہ موجود تھا مگر کسی مقام پر جوش بیجا کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ اڈیٹر صاحب اردوئے معلی نے بھی بحیثیت مجموعی مجھ سے اتفاق ظاہر کیا تھا۔ (یعنی گلزار نسیم نسیم ہی کی تصنیف ہے اور اسکی زبان لکھنؤ کی زبان ہے) انکی تحریر میں بھی کوئی جملہ خلاف تہذیب نہ تھا۔ بیشک حضرت شرر نے نسیم کو کنا بیا اور اشارتاً "ان پڑھ" "جاہل" "بدتمیز" اور اس قابل کہ لکھنؤ سے نکالدیا جائے" وغیرہ کہا ہے یا حضرت شرر کے کلام میں "نسیم کی شان میں اور میری لئے جو ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں انکا اعادہ اردوئے معلی کے ایسے مہذب پرچے میں نہیں ہو سکتا۔ مگر نہ میں نے نہ میری کسی ہم قوم نے ان تحریروں کا جواب شرر کی بہ طرز دینا پسند کیا اب انکی شکایت انصاف سے خالی ہے۔ آپ ہی جور کرو آپ ہی گلہ کرو اگلا۔ یہ صاحب روش اُلٹی ہے زمانہ اُلٹا

حضرت شرر فرماتے ہیں کہ انہوں نے نسیم کو زباں دانوں کے زمرے سے اسلئے نہیں خارج کرنا چاہا ہے کہ وہ ہندو تھے بلکہ محض اُردو زبان سے ہمدردی ظاہر فرمائی ہے۔ اگر واقعی حضرت شرر نے صدق دل سے ایسا لکھا ہے تو مجھے اختلاف ظاہر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بیشک اتنا ضرور کہونگا کہ حضرت شرر کے دل میں جاہئے جسقدر اتحاد و محبت کے چشمے موجزن ہوں مگر انکی طرز تحریر سے کچھ اور پایا جاتا تھا ایسی حالت میں حضرت شرر کو لازم تھا کہ وہ ذرا اعتدال سے کام لیتے۔ تاکہ انکی صفائی باطنی پر مصنوعی تعصب کا پردہ نہ پڑ جاتا۔ ؎ من محو جیرانم کہ خشنا سند رنگ تحقیق ترا۔ پاسبان حسن پاکت خوشتن بودن خوش است

نوٹ۔ اڈیٹر صاحب اُردوئے معلی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہمکو مسٹر چکبست کی انصاف پسند طبیعت سے امید ہے کہ ... انکو ہماری اس امر کے ماننے میں کچھ عذر نہ ہوگا کہ نسیم کا کلام غلطیوں سے پاک نہیں ہے" مجھکو بیشک اس سے انکار نہیں ہے کہ نسیم کا کلام غلطیوں سے پاک نہیں ہے" مجھکو انکار ہے تو حضرت شرر کے اس دعوی سے کہ نسیم کے کلام میں ایسی غلطیاں موجود ہیں جن سے انکے معاصرین کا کلام پاک ہے یا یہ کہ نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نہیں ہے۔ نیز میرا یہ خیال ہے کہ جس قسم کے اعتراضات حضرت شرر نے پیش کئے ہیں انمیں سے ایک بھی قابل وقعت نہیں ہے۔ میں نسیم کے کلام کو کلام خدا نہیں سمجھتا ہوں کہ اسمیں غلطی کا گمان کرنا کفر سمجھوں نسیم کے کلام میں لغزشیں ہیں مگر وہ اسی قسم کی ہیں جیسے کہ ہر شاعر کے کلام میں ملسکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تعقید لفظی عیب میں داخل ہے مگر جب آتش وناسخ کے کلام میں نسیم سے بدتر تعقید لفظی کی مثال موجود ہے تو پھر نسیم پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے اور خاص اس حالت میں جبکہ یہ اعلان شائع کر دیا گیا ہے کہ نسیم کے کلام میں ایسی غلطیاں ہیں جنکا پتہ انکے معاصرین کے کلام میں نہیں ملتا ہے اگر اڈیٹر صاحب اردوئے معلی اس امر پر خاص طور پر غور فرمائے تو آپ کو میری پیش کردہ اسنادوں سے بعض موقعوں پر اختلاف ظاہر کرنے کی تکلیف نہ گوارا کرنا پڑتی۔ فقط

(برج نرائن چکبست لکھنوی)

[illegible]

[illegible]

[illegible] اتحاد ہو یا اختلاف [illegible]

[illegible] خواہ [illegible] اتفاق ہو یا اختلاف ہم صرف [illegible]

[illegible] بعض اخبارات [illegible] یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ خواجہ صاحب نے ریاست [illegible]

[illegible] اس وقت زندگی [illegible] استعفاء [illegible] انکو ریاست کی قید سے بحال سمجھا جاتا ہے۔

(۲) [illegible] ارباب [illegible] یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی ہو کہ امسال [illegible] ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس [illegible] کی شرکت کا بھی انتظام ہوگا لیکن اب یہ سنکر اپنی قوم کے حالپر افسوس آتا ہو کہ بعض گروہ [illegible] لوگوں نے [illegible] سے خیال کر کے [illegible] اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔ اور عذر میں یہ دلیل پیش کی کہ ابھی ایسی باتوں کا وقت نہیں آیا ہے [illegible] ہم کہتے ہیں کہ جس وقت لوگوں کے دلوں میں کسی مفید تحریک کا خیال پیدا ہو وہی اسکی ابتدا کا وقت ہے۔ محرم کی مجالس [illegible] بھی مناسب نہیں کرتے [illegible] تعلیم یافتہ لوگ [illegible] کانفرنس [illegible] بعض لوگ تعلیم نسواں کی مخالفت بھی اسی عذر کے ساتھ بڑے شد ومد سے کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہندوستان کی تمام مذہب قومیں پولیٹکل معاملات میں جد وجہد کر رہی ہیں لیکن مسلمان اپنے ناعاقبت اندیش لیڈروں کے قول کے مطابق یہی کہہ رہے ہیں کہ ابھی اسکا وقت نہیں آیا ہے۔ تمام تعلیم یافتہ فرقے تعلیم نسواں کو ضروری سمجھکر اسکے [illegible] ہیں لیکن مسلمان لیڈر یہی [illegible] کئے جاتے ہیں کہ ابھی اسکا وقت نہیں آیا اور ثبوت میں [illegible] پیش کرتے ہیں ہم ان لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ آخر ان سب باتوں کا وقت کب آئیگا۔ [illegible] کیا [illegible] قول [illegible] الٰہی میں ہر وقت اور ہر زمانے کے لیے یکساں مفید ثابت ہونگے۔

(۳) [illegible] | [illegible] سے برائے طلباء [illegible] حضرات [illegible] قسم دوم کے کاغذ پر چھپا ہوا کریگا اور اسکی قیمت صرف ۱۲/ سالانہ مع محصول ہوگی۔ کاغذ اس پرچہ [illegible] کے ضمیمے کا سا ہوگا۔

رسید کتب | (۱) [illegible] (۲) مضمون [illegible] (۳) بارہ ماسہ [illegible] (۴) شمع انجمن (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) ارکان الاسلام (۸) یادگار دربار اسلام ان کتابوں پر آئندہ ریویو کیا جائیگا۔